حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۴

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۴

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

مقصودِ بعثت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :"إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :"بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ" ② أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

احادیث کا مفہوم...... بزرگانِ محترم! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں ہیں، جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں۔ ان دونوں احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریف آوری، بعثت اور اپنی رسالت و نبوت کی غرض وغایت بیان کی ہے کہ مجھے دنیا میں کیوں بھیجا گیا؟ اور میں کیوں مبعوث کیا گیا؟

تو آپ نے اپنی بعثت کی دو غرضیں ارشاد فرمائیں۔ ایک فرمایا:"إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ③ اور دوسری حدیث میں فرمایا: "بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ" ④

پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تعلیم دوں اور دوسری حدیث میں فرمایا: میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ پاکیزہ اخلاق کو مکمل بنا کے پیش کروں۔ دنیا کے اخلاق کی تکمیل کروں اور دنیا کو خلیق بنادوں۔ پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو عالم بنادوں اور دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو بااخلاق بنادوں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم اور تربیت کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔ تعلیم کے ذریعے علم پھیلتا ہے اور تربیت کے ذریعے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دو غرضیں ہوئیں۔ ایک علم پہنچانا اور ایک اخلاق درست کرنا۔ اس کے بغیر دنیا کی کوئی قوم نہ باقی رہ سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے۔

---

① ③ السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج:۱، ص:۲۶۵. یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ۱/۸۸، رقم ۱۱۔ ② ④ حدیث صحیح ہے مجمع الزوائد باب حسن معاشرۃ ۴/۶۱۔

اگر ایک شخص عالم ہے اور اس کا بہت بڑا علم ہے۔ لیکن بداخلاق ہے، تو اس کا علم کبھی مؤثر نہیں ہوگا، وہ دوسروں کو فائدہ کبھی نہیں پہنچا سکتا اور اگر بہت بااخلاق ہے، نیک خلق ہے، لیکن جاہل ہے، تو محض اخلاق سے وہ دنیا کو تربیت نہیں دے سکتا۔

انسان کی ذات میں علم نہیں ہے...... علم انسان کی ذات میں نہیں ہے، وہ باہر سے لایا جاتا ہے۔ اخلاق اندر موجود ہیں لیکن انہیں درست کیا جاتا ہے۔ تو ایک چیز انسان کے گھر کی ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور ایک چیز سرے سے نہیں ہے۔ اس کو انسان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ تو خلقی طور پر انسان جاہل پیدا ہوا ہے۔ اس میں کوئی علم نہیں تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا اور نکالا۔ کس حالت میں؟ ذرہ برابر تمہیں علم نہیں تھا۔ جاہل مطلق پیدا ہوئے تھے۔ نہ سیاہ وسفید کی تمیز تھی، نہ اچھے برے میں امتیاز تھا، نہ حلال وحرام کا پتہ تھا، بالکل جاہل مطلق تھے، ماں کے پیٹ سے کوئی ہنر لے کر نہیں آئے اللہ نے اپنا فضل کیا۔ ﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾ ② تم میں سننے کی طاقت رکھی، دیکھنے کی طاقت رکھی، سمجھنے اور بوجھنے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات تم سن کر حاصل کرتے تھے۔ کچھ دیکھ کر اور کچھ سنی ہوئی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کر کے علم نکالتے تھے۔ اللہ نے یہ طاقتیں تمہارے اندر رکھیں تا کہ علم پیدا کرو، علم کے اندر آؤ۔ علم بھی تمہارے اندر گھسے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ خالی ہے۔ مگر ہاں صلاحیت ہے کہ اگر علم سیکھنا چاہے تو علم آ سکتا ہے۔ اسی لئے انسان کو جاہل کہا گیا ہے۔ جاہل اسے کہتے ہیں جو علم نہ رکھتا ہو، مگر علم لینے کی اس میں صلاحیت ہو۔ اس دیوار کو ہم جاہل نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ اس میں عالم بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو ہم جاہل نہیں کہیں گے، اس لئے کہ یہ عالم بن ہی نہیں سکتا یہ شامیانہ اور زمین وآسمان جاہل نہیں ہیں، کیونکہ ان میں عالم بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان ہی کو جاہل کہا جائے گا، کیونکہ اس میں عالم ہونے کی صلاحیت ہے، اس میں استعداد موجود ہے۔

تعدیل اخلاق بلا علم ممکن نہیں...... اسی طرح انسان کے اندر اخلاق تو ہیں، مگر جب تک اس میں علم نہیں ہے وہ معتدل اخلاق نہیں ہیں بلکہ انسان یا ایک کنارے پر رہتا ہے یا دوسرے کنارے پر، جب تک علم نہیں آتا وہ درمیان میں اعتدال پر نہیں ہے۔ افراط اور تفریط کے لئے جہالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عدل اخلاق کے لئے ان کو معتدل بنانے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔

مثلاً صبر ایک خلق ہے، تو صبر کا ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آئے تو آپے سے باہر

① ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

ہو جائے، گریبان پھاڑ دے، بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، منہ نوچ لے۔ یہ خلق صبر کا ایک کنارہ ہے یعنی انتہائی بے صبری۔ اور دوسرا کنارہ یہ ہے کہ کتنی ہی مصیبتیں آئیں، کوئی اثر ہی نہ ہو۔ اس کے اندر سرد مہری ہو کہ کوئی فوت ہو جائے تو اس کی آنکھ سے آنسو ہی نہ نکلے، دل میں غم تک نہ آئے، جیسے اپنے کام میں لگ رہا تھا، لگا رہے۔ پتھر کی مانند ہو جائے، اس کی طبیعت میں کوئی اثر نہ ہو۔ تو ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ اتنا بے صبر بن جائے کہ آپے سے باہر نکل جائے، ایک کنارہ سرد مہری کا ہے کہ اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ وہ بھی صبر نہیں، یہ بھی نہیں۔ صبر درمیان میں ہے کہ اثر تو لے، مگر حدود کے اندر رہے، آپے سے باہر نہ ہو، اسے صبر کہیں گے۔ تو نہ جزع فزع صبر ہے نہ سرد مہری صبر ہے۔ بیچ کا درجہ صبر ہے کہ حدود کے اندر رہے اور حدود جب تک معلوم نہ ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ اخلاق کے لئے علم کی ضرورت پڑی۔ اگر حدود کا علم نہ ہو آدمی صابر نہیں بن سکتا، لیکن افراط و تفریط یعنی رخسارے پیٹنا، منہ نوچ ڈالنا، آپے سے باہر ہونا، اس کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں، جہالت کی ضرورت ہے۔ جتنا ہی جاہل ہوگا، اتنا ہی بے صبرا پن بھی ہوگا، اتنا ہی ماتم نوحہ کرے گا، بین کر کے روئے گا۔ اس لئے کہ اسے حدود کا علم ہی نہیں اور بالکل اثر نہ لے، کتنی ہی اموات ہو جائیں، کتنے ہی غم آ جائیں، اسے فکر ہی نہیں۔ یہ بے فکرا ہے، تو بے فکری کے لئے بھی علم کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے جہالت کافی ہے، لیکن صبر بھی کرے اور حد کے اندر رہے، اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں تاکہ اخلاق کے اندر درمیان کا راستہ بتلائیں۔

خلقِ صبر کی حقیقت...... مثلاً حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: ''وَاِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاھِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ.'' ① اے ابراہیم! تمہاری جدائی اور فراق سے ہم غمزدہ ہیں، ہمارا دل متاثر ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو فرماتے تھے کہ صبر کرنا چاہئے، حالانکہ آپ رو رہے ہیں۔ فرمایا: رونا قلب کی رحمت کی علامت ہے۔ میں نے جو کہا تھا صبر کرو، اس کا مطلب یہ تھا کہ بین کر کے مت روو۔ نوحے مت کرو، ماتم مت کرو، رخسارے مت پیٹو، گریبان مت چاک کرو۔ اس لئے کہ یہ بے صبری ہے۔ یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کہ معاذ اللہ آپ نے یہ فعل ٹھیک نہیں کیا کہ فلاں کو موت دے دی۔ میں آپے سے باہر ہوں، تو میں نے حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کے اظہار سے روکا تھا، اس سے نہیں روکا تھا کہ تم آنسو مت نکالو۔ تمہارے دل میں بھی شفقت نہ آئے۔ یہ تو رحمت کی علامت ہے۔ جس مومن کے قلب میں رحمت نہ ہو اس میں ایمان ہی کہاں ہوا؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ اور زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ لوگ بیٹیوں کو زندہ دفن کر

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انابک لمحزونون، ج: ۱، ص: ۴۳۹، رقم: ۱۲۴۱.

دیتے تھے۔ سینکڑوں بچیاں زندہ دفن کر دیں، اس عار میں کہ ہم کسی کے سسر نہ کہلوائیں، کوئی ہمارا داماد نہ کہلوائے۔ وہ شخص آیا، اسلام قبول کیا۔ کسی نے کسی کی موت کی خبر دی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! آپ روتے ہیں۔ میں نے تو اپنی گیارہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا ہے اور وہ چلاتی رہیں۔ اے باپ، اے باپ پکارتی رہیں، مجھے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ فرمایا: تیرے اندر دل ہے یا پتھر ہے؟ یہ قساوت قلب کی بات تھی۔ مومن اور انسان وہ ہے جس کے اوپر غم کا اثر ہو، جو اثر ہی قبول نہ کرے، وہ دل نہیں، وہ پتھر ہے۔

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کہ صابر بنو۔ اور صابر بنا کسے کہتے ہیں کہ غم کا اظہار بھی کرو مگر حدود سے مت گزرو۔ یہ جبھی ہوگا جب حدود کا علم ہوگا کہ کہاں تک ہمیں رونا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ کہاں تک غم کرنا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ تو جائز و ناجائز کی حدود بتلانا یہ تعلیم ہے۔ غرض اخلاق درست نہیں ہو سکتے جب تک علم نہ آئے۔

حقیقتِ تواضع ...... اسی طرح تمام اخلاق ہیں۔ مثلاً تواضع ہے، اس کا ایک کنارہ تو تکبر ہے کہ آدمی فرعون بن جائے، بڑے بول بولے، اکڑ کر اینٹھ کر چلے۔ دوسرا کنارہ یہ ہے کہ ذلت نفس پیدا ہو جائے۔ بس ہر کس و ناکس کے آگے جھکتا پھرے۔ یہ بھی تواضع نہیں، وہ بھی تواضع نہیں۔ وہ دونوں کنارے ہیں، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بیچ میں تواضع ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل بھی نہ بنائے اور متکبر بھی نہ بنائے۔ ذلت بھی نہ ہو یعنی وقار ہو۔ تکبر بھی نہ ہو یعنی تواضع ہو۔ یعنی اللہ کی خاطر اور اللہ کے سامنے جھکے۔ کسی بڑے کی تعظیم کرے تو لوجہ اللہ کرے۔ خوشامد اور غرض مندی سے نہ کرے، خوشامد اور غرض مندی سے جو تعظیم کرے گا، وہ تواضع نہیں ہوگی، وہ تملق اور چاپلوسی ہوگی۔ اور اگر کسی باکمال کے آگے اللہ کے لئے جھکے وہ تواضع للہ ہو جائے گی، تو نہ تکبر جائز، نہ ذلت نفس جائز۔ دونوں کے بیچ میں تواضع ہے مگر تواضع کے لئے حد کی ضرورت تھی کہ اس حد تک جھکو، اس حد تک مت جھکو اور یہ حدوں کا معلوم ہونا بغیر تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کے نہیں ہوتا۔

مثلاً سلام کرنا ہے یہ مسلمان کا حق رکھا گیا ہے کہ اسے سلام کرے، لیکن سلام کرنے میں اگر جھک جائے اور اتنا جھکے کہ رکوع کی کیفیت پیدا ہو جائے، یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اس لئے کہ رکوع یہ عبادت کا جز ہے اور غیر اللہ کی عبادت نہیں کی جاتی۔ غیر اللہ کے آگے اتنا جھکنا جائز نہیں ہے کہ عبادت کی صورت پیدا ہو جائے۔

سجدہ کرنا عبادت ہے، غیر اللہ کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ عبادت خدا کے لئے مخصوص ہے۔ بندوں کے لئے عبادت نہیں ہوتی، حدیث میں ہے اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ مگر اللہ کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں اس لئے میں نے روک دیا۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آ کر سجدہ کیا۔ آپ

نے فرمایا: یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے قیصر اور کسریٰ کا دربار دیکھا وہ بادشاہ اپنے آگے سجدہ کراتے ہیں، وزراء سجدہ کرتے ہیں، ان کی رعیت کے لوگ سجدہ کرتے ہیں۔ یارسول اللہ! قیصر اور کسریٰ سجدہ کرائیں تو اللہ کے رسول بہت باعظمت ہیں، خلق اللہ میں سب سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، سجدہ صرف اللہ کے لئے زیبا ہے۔ کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں۔ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ ①

تو رکوع وسجود کرنا اور جو بھی عبادت کی چیزیں ہیں، وہ غیر اللہ کے لئے حرام اور ناجائز ہیں۔ اس لئے جو ہیئت عبادت کے قریب بھی آجائے وہ بھی ممنوع قرار دی گئی۔ تو مخلوق کے آگے ذلیل النفس بننا جائز نہیں ہے۔ اور ایک ہے تکبر کہ مخلوق کے اوپر آدمی اپنی بڑائی جتلانے لگے یہ بھی ممنوع ہے۔ یعنی تکبر بھی ممنوع اور تذلل بھی ممنوع۔ ذلیل بننا بھی جائز نہیں۔ متکبر بننا بھی جائز نہیں۔ ان دونوں کے درمیان میں تواضع ہے۔ تو آدمی جھکے مگر لوجہ اللہ جھکے اور اتنا نہ جھکے جس سے عبادت کی شان پیدا ہو جائے۔ انہی حدود کے بتلانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

اتباعِ شریعت......اس سے معلوم ہوا نہ ہم تکبر میں آزاد ہیں نہ تواضع اور وقار میں آزاد ہیں۔ ہم شریعت کی تعلیم کے پابند ہیں۔ وہ جتنا ہمیں جھکا دے گی، اتنا جھک جائیں گے۔ جتنا کہے گی گردن اونچی کرلو، ہم گردن اونچی کرلیں گے۔ جتنا کہے گی ذلت اختیار کرو ہم ذلت اختیار کرلیں گے جہاں کہے گی یہاں بڑائی کی صورت بنالو، ہم بڑائی کی صورت بنالیں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ② اے بندو! خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ مونڈھے ہلا کے، چھاتی ابھار کر متکبروں کی چال مت چلو۔ تم دنیا میں بندگی کرنے کے لئے آئے ہو، خدائی کرنے کے لئے نہیں آئے۔ خدائی کے لئے ایک خدا کی ذات کافی ہے۔ جب ہم بندے ہیں تو بندگی کی چال چلیں۔

اور فرمایا گیا کہ ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ ③ تم جو اکڑ کر چل رہے ہو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالو گے اور پہاڑوں کی بلندیوں کو نہیں پہنچو گے۔ اتنی جگہ میں رہو جتنی جگہ میں ہو۔ کیوں خوامخواہ مصیبت بھر رہے ہو؟ کیوں اپنے نفس کو تعب میں ڈال رہے ہو؟۔ اس لئے روک دیا گیا کہ اکڑ کر مت چلو۔ تو دین یہی ہے کہ آدمی اس حکم کو مان کر چلے۔ لیکن اگر کہیں یوں کہیں کہ اکڑ کر چلو تو ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ اس لئے کہ ہم حکم بردار بندے ہیں۔ فرمایا گیا جس طواف میں طواف کے بعد سعی ہو تو ابتداء کے چار پھیروں میں اکڑ کر چلے،

---

① حدیث صحیح ہے۔ مجمع الزوائد للامام الهيثمي، باب حق الزوج على المراة، ج: ٢، ص: ٢١٣.

② ③ پارہ: ١٥، سورۃ الاسراء، الآية: ٣٧.

سینہ ابھار کر مونڈھے ہلاتا ہوا، پہلوانوں کی طرح چلے۔ تو یہاں اس طرح چلنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ اگر نہیں چلے گا تو گنہگار ہوگا اور عام اوقات میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت ہے، اگر چلے گا تو گنہگار ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو حکم بردار رہنا چاہئے۔ جو شریعت حکم دے، اس کی اتباع کرے۔ اگر کہے کہ اکڑو تو اکڑ لے۔ اگر کہے کہ جھک جاؤ تو جھک جائے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدود بتلانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔ مادے انسان میں موجود ہیں، ان کی قدریں بتلانے کے لئے آئے کہ یہ قدر اختیار کرو۔

اسلام نے اخلاقی جواہر کو باقی رکھا ہے...... انسان میں تکبر کا مادہ بھی ہے اور تذلل کا مادہ بھی ہے۔ ذلیل بننے کا بھی ہے، ابھرنے اور اکڑنے کا بھی ہے۔ شریعت نے کسی مادے کو ضائع نہیں کیا، بلکہ کہا کہ باقی رکھو اور جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو۔ تکبر کا مادہ بھی کام آئے گا کہ جب کفار کے مقابلہ پر جاؤ تو خوب اکڑ کر پہلوانوں کی سی ہیئت بناؤ تا کہ ان کے اوپر رعب پڑے۔ اور جب ایمان والوں کے سامنے آؤ تو جھک کر چلو تا کہ تمہاری رحیمی اور کریم النفسی واضح ہو۔ تو دونوں مادوں کو باقی رکھا، ضائع نہیں کیا۔ ٹھکانہ اور مصرف بتلا دیا کہ اس طرح سے استعمال کرو۔ تو اسلام اس لئے نہیں آیا ہے کہ کسی مادے کو ضائع کر دے۔ جو اللہ نے پیدا کیا اور خلقی طور پر رکھا ہے، اسے کھودے، بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔ مثلاً غصہ ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا: "عِظْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَوْجِزْ" ① یا رسول اللہ! کچھ وعظ فرمائیے مگر مختصر۔ فرمایا: اِيَّاكَ وَالْغَضَبَ۔ وعظ ختم ہوگیا۔ لوگو! غصے سے بچتے رہنا۔ اس لئے کہ غصے میں سے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جتنے جذبات بھڑکتے ہیں، اتنا ہی فتنہ پھیلتا ہے۔ جب جذبات میں کوئی آپے سے باہر ہوگا، لڑائی ہو جائے گی۔ اور قرآن کریم نے فرمایا ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ②

"اے پیغمبر! کفار اور منافقین کے مقابلہ میں جہاد کرو اور شدت اور غیظ و غضب ان کے مقابلہ میں دکھلاؤ"۔ یہاں غیظ و غضب اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ غصے کے مادے کو نکال دے، اس لئے آئی ہے کہ غصے کو باقی رکھو مگر ٹھکانے پر استعمال کرو۔ جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو، جہاں ہم روکیں وہاں رک جاؤ۔ یہ ہمارے بخشے ہوئے جوہر ہیں۔ تمہیں حق نہیں ہے کہ تم انہیں کھودو یا نکال دو۔

اسی طرح شہوت کا مادہ رکھا۔ شریعت اس لئے نہیں آئی کہ اس کو کھودو۔ اگر کھودی گئی تو نسل کیسے چلے گی؟ مگر یہ فرمایا کہ اس شہوت کو زنا میں مت استعمال کرو، نکاح میں استعمال کرو۔ تو مصرف اور ٹھکانہ بتلا دیا کہ اس طرح استعمال کرو۔

اخلاقی جواہر میں انسان امین ہے..... حاصل یہ نکلا کہ انسان میں اللہ نے جوہر اور مادے پیدا کئے۔ مگر یہ اس کی

① احمد حدیث ابی ایوب انصاریؓ ۷/۴۷ ۴۹۵. حدیث صحیح ہے۔ الصحیحۃ ۱/۸۰۰، رقم ۴۰۱۔

② پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۷۳.

دی ہوئی امانتیں ہیں۔ انسان ان مادوں میں امین ہے۔ اسے یہ حق نہیں ہے کہ اپنے اختیار و ارادے اور اپنی تجویز سے استعمال کرے۔ جس کی دی ہوئی امانت ہے اسی کی تجویز معتبر ہوگی۔ اسی کے کہنے کے مطابق استعمال کرنا پڑے گا۔

اگر آپ کے پاس کوئی شخص روپیہ امانت رکھوا دے تو آپ کو استعمال جائز نہیں، جب تک کہ وہ اجازت نہ دے۔ اور اجازت دینے والا جو مالک ہے، اگر وہ یوں کہے کہ تم استعمال کر سکتے ہو مگر فلاں چیز میں، مکان خرید سکتے ہو، دوسری جگہ میں اجازت نہیں دیتا۔ جہاں اجازت دے وہیں استعمال کریں گے، اگر وہ استعمال سے روک دے تو آپ کو کوئی حق نہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ امانت جب رکھوائی جاتی ہے تو اس اصل امانت ہی کا واپس کرنا واجب ہے۔ یعنی مثلاً آپ کے پاس سو روپیہ رکھوایا، تو جو روپیہ رکھوایا ہے، وہی بعینہ واپس کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہے کہ آپ نے خرچ کر کے سو اس کی جگہ رکھ دیئے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ تو امانت میں عین کا واپس کرنا واجب ہے۔ اگر آپ خرچ کریں گے تو مالک سے اجازت لینی پڑے گی۔ وہ اجازت دے گا کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ جب میں مانگوں واپس کر دینا۔ اس وقت عین کو بدلا جائے، اس کی جگہ آپ کوئی دوسری چیز دے دیں یہ آپ کے لئے ناجائز ہے۔

غرض یہ بدن، روح، قوتیں اور مادے ان سب کے مالک حق تعالیٰ شانہ ہیں، آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ ہوتے تو خود بنے بنائے موجود ہوتے۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ میاں آپ کو بنائیں جب آپ وجود میں ان کے محتاج ہیں تو مالک وہ ہیں۔ جب وہ مالک بدن ہیں اور بدن میں جتنے جوہر ہیں ان کے بھی، روح میں جتنے ملکات اور قوتیں رکھی ہیں ان کے بھی، سب کے مالک وہ ہیں۔ تو آپ کو ان کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ جب تک ان سے اجازت نہ لیں اور جہاں کی وہ اجازت دے دیں وہیں استعمال کرو۔ جب وہ مانگیں گے تو بعینہ اسی طرح سے واپس کرنا پڑے گا۔ یہ جائز نہیں ہوگا کہ آپ یوں کہیں کہ صاحب! وہ بدن تو میں نے استعمال کر لیا۔ میں نے خودکشی کر لی تھی، اب آپ دوسرا بدن بنا لیں، یہ نہیں ہے، اسی بدن کو واپس کرنا پڑے گا۔

اس واسطے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا، یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سرکاری مشین ہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ اس کو کھو دیں؟ یا خراب کر دیں؟ آپ امانت دار ہیں۔ بعینہ آپ کو واپس کرنا پڑے گا۔ جب ملک الموت آئیں تو سپرد کر دینا پڑے گا کہ روح بھی حاضر ہے، نفس بھی حاضر ہے اور یہ بدن بھی حاضر ہے۔ اس لئے کہ کوئی چیز میری نہیں ہے۔ تو جب اصل روح، بدن اور نفس کے بھی آپ مالک نہیں ہیں، تو ان کے افعال کے آپ کیسے مالک ہو جائیں گے؟ اور جو ان کے اندر مادے اور جوہر رکھے ہوئے ہیں، ان کے مالک آپ کب ہوں گے؟ ان کے مالک بھی حق تعالیٰ ہیں۔ غرض آپ کے نفس میں شہوت کی قوت رکھ دی، غصہ اور غضب کی قوت رکھ دی، تواضع اور جھکنے کی قوت رکھ دی، اکڑنے اور اینٹھنے کی قوت رکھ دی، امانتداری کی قوت رکھ دی اور اس کی کہ دوسروں سے چھین جھپٹ کرو۔ یہ سارے مادے ہیں۔ آپ کو اجازت لینی پڑے گی کہ کہاں کہاں استعمال کروں۔ شہوت و غضب کو کہاں؟ امانت داری اور چھین جھپٹ کے مادے کو کہاں استعمال کروں؟

انسانی جواہر میں تجویز شریعت کا اعتبار ہے.....وہ اجازت دیں گے کہ شہوت کے مادے کو استعمال کر سکتے ہو، مگر نکاح کے ذریعے سے جائز مصرف میں۔ پھر تجویز بھی شریعت ہی بتلائے گی کہ نکاح بھی اگر کرو، تو ماں سے جائز نہیں، بہن سے جائز نہیں، پھوپھی سے جائز نہیں۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ﴾ ① ''تم پر تمہاری مائیں حرام کر دی گئیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری حقیقی بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری حقیقی بھتیجیاں، تمہاری حقیقی بھانجیاں، یہ تم پر حرام کی گئیں الخ''۔ جس وقت شریعت نے اجازت دی کہ اس شہوت کو نکاح کے ذریعے استعمال کرو، تو ساتھ ہی مصرف بھی بتلایا کہ فلاں فلاں جگہ نکاح مت کرنا، ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔ جہاں شریعت بتلائے گی وہیں آپ نکاح کر سکو گے۔

اسی طرح غصے اور غضب کی قوت ہے۔ آپ اس میں مختار نہیں ہیں کہ جس پہ آپ چاہیں اکڑ، پھونک دکھانے لگیں۔ جس پہ چاہیں غصہ کرنے لگیں۔ آپ کو شریعت سے مشورہ کرنا ہوگا کہ میں غصے کو کہاں استعمال کروں؟ چنانچہ باپ کے مقابلے میں یہ جائز نہیں کہ آپ غصہ دکھلائیں۔ وہاں فرما دیا گیا ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ② ماں باپ جب آئیں تو نیاز مندی کے ساتھ گردن جھکا دو، عجز و نیاز کے ساتھ ان کے سامنے جھکو اور محض جھکنا ہی نہیں، بلکہ زبان سے کوئی کلمہ ایسا مت نکالو جس سے ان کا دل دکھے یا ان کا دل پکڑا جائے، ایسا کلمہ نکالنا جائز نہیں۔

اور پھر یہی نہیں یہ تو اسی وقت کیا جائے گا، جب ماں باپ سامنے ہوں گے کہ ادب سے جھکیں گے بھی اور کلمہ بھی ادب سے کہیں گے۔ غائبانہ بھی ہوں تو اس وقت بھی ان کا ادب و عظمت کرو۔ ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ③ اے اللہ! میرے ان ماں باپ پر رحم فرما، جیسے انہوں نے میرے بچپن میں مجھ پر رحم کیا۔ مجھے اتنے سے اتنا بنایا۔ اس وقت جب میں عاجز اور بے بس تھا، ان کے رحم و کرم پر پل کر آج میں اس قابل ہوا کہ چل پھر کر میں اپنا کام کاج کر سکوں۔ تو جنہوں نے مجھے اس قابل بنایا، بے کسی کی حالت میں مجھ پر رحم کھایا۔ اے اللہ! تو ان کی بے کسی کی حالت میں ان پر رحم کھا۔ تو غائبانہ بھی دعاء کرو۔ سامنے آؤ تو برا کلمہ مت کہو، عمل ایسا مت کرو جس سے ان کا دل دکھے۔ تو فرمایا کہ یہ تکبر و بڑائی اور غصے کا اظہار، اس کا مصرف ماں باپ نہیں ہیں۔ اسی طرح استاذ ہو، اس کے سامنے جائز نہیں کہ آپ اکڑیں یا اینٹھیں یا کبر و نخوت دکھائیں۔

عظمتِ استاذ..... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِيْ حَرْفًا، اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ عَتَقَ.'' ④

---

① پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۱۵ سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۴۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۴۔ ④ روایت ضعیف ہے۔ کشف الخفاء ومزیل الالباس، للعجلونی، ج: ۲، ص: ۲۶۵۔

''میں اس کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی تعلیم دی۔ چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے مجھے آزاد کردے''۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، انہیں فقہی مسائل میں خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک مسئلہ میں خنزیر کا ذکر کیا، تو اس کی تحقیق کرنی تھی۔ اس کی تحقیق بھنگی سے زیادہ کسی دوسرے سے نہیں ہوسکتی۔ وہی خنزیر پالتے ہیں، تو حضرتؒ کے گھر کا بھنگی آیا۔ اس سے پوچھا کہ فلاں بات خنزیر کے بارے کس طرح سے ہے؟ اس نے کہا صاحب! یہ ہے۔ اس وقت سے یہ کیفیت تھی کہ جب وہ سامنے آتا اگر بیٹھے ہوئے ہوتے تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ اس کو ہدایا بھیجتے تھے۔ اس کی خدمت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''فلاں مسئلے کی تحقیق مجھے اس بھنگی سے ہوئی''۔ وہ بمنزلہ استاذ کے بن گیا عمر بھر اس کا ادب کیا۔ تو اسلام نے استاذ کی عظمت یہ بتلائی ہے کہ اگر ایک حرف سکھلا دے، تمہیں آنکھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔

علمی احسان...... اس واسطے کہ اگر کوئی کسی کو چار پیسے دیتا ہے تو آدمی اس کا احسان مانتا ہے۔ اولاد کو آدمی وصیت کر جاتا ہے کہ فلاں آدمی نے میری خدمت کی تھی۔ تم اس کے نیاز مند رہنا۔ چار پیسے کا احسان مانتا ہے، تو علم کا ایک مسئلہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، علم اللہ کی صفت ہے۔ اس سے زیادہ باعظمت چیز کونسی ہوسکتی ہے؟ تو کوئی کسی کو علم سکھلائے اور اس کی عظمت ضروری نہ ہو؟ ایسا محسن کوئی نہیں۔ جو آدمی کو ایک مسئلہ بھی بتلا دے۔ اس نے دنیا و مافیہا اور آخرت کا راستہ درست کردیا۔ پیسے سے اگر کوئی کام نکلے گا تو دنیا کا نکلے گا۔ لیکن علم سے آخرت میں، قبر و برزخ میں، حشر میں اور دنیا میں بھی کام نکلے گا۔ ہر جگہ علم کا سکہ چلتا ہے۔ وہاں آپ کے یہ سونے چاندی کے سکے نہیں چلیں گے مگر مسائل کا سکہ چلے گا۔ حتیٰ کہ جنت میں بھی جا کر مسائل کی ضرورت رہے گی، وہاں بھی آپ علم کے محتاج ہوں گے۔ تو جو شخص آپ کے ہاتھ میں علم کا سکہ دے۔ اس سے بڑھ کر کون محسن ہے؟ جب چار پیسے کا احسان کرنے والے کا آپ احسان مانتے ہیں۔ تو ایک مسئلہ بتلانے والے کا احسان کیوں نہیں مانیں گے؟ اس نے آپ کو زیادہ سے زیادہ بڑی دولت دی ہے۔ علم کی دولت چاندی اور سونے کے دولت سے بدر جہا بہتر ہے۔

علم اور مال میں فرق..... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علم اور مال میں فرق ہے، وہ یہ کہ مال جتنا خرچ کرو، گھٹتا ہے، علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے۔ اگر علم کہیں گھٹ جایا کرتا، تو جو حافظ قرآن شریف پڑھانے بیٹھتا، تو جتنی آیتیں بچوں کو سکھلایا کرتا، خود بھول جایا کرتا۔ اس کا علم دوسرے کے پاس منتقل ہوجایا کرتا۔ حالانکہ جتنا پڑھاتا ہے تو استاذ پرانا ہوجاتا ہے، اس کا علم ترقی کر جاتا ہے۔ غرض علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے، دولت کو جتنا خرچ کرو، گھٹتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ مال کی حفاظت مالک کو کرنی پڑتی ہے۔ چار پیسے ہوں گے تو آپ کو فکر ہے کہیں چور نہ لے جائے۔ تالا لگاؤں، تجوری میں رکھوں، گھر کی کوٹھڑی میں رکھوں اور سو رہے ہیں تو فکر ہے کہ رات کو کوئی چور نہ

آئے۔ تو آپ کو خود مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور علم عالم کی حفاظت کرتا ہے، عالم کو ضرورت نہیں۔ علم خود بتلائے گا کہ یہ خطرے کا راستہ ہے، یہ نجات کا۔ تو علم اپنے عالم کی خود حفاظت کرتا ہے مگر مال اپنے مالک کی حفاظت نہیں کرتا، مالک کو حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ مال آئے گا تو سو مصیبتیں ساتھ لے کر آئے گا کہ حفاظت کرو چور سے اور اس سے وغیرہ وغیرہ۔ اور علم آئے گا تو وہ احسان جتلاتا ہوا آئے گا کہ میں تیرا محافظ ہوں، میں تیری خدمت کروں گا، میں تجھے نجات کا راستہ بتلاؤں گا۔ تو علم جیسی چیز اگر کوئی سکھلائے تو وہ سب سے بڑا محسن ہے کہ اس نے دنیا اور آخرت کا راستہ کھول دیا۔

مال یا علم...... دولت سے راستے نہیں کھلتے۔ اس سے تو آدمی بھٹکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں بھی علم ہی کام آتا ہے۔ اگر یہ علم کے مطابق کمائے اور علم کے مطابق خرچ کرے تو دولت کام دے گی اور اگر جاہلانہ طریق سے کمائے، حلال و حرام کا امتیاز نہ کرے اور خرچ کرنے میں حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو، تو دولت مصیبت بن جاتی ہے۔

اب تک تو ہم عقیدے سے سمجھتے تھے کہ بھئی دولت کو بے جا طریق سے کماؤ تو مصیبت بن جاتی ہے، مگر آج تو دنیا میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ یعنی جن کے پاس ناجائز طریق سے کمائی ہوئی دولت تھی، آج وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا کے لئے دولت نکلے، جان تو ہماری بچ جائے۔ کوئی پہاڑوں میں چھپا رہا ہے، کوئی سمندر میں ڈال رہا ہے۔ مگر گورنمنٹ ہے کہ کھوج نکال کر ان چیزوں کو نکال رہی ہے۔ تو مالداروں پر ایک عجیب مصیبت گزر رہی ہے۔

یہ اللہ میاں کا فضل ہے کہ اس وقت ہم جیسے لوگ جو یہ کہا کرتے تھے کہ بھئی تھوڑے پیسے کافی ہیں۔ جو غریب یا زاہد تھے، آج انہیں امراء سے کہنے کا موقع ہے کہ بھئی آرام میں تو ہم ہیں۔ تمہاری دولت نے تمہیں فائدہ نہیں دیا۔ ہماری غربت نے ہمیں فائدہ دیا۔

کس نیاید بخانۂ درویش   کہ خراج زمین و باغ بدہ

درویش کے گھر گورنمنٹ کا کوئی آدمی نہیں آئے گا کہ خراج اور ٹیکس ادا کرو۔ وہ کہے گا کہ میرے ہاتھ پلے ہی کچھ نہیں۔ میں کہاں سے ادا کروں۔ وہ آرام سے ہے اور جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ مصیبت میں مبتلا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ۔

ما ہیچ نداریم ، غم ہیچ نداریم   دستار نداریم ، غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے۔ ہم دستار بھی نہیں رکھتے، پیچ کا غم کہاں سے رکھتے؟ جس پہ دستار ہوگی وہ پیچ و خم کی فکر کرے۔ یہاں تو دستار ہی ندارد ہے۔

جامہ ندارم، دامن از کجا آرم

یہاں کپڑا ہی ندارد ہے تو کلی اور دامن کی فکر کیوں ہوگی؟ بہر حال جو لوگ آج کم یعنی بقدرِ ضرورت رکھتے

ہیں، وہ آرام میں ہیں اور جو زیادہ رکھتے ہیں، وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مگر کیوں مبتلا ہیں؟ محض زیادہ رکھنے کی وجہ سے نہیں۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم مفلس اور قلاش بنو۔ ناجائز طریق پر زیادہ رکھتے ہو، اس لئے پریشان ہو۔ جس کے پاس جائز طریق سے ہے، وہ آج بھی پریشان نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا جائز راستے پر چلنا ہمیشہ راحت کا باعث ہوتا ہے۔ ناجائز راستہ پر چلنا مصیبت کا موجب ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانوناً ناجائز ہو یا شرعاً ناجائز ہو؟ جب کسی ناجائز چیز کا آدمی ارتکاب کرے گا، مصیبت میں مبتلا ہوگا اور جائز و ناجائز کیسے معلوم ہوگا؟ علم و تعلیم سے۔ قانون ہی یہ بتلائے گا کہ یہ چیز جائز ہے یہ ناجائز ہے۔ اس طرح مت کماؤ، قانون اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح کماؤ قانون اجازت دیتا ہے۔ تو اس بات کو علماء بتلائیں گے کہ اس طرح کمانا حلال، اس طرح کمانا حرام، اس طرح دولت رکھنا جائز اور اس طرح دولت رکھنا ناجائز ہے۔ تو دونوں قوانین کے وکلاء اور علماء ہیں۔ وہ سمجھائیں گے، وہی بتلائیں گے اور جب آدمی سمجھ جائے گا اور اس قانون کے مطابق چلے گا، اسے کوئی فکر نہیں۔ اس پر نہ گورنمنٹ اعتراض کرے گی نہ اللہ میاں اعتراض کریں گے۔ معلوم ہوا جان بچانے کا ذریعہ علم ہی ہے، دولت نہیں ہے۔ دولت میں جب علم کا دخل آئے گا تو وہ بچانے کی ذمہ دار ہوگی اور اگر جاہلانہ طریق پر ناجائز کمائی ہو تو وہ مصیبت بن جائے گی تو اصل میں نجات دینے والی چیز علم ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① میں تمہیں علم دینے کے لئے آیا ہوں۔ کیونکہ علم ہی نجات دینے والا ہے، دنیا میں اگر تمہیں علم آ گیا اور علم نے بتلایا کہ یہ راستہ ٹھیک ہے اور یہ غلط ہے اور تم اس کے اوپر چلے تو کبھی تمہارے اوپر آفت نہیں ہے، نہ دنیا میں آفت آئے گی نہ قبر و آخرت میں۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے علم پہنچایا اور علم ہی وہ ہے جس سے دولت کی اصلاح ہوتی ہے، نفس کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ آبرو بھی محفوظ رہتی ہے اور علم نہ ہو تو دولت اور نفس بھی کارآمد نہیں۔

جذباتِ نفسانی بلا علم...... اگر آپ نفسانی جذبات کو بلا علم کے استعمال کریں گے، مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ آپ بازار میں جا رہے ہیں اور حلوائی کی دکان پر نہایت عمدہ تازہ مٹھائیاں بنی رکھی ہیں۔ جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ میں ہاتھ ماروں، منہ ماروں۔ اگر علم ہے تو وہ بتلائے گا کہ غیر کے مال پر ہاتھ ڈالنا جائز نہیں، جب تک اس کی رضا مندی نہ ہو۔ لیکن اگر علم نہیں جذبات ہی جذبات ہیں، تو یا آدمی چوری کرے گا یا جھپٹا مار کر وہاں سے بھاگے گا اور دکاندار اس کے پیچھے گالیاں دیتا ہوا اور وہ آگے آگے اس کے ہاتھ میں چار لڈو ہیں۔ دو منہ میں، دو جیب میں رکھ کر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دکاندار نے آ کر گردن ناپی اور فوراً پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ اس نے ڈکیتی کی اور یہ دکان کے اوپر سے سامان اٹھا کر بھاگا تھا۔ پولیس نے فوراً چالان کیا۔ مقدمہ قائم ہوا، جو مل رہا ہے وہ تھو

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥ . حدیث ضعیف ہے الضعیفة ١/٨٨ رقم ١١۔

ٹھوکر رہا ہے کہ بڑا نالائق بڑا نابکار آدمی تھا۔

تو یہ جتنی ذلتیں اٹھائیں کہ گورنمنٹ الگ ناراض، پولیس الگ ناخوش، پبلک الگ ناخوش، دکان والے الگ ناخوش اور گالیاں پڑ رہی ہیں۔ یہ ذلت و رسوائی کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ نفسانی جذبات پر عمل کیا تھا اور علم آپ کو تھا نہیں، جاہلانہ طریق پر ایک چیز کو لے گئے۔ لیکن اگر علم کے ساتھ اس سے بھاؤ طے کرتے کہ بھائی کتنے میں دیتے ہو؟ وہ قیمت کہتا۔ قانونی طور پر آپ اسے کہتے کہ بھائی! اتنی نہیں، اتنی قیمت لے لو۔ پھر آپ لیتے تو نہ دکاندار برا کہتا نہ پولیس برا کہتی نہ گورنمنٹ ناخوش ہوتی۔ کوئی آپ کو مشکل نہ ہوتی، پریشانی نہ ہوتی۔ معلوم ہوا محض نفسانی جذبات آدمی کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں۔ لیکن اگر صحیح علم کے ساتھ صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے، یہ جذبات کارآمد ہو جاتے ہیں۔ تو اصل میں علم نجات دینے والا ٹھہرا۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ.'' ① سب سے بڑا عیار دشمن وہ ہے، جو تمہارے دو پہلوؤں کے بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو تمہارا نفس ہے۔ اس کو اگر قابو کرنے میں تم کامیاب ہو گئے ہو تو پھر کوئی مصیبت نہیں۔ لیکن اگر وہ آزاد ہے، تو ہر جگہ وہ مصیبت میں مبتلا کرے گا۔

اس واسطے کہ انسان کا نفس بالطبع جاہل ہے۔ پیدائشی طور پر جاہل ہے اگر آدمی علم حاصل نہ کرے، جاہل ہی پیدا ہوا ہو تو جاہل ہی رہے گا اور جاہل ہے تو جاہلانہ حرکات ہی کرے گا، وہ عالمانہ حرکات کہاں سے کرے گا؟ جب جاہلانہ حرکات کرے گا اور اپنے جذبات پر چلے گا، جبھی ذلت و رسوائی آئے گی۔ تو جس کے ذریعے سے رسوائی پہنچے، وہ دوست ہوتا ہے یا دشمن ہوتا ہے؟ سب سے بڑا دشمن وہی ہے جس کے ذریعے سے آدمی ذلیل ہو، جس کے ذریعے سے مصائب میں مبتلا ہو۔ اس لئے اگر نفس انسانی کو عالم نہ بنایا جائے، اس کے جذبات کو خودرو چھوڑ دیا جائے، تو وہ ہمیشہ گڑھے اور کھائی میں ڈالے گا، آدمی مصیبت میں مبتلا ہوگا۔

نفس انسانی کی مثال...... اسی واسطے نفس انسانی کی مثال محققین سرکش گھوڑے سے دیتے ہیں کہ جب سرکش گھوڑے پر سوار ہو تو لگام سنبھال کر بیٹھنا چاہئے۔ اگر لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا اچھل پڑا۔ معلوم نہیں کس کنویں میں لے جاکے گرائے؟ پھر جان بچانی مشکل ہو جائے۔ تو انسان کا نفس بھی جب تک جاہل ہے، اس وقت تک سرکش ہے۔ اس کی لگام سہارنی چاہئے۔ مگر لگام وہی سہارے گا جس کو یہ پتہ ہو کہ لگام کس طرح پکڑنا چاہئے؟ کس طرح سہارنا چاہئے۔ پھر آخر میں علم ہی آ جاتا ہے۔ تو بغیر علم کے نفس سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

اس واسطے تمام انسانوں کے نفس گویا سرکش گھوڑوں کی طرح سے ہیں۔ جب تک ان کے منہ میں لگام نہ ڈالی جائے آدمی آدمی نہیں بنتا۔ بس وہی لگام شریعت ہے، آدمی کو سہار کر چلاتی ہے۔ اگر وہ لگام نکال دی جائے

---

① حدیث ضعیف ہے۔ کشف الخفاء ۲/۱۷۰۔

اور آدمی اس نفس کے اوپر سوار ہو جائے، تو یہ کسی کنویں اور ذلت کے گڑھے میں لے جا کے گرائے گا۔ تو علم انسان کو عزت کی راہ چلاتا ہے اور جہالت ذلت کی راہ پر چلاتی ہے۔ علم وہ دولت ہے جو بڑھتی دولت ہے، اور جہل و نفسانی جذبات یہ وہ ہیں، جو انسان کو گھاؤ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محسن کوئی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو علم سکھلانے کے لئے آتے ہیں اور جہالت مٹانے کے لئے آتے ہیں۔

علوم دنیوی کا نفع...... علم دنیا میں بہت سے ہیں اور ہر علم کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ جوتا گانٹھنے کا علم، اس کی بھی ضرورت ہے، کپڑے سینے اور پہننے کا علم ہے، اس کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے، اسے کپڑوں کی بھی حاجت ہے، اسے جوتے کی بھی ضرورت ہے۔ جب آدمی دنیا میں رہے گا، کاروبار کرے گا، اسے سواری کی بھی ضرورت ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ تجارت کا مال و اسباب لے جانے کی بھی ضرورت ہے، اس کے لئے ریل بھی چاہئے۔ ہوائی جہاز بھی چاہئے تو ایسی چیزوں کا علم یعنی سائنس کا علم وہ بھی کارآمد ہے، اس کے بغیر گاڑی نہیں چلتی۔

اسی طرح سے ایک انسان کو صنعت و حرفت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر برتن نہ ہوں تو کھائیں کیسے؟ اگر کرسی نہ ہو تو بیٹھیں کیسے؟ اگر چارپائی نہ ہو تو لیٹیں کیسے؟ غرض ان تمام علوم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سارے علوم کہاں کارآمد ہیں؟ موت سے پہلے پہلے کارآمد ہیں اور جب انتقال ہوا، اب نہ ہوائی جہاز کارآمد ہے نہ چارپائی نہ کرسی، کوئی چیز بھی کام کی نہیں رہی۔ بیکار ہیں، اس لئے کہ ان تمام چیزوں کا نفع انسان کے بدن کو پہنچتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز منتقل کرے گا۔ تو آپ کے بدن ہی کو منتقل کرے گا، وہ یہاں سے کراچی پہنچا دے گا۔ روح کو ہوائی جہاز کی حاجت نہیں ہے۔ اگر آپ روح کو آزاد چھوڑ دیں وہ پل بھر میں عرش پر پہنچ جائے گی۔ یہ بدن کی مصیبت ہے جس کی وجہ سے یہ ساری چیزیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ جوتا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا، کپڑا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا۔ غرض یہ چیزیں اس وقت تک کارآمد ہوں گی جب تک بدن موجود ہے اور جب روح نکل گئی، بدن لاشہ بن گیا۔ اب یہ ساری چیزیں آپ کے حق میں بے کار ہیں۔

آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر لندن، کراچی جا سکتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آپ جنت میں پہنچ جائیں یا عرش عظیم کی سیر کر لیں، آسمانوں کی سیر کر لیں، یہ نہیں ہو سکے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں کارآمد اور نافع ہیں، مگر صرف بدن کی حد تک نافع ہیں، روح کو نفع پہنچانے والی نہیں ہیں۔ روح کے اندر پاکیزہ اخلاق پیدا کر دیں۔ یہ ہوائی جہاز کا کام ہی نہیں۔ آپ عمدہ سے عمدہ کپڑا پہن لیں، وہ کپڑا آپ میں صبر، علم اور حیاء پیدا کر دے۔ یہ کپڑے کا کام نہیں ہے۔ آپ اعلیٰ طریق پر پگڑی باندھ لیں اور اس کو خوب نمایاں کریں کہ آپ بڑے باوقار ہیں۔ لیکن قلب میں وقار پیدا نہیں ہوگا۔ پگڑی کا یہ کام نہیں کہ آپ کے قلب میں وقار بھی پیدا کر دے۔ یا پگڑی، جوتا بنانے والا آ کر آپ کے اخلاق کی اصلاح کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا، اس کا کام جوتا بنانے کا ہے۔ جوتا

بنانے سے اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور آدمی اخلاق کا نام ہے تو آخر اخلاق کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے؟ ان تمام چیزوں سے بدن کی اصلاح ہو گئی، مگر روح کی اصلاح کیسے ہو؟

تو جو چیز روح کی اصلاح کرنے والی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جو اخلاق کی حدود بتلاتا ہے، اخلاقی قدریں سکھلاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے بغیر آدمی، آدمی نہیں بن سکتا۔ آدمی حیوان بن جائے، بکری بن جائے، کوا بن جائے، یہ ممکن ہے۔ لیکن انسان بن جائے، یہ بغیر تعلیم انبیاءؑ کے ممکن نہیں۔

مثلاً آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑ گئے اور سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ گئے۔ تو کوے، چڑیا اور کرگس بھی تو اڑتے ہیں۔ آپ نے کونسا کام کیا؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے کرگس کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی۔ یہ کوئی انسانی ترقی نہ ہوئی، حیوانیت کی ترقی ہوئی۔ آپ نے اعلیٰ ترین غذائیں کھا کر بدن کو پال لیا۔ تو کتے بلی بھی بدن کو پال لیتے ہیں۔ شیر بھیڑیئے بھی پال لیتے ہیں۔ یہ کونسے کمال کی بات ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے ذرا عمدہ غذا کھالی اور کتا ایسی غذا نہیں کھا سکا، مگر عمدہ اور لذیذ تو آپ جب کہیں، جب کتا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے کہ اوہو! انسان تو پلاؤ کھا رہا ہے اور میں ہڈیاں کھا رہا ہوں۔ اس کو آپ کی غذا سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی آپ کو اس کی غذا سے ہے۔ ہر ایک اپنے مناسب حال غذا کھاتا ہے، آپ بھی ایک حیوان ہیں، وہ بھی حیوان ہے، وہ اپنے مناسب غذا کھا رہا ہے۔ آپ اپنے مناسب کھا رہے ہیں۔ تو کھانے میں دونوں برابر اور شریک ہیں۔ اچھی اور بری غذا، یہ خصوصیات کی بات ہے، لیکن غذا کھانا یہ حیوانیت ہے۔ اس لئے آپ اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بھی کھالیں گے، جب بھی آپ حیوان رہیں گے۔ عمدہ سے عمدہ سرائے میں آپ منتقل ہو جائیں، بدن منتقل ہوگا۔ وہ ایک مادی چیز ہوئی، لیکن اخلاق درست ہو جائیں، ان میں سے کوئی چیز درست نہیں کرے گی؟

علم شرائع ...... اخلاق کی درستگی کے لئے تو اللہ نے انبیاء علیہم السلام ہی بھیجے ہیں کہ وہ آدمیوں کو آدمی بنائیں۔ تو سائنس اور فلسفہ اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتا۔ اچھے انسان پیدا کرنے والی چیز انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔ تو علم سب نافع ہیں۔ مگر ایک نافع مطلق ہے، جو ہر جگہ نفع دے۔ ایک نافع خاص ہے، جو یہاں تو نفع دے، وہاں نفع نہ دے۔ مادی علوم نافع ہیں، مضر نہیں۔ لیکن ایک خاص حد تک نافع ہیں کہ اس دنیا میں نفع دیں گے یا بدن کی حد تک نفع دیں گے۔ آگے نفع نہیں دیں گے۔ لیکن دین کا علم یہاں بھی نفع دے گا، قبر اور آخرت میں بھی نفع دے گا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق نفس انسانی سے ہے۔ نفس ہر جگہ قائم ہے۔ یہاں بھی نفس موجود، برزخ و آخرت میں بھی موجود، ہر جگہ نفس ہے، تو اسے ہر جگہ علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جو علم سارے جہانوں میں کارآمد ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے، وہ دین اور شرائع کا علم ہے جو حلال و حرام بتلائے۔ اس علم کے سکھلانے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں۔

باقی جو صنعت و حرفت کا علم ہے یا مادیات کا علم ہے۔ یہ انبیاء کے آنے پر موقوف نہیں ہے۔ اگر ایک بھی

پیغمبر نہ آتا تو آپ کھیتی کر سکتے تھے۔ مکان بنا سکتے تھے، جیسا بھی بناتے۔ آخر یہ جانور جو گھونسلہ بناتے ہیں کیا ان کو کسی نبی نے آ کر تعلیم دی ہے؟ یہ جو شیر، بھیڑیئے اپنے بھٹ بناتے ہیں، تو کیا کسی اسکول میں پڑھ کر آتے ہیں کہ بھٹ یوں بنانا چاہئے؟ سانپ جو اپنی بِل بناتا ہے تو کیا اس کو کسی مدرسہ میں تعلیم دی تھی کہ یوں بنانی چاہئے؟ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کی فطرت نے راہنمائی کی ہے، اسی طرح انسان کی طبیعت میں بھی راہنمائی ہے کہ وہ اپنے مناسب حال مکان بنالے۔ اگر پیغمبر نہ آئیں وہ پھر بھی مکان بنا سکتا تھا۔ یہ طبعی علوم ہیں اور علوم طبعیہ کے اندر نبوت کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام شریعت کی تعلیم دینے کے لئے آئے ہیں۔ شریعت انسان کی طبیعت سے نہیں ابھر سکتی۔ اس لئے کہ شریعت کے معنی ہیں، ''اللہ کی رضا اور نارضا کا پتہ چلانا''۔ کہ اللہ اس سے خوش ہیں، اس سے ناخوش ہیں اور کسی کی خوشی و ناخوشی اس کے بتلائے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔

دو حقیقی بھائی ہوں، ایک ماں کے پیٹ میں دونوں نے پاؤں پھیلائے ہوں اور دونوں پاس بیٹھ جائیں، بلکہ ایک دوسرے کے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں۔ ایک کے دل میں چھپی ہوئی چیز دوسرے کے دل میں نہیں جائے گی جب تک دوسرا خود ظاہر نہ کرے یا بتلائے۔ تو جب دو حقیقی بھائی، ایک نوع کے دو فرد، ایک دوسرے کے باطن کا پتہ نہیں چلا سکتے، جب تک کہ دوسرا اظہار نہ کرے۔ تو اللہ اور بندے میں تو بون بعید ہے۔ وہ نور مطلق یہ ظلمت محض، یہ اللہ کے اندر چھپی ہوئی مرضی اور نامرضی کا کیسے پتہ چلا سکتا ہے؟ جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ ظاہر فرمادیں۔

قانون شریعت انسانوں تک کیسے پہنچے؟......اور خود ظاہر فرمانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر اعلان کریں کہ دیکھو اس سے میں خوش ہوں یہ کرو۔ اس سے ناخوش ہوں یہ نہ کرو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ان کی شان سے بعید ہے۔ ایک معمولی بادشاہ ایک حاکم، ایک معمولی ضلع کا کلکٹر جو ہم ہی جیسا انسان ہے۔ اس میں کوئی خصوصیت ہم سے زائد نہیں ہے، اس کو تو عار آتی ہے کہ گورنمنٹ کا کلکٹر خود گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا حکم، یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو تحصیلداروں اور نائب تحصیلداروں کو حکم دیتا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے ہیں کہ منادی کرو۔ اس طرح سے قانون عام ہو جاتا ہے اور جو احکم الحاکمین اور بادشاہوں کا بادشاہ ہو، اس کی شان کے ذرا مناسب نہیں کہ وہ گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو قانون بتلائے گا، جو اس کے اپنے مقربان بارگاہ ہوں، وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے۔ پھر وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے، قانون عام ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام نائبین خداوندی ہیں، جو مقربان بارگاہ ہیں۔ اخلاق میں اللہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ قرب کی اپنے اندر استعداد اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالطبع مقدس اور برگزیدہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان کی فطرتوں میں پارسائی اور پاکیزگی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو پاک افراد ہیں۔ اس لئے اللہ جو پاک ذات ہے، اس سے قرب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ ان پر اپنا الہام فرماتے ہیں۔ ان پر اپنا علم نازل فرماتے ہیں، وہ اپنے نائبین تک پہنچاتے ہیں پھر وہ اپنے نائبین کو، وہ اپنے ماتحتوں کو، اس طرح سے علم پھیل جاتا ہے۔ تو دین کا علم انبیاء علیہم السلام

کے ذریعے سے اس لئے آیا کہ انبیاء علیہم السلام ہی مقرب تھے۔ وہی بارگاہِ حق سے مناسبت رکھتے تھے، ان پر علم اتارا گیا، ان کے ذریعے سے بالواسطہ ہم تک علم پہنچا۔

ضرورتِ مذہب...... بہرحال اس علم کا حاصل کیا جانا، یہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آدمی کی نہ روحانیت جاگ سکتی ہے نہ روحانی مراتب طے ہو سکتے ہیں اور نہ اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اخلاق کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے اور جب تک مذہب و دین نہ ہو، آدمی کے اخلاق کبھی تربیت نہیں پا سکتے۔ مادیات سے تربیت نہیں ہوتی۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ① میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ دنیا کو جہالت سے نجات دلاؤں اور لوگ علم میں آئیں، اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں سنور سکتی۔

آج دنیا میں جو دین اور مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلے ہوئے ہیں، یہ اصل میں سب جہالت کے کرشمے ہیں۔ جب آپ کے اندر علم نہ ہو، جہالت ہو، جس کا جی چاہے، آپ کو بہکا دے، جو چاہے کہہ مارے۔ آپ مجبور ہیں، اس لئے کہ خود اپنے اندر کچھ نہیں رکھتے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ علم حاصل کر کے آپ آگے بڑھیں تا کہ جائز و ناجائز عقیدے کا اچھا برا ہونا آپ کے اندر آ جائے۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ سب سے ضروری چیز تعلیم ہے یہ اگر ہے تو سب چیزیں درست ہیں۔ تعلیم نہیں جہالت ہے تو سب چیزیں خراب ہوں گی۔ وقت چونکہ ختم ہو چکا ہے۔ اس واسطے میں ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ ہم اور آپ سب کو توفیق علم و عمل عطاء فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥.
یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ١/ ٨٨ رقم ١١۔

یادِحق

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغٰفِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْاَمْوَاتِ (1) اَوْكَمَاقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ.

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! پہلے سے کوئی علم بھی نہیں تھا اور ارادہ بھی نہیں تھا کہ بیان بھی کرنا ہوگا۔ لیکن حضرت مولانا نے ارشادفرمایا کہ نماز سے پہلے کچھ نہ کچھ بیان ہوگا۔ ان کی تعمیل حکم کے طور پر میں آپ حضرات کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ کوئی لمبی تقریر یا وعظ اس وقت نہیں ہو سکے گا، بلکہ محض تعمیل ارشاد کے طور پر چند کلمات، اس حدیث کی روشنی میں گزارش کروں گا جو اس وقت میں نے پڑھی۔

تمہید...... یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْاَمْوَاتِ" اس کی تفصیل سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک پیکر، بدن اور جثہ ہے اور ایک اس کی روح، زندگی اور حیات ہے۔ یہ ظاہری بدن جو آپ کو دیا گیا ہے۔ یہ خود مستقلاً انسان نہیں ہے۔ یہ انسان کی محض صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اس جثہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جو روح اور حقیقت کی صورت میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے، محض نمائش اور نمود ہے۔ فی الحقیقت ہماری انسانیت وہی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر وہ انسان کے بدن میں سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں چند دن روح کے پچھلے اثرات کے تحت رہے گا۔ جہاں دو تین دن گزریں گے اور زندگی کے جو تھوڑے بہت اثرات سرایت کئے ہوئے تھے، وہ زائل ہو

(1) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، ج:۳، ص:۱۹۵. حدیث صحیح ہے امام بخاریؒ نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے۔ دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج:۲۰ ص:۲۳ رقم: ۵۹۲۸.

جائیں گے یہی بدن گلنا سڑنا اور پھٹنا شروع ہوگا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ مٹی، مٹی میں مل جائے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں مل جائے گی۔ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس بدن کی شیزازہ بندی اگر کر رکھی ہے تو روح نے کر رکھی ہے۔ روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں۔ باطل محض ہے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ زندگی صورت کا نہیں حقیقت کا نام ہے۔ صورت اس زندگی کی محض نمائش ومظاہرہ اور دکھلاوا ہے۔

روحِ کائنات ...... یہی صورت سمجھ لیجئے اس پوری کائنات کی ہے۔ یہ جو ہمارا مختصر بدن''کائنات'' ہے وہ روح سے زندہ ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے یہ پوری کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے۔ جب تک یہ روح اس کائنات میں موجود ہے، یہ کائنات زندہ کہلائے گی۔ جب روح نکال لی جائے گی، ساری کائنات کا خیمہ آ پڑے گا، درہم برہم ہو جائے گا، ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ یہ روح کیا چیز ہے؟ جو روح انسان کے بدن میں ہے، وہی روح کائنات میں ہے۔ انسانی روح کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ ① اے پیغمبر! آپ سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ ② کہہ دیجئے روح اللہ کا ایک امر ہے۔ ایک حکم اور لطیفۂ خداوندی ہے اس سے یہ کثیفۂ جسمانی سنبھلا ہوا ہے۔ وہ نکل جائے تو کثیفہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح سے پوری کائنات کی روح بھی درحقیقت لطیفۂ ربانی ہے اور اس کا نام ذکر اللہ ہے۔ یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس سے ذکرِ خداوندی منقطع ہو جائے گا۔ جبھی یہ خیمہ آ پڑے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ.'' ③

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا اور سارے شرار الناس رہ جائیں گے جن کے دل میں نہ یادِ حق ہوگی نہ ذکرِ خداوندی ہوگا نہ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوگی۔ قلوب یکسر بھلا بیٹھیں گے۔ نہ صرف بھلا بیٹھیں گے بلکہ خالی ہو جائیں گے، ذکر مٹ جائے گا یعنی شرار الناس اور بدترین خلائق رہ جائیں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا ''لَا يَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا'' ④ ''نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے نہ برائی کو برائی''

سڑکوں پر اس طرح سے بدکاری ہوگی جیسے جانور اور بہائم پھرتے ہیں۔ نہ حیا ہوگی نہ غیرت ہوگی۔ جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے۔ اسی وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔ تو قیامت اس عالم

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذهاب الایمان فی آخر الزمان، ج: ۱ ص: ۱۳۱ رقم: ۱۴۸۔

④ المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم، کتاب الفتن والملاحم، ج: ۴ ص: ۱۸۴ رقم: ۸۳۴۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب توقیر الکبیر ورحمۃ الصغیر، ج: ۳ ص: ۳۶۴.

کو ذرہ ذرہ کر کے بکھیر دینے کا نام ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، پانی میں مٹی اور مٹی میں پانی، ہوا میں آگ اور آگ میں ہوا سب گڈمڈ ہو کر قصہ درہم برہم ہو جائے گا اور سارا خیمہ دنیا کا آ پڑے گا۔ جس طرح روح کے نکلنے سے بدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، اسی طرح پوری کائنات کا شیرازہ اس روح کے نکل جانے سے بکھر جائے گا جس کا نام ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی روح ذکرِ خداوندی ہے یادِ حق جب تک موجود رہے گی۔ کائنات کا خیمہ کھڑا ہوا ہے، جب یہ نکل جائے گی کائنات درہم برہم ہو جائے گی، تو ظاہر میں کائنات ہم سے اور آپ سے سنبھلی ہوئی ہے، حقیقت میں اللہ کے ذکر کرنیوالوں سے سنبھلی ہوئی ہے، جب تک یہ موجود ہیں کائنات موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے کائنات ختم ہو جائے گی۔ غرض اس ساری کائنات کا خیمہ یادِ حق اور ذکر کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے...... یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ذکرِ خداوندی میں مصروف ہے، ہر وقت یادِ حق کرتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اس ذرّے کے مٹنے اور ختم ہو جانے کا وقت ہوتا ہے حدیث میں ہے کہ ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے، جب ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ ٹہنیاں خشک ہو کر پتے جھڑ جاتے ہیں تو روحِ نباتی فی الحقیقت یادِ خداوندی ہے جب تک موجود ہے درخت موجود ہے، یادِ حق نہیں ہوگی تو ختم ہو کر مٹ جائے گا۔ اس کے پتے جھڑ جائیں گے، یہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ ذرہ ذرہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① کائنات کا کوئی ذرہ نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ تمہاری زبان اور ہے کائنات کے ذرے کی زبان اور ہے۔ پرندے کی زبان اور ہے۔ وہ اپنی اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ تم ان کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ اور تم ان کی زبان کو کیا سمجھو گے تم اپنے ہی بہت سے بھائی بندوں کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ ایک پنجاب کا رہنے والا بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ بنگال کا رہنے والا پشتو زبان نہیں جانتا۔ ایک پختونستان کا رہنے والا ترکی زبان نہیں جانتا۔ ترکی کا رہنے والا عربی زبان نہیں جانتا۔ تو جو اپنے بھائیوں کی زبان نہ سمجھے۔ وہ کنکریوں اور پرندوں کی زبان کیا سمجھے گا؟ لیکن زبان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر آپ نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگلہ میں اللہ کو کوئی یاد نہیں کر رہا اور اگر آپ پشتو نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ پشتو میں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہے وہ نام لے گا، ذکر کرے گا آپ بیٹھے ہوئے منہ دیکھیں گے اس لئے کہ آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے آپ ٹیلیگراف کے دفتر میں گئے ہوں گے۔ وہاں جا کے آپ نے تار دیا۔ دو تین روپے فیس کے ادا کئے، تار بابو نے پیتل کی کھونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دیا۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔

آپ نے کہا کہ میں نے تو یہ مضمون دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا کھٹ کھٹ کرر ہا ہے، اس کھٹ کھٹ کو اس مضمون سے کیا تعلق ہے۔؟ لیکن آپ کے سامنے تو وہ کھٹ کھٹ آ رہی ہے۔ حقیقت میں اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر میں علوم پہنچ رہے ہیں۔ مگر آپ اس فن سے واقف نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھتے یہ اصطلاحات ہیں جن سے ایک شہر سے دوسرے شہر کو مضمون چل رہا ہے۔ اگر آپ اس فن کو سیکھے ہوئے ہوتے اس کھٹ کھٹ کی اصطلاحات سے واقف ہوتے تو آپ کو فوراً پتہ چل جاتا کہ کراچی سے لاہور کی طرف اور لاہور سے ڈھاکہ کی طرف کیا مضمون جارہا ہے۔ مگر آپ کو اصطلاحات کا علم نہیں اس لئے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ یہ کھٹ کھٹ کرر ہا ہے میرا اتلایا ہوا مضمون کس طرح پہنچے گا، مگر مضمون آپ کا ہے، اصطلاح اس کی ہے اور وہ دوسری جگہ جارہا ہے۔

اسی طرح سے ایک پرندہ جب سیٹی بجاتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ سیٹیاں بجارہا ہے حقیقت میں وہ ذکر اللہ کرر ہا ہے، آپ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ طوطا بولتا ہے وہ اللہ کی یاد کرتا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں جیسا کہ آپ اپنے یورپ والے بھائی کی زبان سے واقف نہیں ہیں جو اپنی زبان میں خدا کو یاد کرے گا۔ آپ بیٹھے ہوئے منہ کو دیکھیں گے۔ تو کوئی پرندہ، درندہ، چرندہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو، مگر زبان اس کی ہے، فہم آپ کا نہیں ہے۔ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو ورنہ وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، جب میل آنا شروع ہوتا ہے ذکر اللہ بند ہو جاتا ہے۔ وہی وقت اس کی فنا کا ہوتا ہے آپ نفرت سے بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں جب تک دھوبی اس کو پاک صاف کر کے نہ لادے، جب سفید ہو جائے گا پھر ذکر میں مشغول ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جس شخص کو مسجد کا امام بنایا جائے، وہ میلے کپڑوں سے نماز نہ پڑھائے، یعنی ایسے میلے کپڑے جن سے بدبو اٹھنے لگے۔ یوں تو کپڑا اگلے ہی دن میلا ہو جاتا ہے۔ علماء عربیت لکھتے ہیں کہ: "لَذَّةُ الثَّوْبِ لِيَوْمٍ" کپڑے کی لذت ایک دن کی ہوتی ہے۔ اگلے دن سے میل آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا بہت میل تو فوراً شروع ہو جاتا ہے، لیکن ایسا میلا پن کہ پسینہ جذب ہوتے ہوتے زرد رنگ بن جائے، اس میں سے بدبو آنے لگے، اس کا رنگ بھی متغیر ہو جائے، شکل بھی بدل جائے۔ اس وقت امام کو ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھانا مکروہ ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ امام فی الحقیقت اللہ کی بارگاہ میں تمام مقتدیوں کا وکیل ہے وہ قابل تعظیم ہے اس میں نفرت کی وجوہ نہ ہونی چاہئیں کہ مقتدی متنفر ہونے لگیں۔ اگر کپڑے غیر معمولی طور پر میلے ہوئے تو مقتدیوں کو خلجان پیدا ہوگا کہ کس بے ڈھنگے آدمی کو آگے لاکے کھڑا کر دیا گیا۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

تو جو مقتدی اس کے بے ڈھنگے پن کے خیال میں مشغول ہوں گے اللہ سے انکا کیا رابطہ قائم ہوگا؟ وہ تو امام کی مذمت میں لگے ہوئے ہیں کہ امام عجیب بے ڈھنگا ہے۔ امامت کے لئے کھڑا ہوگیا، بدبو اس میں سے آ رہی ہے، رنگ اس کا صحیح نہیں، یہ ہمیں خدا تک کیا پہنچائے گا۔؟ تو امام کے لئے ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ کپڑے بھی صاف ہوں۔ تو ظاہری وجہ تو یہی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو باطنی وجہ یہ ہے کہ سفید کپڑا ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے امام کے کپڑوں کا ذکر خود امام کی طبیعت کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جب اس کے اردگرد ذکر اللہ کی آوازیں آ رہی ہیں اگر چہ وہ کانوں سے نہ سنی جائیں، ان آوازوں سے خود امام کے قلب میں ذکر اللہ کی رغبت پیدا ہوگی اور یادِ حق تازہ ہو کر وہ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا تو مقتدی بھی اتنے ہی متوجہ ہو جائیں گے۔

آپ نے تجربہ کر کے دیکھا ہوگا کہ جب آدمی غسل کر کے صاف کپڑے پہنتا ہے تو بے اختیار دل سے الحمدللہ نکلتا ہے طبیعت میں شگفتگی ہوتی ہے اور جب کپڑے میلے ہوتے ہیں تو انقباض اور تشتت دل میں پیدا ہوتا ہے، اللہ کا نام لینا بھی چاہتا ہے تو زبان سے نہیں نکلتا، طبیعت میں انقباض ہے۔ یہ حقیقت میں کپڑے کے ذکر کا اثر ہوتا ہے جو انسانی قلب پر پڑتا ہے۔

اگر سبزے میں بیٹھیں گے ذکر اللہ کی زیادہ توفیق ہوگی جھاڑ پھنکار میں بیٹھیں گے، کم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ سبزہ خود تسبیح میں مشغول ہے۔ اکثر اہل اللہ کو دیکھا گیا ہے کہ دریا کے کنارے سبزے پر جا کر ذکر اللہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کا ذکر ان کے قلوب کے اوپر موثر ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رک جاتا ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ چلتا ہوا پانی ذکر کی حیات کی وجہ سے درحقیقت زندہ ہے اور جب ٹھہر گیا جسے ماءِ راکد کہتے ہیں اس میں تغیر آ جاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے، خراب ہو جاتا ہے، تسبیح بند ہو جاتی ہے، تسبیح کا بند ہونا ہے کہ لطافت کی روح اس میں سے کھنچ جاتی ہے، اس کے اندر کثافت پیدا ہو جاتی ہے بہر حال چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے، سبز ٹہنیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، کنکریاں تسبیح کرتی ہیں۔ بہر حال تمام چیزیں ذکر میں مشغول ہیں ہم آپ سمجھتے نہیں ہیں۔

مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہل باطن کا ادراک...... اہل باطن کو کبھی کبھی علم دیدیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے یہ علم دیا جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہی تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام کا مقولہ قرآن حکیم میں نقل کیا گیا ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (1) ''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں''۔

(1) پارہ: 19، سورۃ النمل، الآیۃ: 16۔

سلیمان علیہ السلام بتلا دیتے تھے کہ یہ دو کوّے آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور یہ دو چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں۔
احادیث میں تقریباً مختلف جانوروں کی اٹھارہ انیس مثالیں دی گئی ہیں اور ان کی تسبیح ذکر کی گئی ہے۔ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ فلاں کی یہ تسبیح ہے، فلاں کا یہ ذکر ہے۔ تیتر کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اس کی تسبیح یہ ہے کہ كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ. ① ”جیسا کرو گے ویسا بھرو گے“۔ یہ ایک نصیحت ہے جو اس کی زبان سے ہر وقت نکلتی رہتی ہے۔
بعض کی یہ تسبیح ہے کہ ”سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰى وَزَيَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ“ ② پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت دی۔ مختلف عبرتیں اور نصیحتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں مگر ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ③

کس زبان مرانمی دند با عزیزاں چہ التماس کنم

لوگ میری زبان نہیں پہچانتے تو میں دوستوں سے کیا کہوں۔ پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں تو نصیحت پیش کر رہا ہوں۔ مگر انسان میری زبان نہیں پہچانتے، جن کو حق تعالیٰ علم دیتے ہیں وہ زبان پہچانتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی بولیوں کا علم جان لیا تھا۔ مگر کسی کالج یا مدرسہ میں پڑھ کر نہیں، اللہ کے الہام سے یعنی بطور معجزے کے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو...... جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا حاضر ہوا اور اس شان سے آیا کہ بول رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا۔ فرمایا اس کے مالک کو بلاؤ۔ اونٹ والا بلایا گیا۔ وہ آیا۔ فرمایا۔ یہ شکایت کر رہا ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ لادتا ہے اس نے اقرار کیا۔ یا رسول اللہ! بے شک میں اس جرم کا مجرم ہوں۔ فرمایا۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اونٹ خوش ہوتا ہوا واپس ہو گیا۔ تو اونٹ کی زبان کو سمجھ کر اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔
اسی طرح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی دیہاتی کے مکان کے قریب سے گزر ہوا، وہ کہیں پہاڑ میں سے کوئی ہرنی پکڑ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی، وہ کھونٹی سے بندھ رہی تھی۔ اس نے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد شروع کی۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیہاتی تجھے پکڑ لایا ہے تو اس کی ملک ہو گئی ہے اس لئے کہ پہاڑ میں جو چیز

① تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۵. ② علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواہ الحاکم عن عائشة وذكره في تخريج احاديث مسند الفردوس للحافظ ابن حجر في اثناء حديث بلفظ. ملائكة السماء يستغفرون لذوائب النساء ولحى الرجال ويقولون سبحان الذى زين الرجال باللحى والنساء بالذوائب. اسنده عن عائشة دیکھئے: كشف الخفاء ج:۱ ص: ۴۴۴. ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۴۴.

ہوتی ہے، جو اس پر قبضہ کرے وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔ تو اس کی ملک ہوگئی، میں تجھے کیسے چھوڑ دوں؟

اس نے عرض کیا، یارسول اللہ! پہاڑی میں میرے دو بچے بلبلا رہے ہیں اور بھوکے ہیں۔ میں ہی انہیں دودھ پلاتی تھی، میرے بچے مرجائیں گے آپ مجھے چھوڑ دیں۔

فرمایا: وعدہ کر کہ تو دودھ پلا کر پھر یہاں آ جائے گی۔ اس نے وعدہ کیا اور حلف دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گلے میں سے رسی کھولدی اس نے جونہی جا کر دودھ پلایا، واپس آ کر پھر وہیں کھڑی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رسی اس کے گلے میں ڈال دی۔

جب دیہاتی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا تو نے زیادتی کی ہے؟ اس کے بچے بلبلا رہے ہیں تو نے جا کے قبضہ کیا۔ اس کو چھوڑ دے۔ اس نے نصیحت قبول کی اور ہرنی کو آزاد کر دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی بولیوں پر مطلع ہوتے تھے۔ تو انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے زبانوں کا علم دیا گیا حتیٰ کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوع انسان کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے...... جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں کی زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ جو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیے گئے۔ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا يَعْنِيْ عِلْمَ اللُّغَاتِ كُلِّهَا."

آدم علیہ السلام کو ساری لغتیں سکھلا دی گئی تھیں جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جائیں گی وہ ہر زبان سکھلا دی تھی۔ ان کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب نسل مختلف ہوئی اور دنیا میں منتشر ہوئی، کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں آباد ہوا۔ تو وہاں کی زمینوں کی خصوصیات تھیں۔ ایک ایک قبیلے کے اوپر ایک ایک لغت کا غلبہ ہوگیا۔ اس طرح زبانیں الگ ہوگئیں۔ تو ایک نے دوسرے کی زبان کو سمجھنا چھوڑ دیا اور سمجھنے سے محروم ہوگیا۔ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمایا ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ ② اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش۔ اور تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یعنی بنی آدم اس میں مختلف ہیں حالانکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک جنس، ایک نوع، لیکن ایک سے دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی۔ ایک پنجابی بولتا ہے، ایک بنگلہ بولتا ہے، ایک ہندی اور ایک انگریزی بولتا ہے۔ دنیا کے جتنے جاندار ہیں ہر نوع کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ مثلاً طوطا ٹیں ٹیں کرے گا۔ وہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، عربستان کا ہو یا ترکستان کا۔ مور ایک بولی بولے گا چاہے یورپ کا ہو یا ایشیاء یا افریقہ کا ہو۔ کبوتر ایک ہی طرح بولے گا کہیں کا ہو۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲.

لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ ترکی اور طرح سے یورپین اور ایشین اور انداز سے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک جنس کے سارے افراد ہیں اور زبان الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ یہ قدرت خداوندی کی نشانی ہے۔

انسان کی غفلت...... بہر حال ہر ہر چیز اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے مگر ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے، غرض کنکریاں تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے، چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے، ہری ٹہنیاں تسبیح و ذکر کرتی ہیں۔ لیکن نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں کرتا، غافل ہے، تو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہے، حالانکہ سب سے زیادہ اس کو ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اللہ نے جو نعمتیں اس پر مبذول کی ہیں، کائنات میں اللہ نے وہ کسی کو نہیں عطاء کیں۔ جتنا چہیتا اور پیاری مخلوق انسان ہے۔ کوئی مخلوق کائنات میں اللہ کو اتنی پیاری نہیں ہے۔ تو ساری مخلوقات ذاکرِ حق ہیں، مگر یہ حق تعالیٰ سے غافل ہے حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اوپر انعامات کی بارش ہے۔

ساری کائنات انسان کی غذا ہے...... ہر چیز کا لباس اس کی کھال ہے۔ اس کو الگ لباس دیا گیا۔ رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے۔ ہر نوع کی غذا ایک ہے۔ کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی نوع دانہ کھاتی ہے، کوئی پتے چباتی ہے، کوئی مٹی کھاتی ہے، کوئی ہوا چوستی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا ہر چیز اس کی غذا ہے۔ گھاس یہ کھائے، پھونس یہ کھائے، پتے یہ کھا جائے، چونا یہ کھائے، مٹی یہ کھائے، چاندی یہ کھائے، سونا یہ نگل لے، جواہرات اس کے پیٹ میں جاتے ہیں۔ غرض جمادات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں اس کی غذا ہیں۔ تانبے اور سونے کے ورق نگل جائے گا، چاندی سونا کا کشتہ کھا جائے گا۔ یاقوتیاں اس کی طاقت کے واسطے بنتی ہیں۔ مٹی یہ کھاتا ہے۔ یہ چونا آخر مٹی پتھر نہیں تو اور کیا ہے؟ کتھ یہ کھائے، پتے یہ کھائے، سبزیاں یہ کھائے۔ دنیا بھر کی چیزیں اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا اور پوری کائنات اس کی غذا۔

ساری کائنات انسان کی سواری ہے...... ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ اس کو سواریوں پر اٹھا کے چلایا گیا۔ حیوانات اس کی سواری میں ہیں، ریلیں جو چلتی ہیں وہ حیوانات کی قسم میں سے نہیں ہیں وہ جمادات میں سے ہیں اس کی سواری بنتی ہیں، گھوڑا، اونٹ، بیل یہ سب اس کی سواری بنتی ہیں تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار جمادات کے سروں پر یہ سوار اور نباتات اس کی سواری میں ہیں۔

سمندروں میں یہ سواری کر جائے، ہوا میں یہ سواری کر جائے، زمین کی پشت پر یہ سواری کر جائے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو سواری دی گئی ہو۔ ہر ایک اپنے پیر سے چلنے پر مجبور ہے اس کو مقرب اور معظم بنایا گیا ساری کائنات اس کی سواری بن گئی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے...... اور ساری کائنات اس کا لباس کہ درختوں کی چھال سے یہ لباس

بنائے، روئی سے یہ لباس بنائے، جانوروں کی کھال کھسوٹ کر یہ لباس بنالے۔ اب سنا ہے کہ شیشے کے کپڑے چلنے والے ہیں۔ لکڑی اور کھال کے کپڑے بننے لگے ہیں۔ غرض ساری کائنات اس کا لباس، ساری کائنات اس کی غذا، ساری کائنات اس کی سواری۔ اللہ کے یہاں اتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے کہ کھانے کو آئے تو سر تسلیم خم کردے کہ کھالینے دو۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس کو لباس بنانے دو۔ سواریاں بنائے تو سر جھکا دو کہ سوار ہو کر جائے، تو ساری چیزوں سے زیادہ اس کو ذاکر بننا چاہئے تھا مگر سب چیزوں سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے پتھر بھی ذکر میں لگ جاتا ہے۔

انعامات کا تقاضا کیا ہے؟...... پتھروں کی شان یہ ہے کہ ﴿یَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ﴾ ① اور کچھ نہیں تو پتھر رو پڑتے ہیں۔ ان سے پانی بہہ پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو پتھر اوپر سے نیچے آ پڑتا ہے یہ اس کی تواضع اور انکساری کی بات ہے۔ لیکن اگر فرعونیت اور کبر بھرا ہوا ہے تو انسان میں بھرا ہوا ہے کہ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا اور گرتا ہے۔ حالانکہ پتھر گر بھی پڑتا ہے اور پانی بھی بہا دیتا ہے تو سب سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے حالانکہ اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس پر انعامات کی بارش ہے۔

حقیقتِ زندگی......اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے، تو ذکر کرنیوالا غافلوں میں ایسا ہے جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک بھرا مجمع غافلوں کا ہو، ایک اللہ کی یاد کرنے والا موجود ہے وہ ایسا ہے جیسے مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ زندگی نام بدن کا نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی زندگی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے ۔۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام دل کی زندگی کا ہے اور دل کی زندگی اللہ کی یاد سے ہوتی ہے۔ روٹی اور ٹکڑے سے نہیں ہوتی۔ یہ بدن کی زندگی ہے جو روٹی سے ہوتی ہے۔ یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں دیر ہوجائے بدن مرجھانے لگتا ہے اور منقطع ہوجائے تو بدن چھن جاتا ہے۔ لیکن قلب کی زندگی دوامی ہے۔ اس لئے کہ ذکر اللہ جو زندگی پیدا کرتا ہے وہ دوامی زندگی ہوتی ہے وہ نفس کے اندر قائم ہوجاتی ہے۔

ذاکر انسان کا مقام......تو فرمایا گیا ذکر کرنے والے کی مثال غافلوں کے اندر ایسی ہے جیسے مردوں کے اندر کوئی زندہ بیٹھا ہوا ہو تو انسان اگر ذاکر بنے گا تو سارے ذاکروں پر بڑھ جائے گا اور اگر غافل بنے گا تو سب سے زیادہ بدتر ہوجائے گا۔ حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذکر کرتا۔ اور یہ غافل بن گیا پھر پتھر بھی اس سے اچھا، جانور بھی اس سے اچھے، درخت کی ٹہنیاں بھی اس سے اچھیں کیونکہ سب ذکر میں مشغول ہیں۔ یہ سب سے زیادہ ذلیل اور بدتر ہے اور اگر ذکر پر آجائے تو ہر ذاکر اس سے نیچے ہے اس لئے کہ اس کا ذکر جامع ہوگا جو اور انواع کو میسر نہیں ہے۔ تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے غذائے روحانی ذکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۴.

زندگی کی حقیقی غذا...... انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی غذائیں قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ قوت ان میں یادِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے امت کو ممانعت فرمائی کہ صوم وصال مت رکھو یعنی بلا افطار کئے روزہ پر روزہ مت رکھو۔ سحر بھی کھاؤ، افطار بھی کرو، کھا پی کر اگلا روزہ رکھو۔ بلا کھائے پیئے روزے پر روزے رکھتے چلے جانا اس کو صوم وصال کہتے ہیں اس سے آپ نے ممانعت فرمائی۔ اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھتے تھے پندرہ پندرہ دن آپ کا مسلسل روزہ ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود حضور صوم وصال رکھتے ہیں۔ فرمایا: ''أَيُّكُمْ مِثْلِي يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي'' ① تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے، یہ کھانا اور پلانا کیا تھا؟ یہ پلاؤ اور زردے کے دسترخوان آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ یہ ذکر اللہ اور یادِ حق غذا تھی جو روح میں پیوست تھی۔ اس سے روح زندہ تھی اور روح سے بدن زندہ تھا تو اللہ کا ذکر جب رگ وپے میں سما جاتا ہے تو غذاؤں کی حاجت کم ہو جاتی ہے تو زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں کہ اخیر عمر میں انتقال سے چند ماہ پیشتر یہ فرمایا کہ: ''اب بحمد اللہ بقائے حیات کے لئے مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ محض اتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں۔ زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی''۔ غرض جب ذکر اللہ رگ وپے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر زندگی کا دارومدار روٹی پر نہیں ہوتا ذکر پر رہ جاتا ہے۔ ذکر اللہ سے آدمی زندہ ہوتا ہے۔ قوتِ روحانی سے اس کی حیات اور بقاء ہوتی ہے تو اصل زندگی فی الحقیقت یادِ حق کا نام ہے۔

محبوب کے فراق ووصال کے آثار...... بلکہ یوں کہنا چاہئے زندگی نام ہے نامِ محبوب اور وصالِ محبوب کا۔ محبوب کا نام آتا ہے تو محبّ اور عاشق میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہے اور رات دن اس کے دھیان میں غرق ہے اور محبوب اس سے جدا ہو جائے۔ یہ فراق میں پڑا ہوا گھل رہا ہے گھلتے گھلتے چارپائی کو لگ گیا ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی کھانا بھی چھوٹ گیا، پینا بھی چھوٹ گیا، چارپائی پر پڑا ہوا ہے فکرِ محبوب میں ہر وقت گرفتار ہے ایسے وقت کوئی آ کر کہہ دے کہ وہ آ گیا تیرا محبوب۔ ایک دم اٹھ بیٹھے گا کہاں ہے؟ کس نے کہا؟ یہ جان اس کے اندر کہاں سے آئی؟ کیا اس نے کوئی روٹی کھائی یا کوئی یاقوتی کھائی؟ محبوب کا نام ہی تو آیا مردہ اٹھ کر زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا زندگی نام ہے کسی محبوب چیز کے وصال کا۔

اب اگر کسی کو روپے پیسے سے محبت ہو گئی۔ جب تک اس کے سامنے روپے پیسے کا نام آتا رہے گا اس میں زندگی ہے اگر منقطع ہو جائے تو اس کی جان پہ بن جائے گی، بعض آدمی جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو ہارٹ فیل ہو جاتا

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال، ج: ۲ ص: ۲۹۴ رقم: ۱۸۶۴.

ہے۔اس لئے کہ محبوب چھن گیا۔زندگی ختم ہوگئی۔

یا اگر کسی کو کسی عورت سے محبت ہو جائے جب تک وہ پاس موجود ہے وہ زندہ ہے، جب چلی جائے تو فراق میں گھل کر جان دیدے گا۔غرض وصال محبوب کا نام زندگی ہے۔کسی کا محبوب دولت،عورت یا عزت ہے۔جن کا محبوب اللہ رب العزت ہے وہ اس کے نام سے زندہ ہیں جب تک ذکر حق ہے،ان میں زندگی ہے۔جب ذکر ان سے منقطع ہو جائے،ان کی موت ہو جاتی ہے۔جن کا دل پروردگار حقیقی سے اٹک چکا ہے ان کی زندگی جبھی ہے کہ وہ ہر وقت ذکر اللہ کئے جائیں،نام حق لئے جائیں۔جب اس میں کمی آجائے گی،یوں محسوس ہوگا کہ ہم ختم ہو گئے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود گرز باغ دل خلال کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں،غم کا پہاڑ اس کے دل پر ٹوٹ پڑتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ باغ دل میں سے ذکر اللہ کا کوئی خلال کم ہو گیا ہے تو ایک ذاکر کے لئے موت کے برابر ہو جاتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ اب میں زندہ نہیں ہوں۔

ذاکرین کے اوپر بعض اوقات قبض طاری ہوتا ہے اس قبض کا اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمارے اندر ذکر اللہ باقی نہیں ہے اور حق تعالیٰ سے جو تعلق تھا اس میں کمی آگئی۔تو بعض اوقات قبض زدہ لوگوں نے خودکشی کر لی۔اگر سنبھالنے والے موجود نہ ہوں مربی نہ سنبھالے تو قبض کی حالت میں خودکشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز فرما دیئے گئے اور پہلی وحی آئی کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ① اس کے بعد میں وحی منقطع ہو گئی۔ایک عرصہ وحی کا انقطاع رہا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک غم اور گھٹن طاری ہوئی۔آپ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں،کہ اب زندگی کس کام کی جب وہ شے باقی نہیں جس سے محبت ہے۔حتیٰ کہ یہ ارادہ کر کے پہاڑ کے اوپر آئے کہ اپنے کو نیچے گرادوں،تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ گر پڑوں تو پیچھے سے کسی نے آواز دی یا محمد! آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی موجود نہیں تھا۔یہ قبض کی کیفیت جب طاری ہوتی ہے تو موت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔سالک یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی ختم ہو گئی۔غرض زندگی ذکر اللہ،یاد حق اور یاد خداوندی کا نام ہے۔ہم چونکہ رات دن اس کھانے پینے اور پہننے میں مشغول ہیں۔اس لئے ہم نے زندگی اسی کو سمجھ لیا ہے،ہم اس کوچے سے نابلد ہیں جو حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے جو اس کے اندر آگئے ان کی سمجھ میں آگیا کہ حقیقی زندگی یہی ہے۔

تو اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مَثَلُ الذَّاكِرِ فِی الْغَافِلِیْنَ كَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ'' ② ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ ایک زندہ مردوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو تو غفلت مردنی ہے اور ذکر زندگی ہے۔

① پارہ: ۳۰،سورۃ العلق،الآیۃ: ۱ ② مرقاۃ المفاتیح،کتاب الصلوۃ،باب المساجد ومواضع الصلوۃ، ج: ۳، ص: ۱۹۵.

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ...... پھر اس کا عجیب اور عظیم ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانون مکافات ہے، جیسے انسان خود کرتا ہے، ویسا ہی ادھر سے معاملہ ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ① اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور فرمایا: مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآءَهٗ ② جسے یہ پسند ہے کہ میں جلد اللہ سے جاملوں۔ اللہ کو یہ پسند ہے اور انتظار ہے کہ کب میرا بندہ مجھ سے آکر ملے گا، جو ادھر سے معاملہ وہ ادھر سے معاملہ۔ اور فرماتے ہیں ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ③ مجھے یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔ اگر تم ذکر اللہ کرو گے تو میں تمہارے نفس کا ذکر کروں گا۔

حدیث (قدسی) میں فرمایا گیا کہ: اگر بندہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں جو بھرے مجمع میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اسے ملائکہ کے مجمع میں یاد کرتا ہوں جس نوع کا یہ ذکر کرے گا اسی نوع کا وہاں ذکر ہوگا۔ تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے، انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ ادھر سے اس نے ذکر کیا ادھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا تو مذکور بن گیا۔ اس لئے اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا تذکرہ رہے تو یہ اللہ کا تذکرہ شروع کر دے۔ جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی وہ یاد کریں گے۔

دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم، وزیر اعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں آپ کا تذکرہ آجائے اور آپ سن پائیں کہ آج پریذیڈنٹ نے میرا ذکر کیا تھا تو عزت و افتخار سے سر اونچا ہوجاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج پریذیڈنٹ نے ہمارا تذکرہ کیا ہے۔ اس لئے کہ ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے مجھے یاد کرلے تو یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔

حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے یہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ تھوڑے فخر کی بات ہے؟ یہ تھوڑی عزت کی چیز ہے کہ اللہ کسی کو یاد کرے؟ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب تم یاد کرو گے؟ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ④ غرض اگر کوئی یوں چاہتا ہے کہ میری یاد وہاں قائم ہوجائے، وہ اس کی یاد کو اپنے اندر قائم کرلے۔ اگر یہ ہر وقت ذکر کرے گا۔ وہاں بھی ہر وقت ذکر ہوگا یہ غافل بن جائے گا تو وہاں بھی غفلت برتی جائے گی۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ⑤ تم ایسے مت بنو کہ اللہ کو بھلا دو۔ تو تم اپنے نفس کو بھلا دو گے تو اللہ بھی تمہیں بھلا دے گا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم یاد کرکے اسے بھول جائیں تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس بندے کو نابینا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا ﴿رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا﴾ ⑥ اے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں بینا تھا؟ میں تو دیکھنے والا تھا؟ ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ ⑦ ہم نے اپنی آیتیں تیرے سینے میں ڈالی

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۷۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج: ۲۰، ص: ۱۲۵، رقم: ۶۰۲۶۔ ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲۔ ④ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲۔

⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹۔ ⑥ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۵۔ ⑦ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۶۔

تمہیں تو نے انہیں بھلا دیا، ہم نے تجھے بھلا دیا تو اگر یہ نسیان کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی نسیان کا برتاؤ ہو جائے گا۔ یہ ذکر کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی ذکر کا برتاؤ ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ:

اے بندے! تو اپنی تندرستی کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری بیماری کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو اپنی تونگری کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری مفلسی کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ بیماری کے وقت میں تجھے یاد رکھوں جب کوئی تیرا یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ تو اپنی دنیا میں مجھے یاد رکھ تاکہ قبر میں میں تجھے یاد رکھوں۔ جو یہاں یاد کرے گا، یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے گا، وہ وہاں بھی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔

یادِ حق کا احساس...... اس لئے ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ انسان کی بھی روح ہے بلکہ انسان کی روح کی روح ہے۔ اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مردنی چھا جاتی ہے اگر احساس ہو فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزاروں دھبے ڈال دو احساس نہیں ہوگا کہ اس پر بھی کوئی دھبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تو ہے ہی سیاہ اور سفید کپڑے پر ذرا سا دھبہ لگا دو، وہ نمایاں ہوگا اور محسوس ہوگا۔ تو جن کے قلوب میں غفلت رچ چکی ہے۔ ان میں اگر دس غفلتیں بڑھ جائیں احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ دل غفلتوں میں رنگا ہوا ہے، لیکن یاد کرنے والا منٹ بھر غافل ہوا سے احساس ہوگا کہ پتہ نہیں کیا چیز میرے اندر سے چھن گئی۔

اس لئے ذکر اللہ کا احساس پیدا کرنا چاہئے زندگی یہی ہے۔ زندگی فی الحقیقت شیرازہ بندی کا نام ہے، اور موت شیرازہ بکھر جانے کا نام ہے اس بدن میں آج پانی مٹی ہوا آگ جمع شدہ موجود ہیں کہا جائے گا کہ زندہ ہے۔ قبر میں جاکے ریزہ ریزہ ہو کر اجزاء بکھر جائیں گے کہا جائے گا کہ مردہ ہے تو ذکر اللہ روح کو بدن سے ملائے رکھتا ہے اور بدن کے اجزاء کو جمع رکھتا ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہے۔

یادِ حق کا اصل طریق...... اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی اور مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی لمبی تقریر کی جائے مقصد صرف اس حدیث کی تشریح اور ترجمہ تھا کہ ذکر اللہ کی عادت ڈالی جائے اور اس کے تین طریقے ہیں۔ سب سے پہلا طریقہ جو اصل اور بنیادی ہے وہ فرائض کی ادائیگی ہے۔ سب سے بڑا ذکر، اللہ کے فرائض میں نماز ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ① نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔ معلوم ہوا کہ نماز ذکر اللہ اور یادِ حق ہے۔

حج کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا گیا ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ ② حج کے ایک ایک رکن پر کہیں ذکر اللہ، کہیں استغفار، کہیں توبہ، کہیں یادِ حق ان سب کا

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۸، ۱۹۹۔

مقصد ذکر ہے نماز کا مقصد بھی ذکر ہے۔

زکوٰۃ اور صدقات کا مقصد بھی فی الحقیقت ذکر ہے فرمایا ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ ① جو تم قربانیاں کرتے ہو اس کا گوشت پوست اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ ذکر اللہ یاد حق پہنچتی ہے جو قربانی کے وقت نام لیتے ہو اور قلب میں نیت کرتے ہو۔ وہ چیز اللہ تک جاتی ہے۔ یہ اس کی علامت ہے۔ بہرحال قربانی ہو، زکوٰۃ ہو، حج ہو، نماز ہو ان سب کی روح ذکر بتلائی گئی ہے تو ذکر کرنے کا بنیادی طریق فرائض شرعیہ کی ادائیگی ہے۔ یہ اصل ذکر ہے۔

ذکرِ مؤقت...... لیکن اصل ذکر کے ساتھ ساتھ امر کیا گیا ہے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ ② اے لوگو! اللہ کی یاد کرو ذکر کثیر کے ساتھ۔ تو ایک ذکر اصل ہے وہ فرائض ہیں اور ایک ذکر زائد اور ذکر کثیر ہے، وہ اس سے اوپر ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک موقت، ایک غیر مؤقت۔ مؤقت تو یہ ہے کہ صبح اور شام کا وقت مقرر کر کے کچھ تسبیح اور تہلیل کر لیا کرے۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھ گئے۔ فرض کیجئے آپ نے سو مرتبہ کلمہ تمجید پڑھ لیا۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" سو مرتبہ استغفار پڑھ لیا، سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا۔ اسی طرح شام کو پڑھ لیا: ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ ③ فرمایا! اللہ کی تسبیح کرو کچھ صبح کو، کچھ شام کو کچھ دوپہر کو ﴿وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ ④ صبح اور شام اللہ کی تسبیح کرو۔ تو یہ مؤقت طریق ہے کہ ایک وقت باندھ کر آدمی کچھ تسبیح پڑھے، سو مرتبہ نہ ہو تینتیس مرتبہ پڑھ لے اتنا نہ ہو کچھ کم کر لو۔ مگر ایک عدد اور وقت معین کر کے اس کو نبھادے۔

حدیث میں ہے "خَيْرُ الْاُمُوْرِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ" ⑤ بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اور دوام برتا جائے۔ جو قلب میں جڑ پکڑ لیتا ہے رسوخ پیدا کر لیتا ہے۔ پہاڑ کی ایک چٹان ہے اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ آپ نے لاکھوں من پانی بہا دیا۔ گرد دھل گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چڑھ جائے گی۔ تو منوں پانی بہا دینے سے ظاہری صفائی آ جاتی ہے۔ مگر چٹان کے اندر نمی نہیں پہنچتی، لیکن اگر آپ ایک قطرہ برس دن تک گراتے رہیں تو پتھر میں بھی سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا تھوڑا عمل ہو۔ اس سے قلب میں جڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایک دن پچاس نمازیں پڑھ لیں لیکن پھر ایسے غائب ہوئے کہ برس دن تک غائب رہے تو گرد دھل جائے گی، اجر مل جائے گا لیکن قلب میں کوئی ملکہ، کوئی بنیاد، کوئی جڑ قائم نہیں ہوگی۔ تو تھوڑا عمل ہو مگر دوام کے ساتھ ہو وہ کارآمد ہوتا ہے دل میں

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۷. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۱.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۷، ۱۸. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ ۴۲.

⑤ الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: کان احب العمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مادیم علیه، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحة، ج: ۱۰ ص: ۷۸ رقم: ۲۷۸۳. امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے حوالہ ہذا۔

ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جڑ قائم ہوجاتی ہے۔ بہر حال سومرتبہ نہ ہو بالکل تھوڑا ہی عدد ہومگر ایک وقت مقررہ پر نام حق لیا جائے، کچھ تلاوت کرلی، کچھ تسبیح، کچھ تہلیل خواہ دس منٹ ہومگر آدمی اس کا پابند ہوجائے، چالیس دن کے بعد خود محسوس ہوگا کہ میرے قلب کے اندر کیا اثر قائم ہوا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی عمل کو چالیس دن خلوص کے ساتھ مسلسل کرے تو قلب میں سے حکمت کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ یادِ حق کی ایک بنیاد قائم ہوجاتی ہے جس کی جیسی مناسبت ہے ویسی معرفت اس کو شروع ہوجاتی ہے تو ذکر کثیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مقررہ وقت پر آدمی کچھ اللہ کا نام لے۔

ذکر غیر مؤقت...... دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقررہ طریق پر آدمی یہ عادت ڈالے کہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام نکلتا رہے۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ وغیرہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے چلتے ہوئے کھڑے، وضو سے بے وضو کوئی قید نہیں۔ مہینہ دو مہینہ تو تکلف کر کے عادت ڈالنی پڑے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی تو بے اختیار اللہ کا نام زبان سے جاری ہوگا۔ کوئی حادثہ پیش آئے گا۔ (خدانخواستہ) مثلاً آپ گر پڑے فوراً اِلَّا اللّٰهُ، بِسْمِ اللّٰهِ کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان سے نکلے گا۔ یہ نہیں نکلے گا کہ لوگو دوڑو، مجھے بچاؤ، اللہ کا نام نکلے گا۔ ابتداً تکلف کرنا پڑے گا۔ جب عادت پڑ جائے گی تو پھر بغیر ارادہ ذکر حق زبان سے شروع ہوجائے گا۔

ذکر غیر مؤقت کا ثمرہ...... اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرتے وقت بھی بلا ارادہ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہوگا۔ خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہوگی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے''۔

اگر اللہ کے نام کی مشق پر زندگی گزاری ہے تو موت کے وقت یقیناً اللہ کا نام زبان پر جاری ہوگا اور جب آدمی اللہ کا نام لیتا ہوا مرے گا تو قبر سے جب اٹھے گا وہی نام اس کی زبان پر جاری ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں درحقیقت موت میں ہوں اور اللہ کا نام لے رہا ہوں بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ تو میدانِ حشر ہے۔

آدمی کو جب عادت پڑتی ہے تو غیر ارادی طور پر وہ چیز جاری ہوجاتی ہے جس کی عادت ہوتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر عبادت ابتداء میں ریاکاری ہوتی ہے دکھلاوا ہوتا ہے۔ بعد میں عادت بنتی ہے، اخیر میں عبادت بنتی ہے۔ اور حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ''مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا.'' ① بچہ جب سات برس کا ہو، اس کو نماز کی تاکید کرواسے مسجد میں ساتھ لاؤ۔ اگر دس برس کا ہوجائے اور نہ مانے تو اس کو مار کر نماز پڑھاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ سات برس کے بچے کو جب آپ نماز پڑھائیں گے وہ نماز اللہ کی تھوڑا ہی ہوگی وہ باپ کی ہوگی۔ وہ مار پٹائی کے ڈر سے نماز ہوگی کہ مسجد میں جائے گا تو کن آنکھوں سے دیکھے گا کہ باپ دیکھ رہا ہے کہ نہیں۔

---

① المصنف لابن ابی شیبة، ج: ۱ ص: ۳۸۲.

اگر دیکھا کہ کھڑا ہوا ہے تو بڑے خشوع سے سجدہ کرے گا اور دیکھا کہ باپ چلا گیا تو وہ بھی تھوڑی دیر میں کھسک جائے گا۔ یہ باپ کی نماز ہے۔ حقیقی نماز نہیں ہے آٹھ نو برس کی عمر تک یہ ریاکاری رہی۔ دس برس کی عمر میں آ کر عادت پڑ گئی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔ نماز کی حقیقت منکشف نہیں۔ بس ایک عادت پڑی ہوئی ہے کہ گھر سے نکلے مسجد تک آ گئے۔ جماعت میں کھڑے ہو گئے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں اس کے اندر حقیقت کیا ہے؟ یا یہ کوئی عبادت یا طاعت ہے۔ بس ایک عادت ہے تو ابتداءً ریاکاری تھی کرتے کرتے عادت پڑ گئی پندرہ بیس برس کے بعد جب آثار و کیفیات طاری ہوں گے تب سمجھے گا یہ کوئی عبادت ہے۔ اب آ کر عبادت بنے گی۔ تو ہر عبادت ابتداء میں ریاکاری ہوتی ہے، بعد میں عادت بنتی ہے، پھر عبادت بنتی ہے۔

مگر اس کے باوجود شریعت نے حکم دیا کہ ریاکاری ہی سہی مگر نماز پڑھو اور عادت کے طور پر ہی سہی مگر نماز پڑھواؤ تاکہ عبادت بن جائے۔ تو اگر کوئی ذکر اللہ کرنے آئے اور دل میں خیال ہو کہ یہ تو ریاکاری ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بڑے صوفی بن گئے، بڑے نمازی آئے، بڑے ذکر کرنے والے آئے، تو سمجھے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دکھلاوے کے لئے ہی تم ذکر اللہ کرو، کرتے رہو۔ یہ ذکر خود کھینچ لے گا اور آپ کے قلب کے اندر رچ جائے گا۔

تو ابتداءً ؎

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام ــــ اللہ اللہ کردہ باید والسلام

دین کے لئے ہو، دنیا کے لئے ہو یا دکھلاوے کے لئے ہو، اللہ کا نام لیتے رہو۔ یہ نام آپ کو اپنی طرف خود کھینچ لے گا۔

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں جن کا محدثین میں عظیم رتبہ ہے: ''طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَاَبٰی اَنْ یَّکُوْنَ اِلَّالِلّٰہِ.'' ① ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا تھا کہ علم پڑھ کر شہرت کمائیں گے۔ کچھ نام و نمود ہوگا۔ ممکن ہے کچھ پیسے بھی مل جائیں، سیکھا تو دنیا کے لئے تھا، مگر جب علم آ گیا تو علم نے انکار کیا کہ میں دنیا کے لئے نہیں میں تو اللہ ہی کے لئے ہونا چاہتا ہوں۔ آخر اس نے ہمیں بھی اللہ سے جا ملایا۔ تو علم آدمی چاہے دنیوی غرض سے سیکھے مگر سیکھ لے، علم آخر وہیں پہنچاتا ہے جو اس کا مقام ہے۔ تو علم پست رہنا نہیں چاہتا، علم بلندی کی چیز ہے۔ آپ کتنا ہی پست رہیں گے۔ مگر وہ آپ کو پکڑ کر اوپر لے جائے گا۔

یہی حقیقت ذکر اللہ کی بھی ہے کہ اللہ بلند ہے، اس کا نام بھی بلند ہے، اس کا ذکر بھی بلند ہے۔ بلند چیز کو جب آپ زبان پر رکھیں گے۔ چاہے اس کی غرض دنیّ اور پست ہو مگر انجام کار وہ رفعت کی طرف جائے گا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جائے گا اس واسطے صبح اور شام کچھ نہ کچھ اللہ کا نام لینا چاہئے۔

تسبیح مذکرہ ہے...... اگر ویسے یاد نہ آئے تو آدمی تسبیح ہاتھ میں رکھ لے۔ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دلاتی

① مرقاۃ المفاتیح، المقدمۃ، ج: ۱ ص: ۲۰.

ہے۔ تسبیح دیکھ کر خواہ مخواہ ہی سُبْحَانَ اللّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دہانی کرا دیتی ہے۔

جواب شبہ: اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ لوگ کہیں گے بڑے صوفی بنے ہیں تو حضرت جنید بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیال کی وجہ سے ذکر کا چھوڑ دینا یہ شرک میں داخل ہے۔ اس واسطے اس کی پرواہ مت کرو لوگ کیا کہیں گے۔ اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ کرلو۔ ضمیر سے معاملہ ہے حق تعالیٰ کا لوگوں سے نہیں ہے۔ آپ جب اپنے قلب میں خالص اللہ کے لئے ذکر اللہ کر رہے ہیں، تو یہ وسوسہ اگر آئے کہ میں دکھلاوے کے لئے کر رہا ہوں تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس پر لَاحَوْلَ پڑھ لے۔

عشق کامل ہو تو ملامت کارگر نہیں ہوتی...... اگر کوئی ملامت کرے تو کرنے دیجئے، اس لئے کہ ملامت جبھی کارگر ہوتی ہے جب عشق ناتمام ہوتا ہے۔ جب محبت کامل ہوتی ہے۔ پھر ملامت گروں کی ملامت کوئی اثر نہیں کرتی۔ حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، جب ایران فتح ہوا تو حضرت حذیفہ ایران پہنچے، اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ایران کا ملک بڑا متمدن ملک تھا۔ اس زمانے میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں، ایک قیصر کی حکومت یعنی رومیوں کی حکومت جو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، ایک کسریٰ کی حکومت جو فارسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ باقی ساری حکومتیں یا ان کے ماتحت تھیں یا ان کے زیر اثر تھیں جو صورت آج روس اور امریکہ کی ہے وہی اس زمانے میں ان کی تھی۔ تو حذیفہ ابن یمانؓ کھانا کھانے بیٹھے اور ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی اس کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں سے زمین پر لقمہ گر پڑا۔ انہوں نے جلدی ادب کے ساتھ لقمہ کو اٹھا کر مٹی جھاڑی اور تناول فرمالیا۔

فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ ملک تو بڑا مہذب ملک ہے۔ یہ بات یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے، لوگ کہیں گے یہ بڑے حریص ہیں ایک ایک لقمہ پر جان دیتے ہیں۔ مٹی تک جھاڑ کر کھا گئے۔ یہ حرص کی دلیل ہے۔ ایسا نہ کیجئے یہ تمدن والوں کا ملک ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا؟ فرمایا: "ءَاَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ." کیا میں اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟ گویا اس درجہ ایک سنت محبوب تھی، عزیز تھی کہ فارسیوں کا پورا ملک اور ان کی تہذیب وتمدن اتنا عزیز نہیں تھا۔ جب محبت کامل ہوتی ہے تو ملامت گر کی ملامت اثر نہیں کرتی۔ ملامت سے منفعل ہونا جبھی ہوتا ہے جب اپنے اندر خامی ہوتی ہے۔ اس واسطے خامی کو رفع کیجئے اور خامی رفع ہونے کی یہی صورت ہے کہ ذکر اللہ اور یادِ حق کی عادت پڑ جائے۔ جب چوبیس گھنٹے اللہ کا نام دل او زبان پہ ہوگا، محبت اور معرفت بڑھ جائے گی۔ پھر ملامت کرنے والے ہزار ملامت کریں گے، کوئی اثر نہیں ہوگا، ان پر ہنسی آئے گی کہ یہ احمق ہیں اس چیز سے روک رہے ہیں۔ آپ خود منفعل اور شرمندہ نہیں ہوں گے۔

بہر حال یہ حدیث بتلاتی ہے کہ زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے جب کائنات، نباتات، جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی۔ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر رہنا چاہئے تبھی وہ زندہ ہوگا بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

بس مولانا کی تعمیل حکم کے لئے یہ چند کلمے میں نے عرض کر دیئے اور اس حدیث کی شرح کی، دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ہم کو یادِ الٰہی اور ذکرِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖۤ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِکَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

نبوت وملوکیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ ٥ وَنُمَکِّنَ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَجُنُوْدَھُمَامِنْھُمْ مَّاکَانُوْا یَحْذَرُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

مادی وروحانی اقتدار کی انتہاء...... بزرگانِ محترم! اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نعمتوں کے دوسلسلے قائم فرمائے ہیں، ایک سلسلہ مادی نعمتوں کا اور ایک روحانی نعمتوں کا ہے۔ مادی نعمتوں کے سلسلے میں جیسے بہترین غذائیں، بہترین لباس اور بہترین مکان اور بہترین شکلیں، صورتیں اور ان سے نفع اٹھانا وغیرہ ایک یہ سلسلہ ہے جس کی کوئی حدونہایت معلوم نہیں ہوتی۔ دنیا میں یہ نعمتیں روز بروز ترقی پر ہیں۔ ہر چیز کے نئے سے نئے ڈیزائن اور نمونے، کچھ آنکھوں کو فرحت دینے والے، کچھ کانوں کو، کچھ دماغ کو اور کچھ ناک کو۔ غرض حواس خمسہ کے لئے اللہ نے نئی سے نئی نعمت پیدا کی اور وہ بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مادی نعمتوں میں سب سے بڑھ کر اقتدار ہے کہ کسی قوم کو عزت دی جائے، اس کے ہاتھ میں قدرت وتمکنت ہو اور وہ اپنی قسمت کی مالک آپ بن جائے۔ اسی کا نام اقتدار ہے پھر ان مادی نعمتوں میں ایک حصہ لذات کا ہے اور ایک اقتدار کا ہے۔

اس کے بالمقابل دوسری نعمتیں روحانی ہیں، جیسے علم، اخلاق، ہدایت پانا، قلب کی تسکین اور عقلی کام ہیں۔ یہ سب روحانی نعمتیں کہلاتی ہیں جن کے ذریعے انسان کی روح کو فرحت اور تسکین ملتی ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ مادی نعمتیں اس کے سامنے گرد ہیں جس کو روحانی لذت میسر آجائے، پھر مادی نعمتیں ہیچ اور گرد بن جاتی ہیں۔

اہل اللہ نے مادی لذتوں پر لات ماری ہے تو کوئی نعمت ان کو ہاتھ لگی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ان

① پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۵، ۶.

نعمتوں کو حقیر اور کم رتبہ سمجھا ہے۔ غرض یہ بات الگ ہے کہ ایک نعمت اعلیٰ ہے۔ اور ایک ادنیٰ ہے۔ مگر ہیں دونوں نعمتیں ایک مادی اور جسمانی، دوسری روحانی اور معنوی لذتیں۔ مادی لذتوں کی انتہاء ملوکیت پر ہوجاتی ہے کہ کسی قوم کو اللہ بادشاہت اور تمکنت دیدے اور ساری نعمتیں اس کے قبضہ میں آ جائیں۔

اور روحانی نعمتوں کی انتہاء نبوّت پر ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام نبوّت کے راستے سے جو نعمتیں لاتے ہیں وہ روح کی تسلی کی ہیں۔ ان میں علم واخلاق ہے، اللہ کے جمال وجلال کا مشاہدہ ہے، ہدایت پانا، اللہ کی کتابوں کی تلاوت کرنا، اس کے ذریعے سے روح کو اقتدار ملتا ہے یہ سلسلہ نبوّت پر جا کر ختم ہوجاتا ہے۔

مادی وروحانی اقتدار کی تاثیر...... تو بادشاہوں کا اقتدار مادی ہے جو بدنوں کے اوپر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اقتدار روحانی ہوتا ہے جو دلوں کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ بدنوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کی حکومت جبری اور ان کی حکومت محبت کی ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ سامنے ہے تو آدمی ڈرتا ہے۔ اس کی سی، آئی، ڈی ہے تو خائف ہوتا ہے کہ کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکال دوں جس کی وجہ سے قانون کی زد میں آ جاؤں اور مقدمہ چل جائے۔ چاہے دل میں لعنت ہی بھیجے۔ تو دل پر کوئی حکومت نہیں بلکہ دل میں بعض اوقات نفرت ہوتی ہے۔ لیکن زبان سے نہیں کہہ سکتا تو شاہی اور ملوکیت کا اقتدار بدنوں پر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی حکومت اور اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔ وہ سامنے بھی نہ ہوں تب بھی آدمی انکی عظمت میں دبا ہوا ہوتا ہے بلکہ دنیا میں بھی نہ ہوں، جب بھی وہی عظمت واقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے جو ان کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ آج انبیاء علیہم السلام کا نام آ جائے سب درود شریف پڑھیں گے صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں گے انبیاء علیہم السلام کی ذات تو بہت بلند و بالا ہے ان کے خدام صحابہ کا ذکر آ جائے تو رضی اللہ عنہم اجمعین کہیں گے۔ صحابہ کرام کا مقام بھی بہت بلند ہے ان کے خدام اور غلام اولیاء کرام ہیں، انکا ذکر آ جائے تو سب رحمہ اللہ علیہم اجمعین کہیں گے۔ صالحین کا ذکر آ جائے محبت سے یاد کریں گے۔ تو آج انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہیں لیکن قلوب ان کی محبت وعظمت سے لبریز ہیں۔ اگر آج خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آ جائے تو عقیدت سے دل جھک جاتا ہے۔ اگر شیخ علاء الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آ جائے تو فرط عقیدت سے دل جھک جائے گا، آج اگر کوئی امام ابی حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ کا نام لے تو دل عقیدت سے جھک جائیں گے۔ اگر کوئی شخص ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہے آدمی جان دینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ انکے خلاف کوئی کلمہ برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ محبت وعقیدت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ حضرات آج دنیا کے اندر موجود نہیں ہیں۔ لیکن قلوب پر حکومت آج بھی کرر ہے ہیں۔

مسٹر آرنلڈ جو سرسید مرحوم کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی ہے۔ اس نے اسلامی تبلیغ کے دور اور طریقے تاریخی طور پر ذکر کیے ہیں کہ کس کس طرح سے

اسلام پھیلا اور دنیا میں رائج ہوا۔ اس نے اس میں بڑی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ ہندوستان کا بھی ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک بڑی عجیب بات دیکھی جو مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے اسے کہیں اور نظر نہیں آئی۔ لیکن دوسروں کو وہ ہر جگہ نظر آئی مگر اس کے لئے وہ انوکھی بات ہے۔

''وہ یہ کہ میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ ایک شخص اجمیر میں قبر میں لیٹا ہوا، پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور سلطان بنا ہوا ہے۔ نام بھی اس کا ''سلطان الہند'' ہے۔ یعنی حضرت خواجہ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ''۔

تو اس نے کہا میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے اس دنیا میں نہیں ہے مگر پورے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر اس کی حکومت قائم ہے اس کا نام بھی آتا ہے تو لوگ عظمت سے اس کا نام لیتے ہیں۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے مادی اقتدار بدنوں کے اوپر ہوتا ہے، روحانی اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام، ان کے خدام اور تربیت یافتہ، دلوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ سلاطین اور ان کے تربیت یافتہ بدنوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ سلاطین دنیا سامنے موجود ہوں تو آدمی عظمت کا کلمہ کہتا ہے ورنہ بعض اوقات لعنت کرتا ہے، انبیاء اور اولیاء دنیا میں موجود ہوں یا نہ ہوں، قلوب پر یکساں ان کی عقیدت و عظمت قائم ہے، محبت سے دل لبریز ہے تو اقتدار کے دو سلسلے نکلے، مادی اقتدار کی انتہاء حکومت کے اوپر ہے اور روحانی اقتدار کی انتہا نبوّت کے اوپر ہے۔

مزاج نبوّت وملوکیت میں فرق...... لیکن ان دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ نبوّت کا بھی ایک مزاج ہے اور بادشاہت وملوکیت کا بھی۔ دنیا میں جب بادشاہت غالب آتی ہے تو اس کا مزاج کچھ اور ہے۔ ان دونوں مزاجوں کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ بادشاہ جب کسی ملک پر غالب آتے اور اقتدار پاتے ہیں اور فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہ کیا کرتے ہیں؟ ﴿اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ ① جب کوئی بادشاہ کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس شہر کو اس طرح سے فاسد کرتا ہے کہ عزت والوں کو پست کرتا ہے، ذلت والوں کو اونچا کرتا ہے۔ انقلاب عظیم برپا کرتا ہے۔

اس لئے کہ جو اب تک عزت والے تھے ان سے عزت چھیننی ہے کیونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پھر برسر اقتدار نہ آجائیں۔ اس لئے انہیں کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے اقتدار کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ وہ نشانات مٹائے جاتے ہیں جو کسی قوم کے اقتدار کے ہوتے ہیں۔ کاغذوں سے وہ نام محو کئے جاتے ہیں تا کہ خیال بھی ادھر نہ جائے اس لئے کہ اگر ان کا اقتدار کسی درجہ میں بھی رہ گیا تو ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔ ﴿وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ ② یہ سلاطین کا طریقہ ہے بادشاہت اور ملوکیت کی تاریخ دیکھی جائے تو ایسی ہی نظر آئے گی۔

① ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۳۴.

اقتدار پانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل......اور ایک انبیاء علیہم السلام کا مزاج ہے۔ جب نبوّت کا اقتدار غالب ہوتا ہے تو وہ امن کا اعلان کرتے ہیں۔ عزت والوں کی عزت کو برداشت کرتے ہیں اور جو پست ہیں ان کو ابھارتے ہیں تا کہ سب عزت میں شریک ہو جائیں اور کسی کی تذلیل اور رسوائی نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس برس کی زندگی کے بعد جب مدینہ طیبہ سے تشریف لائے اور فاتحانہ انداز میں مکہ کے اندر داخل ہوئے تو دس ہزار صحابہ کا لشکر ساتھ تھا۔ آپ اونٹنی پر سوار ہیں۔ بادشاہ ایسے موقع پر اقتدار جتلاتا ہوا اور اینٹھتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے۔ حدیث میں ہے کہ تواضع اور خاکساری کی وجہ سے گردن مبارک اونٹنی کی گردن پر جھکی ہوئی تھی۔ چونکہ عزت کے ساتھ داخلہ ہوا ہے تو اللہ کی عزت پیش نظر تھی۔ اس لئے غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے سر مبارک اتنا جھک گیا تھا کہ اونٹنی کے سر کو آ ملا تھا۔ تو انبیاء کا داخلہ تو اس شان سے ہوا۔ سلاطین داخل ہوتے ہیں تو اکڑتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ پھر سلاطین عزت والوں کو ذلیل بناتے ہیں، پستوں کو اور پست کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا مزاج یہ ہے کہ آپ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ داخل ہوئے تو جگہ جگہ امن کا اعلان فرمایا۔ فرمایا: "مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ" ابوسفیان کے گھر میں جو چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ "وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَھُوَ اٰمِنٌ" جو مسجد حرام میں چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ "مَنْ اَغْلَقَ بَابَهٗ فَھُوَ اٰمِنٌ" جو اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کرے گا اس کے لئے بھی امن ہے۔ غرض امن کا اعلان عام ہوتا جا رہا ہے۔ ①

اور کس قوم کے مقابلے میں؟ جس نے تیرہ برس اللہ کے رسول کو چین نہیں لینے دیا۔ انتہائی ایذاء رسانی کی بلکہ حد کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گالیاں دی گئیں، کذاب، مجنون، ساحر اور کاہن کہا گیا جادو آپ کے اوپر کرایا گیا، طائف میں تشریف لے گئے تو پتھر اتنے مارے گئے کہ پیر مبارک اتنے زخمی ہو گئے کہ نعلین مبارک خون سے بھر گئے، کتے پیچھے لگائے گئے، اس قوم کے مقابلے پر امن کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ جو مسجد حرام میں یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرے، اسے بھی امن۔ گویا کوئی راستہ ایسا نہیں چھوڑا کہ بدامنی یا قتل و غارت ہو اور اس قوم کے ساتھ یہ شفقت برتی گئی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، وطن سے بے وطن کیا۔ یہ نبوّت کا مزاج ہے کہ جتنا اقتدار ملتا جاتا ہے اتنا ہی جھکتے جاتے ہیں۔

نہد شاخ پرز میوہ سر بر زمین

درخت کا پھل جب بڑھ جاتا ہے تو شاخیں زمین کی طرف جھک جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ درخت جب پھل دار ہو تو اوپر کو اٹھنے لگے۔ انبیاء علیہم السلام، اللہ کی طرف سے ساری دولتیں لے کر آتے ہیں ان میں تواضع بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن مادی دولت جوں جوں بڑھتی ہے اس سے نخوت بڑھتی رہتی ہے۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فتح مکه ج: ۹ ص: ۲۴۹.

حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جب آپ ہجرت فرمارہے تھے تو جاتے ہوئے مسجد حرام میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا کلید بردار عثمان شیبی کا خاندان تھا۔ شیبی اسے کہتے تھے، وہ بیت اللہ کے دروازے پر بیٹھتا تھا۔ بیت اللہ کی کنجی اس کے پاس رہتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مکہ چھوڑ کر ہجرت فرمارہے ہیں۔ آپ کو صدمہ ہے تو شیبی سے کہا:

''اے شیبی! ایک دومنٹ کے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھول دے، تاکہ میں اندر دونفل پڑھ لوں''۔ اس نے جھڑک کر اور ڈانٹ کر کہا کہ تم ہرگز داخل نہیں کئے جاسکتے۔ تم نے ہمارے آبائی دین کو چھوڑا، ہمارے بتوں کو برا کہا۔ یہ نہیں ہوسکتا جاؤ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لجاجت (نرمی) سے کہا ''میں عبادت کرنا چاہتا ہوں، دو رکعت پڑھنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا نہیں، آپ کو اجازت نہیں دی جائے گی، آپ جایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے شیبی! ایک وقت آنے والا ہے کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے وہاں تو میں ہوں گا اور جہاں میں کھڑا ہوا التجاء کررہا ہوں یہاں تو کھڑا ہوگا۔ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا؟''

اس نے کہا ''جاؤ ایسی باتیں بہت دیکھی ہیں۔'' اقتدار کے غرور میں مست تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بے کس و بے بس ہوکر گھر سے باہر نکل رہے تھے، مکے والوں کی اکثریت تھی، اقتدار تھا، دولت اور فوج بھی ان کی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا تو اسے غرور کا نشہ تھا، وہ جانتا تھا کہ آپ کچھ نہیں کرسکتے، نبوت کی عظمت اس کے دل میں نہیں تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ نبوت کو اللہ نے کیا کیا طاقتیں بخشی ہیں۔ وہ تو صرف مادی طاقت کو جانتا تھا اس بناء پر اس نے کہا ایسی تخیلات کی باتیں بہت سنی ہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں کہ میں کعبہ کے دروازے پر بطور متولی کے بیٹھوں گا اور جو آج متولی ہے وہ نیچے کھڑا ہوگا۔ یہ شیخ چلی کی باتیں ہیں، محض تخیلات ہیں۔ یہ اس نے کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوگئے، ہجرت فرمائی۔ جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور امن کا اعلان کیا، ایک نفس کی خونریزی نہیں ہوئی، ایک جان نہیں گئی۔ آپ مسجد حرام میں تشریف لائے اور فرمایا کہ شیبی کو بلاؤ۔ وہ آیا، کعبے کی کنجی اس کے ہاتھ میں، کعبے کے دروازے کا تالا کھولا۔ آپ وہیں تشریف لے گئے جہاں شیبی کھڑا ہوا تھا اور شیبی وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں آپ کھڑے ہوئے التجا کررہے تھے۔

فرمایا: شیبی! وہ وقت تجھے یاد ہے کہ میں نے لجاجت سے التجاء کی تھی کہ مجھے ایک دو رکعت پڑھنے کی اجازت دیدے، تو نے ڈانٹ دیا تھا۔ کہا جی ہاں یاد ہے۔ فرمایا: یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے اس جگہ میں ہوں گا اور جس جگہ میں کھڑا ہوں اس جگہ تو کھڑا ہوا ہوگا یہ تو نے دیکھ لیا؟

اس نے کہا: جی ہاں دیکھ لیا، بے شک میں اسی جگہ کھڑا ہوا ہوں جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے۔ اور آپ اس

جگہ ہیں جس جگہ میں تھا۔ فرمایا، اب تیرا کیا حشر ہونا چاہئے؟

اس نے ایک ہی جملہ کہا کہ اَخٌ کَرِیْمٌ وَّابن اخ کَرِیْمٌ ① میں ایک کریم پیغمبراور کریم بھائی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ بہر حال یہ خاندان قریش میں سے تھا، تو اس نے یہ جملہ کہا اَخٌ کَرِیْمٌ وَنَبِیٌّ کَرِیْمٌ ۔

اب یہ خیال فرمائیے شیبی نے کس طرح سے ڈانٹا تھا۔ اللہ کے رسول کی انتہائی عظمت کے باوجود اس نے کیا کہا کہ لیکن آپ نے کیا معاملہ فرمایا۔ فرمایا ''اے شیبی! یہ کعبے کی کنجی تیرے حوالے کرتا ہوں، قیامت تک تیرے ہی خاندان میں رہے گی، کوئی دوسرا اسے نہیں حاصل کر سکے گا۔ آج سے تو اور تیرا خاندان قیامت تک کے لئے متولی ہے''۔

عرب میں بیسیوں نئے انقلابات ہوئے، حکومتیں بدلیں، لیکن شیبی کا خاندان بدستور قائم ہے اور کعبے کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، مکہ کے آدھے بازاروں پر آج شیبی کا قبضہ ہے اور اس کی دولت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا ہر شخص چاہتا ہے اور وہ فیس لگا دیتا ہے کہ اتنی فیس ادا کردو گے تو داخل ہونے دوں گا ورنہ نہیں۔ حالانکہ ایسا داخلہ لگانا ممنوع ہے کیونکہ اس پر فیس لگانا جائز نہیں، مگر ایک تو بیت اللہ کی محبت اور اوپر سے کچھ عظمت بھی اور کچھ محبت بھی، اس لئے لوگ فیس ادا کرتے ہیں اور داخل ہوتے ہیں۔ لیکن محض محبت ہی تو مطلوب نہیں، شریعت کا ادب بھی تو ملحوظ ہے۔ وہ صحیح محبت سے کام نہیں کرتا جب تک اتباع شریعت نہ ہو، وہ محبت کارآمد نہیں ہے، جب تک محبت کے ساتھ متابعت سنت اور شریعت کی عظمت نہ ہو۔ اس لئے رشوت دے کر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

کئی بار حاضری ہوئی ہمارا بہت جی چاہتا تھا تو ہمارے لئے یہ مشکل تھی، تو ہم نے افسوس کے ساتھ مکے میں اپنے دوست سے ذکر کیا کہ ہم تو محروم ہی رہ گئے اور بیت اللہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ ان کے شیبی کیساتھ تعلقات تھے۔ اس نے کہا، تنہا آپ کے لئے بیت اللہ کھولا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ اندر جاکے زیارت کریں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایسا انتظام کیا جب ہجوم ختم ہو گیا، شیبی کعبے کا دروازہ بند کر کے جانے لگا، انہوں نے اپنے تعلقات کے وجہ سے اس سے بات کی اور بیت اللہ کا دروازہ کھولا اور میرے پاس آدمی بھیج کے مجھے بلایا کہ آپ کے لئے بیت اللہ کھلا ہوا ہے۔ تو میں تو کیا چیز تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں میں نے شریعت کا اتباع کیا تھا اور دل میں داخل ہونے کا جذبہ تھا لیکن رشوت دینا جائز نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرما دیا۔

بہر حال لوگ یہ نہیں سمجھتے وہ چاہتے ہیں بس داخل ہو جائیں خواہ کسی ممنوع کا ارتکاب کرنا پڑے۔ غرض شیبی آج بھی برسر اقتدار ہے۔ چودہ صدیاں گذر گئیں مگر اسی کے خاندان کے ہاتھ میں بیت اللہ کی کنجیاں ہیں حالانکہ

---

① السنن الکبریٰ للبیھقی، باب فتح مکۃ حرسھا اللہ تعالیٰ، ج: ۹ ص: ۱۱۸.

شیبی نے اللہ کے رسول کے ساتھ انتہائی بے عظمتی کا برتاؤ کیا تھا اور آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے اسے کیا دیا کہ بیت اللہ کا متولی قیامت تک کے لئے قرار دیدیا، بجائے اس کے کہ شیبی سے انتقام لیا جاتا۔ یہ چیز ملوکیت اور بادشاہت میں نہیں ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی ذرا بھی اقتدار کا خلاف کرے تو بغاوت کا الزام قائم ہوتا ہے اور اسے پھانسی دیدی جاتی ہے۔ تو یہ نبوّت کا خاصہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو ایک دوست دوست کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ تو نبوت کا مزاج اور ہے، ملوکیت کا اور ہے۔ آج بھی شیبی برسرِ اقتدار ہے اور کعبے کی کنجیاں اس کے پاس ہیں اور قیامت تک رہے گا۔ کیونکہ اللہ کے رسول نے فرمادیا ہے کہ کنجیاں قیامت تک کے لئے تیرے خاندان کو دیتا ہوں۔

اہل اللہ کے مزاج میں نیکی کی حرص...... اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ اللہ والے بھی عجیب چیز ہیں۔ یہ ہر بات سے اپنی آخرت کا فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ جب ایک شخص دنیا کا طالب ہو وہ ہیر پھیر کر کے اپنے پیسے کما لیتا ہے۔ یہ اللہ والے ہیر پھیر کر کے دین اور آخرت کما لیتے ہیں۔ جب ہم دنیا دار دنیا کے بارے میں حریص ہیں کہ اگر سو روپیہ مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ ہزار روپیہ مل جائے، ہزار مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ کروڑوں ہو جائیں۔ غرض طلب کسی حد پر رکتی نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر اس بنی آدم کو ایک جنگل بھی سونے کا مل جائے تو کہے گا یا اللہ! پیٹ نہیں بھرا، ایک جنگل اور سونے کا مل جائے۔ دوسرا مل جائے تو تیسرا مانگے گا کسی حد پر نہیں رکتا۔ بعینہ یہی کیفیت اللہ والوں کی ہے کہ ساری جنت پر ان کا قبضہ ہو جائے، تب بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ غرض اہل دنیا دنیا کے بارے میں حریص ہوتے ہیں، اہل اللہ آخرت کے بارے میں حریص ہوتے ہیں۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو نقشبندیہ خاندان کے اکابر میں سے تھے، ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ آئے، وہیں ان کی وفات بھی ہوئی اور قبر بھی ہے۔ انہیں یہ حدیث معلوم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبی کو بیت اللہ کی کنجیاں سپرد کی ہیں۔ مکہ میں چاہے سارے خاندان اجڑ جائیں مگر شیبی کا خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا۔ یہ ان کا ایمان تھا اور اللہ کے رسول کا قول تھا تو مولانا رفیع الدین صاحب کو عجیب ترکیب سوجھی۔ واقعی ان بزرگوں کو داد دینی چاہئے کہاں ذہن پہنچا۔

انہوں نے کہا جب یہ خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا تو اس زمانے میں بھی موجود ہوگا، جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔ اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ مہدی کا جب قربِ قیامت میں ظہور ہوگا تو مکہ ہی میں ہوگا اور وہ بیت اللہ شریف کی دیوار سے کمر لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، لوگ ان کے ہاتھ پر آ کر بیعت کریں گے۔

اور اس وقت کی جو علامات بتلائی گئی ہیں وہ یہ کہ پوری دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا۔ بلاواسطہ پوری دنیا پر

نصاریٰ کا اقتدار چھایا ہوا ہوگا۔ دوسری علامت یہ فرمائی گئی "مُلِئَتِ الدُّنْیَا ظُلْمًا وَجَوْرًا." ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ دین و دیانت کا نشان باقی نہیں رہے گا، شرارت نفس، تعیش و عیاشی، ظلم اور بددینی عام ہوجائے گی، محدودلوگ ہوں گے جو پہاڑوں کی چوٹیوں میں جاکر اپنے دین کو سنبھالیں گے، دنیا ان کو حقیر وذلیل سمجھے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک عالم اتنا ذلیل ہوجائے گا جیسے مردے گدھے کی لاش ہوتی ہے کہ اسے کوئی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایک عالم کی ذلت کی یہ کیفیت ہوگی۔ تو اس درجہ ظلم وستم بددینی اور بددیانتی دنیا میں پھیل جائے گی۔ یہ وقت ہوگا کہ دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا، مسلمان انتہائی ظلم وستم میں گرفتار ہوں گے۔ دیندار پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جاکر چھپ چھپ کر اپنے دین کی حفاظت کررہے ہوں گے، شہروں اور قصبوں میں ان کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ نماز، روزہ کا تو ذکر کیا رہے گا، بس ظلم وستم غالب ہوگا۔ اس وقت مکہ مکرمہ میں مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔

اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ انکے بارے میں اللہ کی طرف سے اعلان کیا جائے گا، ایک غیبی آواز پیدا ہوگی کہ "هٰذَا خَلِيْفَةُ اللهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْمَعُوْا لَهُ وَاَطِيْعُوْا" ② یہ اللہ کے خلیفہ مہدی ہیں ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ فرمایا گیا اس وقت ابدال شام، نجباء عراق اور اقطاب ہند اور تمام اہل اللہ جہاں جہاں ہوں گے سمٹ کر شام میں پہنچیں گے اور شام کو حضرت مہدی علیہ الرضوان مرکز بنائیں گے اور یہ وہیں جاکر ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور مسلمانوں کی قوت وہاں جمع ہوگی ان کے ہاتھ پر مغرب اور نصاریٰ کی طاقتیں ٹوٹیں گی اس کے بعد وہ آئے گا کہ پورے عالم میں دین اسلام پھیل جائے گا اور دوسرا کوئی دین اور قومیت باقی نہیں رہے گی۔ اس کی تفصیلات ہیں۔

ان میں مجھے نہیں جانا۔ جو مجھے واقعہ سنانا ہے اس کے متعلق جتنی چیز بیان کرنی تھی وہ میں نے عرض کی۔ گویا مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا۔ شام کو وہ اپنا مرکز بنائیں گے۔ مسلمانوں کی ساری قوت شام میں سمٹ آئے گی۔ دجال اور مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہوگا ملحمہ کبریٰ واقع ہوگا یعنی سب سے بڑا جہاد اس زمانے میں ہوگا اور تین معرکے ہوں گے لاکھوں آدمی اس میں قتل ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ محاذ جنگ ہی اتنا لانبا ہوگا کہ کوا اڑے گا، کوے کی اڑان مشہور ہے کہ صبح سے شام تک اڑتا رہتا ہے، تھکتا نہیں ہے۔ تو صبح سے شام تک کوا اڑے گا، جہاں جہاں وہ جائے گا لاشیں ہی لاشیں نیچے پڑی ہوئی ہوں گی۔ اس کو یہ نظر آئے گا۔ اتنا لانبا محاذ ہوگا اور مقتولین کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ یہ عظیم جہاد ہوگا اس جہاد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے مجاہدین کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب المهدی، باب ١١ ص: ٣٥٦ رقم: ٣٧٣٦. اس حدیث کو ترمذیؒ نے حسن صحیح بتایا ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ٩ ص: ٢٨٢ رقم: ٤٢٨٢. ② الحدیث اخرجه الامام احمد ولفظه: اذا رأیتم الرایات السود قدجاءت من قبل خراسان فأتوها فان فیها خلیفة المهدی. مسند احمد ج: ٧ ص: ١٩٣ ومن حدیث ثوبانؓ.

اجر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث میں فرمایا گیا ہے اب میں واقعہ عرض کرتا ہوں جو مولانا رفیع الدین صاحب یہ حدیث سن کر ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچے۔

یہ ان کا ایمان تھا کہ شیبی کا خاندان قیامت تک ضرور رہے گا اور جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا جب بھی یہ مکہ ہی میں ہوگا۔ جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا تو وہ بیت اللہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے اور مسلمانوں سے بیعت کریں گے۔ تو بیت اللہ کے دروازے کے کنجیاں شیبی کے ہاتھ میں ہوں گی۔ اس لئے یہ بھی وہاں موجود ہوگا۔ یہ چند کڑیاں ملا کر مولانا رفیع الدین صاحب نے ایک حمائل شریف اور ایک تلوار، یہ دونوں لیں۔ اور مہدی علیہ الرضوان کے نام ایک خط لکھا کہ

''فقیر رفیع الدین دیوبندی مکہ معظمہ میں حاضر ہے اور آپ جہاد کی ترتیب کر رہے ہیں۔ مجاہدین آپ کے ساتھ ہیں۔ جن کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا، تو رفیع الدین کی طرف سے یہ حمائل تو آپ کی ذات کے لئے ہدیہ ہے اور یہ تلوار کسی مجاہد کو دیدیجئے کہ وہ میری طرف سے جنگ میں شریک ہو جائے، اور مجھے وہ اجر مل جائے جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا''۔

یہ خط لکھ کر کے تلوار اور حمائل شیبی کے سپرد کی جوان کے زمانہ میں شیبی تھا اور کہا کہ تمہارا خاندان قیامت تک رہے گا اور مہدی علیہ الرضوان کے ظہور تک یہ امانت ہے۔ تو جب انتقال کرو تو جو تمہارا قائم مقام ہو اسے وصیت کر دینا اور اس سے یہ کہہ دینا کہ جب اس کا انتقال ہو وہ اپنی اولاد کو وصیت کرے کہ رفیع الدین کی یہ تلوار اور حمائل شریف خاندان میں چلتی رہے یہاں تک کہ مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہو جائے۔ تو جو اس کے زمانے میں شیبی ہو وہ میری طرف سے حضرت مہدی علیہ الرضوان کو یہ دونوں ہدیئے پیش کر دے۔ حمائل ان کی ذات کے لئے تحفہ ہے اور تلوار امانت ہے کہ وہ کسی مجاہد کو میری طرف سے دیدیں تا کہ جب وہ جہاد میں شریک ہو تو میری شرکت بھی ہو جائے اور اس اجر میں میں بھی حصہ پالوں۔ کہاں کی بات انہوں نے سوچی۔ اس حدیث سے انہوں نے کس طرح کام لیا کہ اعلیٰ ترین جہاد کے اندر اپنی شرکت کر لی۔

تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ والے نیکیوں پہ اتنے حریص ہوتے ہیں کہ چاہے ان کا گھر بھر جائے نیکی سے، لیکن انہیں خیال ہو کہ نیکی یہاں سے بھی مل جائے گی، جھٹ وہاں پہنچ جائیں گے کہ اسے بھی کیوں نہ سمیٹ لیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنتیں ہمارے قبضہ میں آ جائیں۔ یہ اللہ والوں کا مزاج ہے۔

امام ابوداؤد رحمتہ اللہ علیہ بہت بڑے محدث گزرے ہیں جن کی کتاب ابوداؤد مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، داخل درس ہے۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اور سمندر میں جہاز اترا ہوا کھڑا تھا۔ ایسی گودیاں اس زمانے میں نہیں تھیں، جیسی آج بنتی ہیں۔ تو جہاز ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوتا تھا۔ چونکہ کنارے پر پانی کم ہوتا تھا وہ جہاز کے لئے کافی نہیں ہوتا تھا اور لوگ کشتیوں میں بیٹھ کے جہاز میں

جاتے اور سوار ہوتے۔

ایک جہاز فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤدؒ سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی۔ اس نے چھینک کر زور سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے اسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا چاہئے اور جس کے کان میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑے، وہ جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہے۔ اس شخص نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس زور سے کہا کہ امام ابوداؤدؒ کے کان میں آواز آئی۔ اب ان کا جی چاہا کہ میں شریعت کی اس چیز پر عمل کروں اور یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہوں تا کہ مجھے ثواب ملے حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ چھینک لینے والے کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا واجب ہے جبکہ اس مجلس میں وہ موجود ہو اور اس کے کان میں پڑ جائے کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا ہے۔ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ کر جواب دے۔ یہ نہیں ہے کہ مسجد میں ایک شخص کو چھینک آئے اور دوسرا شخص بازار میں جا رہا ہے اور وہ جواب دینے کے لئے مسجد میں آئے۔ ایک مجلس کا مسئلہ ہے مجلس سے خارج کا نہیں ہے۔

تو امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ جواب دیں۔ اس لئے کہ چھینک لینے والا ایک فرلانگ پہ ہے اور یہ یہاں، وہ جہاز پر ہے۔ یہ کنارے پر ہیں۔ مجلس بھی ایک نہیں جگہ بھی ایک نہیں بیچ میں سمندر حائل، مگر وہی بات ہے کہ نیکی کی حرص ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کمالیں اس نیکی کو بھی کیوں چھوڑیں۔

امام ابوداؤدؒ کی آواز اتنی اونچی تو تھی نہیں کہ یہاں کنارے سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہیں تو اس کے کان میں پہنچے۔ چھینک لینے والے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا اس کی آواز یہاں پہنچ گئی تو تین درہم میں کرائے کی کشتی لی اور اس کشتی میں بیٹھ کر ڈیڑھ فرلانگ کا سفر کر کے جہاز میں پہنچے اور جہاز میں اوپر چڑھ کے کہا، یَرْحَمُکَ اللّٰہُ. یہ گویا نیکی کمائی۔ مورخین لکھتے ہیں جس وقت انہوں نے جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا، غیب سے ایک آواز آئی کہنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ آواز یہ آئی کہ ''اے ابوداؤد آج آپ نے تین درہم میں جنت خرید لی''۔

یہ آواز کان میں پڑی۔ معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ حالانکہ امام ابوداؤدؒ محدث ہیں۔ جانے کتنی انہوں نے حدیثیں لکھیں اور کتنا اجر کمایا، کتنی نوافل اور تہجد پڑھے ہوں گے، کتنے صدقات دیئے ہوں گے۔ لیکن جنت کی خریداری کے وقت اس حقیر سے عمل کا ذکر کیا کہ تین درہم میں کشتی کرائے پر لے کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ دیا۔

اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کی مقبولیت اس کی صورت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی حقیقت سے ہوتی ہے۔ اخلاص جتنا غالب ہو، چاہے عمل چھوٹا ہو مگر اخلاص سے وزن پیدا ہو جاتا ہے، وہ مقبول ہوتا ہے۔ لمبا چوڑا عمل ہو، اخلاص ندارد ہو۔ قبولیت کی شان نہیں پیدا ہوتی۔ امام ابوداؤدؒ نے معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا ہوگا. اتباع سنت کے کس جذبے سے گئے ہوں گے کہ یہ ایک عمل اتنا غالب آ گیا کہ نہ تہجدوں کا ذکر آیا نہ صدقات کا ذکر آیا، ذکر آیا تو اس عمل کا ذکر آیا کہ تین درہم میں آپ نے جنت خرید لی۔ غرض یہ لوگ دین کے اندر بے حد حرص رکھتے ہیں کمانا اتنا جانتے ہیں کہ گویا ہر وقت کماتے ہی رہتے ہیں۔ ہم دکان پہ بیٹھ کے کماتے ہیں۔ یہ چلتے ہوئے الگ،

بیٹھے ہوئے الگ، سوتے ہوئے الگ اور گھر میں الگ کمائیں۔ غرض ہر جگہ ثواب کمانے کی فکر رہتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداداللہ قدس اللہ سرہ جو شیخ الطائفہ ہیں گویا تمام اہل دیوبند کے مرشد ہیں۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مرشد ہیں۔ ان کا عمل کیا تھا؟ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آدمی جب گھر سے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے چلتا ہے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک بدی مٹائی جاتی ہے اور یہ بھی دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ نے سوال فرمایا کہ لوگو! جانتے ہو کہ درجات کن کن چیزوں سے بلند ہوتے ہیں اور کفارات کن کن چیزوں سے ہوتے ہیں کہ گناہ مٹا دیئے جائیں؟ عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

منجملہ اور چیزوں کے فرمایا: کَثْـرَۃُ الْخُطَاءِ اِلَی الْمَسْجِدِ ① مسجد کی طرف جتنے زیادہ قدم پڑیں گے اتنا ہی گناہوں کا کفارہ ہوگا، اتنے ہی درجات بلند ہوں گے۔

تو ایک طرف یہ حدیث ہے کہ جتنے قدم زیادہ ہوں گے نیکیاں بڑھیں گی، بدیاں گھٹیں گی اور دوسری طرف وہ حدیث ہے کہ ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹائی جاتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ کا یہ عمل تھا کہ اگر مسجد کو دو راستے جاتے ہوں۔ ایک ذرا لمبا اور ایک چھوٹا ہو تو لمبا راستہ اختیار کرتے تھے تاکہ قدم زیادہ پڑیں، نیکیاں زیادہ لکھی جائیں اور بدیاں زیادہ مٹائی جائیں اور اس میں بھی یہ کرتے تھے کہ لانبا راستہ اختیار کر کے چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے تھے۔ لمبی لمبی گریں نہیں ڈالتے تھے، اس لئے کہ حدیث میں کَثْرَۃُ الْخُطَاءِ فرمایا گیا ہے کہ قدموں کی کثرت مطلوب ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ چھوٹے قدم ہوں یا بڑے قدم ہوں اس کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر میں چھوٹے قدم ڈالوں، شریعت نے مجھے نہیں روکا، یعنی اگر بیس قدم سے راستہ طے ہوتا، چالیس قدم سے طے کرتے تھے تاکہ چالیس نیکیاں ملیں۔ یہ جب ہوتا ہے کہ دل میں ایک لگن لگی ہوئی ہو کہ مجھے نیکی کمانی ہے بالکل ہمیں اپنے اوپر قیاس کر لینا چاہئے کہ ہمارے دل میں لگن ہوتی ہے کہ کسی طرح ہم پیسہ کمائیں، تجارت، زراعت، ملازمت کے ذریعے کسی طرح کمائیں۔ چوبیس گھنٹے آدمی دماغ لڑاتا رہتا ہے کہ مال کس طرح سے فراہم کروں، اگر مال میں کمی ہو جائے تو کس طرح سے بڑھاؤں' ڈیزائن ختم ہو جائے تو کس طرح سے پورا کروں کہ کمی نہ ہونے پائے۔ گاہک آنے میں یوں نہ کہوں کہ اس وقت مال نہیں ہے۔ تو تاجر ہر مال رکھتا ہے تاکہ گاہک کو جواب نہ دینا پڑے۔

گاہکوں کی اگر کثرت ہے مثلاً پچاس ہوں تو سو گاہک کا مال رکھے گا کہ اگر ایک دم سو گاہک آجائیں تو مجھے انکار نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ اگر وہ انکار کرتا اور سو کی بجائے پچاس کو دے، روٹی تب بھی چلے گی، مگر وہ تو جذبہ ہوتا ہے کہ مال بڑھے، پیسہ بڑھے ایک لگن لگی ہوتی ہے۔۔ بس ٹھیک اسی طرح سے ان لوگوں کے دل میں لگن ہوتی ہے

① السنن لابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ماجاء في اسباغ الوضوء ج: ٢ ص: ١٩.

کہ نیکی بڑھے، حالانکہ نجات کے لئے اتنی نیکیاں بھی کافی ہیں جتنی اب تک تھیں، مگر یہ چاہتے ہیں کہ اور اضافہ ہو، درجات ملتے رہیں۔ کسی مرتبے اور درجے پر آ کر رکتے ہی نہیں۔ ان کے دل میں ہوس ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ حرص وہوس کوئی بری چیز نہیں، مصرف اس کا صحیح، غلط ہوتا ہے۔ حرص بہت بڑی چیز ہے، اس کو ہم برا نہیں کہتے۔ حرص سے انسان کا حوصلہ کھلتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''اگر ہم ایک جنگل بھر کر بنی آدم کو سونے کا دیدیں تو یہ ہم سے دوسرا مانگے گا''۔

معلوم ہوا اتنا بڑا حوصلہ ہے کہ پوری دنیا کو سونے سے بھر دیں جب بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ گویا اس کا پیٹ یعنی حوصلہ بہت بڑا ہے تو حرص بہت بڑی چیز ہے۔ اس واسطے یہ بری چیز نہیں ہے کہ اس کو برا کہا جائے گا۔

البتہ برا کس چیز کو سمجھا گیا؟ اس کو کہ حوصلہ تو اتنا بڑا اور اسے چند ٹھیکروں میں گنوا دے، اس چیز سے وہ چیز کماؤ کہ جیسے تمہاری حرص کی حد نہیں، اس نعمت کی بھی کوئی حد نہ ہو۔ دنیاداری میں اگر ہم نے حرص لگائی تو حرص تو اتنی بری کہ دنیا کے ساتھ آخرت بھی سما جائے اور اسے دنیا کی چیزوں کے اوپر لگا دیا۔ دنیا کی چند دن کی عمر ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ حرص تو آگے جارہی ہے اور دنیا یہیں ختم ہوگئی۔ تو اس جذبے کی ہم نے ناقدری کی کہ اللہ نے جذبہ بڑا دیا تھا اس کو حقیر چیز کے اندر ہم نے کھو دیا۔ لیکن اگر اس حرص سے ہم جنت چاہیں تو جیسے ہماری حرص کی حد نہیں، جنت کی نعمتوں کی بھی حد نہیں۔ مانگو کہاں تک مانگتے ہو۔

﴿وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ① یہی موقع ہے جس میں آدمی حریص بنے۔ تو حرص کا جذبہ برا نہیں ہے۔ اس کا مصرف ہم نے غلط تجویز کر رکھا ہے۔ حرص ہمیں وہاں کرنی چاہئے جہاں نعمت کی کہیں انتہاء نہ ہو۔ وہ اللہ کے علوم وکمالات ہیں کہ ان کی کہیں انتہا نہیں۔ یعنی ایک عالم دوسرے عالم کو دیکھ کر حرص کرے کہ کہ اسے سو مسئلے معلوم ہیں میں ڈیڑھ سو کیوں نہ معلوم کروں؟ اور یہ دو سو جانتا ہے میں اڑھائی سو کیوں نہ معلوم کروں، اس میں حرص کرے۔

اس لئے دونوں اگر حرص کریں گے کہ اسے ڈیڑھ سو معلوم ہوئے اسے عار آئی کہ یہ مجھ سے بڑھ گیا میں تین سو معلوم کروں گا پھر اسے عار پیدا ہوئی تو یہ کہے گا میں چار سو معلوم کرتا ہوں۔ ساری عمر یہ بڑھتے رہیں وہاں کمی نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ علم کی کوئی انتہاء نہیں اگر ساری دنیا مل کر حرص کرنے لگے کہ ہمیں علم حاصل ہو۔ جب بھی علم میں کمی نہیں آئی گی۔ تو حرص ایسے موقع پر کرے جہاں کمی نہ ہو۔ حرص جیسی نعمت کو چھوٹی چیزوں میں گنوا دیا جائے، اسے پسند نہیں کیا گیا۔ یہاں تو ضرورت پوری کرو اور حرص کے جذبے کو آخرت، عمل اور معرفت کے ساتھ لگا دو تاکہ کہیں بھی تم نہ رک سکو۔ ان اہل اللہ نے دانش مندی سے کام لیا کہ اپنے اس حرص کے جذبے کو نیکی اور اجر کمانے کے اندر لگایا کہ جیسے ہماری حرص کی حد نہیں نیکی کی بھی حد نہیں ہم نے حرص کو ان چیزوں کے اندر لگا دیا جو

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶۔

چند دن کے بعد ختم ہو جانے والی ہیں اور حرص آگے تک چلے گی، تو اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور آخرت میں پیٹ بھر سکتا ہے اس لئے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑ نا نہیں چاہتے۔ تو ہمارے حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ، مسجد کے دو راستے ہوتے تو طویل راستے کو اختیار کرتے۔ مختصر راستے کو اختیار نہ کرتے اور طویل راستے میں بھی قدم کثیر رکھتے تا کہ قدم بڑھ جائیں۔ یہ وہی حرص تھی کہ جتنی نیکیاں کما سکیں۔

نبوّت ضعفاء کو بلند کرتی ہے...... بہر حال ایک ملوکیت اور ایک نبوّت ہے۔ ملوکیت دولت اور اقتدار کی مالک ہوتی ہے مادی چیزیں قبضے میں ہوتی ہیں اور نبوّت روحانی نعمتوں، علم، معرفت، کمالات خداوندی اور قرب الٰہی وغیرہ کی مالک ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے مزاج میں رافت نرمی، محبت اور ترس کھانا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ غالب ہوں گے اتنا زیادہ رحم وکرم ان میں اور بڑھتا رہے گا اور مادی اقتدار کے اندر قصہ برعکس ہوتا ہے۔ چونکہ اقتدار محدود ہے خواہ بادشاہ کا ہو، اسے ڈر ہوتا ہے کہ دوسرا نہ چھین لے۔ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تو وہ شک کے اوپر بھی دوسروں کی راہیں بند کرنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ کہیں آنے نہ پائیں کہ میرے اقتدار میں کمی آجائے۔

تو نبوت اور ملوکیت میں یہی فرق ہے کہ ملوکیت تعدی اور زیادتی کی طرف چلتی ہے اور نبوت رحمدلی اور مہربانی کی طرف چلتی ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی برسر اقتدار سامنے آئے اس کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کمزور ہو اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ابھرنے نہ پائے اور انبیاء علیہم السلام کمزور کو ابھارتے ہیں، جو زور آور ہو اسے اعتدال پر رکھتے ہیں، اسی واسطے جو زیادہ ضعیف ہوگا اس پر انبیاء علیہم السلام کا لطف وکرم زیادہ مبذول ہوگا۔

دنیا کی اقوام نے عورت کی تذلیل کی اور اسلام نے اسے مقام بخشا...... مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ عورت بہت زیادہ کمزور صنف ہے۔ مرد کو اللہ پاک نے قوت بخشی ہے، عورت میں وہ قوت نہیں ہے۔ نہ معنوی قوت اتنی ہے نہ ظاہری۔ بدن کے اعتبار سے بھی عورت بنسبت مرد کے کمزور ہے اور اندرونی قوتوں عقل و فراست دونوں کے لحاظ سے بھی مرد سے کمزور ہے۔ تو یہ ایک ناتواں اور ضعیف صنف ہے، اسلام نے اس کو اتنا ابھارا، اتنا سہارا دیا کہ اسے احساس نہ پیدا ہو کہ میں کمزور ہوں۔ شروع سے ابھارنا شروع کیا۔ عورت پر تین ہی حالتیں گزرتی ہیں۔ ایک اس کا بچپن ہے جب وہ اولاد کے درجے میں ہوتی ہے۔ ماں باپ سرپرست ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ جوانی کا ہے جب اس کا نکاح ہو جاتا ہے تو خاوند کے ماتحت آجاتی ہے۔ اور تیسری حالت یہ ہے کہ اس کی اپنی اولاد سامنے ہو۔ تو ایک خود بیٹی ہے اور ایک بیٹوں کی ماں بن جائے اور ایک خاوند کی بیوی بنے۔ ان تینوں حالتوں کے اندر اسلام نے اسے ابھارا ہے۔

جب وہ خود بیٹی ہو، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لڑکے تمہارے حق میں نعمتیں ہیں، ان پر شکر کرو اور لڑکیوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تمہاری نیکیاں ہیں۔ گویا نعمت کے اوپر شکر واجب ہے، کفران نعمت کرو گے سزا ملے گی اور لڑکی کو کہا گیا کہ یہ باپ کی حسنات میں داخل ہے۔ نیکیاں جنت میں پہنچاتی ہیں تو یہ تمہیں جنت میں پہنچانے کا

ذریعہ بنیں گی۔اس لئے لڑکی کے اوپر محبت وشفقت زیادہ مبذول کی گئی تا کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں پر ماں باپ زیادہ شفقت کریں۔اندازہ کیجئے لڑکوں کونعمت اورلڑکیوں کو نیکی کہا گیا۔تو جیسے ہر نیکی پر توقع ہوتی ہے کہ اجر ملے گا تو لڑکی کے ہونے پر اجر ملے گا۔لڑکے اگر دس بھی ہو جائیں اس پر اجر کا کوئی سوال نہیں۔شکر کرو گے تو ٹھیک ہے۔ نہیں کرو گے تو گردن نپے گی اور لڑکی اگر ہوگئی، آدمی شکر کرے نہ کرے لیکن خود اس کا ہو جانا ایک مستقل نیکی ہے۔ نامہ اعمال میں اجر لکھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اولاد میں گویا ماں باپ کے اوپر اس درجے میں احسان ہے کہ انکے نامہ اعمال کو اس نے نیکیوں سے بھر دیا اور شریعت کا منشاء یہ ہے کہ شفقت ورحمت لڑکی کے اوپر زیادہ مبذول ہونی چاہئے غرض جب وہ بیٹی ہے تو شریعت نے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور جب وہ منکوحہ ہو کر خاوند کے تحت آئی، پھر شریعت نے یہ بتلایا کہ "اِنَّ اَکْـرَمَ الْـمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَـنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَهْلًا" تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم ،مسلمان وہ ہے کہ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت کرے، سخت دلی کا برتاؤ نہ کرے، تنگی اور سختی سے پیش نہ آئے۔اگر ان سے کوئی زیادتی بھی ہو تو صبر وتحمل سے کام لے۔تو جب بیوی ہونے کی حالت ہے تو خاوند کو متوجہ کیا کہ یہ تیری سب سے زیادہ شفقت ومحبت کی مستحق ہے اور اس کی اپنی اولاد ہو جائے، یعنی ماں بنے تو حدیث میں فرمایا گیا کہ اولاد کے لئے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔جتنی ماں کی اطاعت کرے گا، جنت اس کے قریب ہوگی۔جتنی ماں کی نافرمانی کرے گا، اتنی جنت بعید ہوگی، اللہ کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے سر پر حق تعالیٰ کی رحمت مبذول ہوتی ہے کہ اگر اولاد ماں کے قریب ہو جائے تو رحمت قریب ہو جاتی ہے۔

اور یہ کیسے لطف کے ساتھ فرمایا، یوں بھی فرما دیتے کہ عورت (ماں) کے ہاتھ کے نیچے یا نگاہوں کے نیچے جنت ہے، یہ نہیں فرمایا۔فرمایا قدموں کے نیچے جنت ہے۔گویا مطلب یہ ہے کہ قدم سب سے زیادہ کم درجے کی چیز ہوتی ہے۔انسان کے بدن میں سب سے زیادہ کم رتبہ قدم ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ بارتبہ سر ہوتا ہے۔ اولاد کو یہ تنبیہ کی گئی کہ تیرے حق میں اس کے قدم بھی بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔اگر تو ان قدموں کے اوپر ہاتھ رکھے گا تو جنت کو اس کے قدموں میں پائے گا۔گویا انتہاء درجے کی تکریم کی۔

عورت اقوام دنیا کی نظر میں......اور یہ اس لئے کہ دنیا کی اقوام نے عورت کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسلام سے پہلے ایک زمانہ تھا جب کہ یہود کا غلبہ تھا۔اب یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے مذہب کی چیز تھی یا نہیں تھی۔غالب گمان یہ ہے کہ مذہب کی چیز نہیں تھی، قومی قانون بنایا گیا تھا اس قومیت کے قانون کے تحت یہ چیز تھی اور یونانیوں میں سب سے زیادہ تھی۔وہ یہ کہ عورت پر ماں باپ کو اتنا استحقاق حاصل ہے کہ اسے چاہے باپ قتل کردے، چاہے اسے زندہ دفن کردے حتیٰ کہ مشرکین مکہ میں بھی یہ رسم رائج تھی کہ عورت کو زندہ دفن کرتے۔گویا اس زمانے کے قانون نے انہیں یہ حق دیا تھا کہ اگر لڑکی کا گلا گھونٹ کر یا زندہ کو قبر میں ڈال دو، کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں،

کوئی عدالت انہیں سزا نہ دے سکتی تھی۔ یونانیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ خاوند جب کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا تو عورت باندی سے بھی کم رتبہ ہوتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور نافرمانی پر اسے حق تھا کہ عورت کی گردن مار دے اور قتل کر دے۔ انتہا سے زیادہ سزا تھی۔ یہاں تک کہ اگر عورت سے کوئی برائی ثابت ہو جائے تو گھوڑے کی ٹانگ میں رسی باندھ کر رسی کا ایک سرا عورت کی گردن میں باندھا جاتا تھا اور خاوند گھوڑے پر بیٹھ کر اسے دوڑاتا تھا اور وہ بیچاری گھسٹتی جارہی ہے لہولہان ہو رہی ہے۔ عورت سے یہ سلوک کر رکھا تھا۔ اسلام نے آ کر عورت کا رتبہ بلند کیا۔

اور یہ تو وہ زمانہ تھا جس کو جہالت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ آج تمدن کا زمانہ ہے ابھی تقریباً دس پندرہ سال کا عرصہ ہوا ہے اخبارات میں خبر چھپی تھی کہ یورپ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی کہ اس پر غور کیا جائے کہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ عورت کی حیثیت و پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟۔ مختلف ممالک کے نمائندے جمع ہوئے جنہوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف رائیں ہوئیں بعض ملکوں کے نمائندوں نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ عورت انسانیت میں ہی داخل نہیں ہے انسان نام فقط مرد کا ہے، عورت کا نام نہیں ہے۔ یہ کوئی اور جنس ہے جو مرد کے رحم وکرم پر ہے۔ یہ ایک ملک والوں نے رائے دی پھر آراء میں اختلاف ہوتا رہا، بالآخر اس پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ عورت مرد کی تفریح کا ایک آلہ ہے، کھلونا ہے کہ مرد اس سے تفریح کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص پوزیشن عورت کی نہیں ہے اس تفریح کی وجہ سے قدر کرتے ہیں، عورت کے مرتبے کی وجہ سے قدر نہیں کرتے۔ چونکہ اپنی غرض متعلق ہے اس واسطے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، آلۂ تفریح ہے اس لئے اس کو سجاتے ہیں۔ جیسے لڑکیاں جب گڑیوں سے کھیلتی ہیں تو دلہن کو بڑے اچھے اچھے کپڑے پہناتی ہیں، اس کو زیور بھی پہناتی ہیں اور بعض بے وقوف جب ان کی آپس میں شادیاں کراتی ہیں تو دس دس روپے کا جہیز بھی اسے دیتی ہیں۔

یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ انکے دل میں گڑیا کی کوئی وقعت ہے۔ وہ تو ایک کھلونا ہے اپنی تفریح طبع کے لئے اس گڑیا کو لباس پہنا کے سجا دیتے ہیں، چونکہ عورت بھی تفریح کا آلہ ہے، اس لئے اس کو سجا دیا۔ زیور پہنا دیا ورنہ اس کا کوئی خاص حق نہیں ہے۔

خاوند بیوی بلحاظ حقوق مساوی ہیں...... لیکن اسلام نے آ کران کے برخلاف عورتوں کو حقوق دیئے اور فرمایا ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ① جو عورت پر خاوند کے حقوق واجب ہیں وہی خاوند پر عورت کے حقوق واجب ہیں وہ حقوق میں کمی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ عورت کرے گی، اسے سزا دی جائے گی۔

تو زوجین میں نکاح کے بعد ازدواجی زندگی میں دونوں کا رتبہ حقوق کے لحاظ سے برابر قرار دیا۔ یہ الگ چیز ہے کہ عورت کی عقل میں چونکہ نقصان یا کمزوری ہے اس واسطے اس کو زیر تربیت رکھا، تو یہ منصب کی بات ہے لیکن

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸.

حقوق کے درجے میں دونوں کو برابر قرار دیا کہ عورت کے اوپر مرد کے حقوق ہیں تو عورت کے بھی ہیں۔

اگر عورت نافرمانی کرے تو مرد کو طلاق کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر مرد زیادتی کرے تو عورت کو خلع کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہو تو وہ عدالت میں قاضی کے ہاں درخواست دے سکتی ہے کہ میں خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتی۔ نان ونفقہ خاوند پر واجب ہے، وہ ادا نہیں کرتا۔ حکومت اس کے اوپر جبر کرے گی اور اگر بالکل علیحدہ ہونا چاہے تو علیحدہ بھی ہوسکتی ہے جس کو خلع کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ قاضی کے ہاں درخواست کرے گی قاضی خاوند کو بلا کر اس سے مؤاخذہ کرے گا، کیوں نہیں تم نے حقوق ادا کئے۔ اگر اس نے جواب کچھ معقول دیا فبھا۔ ورنہ قاضی کہے گا نکاح فسخ کردے۔ یہ تیرے پاس نہیں رہنا چاہتی۔ اگر فسخ نہیں کرے گا تو قاضی عورت کو طلاق دیدے گا اور طلاق واقع ہوجائے گی تو اس خلع کا مالک عورت کو بنایا گیا ہے۔ غرض اگر ایک طرف طلاق کی ملکیت مرد کے لئے رکھی تو خلع کی ملکیت عورت کے لئے رکھی۔ وہ مجبور ہو کر جدا ہونا چاہے، ہوسکتا ہے یہ چاہے یہ بھی ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ حقوق کے درجے میں مساوی قرار دیا۔

بعض چیزیں عورت اخلاقاً انجام دیتی ہے اور بعض چیزیں مرد بھی اخلاقاً انجام دیتا ہے لیکن عورت کے لئے واجب نہیں ہے جیسے مثلاً دودھ پلانا ہے عورت کے ذمے واجب نہیں ہے۔ مرد سے کہہ سکتی ہے کہ تو خرچ کر کے دودھ پلوا، میں دودھ نہیں پلاسکتی۔ عورت اولاد کے کپڑے سیتی ہے لیکن اگر وہ خاوند سے کہے کہ درزی سے سلواؤ میرے ذمے واجب نہیں ہے تو خاوند ہرگز مجبور نہیں کرسکتا۔ بہرحال شریعت اسلام میں اس قسم کی چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر اس کے حقوق ہیں تو اس کے بھی حقوق ہیں۔ یہ اسلام ہی نے اس کو ابھارا۔ تنگ دست اور نازک صنف کو ابھارا، جس کو دنیا کی اقوام نے پامال کردیا تھا۔

غرض جاہل اقوام نے اس پر یہ حقوق جتلائے کہ اس کی گردن مار سکتے تھے، اس کو ایذائیں پہنچا سکتے تھے اور متمدن اقوام یہاں تک پہنچیں کہ وہ تفریح کا ایک کھلونا ہے اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام نے کہا کہ کھلونا نہیں، بلکہ خانگی زندگی میں برابر کی حقدار ہے، جس طرح کہ خاوند کے انتقال کے بعد اس کی اولاد وارث ہوگی، دوسرے اس کے وارث ہوں گے، عورت کو وراثت پہنچے گی۔ جس طرح سے عورت کے انتقال کے بعد خاوند کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ عورت کو بھی خاوند کا وارث قرار دیا گیا۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (1) جتنے عورتوں پر خاوندوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اتنا ہی خاوندوں کے اوپر بھی عورتوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ برابری اس حد تک رکھی گئی ہے کہ عورت کوئی باندی اور مملوک نہیں بلکہ شریک زندگی اور شریک حیات ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ کمزوروں کو ابھارتا ہے، دبتے کو دباتا نہیں

(1) پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸۔

بلکہ دبے ہوئے کو اونچا کرنا چاہتا ہے، کمزوروں کو دباتا نہیں بلکہ اونچا بنانا چاہتا ہے، سب سے زیادہ کمزور صنف عورت تھی۔ اسلام نے اس کے اوپر انتہائی رحم وکرم کیا کہ جب وہ بیٹی ہونے کی حالت میں ہے تو ماں باپ کی نیکیوں میں شمار کیا جارہا ہے۔ جب وہ منکوحہ بنی، تو خاوند سے کہا گیا تو قابلِ تکریم تب بنے گا جب عورت کے ساتھ نرمی اور مدارات کا برتاؤ کرے، جب وہ ماں بن گئی تو اولاد سے کہا جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر قدم پر ہاتھ رکھے گا جنت کو قریب پائے گا، اگر تو نے ماں کو ستایا تو جنت قریب نہیں ہوگی، آخرت میں نجات نہیں ہوگی یعنی باپ سے زیادہ ماں کا حق قائم کر دیا۔ باپ کے بھی اولاد کے اوپر حقوق ہیں لیکن ماں کے حقوق اس سے زیادہ ہیں۔

ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں...... اور اس کی وجہ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمائی کہ عورت جتنی مصیبت اولاد کی پرورش میں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا۔ باپ زیادہ سے زیادہ کماتا ہے میں کہتا ہوں اگر وہ شادی نہ کرتا جب بھی کماتا، اپنے لئے کماتا، دوسروں کے لئے کماتا۔ تو کمانا اس کی طبعی بات ہے وہ ہر صورت سے کماتا گویا وہ محنت محض بیوی کے لئے نہیں ہوتی، وہ اپنے نفس کے لئے بھی ہوتی ہے، اپنے عزیزوں کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن عورت اولاد کے لئے جو محنت گوارا کرتی ہے وہ خاوند نہیں کرسکتا۔ نو مہینے تو پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے جس کو فرمایا گیا ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ ①

اور فرمایا گیا ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ﴾ ②

تھک تھک کر، عاجز آکر نو مہینے اس کو پیٹ میں اٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر ایک بوجھ ہے مگر برداشت کر رہی ہے۔ پھر اس کے بعد وضع حمل، تو اس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ ''جننا اور مرنا برابر ہوتا ہے'' گویا اس کی زندگی کے لالے ہوتے ہیں۔ باقی اللہ بچاوے تو بچاوے، ورنہ موتیں واقع ہوجاتی ہیں۔ تو نو مہینے وہ مصیبت اٹھائی اور جننے کی ایک مستقل مصیبت اٹھائی، پھر اس کے بعد دو برس اس کو اپنا خون چسانا، دودھ پلانا، یہ اپنے بدن کے اجزا اس کو پہنچانا یہ خاوند نہیں کرسکتا، بیوی کرتی ہے، یہ ماں کرتی ہے، باپ نہیں کرسکتا۔

پھر اگر بچے کو ضد چڑھ گئی کہ میں تو گود میں چڑھ کر سوؤں گا۔ عورت کو ساری ساری رات گزر جاتی ہے کہ گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ بچہ اگر بیمار ہے تو ماں اس سے پہلے بیمار ہوجاتی ہے۔ اس کو الگ دکھ ہوتا ہے۔ غرض باپ کی مجال نہیں ہے کہ یہ محنت برداشت کرے، وہ تو مجنوں ہو کے نکل جائے۔

عورت میں جذبۂ خدمت...... اور کہیں ایسا ہو کہ عورت یوں کہے کہ سال یا مہینہ بھر کے لئے خدمت کا تبادلہ کرلیں۔ میں تیری خدمت انجام دوں اور تو بیٹھ کے بال بچے پال، تو ممکن نہیں دو دن میں اسے جنون ہو جائے گا اور پریشان ہو کے نکل جائے گا یہ عورت ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس محنت کو برداشت کرتی ہے مرد برداشت نہیں کرسکتا۔

وہ ہمارے ہاں ایک کاشتکار کا قصہ مشہور ہے اور قصہ واقعی ہے، فرضی نہیں ہے کہ وہ کاشتکار اپنے کھیت پر گیا۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۱۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۴۔

وہاں جا کے کھیت کیاری کے کام میں لگ گیا۔ تو طریقہ یہ تھا کہ اس کی عورت ٹھیک بارہ بجے کھانا پکا کے لایا کرتی تھی ایک دن اتفاق سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر ہوگئی۔ کاشتکار آئے جائے تو کہاں؟ اسے غصہ چڑھا اس نے سینکڑوں صلواتیں بیوی کو سنائیں کہ تجھ سے کام نہیں ہوتا اور تو سست ہوگئی ہے اور کم بخت تجھ سے کچھ نہیں نبھتا اور میں ہوتا تو یوں کرتا اور تو ایسی ہے تو ویسی ہے بیچاری سنتی رہی یعنی صبح سے شام تک لڑکھپ کے بچوں کو الگ پالا، کھانا الگ پکایا، کھیت پر لے کر بھی گئی، اتفاق سے اگر ذرا دیر ہوگئی تو خاوند نے سینکڑوں صلواتیں سنائیں خیر وہ غریب سنتی رہی۔ خاوند کی زبان سے نکلا کہ اگر میں اس کام میں ہوتا تو کبھی یہ بات نہ ہوتی۔ اس نے کہا اچھا پھر دو چار دن کے لئے خدمتوں کا تبادلہ کرلو۔ میں کھیت پر کام کروں گی تو گھر پر رہ بچوں کو پال اور بارہ بجے کھانا لیکر آجایا کرنا۔ اس نے کہا یہ کونسی بڑی بات ہے میں کرلوں گا۔ اس نے کہا اچھا کل سے پھر یہی ہوگا۔

چنانچہ صبح کو اٹھتے ہی بیوی تو کھیت پر چلی آئی اور کھیتی کا کام شروع کر دیا۔ اب یہ خاوند صاحب گھر لیٹے رہے آنکھ کھلی تو ایک بچہ رو دیا، یہ اسے سنبھالنے کے لئے گئے تو ادھر سے دوسرا چلایا، اسے پکڑنے کے لئے گئے تو تیسرا رویا، ابھی اس سے نہیں نمٹے کہ معلوم ہوا، وہ گھر میں گائے بندھ رہی تھی اس کا بچھڑا رسہ چھڑا کر گائے کے دودھ پر جا کے لگ گیا، اسی پر گذر اوقات تھی۔ یہ جلدی سے بچھڑے کو سنبھالنے گیا، تو بچہ چارپائی سے نیچے گر پڑا، اب وہ چلا رہا ہے، شور مچا رہا ہے، یہ وہاں پہنچے بچھڑا جو وہاں پہنچا اور اس نے دودھ لیا تو گائے گھبرا کے بھاگی اور اس کی رسی چارپائی میں اٹک گئی تو وہ چارپائی سمیت چولھے پر چڑھ گئی۔ تو اب چارپائی چولھے کے اوپر رکھی ہوئی ہے، بچہ وہاں پڑا ہوا ہے اور ایک بچہ ادھر چلا رہا ہے، اب اسے پریشانی ہے کہ بچوں کو سنبھالوں یا بچھڑے کو سنبھالوں یا کھانا پکاؤں یا دودھ نکالوں، کھڑا ہوا مجنوں کی طرح ہر طرف دیکھ رہا ہے، یہاں تک کہ دس گیارہ بج گئے، وہ بیچاری کھیت کے اوپر محنت کر رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ آج بارہ چھوڑ ساڑھے گیارہ بجے کھانا آجائے گا۔ اس لئے کہ مرد بہت قوی ہے، خوب کام انجام دے گا۔ جب بارہ چھوڑ ایک بج گیا اور کوئی نہ آیا۔ اس نے کہا کیا قصہ پیش آگیا؟ وہ آئی۔ تو آ کے دیکھا کہ ایک بچہ ادھر پڑا رو رہا ہے، ایک ادھر رو رہا ہے اور چارپائی چولھے کے اوپر ٹنگ رہی ہے اور گائے چولھے پر چڑھ رہی، اور بچھڑا پڑا ہوا ہے، نہ کھانا، نہ دودھ، نہ چارپائی، نہ اپنے بچے، گھر میں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں اور خاوند صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ خاوند نے کہا بس کچھ نہیں۔ یہ تیرا ہی کام ہے میرے بس کا کچھ نہیں۔ پھر اس نے کھیتی کا کام شروع کیا اور عورت نے گھر کو سنبھالا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عورت کا بڑا حوصلہ ہے کہ گھر میں بچوں کو سنبھالنا، کھانا پکانا، گھر کا انتظام کرنا اور خاوند کے سارے معمولات اور خدمات کو انجام دینا۔ اگر خاوند کو چار خدمتیں سپرد کر دی جائیں، دیوانہ ہو جائے۔ یہ عورت ہی کر سکتی ہے۔ چونکہ یہ چیز تھی اس واسطے شریعت اسلام نے اس کا رتبہ بلند کیا۔ باپ سے زیادہ اس کے حقوق بڑھائے۔ مرد منصب کے لحاظ سے کتنا ہی بلند سہی، لیکن حقوق کے لحاظ سے اتنا بلند نہیں ہے جتنے شریعت نے عورت کے حقوق قائم کئے ہیں۔

تو شریعت کا یہ خاص اصول ہے کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ ① جو زمین میں ضعیف اور کمزور ہیں ہم ان کو ابھاریں گے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ ان کو بلند و بالا کیا جائے، تو عورت ضعیف، نازک تھی اس لئے اس کو ابھارا۔

یتیم پر شفقت کے لئے ساری امت کو متوجہ کیا گیا...... اسی طرح یتیم بیچارہ ضعیف ہوتا ہے۔ ماں باپ اس کے گزر گئے لاوارث رہ گیا، کوئی پالنے والا نہیں ہے اس پر شفقت کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے، اگر کوئی شخص یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: ''اَنَا وَکَافِلُ الْیَتِیْمِ کَهَاتَیْنِ.'' ② میں اور یتیم کی خدمت کرنے والا جنت میں بالکل اس طرح برابر ہوں گے میں ذرا آگے نکل جاؤں گا۔ وہ کچھ پیچھے رہے گا۔ مگر اس کے رتبے کی معیت وہی ہوگی جو جنت میں مجھے دی جائے گی۔ اور پہلے یتیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ سے زیادہ یتیموں کا والی اور وارث کون ہوسکتا ہے؟ اور آپ سے زیادہ یتیموں کو سہارا دینے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس واسطے احادیث یتیموں کی خدمت کے فضائل سے بھری پڑی ہیں۔

روح اس کے اندر یہی ہے کہ یتیم کمزور تھا، ماں باپ گزر گئے تھے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ عزیز اقرباء بھی ہوتے ہیں، لیکن جب تک خود اپنی غرض متعلق نہ ہو خلوص سے خدمت کرنے والے دنیا میں گنے چنے ہوتے ہیں، عام طور سے نہیں ہوتے اس واسطے پوری امت کو متوجہ کیا ہے کہ یتیم کا باپ گزر گیا تو ساری امت بمنزلہ باپ کے ہے۔ ہر انسان اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی خدمت کی طرف توجہ کرے۔ تو عورت کمزور تھی اس کی طرف توجہ فرمائی، یتیم کمزور تھا اس کی طرف توجہ فرمائی۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم...... اگر آپ کا کوئی زرخرید غلام ہے وہ بیچارہ کمزور ہے۔ آپ کو آقا سمجھتا ہے تو اس کے لئے شریعت نے فرمایا، اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ ③ وہ غلام جن کو تم نے خریدا ہے وہ بمنزلہ تمہارے بھائی کے ہیں۔ جو خود کھاتے ہو وہ انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ، جو اپنی اولاد کو تعلیم دیتے ہو، وہ انہیں تعلیم دو۔ یعنی برابری کا رتبہ رکھو۔ پھر اس کی اتنی عزت بڑھائی کہ اگر آقا اور غلام مسجد میں آئیں تو یہ فرق نہیں ہوسکتا کہ غلام پچھلی صف میں آئے اور آقا اگلی صف میں آئے، وہ دوش بدوش برابر کھڑا ہوگا۔ آقا کو کوئی حق نہیں ہے کہ اسے پیچھے ہٹادے۔ شریعت نے مساوات قائم کی۔ تو ادھر فرمایا ''اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ'' ④

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب البر، باب الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم، ج: ۴ ص: ۲۲۸۷ رقم: ۲۹۸۳.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاهلیة ولایکفر صاحبها، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاهلیة ولایکفر صاحبها، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

تمہارے برابر کے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ، ان کو تعلیم اور تادیب کرو، حسن سلوک سے ان سے پیش آؤ۔

پھر غلام کو آزاد کرنے کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کر دیا فرمایا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک حج مع عمرے کے انجام دیا۔ جو اس کا اجر ہوتا ہے، وہ ایک غلام کو آزاد کرنے میں اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شروع زمانے میں جہاد جتنا زیادہ تھا، غلام زیادہ آتے تھے، ان کو آزاد کرنے کا اتنا دستور تھا کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں غلام آزاد ہوتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے، پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شروع زمانہ اسلام میں بڑے بڑے اکابر علماء جن سے دین اور علم پھیلا، زیادہ تر غلام ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس کوئی زیادہ اسباب معیشت اور دولت نہیں ہوتی تھی، گھر بار نہیں ہوتا تھا کہ اس میں لگیں۔ وہ خالص دین اور علم کی طرف متوجہ ہو جاتے، اس لئے جتنا وہ علم سیکھتے تھے گھر بار والے اتنا نہیں سیکھتے تھے۔ انہیں کچھ دولت کا، کچھ گھر کا شغل بھی ہوتا۔ انہیں فقط علم سیکھنے کا شوق اور شغل ہوتا تھا۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دیہات کے رہنے والے اور غلام تھے۔ لیکن آج وہ سارے مسلمانوں کے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباحؒ کے بارے میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "مَارَاَیْتُ اَحْسَنَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ" (1) میں نے اپنے زمانے میں عطاء ابن ابی رباح سے زیادہ فضیلت والا کوئی شخص نہیں دیکھا، تو جس کے علم کی امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعریف کریں۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے علم کیا رتبہ ہوگا؟ یہ بھی غلام ہیں۔ تو اتنے بڑے ہیں کہ آج مسلمانوں کے مقتداء ہیں اور اپنی ذات سے دیکھیں تو وہ غلام ہیں۔

صوفیاء اور علماء میں غلام بڑے بڑے اکابر ہوئے اور بڑی تعداد میں ہوئے۔ یہ شریعت اسلام کی اس ہدایت کا اثر ہے کہ اس نے کمزور دیکھ کر پوری امت کو متوجہ کر دیا، ہر آقا کو متوجہ کیا کہ اپنے غلام کو حقیر مت سمجھنا۔

اسلام سے قبل غلاموں سے بدسلوکی...... یہ اس لئے ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کے لئے غلامی ایک بدترین عذاب تھا آقا کو غلام پر حق حاصل تھا کہ اسے قتل کر دے، اس کو ذبح کر دے، اس کو دردناک سزائیں دے، کوئی قانون اس پر گرفت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک لوگ کرتے تھے کہ تاریخوں میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ کس طرح ان کے دل برداشت کرتے تھے، غلام سے ذرا سی کوتاہی ہوئی شکنجے بنوائے ہوئے ہوتے جس میں اِدھر اُدھر برچھے

(1) لم اجدهذه الروايةبهذا السياق ولكن اخرج الإمام الترمذى والبيهقى وابن حبان والعلامة ابن بطةوالفاكهى وابن الجعد والزيلعي والعينى وابن عبدالبرواللفظ للترمذى:حيث قال: حدثنامحمودبن غيلان ،حدثناابويحيىٰ الحمانى سمعت اباحنيفة رحمه اللّٰه تعالىٰ يقول مارايت احدا اكذب من جابرالجعفى ولاافضل من عطاء ابن ابى رباح ،السنن للترمذى ج:١٢ ص:٤٩٢ .اللهم الان الراقم قد تساهل فى نقل الرواية الصحيحة بهذه الالفاظ حيث ذكر"احسن "بدل قوله افضل. واللّٰه اعلم.

لگے ہوتے تھے بیچ میں غلام کو رکھ کے اس کو ملا دیتے تھے۔ اُدھر اُدھر سے برچھا آر پار ہو جاتا تھا اور ہنس رہے ہیں۔

تالابوں کے اندر سانپ چھوڑے ہوئے ہیں، غلام سے ذراسی کوتاہی ہوئی لات مار کے دھکیل دیا۔ سانپ لپٹ گئے اور آقا کی تفریح ہورہی ہے۔ بھڑیئے جمع کئے گئے اور اس غلام پہ چھوڑ دیئے گئے، جو سزا کا مستحق تھا، بھیڑیئے اس کو جھپٹ رہے ہیں پھاڑ کھا رہے ہیں اور آقا تفریح کر رہے ہیں۔ غلام کی یہ کیفیت تھی۔

اسلام نے غلامی کو ختم کیوں نہ کردیا؟...... اسلام نے آکر غلامی کو تو نہیں مٹایا کہ یہ فطری سی چیز ہے۔ سیاسی طور پر جب کسی قوم پر غلبہ ہو اور وہ قوم حربی بنے اور مقابلہ پر آئے تو سیاسی آزادی چھینی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم مفتوح قوم سے سیاسی آزادی چھین لیتی ہے۔ ان سے بھی چھینی جاتی تھی۔ یہی معنی غلامی کے ہیں۔ دینی آزادی نہیں چھینی جاتی تھی۔ غلام مسجد میں آسکتا ہے، تلاوت بھی کرسکتا ہے، آقا کے برابر عبادات کرسکتا ہے۔ سیاسی حقوق نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی تھی تو سیاسی آزادی چھن گئی اور سارے حقوق باقی رکھے گئے، تو پچھلی اقوام غلام پر اتنا حق رکھتی تھیں کہ انتہائی دردناک سزائیں دیتیں۔ اسلام نے وہ سب سزائیں مٹادیں۔ آزاد کرنے کے فضائل بیان کئے جس سے ہزاروں غلام روز آزاد ہوتے تھے تعلیم دینے کی فضیلت بیان کی جس سے ہزاروں غلام بڑے بڑے علما اور فضلاء بن گئے۔ تو ضعفاء کے اوپر اسلام نے رحم کھایا۔ اس لئے عورت، یتیم اور غلام پر رحم کیا۔ جو مظلوم اور بے کس ہو اس کے لئے پوری امت کو فرمایا گیا کہ پوری امت کا حق ہے کہ اس کے ظلم کو دفع کرے اور اس کی مدد کرے۔

جانوروں پر رحم کرنے کا حکم...... حتیٰ کہ جانور جو زیادہ کمزور ہوتا ہے، اس پر اور زیادہ رحم و کرم بتلایا گیا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو آپ نے جنت میں دیکھا۔ ساری عمر بدکاری کی اور دیکھا گیا جنت میں۔ وجہ کیا پیش آئی؟

فرمایا: ایک کتا پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا، زبان پر کانٹے پڑے ہوئے تھے، عرب کی گرمی کی خشکی کی وجہ سے زبان باہر نکلی ہوئی وہ فاحشہ عورت آئی اس کو رحم آیا کہ ایک بے زبان جانور مر رہا ہے کنویں پر نہ ڈول تھا نہ رسی تھی۔ اس نے اپنے پیروں سے چمڑے کا موزہ نکالا اور اپنے دوپٹے میں اس کو باندھ کر اس میں جتنا پانی آیا وہ کتے کے منہ میں ٹپکایا جس سے اس کے دم میں دم آگیا اور اس کی جان بچ گئی۔ فرمایا اس عمل کی بدولت فاحشہ عورت جنت میں داخل کی گئی۔

اور حدیث میں ہے کہ ایک نیک اور متقی آدمی کو آپ نے جہنم میں دیکھا۔ فرمایا کہ یہ منکشف ہوا کہ وہ اس لئے جہنم میں گیا اس نے ایک بلی کو جو ستاتی تھی جیسے بعض جانور ستاتے ہیں، اس نے غصے میں آکر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور کہا کہ اسے کوئی نہ کھولے دو تین دن میں وہ سسک کر اندر مر گئی۔ فرمایا: وہ متقی جہنم میں گیا۔ اس لئے کہ اس نے جانور کے اوپر رحم نہیں کھایا۔

فرعونی طاقت پر نبی اسرائیل کے ضعفاء کو غالب کیا گیا.....غرض اسلام ہر کمزور پر رحم کھاتا ہے، انسانوں میں کوئی کمزور ہو یا جانوروں میں تو جس دین نے جانوروں تک پر رحم کھایا وہ کیسے گوارا کرے گا کہ انسان انسانوں پر ظلم کرے یا کوئی کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے۔ یہ اس نے برداشت نہیں کیا۔

اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ①

یہ قصہ فرعون کے زمانے کا ہے، موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ اس کو قرآن میں حکایت فرمار ہے ہیں کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ہم احسان کریں گے، کن پر؟ ان لوگوں پر جو زمین کے اندر کمزور ہو گئے۔ گویا یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا جا رہا ہے۔

فرعون چونکہ غالب تھا، اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا، بنی اسرائیل مغلوب تھے اور بنی اسرائیل کو فرعون نے انتہا درجے کی ذلت پر پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ انبیاء زادے تھے، نبیوں کے خاندان سے تھے۔ اہل علم وسمجھ تھے۔ لیکن چونکہ فرعون کی غلامی میں مبتلا ہو گئے، اس واسطے اس نے جتنی ذلیل خدمات تھیں، وہ نبی اسرائیل کے سپرد کر رکھی تھیں۔ مزدوریاں کرنا، کوڑا اٹھانا اور ان کے بچوں کو پالنا غرض اس قسم کی ساری ذلیل خدمات ان سے لی جاتی تھیں اور انتہائی ذلت کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انہیں نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تربیت شروع کی، تعلیم وتربیت کے ذریعے ان کے اخلاق اور کردار کو درست فرمایا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ یہ جو کمزور ہیں، جن کی تم تربیت کر رہے ہو، ان کے اخلاق درست کر رہے ہیں، ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ان پر ہم احسان کرنے والے ہیں۔ یہ ضعفاء ہیں، زمین پر کمزور ہیں، ہم ان کو قوت دینے والے ہیں۔ ﴿وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً﴾ ② انہیں زمین میں امام بنانے والے ہیں۔

﴿وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ③ اور زمین کی وارثت ان کو سپرد کرنے والے ہیں۔ زمین کی وراثت میں یہ حصہ دار بنیں گے گویا موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو تسلی دی گئی کہ اپنی کمزوری پر غم نہ کھاؤ۔ مگر ہاں شرط یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح تعلیم وتربیت دے رہے ہیں ان کا اتباع کئے جاؤ جس علم کی طرف لا رہے ہیں اس علم کی طرف آؤ۔ جن اخلاق کی طرف بلا رہے ہیں ان اخلاق کی طرف آؤ ان کی پیروی کرتے رہو۔ انکی تعلیم وتربیت کے سامنے جھکتے رہے۔ جب تمہارا اخلاق بلند ہوگا تو عنقریب ہم تم کو بلند کرنے والے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔

آگے ارشاد فرمایا ﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا

① ② ③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

یَحۡذَرُوۡنَ﴾ ① اور ہم انہیں اقتدار وتمکنت دینے والے ہیں اور فرعون وہامان اور انکے لشکر جن جن چیزوں کو سامنے رکھ کر ڈرتے تھے، اب ان کے سامنے آنے والا ہے۔ انہی چیزوں میں مبتلا کئے جانے والے ہیں جن چیزوں کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ بنی اسرائیل غلبہ نہ پالیں اور ہمیں کہیں نیچا نہ دکھادیں۔ یہ ان کے آگے آئیں گی اور تم کمزوری میں مبتلا تھے، تم ان پر غلبہ پاؤ گے۔ حق تعالیٰ نے اس زمانے کے اس واقعہ کی حکایت فرمائی اور اسلام نے اسے بطور اصول بیان کیا تو اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضعفاء کو سہارا دیا جائے، جو کمزور ہوں انکے اوپر احسان کیا جائے، جو مفلوک الحال ہوں ان کی مدد کی جائے جو غرباء، یتامی اور مساکین ہوں ان کا ہاتھ بٹایا جائے۔ جو کسی ظلم میں گرفتار ہو اور اسے ظلم سے نجات دلانا آپ کے اختیار میں ہو تو آپ پر فرض ہے کہ آپ اسے نجات دلائیں۔

بہر حال عورت، غلام، یتیم اور مظلوم ومصیبت زدہ ان سب پر رحم کیا ہے۔ تو یہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ اس امت مسلمہ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم کمزوروں پر احسان کرنا سیکھو۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین فرمائی گئی کہ آپؐ جہانوں کے لئے رحمت ہیں اور سب سے زیادہ آپ کی رحمت کمزوروں پر ظاہر ہوئی ہے، سب سے زیادہ کمزور عرب تھے، ان کو اتنا قوی کیا کہ پورے عالَم میں ان کا نظام قائم ہو گیا، ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ تو آپ کی رحمۃ للعالمینی نے کمزوروں اور ضعفاء کو سہارے دیئے مساکین کو اونچا کیا، یتیموں کو والی اور وارث بلکہ آقا بنا دیا۔ غلاموں کو ان کے آقاؤں کے اوپر غالب کر دیا۔ یہ اسلام کی تعلیم کا اثر تھا اس امت کے سامنے یہ تعلیم پیش کی گئی ہے تا کہ امت بھی اسی راستے پر چلے کمزوروں پر رحم کھائے۔ ہر قوم میں کمزور بھی ہوتے ہیں، قوی بھی ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ ناداروں کی وہ خبر گیری کریں، ضعفاء کی رعایت ومدد کریں۔

دورِ فاروقی میں غرباء کو عدل وانصاف کے ذریعہ غالب کیا گیا...... امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفۃ المسلمین بنا دیئے گئے تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کے اعلان کیا کہ آج سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے اور جو قوی ہے وہ آج سے میرے نزدیک کمزور ہے۔ یعنی میں کمزوروں کی مدد کروں گا اور اقویاء اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کے ہاتھ میں قوت ہے میں ایک ایک حق ان سے منتقل کر کے کمزوروں کو دلاؤں گا۔

چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت اس سے بھری پڑی ہے کہ عدل وانصاف سے غریبوں کو کتنا سہارا دیا۔ گویا اسلامی حکومت کا اصل مقصد تربیت خلق اللہ ہے۔ امیر المومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی تربیت کرے۔ اخلاقی طور پر ان کی نگہداشت کرے اور یہ دیکھے کہ علم اور اخلاق کے اندر کون کمزور ہے اس کو سہارا دیں۔ بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مثالیں قائم کیں۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کو نگہداشت کرنے کے لئے نکلتے کہ

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ٦۔

رات میں کون کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے حتیٰ کہ گھروں کی حالت معلوم کرتے تھے کہ اخلاقی حالت کچھ کمزور تو نہیں ہوگئی تو راتوں کو گشت کرتے تھے۔ ایک دفعہ گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے کچھ گنگنانے کی آواز آئی جیسے کوئی کچھ گا رہا ہو اور عورت کی آواز تھی۔ نوجوان لڑکی کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، اشعار بھی کچھ عاشقانہ تھے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کھٹک پیدا ہوئی کہ ایک لڑکی اور گھر میں عاشقانہ اشعار پڑھے۔

خیر وہ گھر پہ آئے دستک دی کہ کون ہے گھر کے اندر؟ وہ لڑکی امیر المومنین کی آواز پہچان گئی اور رعب کی وجہ سے سہم گئی اور دب گئی اور اتنا رعب پڑا کہ وہ جواب نہ دے سکی، اس کے جواب نہ دینے اور چپ ہو جانے کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ شبہ پیدا ہوا کہ گانے کی آواز تو بند ہوگئی، مگر جواب کوئی نہیں دیتا پھر ڈانٹ کر آواز دی کہ اس گھر کے اندر کون ہے؟ لڑکی بیچاری اور زیادہ دب گئی اور ڈر گئی۔ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دیوار پھلاند کر گھر میں داخل ہوگئے کہ دیکھوں اندر کیا بات ہے۔ معلوم ہوا کہ گھر میں ایک نوجوان لڑکی ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہے۔

فرمایا تو کون ہے؟ اور کیوں گا رہی تھی؟ اور تجھے معلوم نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کی آواز کو بھی عورت بنایا ہے۔ تو اتنی زور سے بول رہی تھی کہ باہر آواز آئے، تو نہیں سمجھتی کہ تو گنہگار ہوئی اب لڑکی نے جرات کی۔ اسے بھی بھروسہ تھا کہ فاروق اعظمؓ عادل کامل ہیں۔ جو چیز کہوں گی تو یہ نہیں ہے کہ وہ جذبات میں آ کر فیصلہ کریں وہ اس پر غور کریں گے۔ اس لڑکی نے ذرا کرخت آواز کر کے کہا: امیر المومنین! مجھے آپ طعنہ دے رہے ہیں کہ میں نے گناہ کیا۔

آپ نے اس وقت کھڑے کھڑے تین گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کے احکام کی تین خلاف ورزیاں کی ہیں۔

بس! فاروق اعظم ٹھنڈے ہوگئے، بجائے اس کے کہ کوئی غصہ آتا۔ رعایا کی ایک لڑکی اور امیر المومنین کو ڈانٹ دے تو جذبات ابھرنے چاہئے تھے۔ کوئی اشتعال پیدا ہونا چاہئے تھا، لیکن جب اس نے کہا کہ آپ نے تین گناہ کئے ہیں تو فوراً سہم گئے اور مرعوب ہوگئے۔ فرمایا بہن! میں نے کیا گناہ کئے؟

اس نے کہا کہ پہلا گناہ تو آپ کا یہ ہے کہ میں ایک اجنبی لڑکی ہوں اور اجنبی لڑکی کے ساتھ کسی مرد کو خلوت جائز نہیں ہے۔ آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے گھر میں آئے اور آ کر میرے تخلیے میں خلل ڈالے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا صاف حکم ہے کہ ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ① گھروں میں دروازوں کے ذریعے سے داخل ہو۔ آپ نے خلاف ورزی کی کہ آپ دیوار پھلاند کر گھر میں آئے آپ کو دیوار پھلاند کر آنے کا کیا حق تھا؟

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا حکم ہے۔ ﴿لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ② کسی کے گھر کے اندر اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور سلام نہ کر لو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی دوسرے کے گھر پر جاتے تو تین دفعہ سلام فرماتے

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۷۔

اور تین سلاموں کی کیا صورت ہوتی؟

ایک سلام استیذ ان یعنی اجازت لینے کا سلام، بجائے اس کے کہ دستک دیں، نام لے کر پکاریں۔ آپ دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے فرماتے ،السلام علیکم ،گھر والوں کو آواز سنائی دیتی ،وہ وعلیکم السلام کہہ کر باہر آتے، اجازت دیتے اور گھر میں بلاتے۔ پھر جب گھر میں داخل ہوتے ،تو مجلس کو سلام کرتے۔ یہ سلام تحیہ کہلاتا ہے۔ اور پھر جب واپس ہوتے، پھر سلام وداع کہتے، یہ سلام وداع کہلاتا ہے۔ تو تین سلام ہوتے ہیں۔ جو ابتدائی سلام ہے وہ سلام استیذ ان یعنی اجازت لینے کا سلام ہے۔ تو لڑکی نے کہا، قرآن نے حکم دیا تھا کہ جب تک اجازت کا سلام نہ کیا جائے، گھر میں داخل نہ ہوں۔ آپ بلا سلام استیذ ان واجازت کیسے داخل ہوگئے؟

یہ تین گناہ آپ سے سرزد ہوئے ہیں۔ لڑکی نے یہ ڈانٹ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بہن! لوجہ اللہ مجھے معاف کر، واقعی میرے سے غلطی ہوئی اس نے کہا میری خطاء آپ نے کب کی ہے جو میں آپ کو معاف کروں جس کی خطاء کی ہے، اس سے معافی چاہو، قرآن کی خلاف ورزی کی ہے۔ خدا کے سامنے توبہ استغفار کرو میرے سے معافی کا کیا مطلب؟

اب فاروق اعظمؓ بہت ہی شرمندہ اور بہت ہی منفعل وہاں سے واپس آئے۔ حالانکہ فاروق اعظمؓ امیر المومنین ہیں۔ امیر کو یا امیر کی پولیس کو شبہ پر یہ حق حاصل ہے کہ چھاپہ مار کر گھر میں داخل ہو۔ فاروق اعظم نے یہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اجازت تو لی۔ ڈانٹ کر کہا کہ کون ہے جو اندر گا رہا ہے؟ جب کوئی بولا نہیں اور انہیں شبہ ہوا، پھر داخل ہونے کا حق تھا تو خلاف ورزی انہوں نے کی یا لڑکی نے؟

امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو گنہگار کے مقام پر سمجھا کہ حقیقتاً مجھ سے غلطی ہوئی اور تمام رات جاگ کر استغفار کیا، عبادت کی اور اللہ کے سامنے روئے۔ صبح کو انشراح ہوا کہ اللہ نے میری غلطی معاف کر دی حالانکہ توبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ گنہگار تھے ہی نہیں مگر پھر بھی اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر توبہ کی۔

اب ضابطے کے مطابق آدمی بھیجا کہ اس لڑکی کو دربار خلافت میں حاضر کرو۔ لڑکی لائی گئی۔ فرمایا، بہن! اللہ تجھے جزائے خیر دے، تو نے مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کیا۔ میں نے تمام رات اللہ کے سامنے استغفار کیا اور توبہ کی اور اب مجھے انشراح ہے کہ اللہ نے میرے گناہ کو معاف کر دیا۔

تو اضعاً گناہ کہہ رہے ہیں، ورنہ گناہ نہیں تھا۔ مجھے اللہ نے معاف کر دیا اور میں تیرا احسان مند ہوں۔ لیکن اب بحیثیت امیر المومنین ہونے کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ گانا بجانا کیسا تھا اور تو یوں گا رہی تھی تجھے ایسے عاشقانہ اشعار پڑھنے کا کیا حق ہے؟

لڑکی نے کہا، امیر المومنین! اصل واقعہ یہ ہے کہ میں ایک نوجوان لڑکی ہوں اور بھر پور جوانی ہے اور ابھی

پندرہ دن میری شادی کو ہوئے تھے، میرا خاوند بھی نوجوان ہے آپ نے اسے فلاں محاذ پر فوج کیساتھ بھیج دیا۔ میں اس کے فراق میں یہ عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی اور کوئی بات نہیں تھی۔ نہ میں زانیہ ہوں نہ بدکار۔ فرمایا، بہتر تو نے سچ کہا، تیرا لہجہ بتلا رہا ہے کہ حقیقتاً بات یہی ہے۔ پھر اسے بہت اکرام کے ساتھ واپس کیا۔

ایک لڑکی کی وجہ سے پوری فوج کے لئے ضابطہ جاری کیا گیا...... ادھر لڑکی کو واپس کیا اور گھر میں آ کر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلیہ محترمہ (رضی اللہ عنہا) سے یہ پوچھا کہ اگر نوجوان لڑکی کی شادی ہو اور نوجوان ہی خاوند ہو اور دونوں میں جدائی کر دی جائے تو کتنے دن تک وہ صبر کر سکتے ہیں کہ اس کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ فرمایا، تین مہینے سے زیادہ نوجوان عورت صبر نہیں کر سکتی۔ یہ الگ چیز ہے کہ اس کا دین مضبوط ہو، اس میں حیاء ہو اور اپنے اخلاق کی وجہ سے صبر سے برسہا برس بلکہ عمر بھر گزار دے یہ عوارض کی بات ہے۔ گفتگو طبعی جذبات کے اوپر ہو رہی تھی، طبعی جذبات کے اعتبار سے فرمایا کہ اندیشہ ہوتا ہے تین ماہ کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جائے، اگر کوئی دین و دیانت مانع نہ ہو۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اب سرکاری آرڈر جاری کیا'' جن شادی شدہ جوانوں کو جنگ پر بھیجا گیا ہے۔ انہیں تین مہینے کے اندر واپس کیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے سپاہی بھیجے جائیں، تین مہینے یا تین مہینے سے زیادہ کسی نوجوان کو نہ رکھا جائے، جس کی شادی ہو چکی ہو، اور امکانی حد تک ان جوانوں کو فوج میں بھیجنے کی کوشش کی جائے، جو شادی شدہ نہ ہوں تاکہ یکسوئی کے ساتھ جہاد کر سکیں اور شادی شدہ ہوں تو انہیں تین مہینے کے اندر اندر فوراً واپس کیا جائے''

قوم کے اخلاق کی نگہداشت امیر المومنین کا فرض ہے...... گویا اخلاق کی یہ نگہداشت سرکاری طور پر تھی۔ ایک سیاسی نگہداشت ہوتی ہے وہ تو ہر بادشاہ کرتا ہے۔ ایک اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ اسلام میں امیر المومنین کا یہ فرض ہوتا ہے کہ پبلک کے اخلاق وعادات کی اصلاح کرے۔ ان کے اخلاق اور گھریلو معاملات کو دیکھے کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہو رہی۔ ان کے تقویٰ وطہارت میں کوئی فرق تو نہیں آ گیا یہ ساری ذمہ داری امیر المومنین پر عائد ہوتی تھی۔

مذہبی معاملات میں پیشوائی بھی امیر المومنین کا فرض ہے...... یہی وجہ تھی کہ امیر کا حق سمجھا گیا ہے کہ وہ امامت کرائے، نماز پڑھانا یہ امیر المومنین کا اصل کام ہے جس عہدے کو ہم بہت ہی گھٹیا اور ردی سمجھتے ہیں۔

یہاں تو خدا کا فضل ہے، یہاں کے مسلمان الحمدللہ مسجدوں کا صرف احترام ہی نہیں کرتے بلکہ مسجدوں کو اپنے گھروں سے زیادہ آراستہ کرتے ہیں۔ ائمہ مساجد کی عزت بھی ہے، تنخواہیں بھی معقول ہیں۔ لیکن ہماری طرف اس بارے میں اس قدر حال ابتر ہے کہ جو بالکل کودن، نکما اور کندۂ ناتراش ہو، اسے امام بنائیں گے، جو حد درجہ جاہل ہو، جو دنیا کا کوئی کام نہ کر سکتا، اسے امام بنائیں گے، جو اندھا، لنگڑا، لولا ہو اسے موذن بنائیں گے، جو دنیا کے کسی کام کا نہ ہو اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر کا کمین ہے جیسے نائی، حجام، ڈوم کمین ہوتے ہیں۔ یہ امام بھی

ایک کمین ہے جیسے شادیوں کے موقع پر حجاموں اور ڈوموں کو دیا جاتا ہے۔ مسجد کے امام کو بھی کچھ دیدیتے ہیں۔

حالانکہ فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا وقیع عہدہ ہے اس کو امام بنانا چاہئے جس کی محلے دار عزت وعظمت کرسکیں، اس کی عزت کرنا شریعت نے فرائض میں شامل کیا۔

اس لئے کہ وہ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے۔ یہ قائم مقام کی حیثیت سے امامت کرار ہا ہے۔ تو اصل میں یہ حق امیر المومنین کے لئے رکھا گیا ہے اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ" مثل مشہور ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ کے طریق پر چلتے ہیں۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ہوگا ویسی رعیت بنے گی، تو جب امیر المومنین پانچ وقت آکر نماز پڑھائیں گے تو رعیت کا کونسا آدمی رہ جائے گا جو مسجد میں حاضر ہوکر نماز نہ پڑھے۔

اس لئے کہ لوگ بادشاہ کی شوکت کو دیکھ کر وہی کام کرتے ہیں، جو بادشاہ کرتا ہے۔ یعنی دین تو بڑی چیز ہے اگر بادشاہ فسق وفجور میں مبتلا ہے تو رعیت میں بھی از خود وہی بات ہو جاتی ہے کہ رعیت بھی مبتلا ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک، یہ اموی خاندان کا خلیفہ تھا۔ اس کو شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ ناجائز تو نہیں کرتا تھا۔ چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھتا تھا مگر جسے جائز عیاشی کہتے ہیں کہ قانون کی آڑ رکھ کر عیاشی کرنا، وہ کرتا تھا چار بیویاں رہتی تھیں جہاں چھ ماہ گزرے ایک کو طلاق دی اس کا مہر ادا کیا، اس کی جگہ پانچویں لے آئے پھر دوسری کو طلاق دے کر اس کی جگہ لے آئے۔ غرض اسی طرح کرتے کرتے اس نے دو اڑھائی سو کے قریب شادیاں کیں بس اس کا یہ شوق تھا، بادشاہت تھی، خزانہ ہاتھ میں تھا۔ دین و دیانت پیش نظر نہیں تھا کہ وہ قومی خزانہ اس طرح سے ذاتی مصارف میں خرچ کرتا اتنا غنیمت تھا کہ حرام کاری سے بچتا تھا۔ بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ مگر چار میں ردوبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ اس کا طریقہ تھا۔

تو اس زمانے کے امراء کی مجلس میں بیٹھ کر فخریہ باتیں ہوتی تھیں، ایک رئیس کہتا کہ میں پچاس شادیاں کر چکا ہوں، تو دوسرا کہتا آپ نے کون سا بڑا کام کیا، میں سو بیویاں کر چکا ہوں، تیسرا کہتا جناب! میں دوسو کر چکا ہوں چونکہ بادشاہوں میں یہ طریقہ تھا تو ساری پبلک میں یہی چیز فخر کا باعث بن گئی۔

جس راستے پر امراء اور سلاطین چلتے ہیں اسی پر عام پبلک کے لوگ چلتے ہیں۔ اس لئے شریعت اسلام نے امیر المومنین کا کام قرار دیا کہ وہ امامت کرائے تا کہ یہ ذلیل نہ رہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب امیر المومنین خود مسجد میں آئیں گے تو امراء میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا جو مسجد میں نہ آجائے، غرباء ممکن ہے نہ آئیں لیکن امیر، نواب اور جاگیردار کوئی باقی نہیں رہے گا، جو مسجد میں نہ آئے اس لئے کہ انہیں بادشاہ کی رضامندی اور اس راہ پر چلنا مقصود ہوتا ہے۔ اب جب بادشاہ نماز کے راستے پر آ گیا تو وہ کہیں گے چلو ہم بھی نماز کے راستے پر سہی۔

عالمگیرؒ کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے کہ عالمگیرؒ کے زمانے میں علماء کچھ کسمپرسی میں مبتلا ہو گئے، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ اس واسطے کہ امراء اپنے نشۂ دولت میں پڑ گئے اب علماء سے مسئلہ کون پوچھے۔ تو علماء بے چارے جوتیاں چٹخاتے پھرنے لگے عالمگیرؒ چونکہ خود عالم تھے۔ اہل علم کی عظمت کو جانتے تھے۔ تو انہوں نے کوئی بیان وغیرہ اخبارات میں شائع نہیں کرایا کہ علماء کی قدر کرنی چاہئے۔

یہ تدبیر اختیار کی کہ جب نماز کا وقت آ گیا تو عالمگیرؒ نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آج فلاں والیٔ ملک جو دکن کے نواب ہیں وہ ہمیں وضو کرائیں تو جو دکن کے والی تھے انہوں نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی کہ بادشاہ سلامت نے مجھے حکم دیا کہ میں وضو کراؤں۔ وہ سمجھے کہ اب کوئی جاگیر ملے گی۔ بادشاہ بہت راضی ہے تو آپ فوراً پانی کا لوٹا بھر کر لائے اور آ کر وضو کرانا شروع کر دیا۔

عالمگیرؒ نے پوچھا کہ وضو میں فرض کتنے ہیں؟ انہوں نے ساری عمر کبھی وضو کیا ہو تو انہیں خبر ہوتی۔ اب وہ حیران کیا جواب دیں پوچھا واجبات کتنے ہیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ پوچھا سنتیں کتنی ہیں۔ جواب ندارد۔ عالمگیرؒ نے کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ لاکھوں کی رعیت کے اوپر تم حاکم ہو، لاکھوں کی گردنوں پر حکومت کرتے ہو اور مسلم تمہارا نام ہے تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وضو میں فرض واجب اور سنتیں کتنی ہیں، مجھے امید ہے کہ میں آئندہ ایسی صورت نہیں دیکھوں گا ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک دوسرے امیر سے کہا آپ ہمارے ساتھ افطار کریں اس نے کہا۔

جہاں پناہ! یہ تو عزت افزائی ہے۔ ورنہ فقیر کی ایسی کہاں قسمت کہ بادشاہ سلامت یاد کریں اور جب افطار ہوا تو عالمگیرؒ نے ان سے کہا کہ مفسدات صوم جن سے روزہ فاسد ہوتا ہے کتنے ہیں؟

انہوں نے اتفاق سے روزہ ہی نہیں رکھا تھا انہیں پتہ نہیں تھا کہ روزے کے مفسدات کیا ہیں۔ اب چپ ہیں کیا جواب دیں۔

عالمگیرؒ نے کہا، بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ تم مسلمانوں کے امیر، والی ملک اور نواب کہلاتے ہو، ہزاروں آدمی تمہارے حکم پر چلتے ہیں اور تم مسلمان، ریاست اسلامی، تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ روزہ فاسد کن کن چیزوں سے ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی سے زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھا تو زکوٰۃ کا نہ آیا۔ کسی سے حج وغیرہ کا۔ غرض سارے فیل ہوئے اور یہ کہا کہ آئندہ میں ایسا نہ دیکھوں۔

بس جب یہاں سے امراء واپس ہوئے۔ اب انہیں مسائل معلوم کرنے کی فکر پڑی تو مولویوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اب مولویوں نے نخرے شروع کئے ہم پانچ سو روپے تنخواہ لیں گے۔ انہوں نے کہا حضور! ہم ایک ہزار روپیہ تنخواہ دیں گے، اس لئے کہ جاگیریں جانے کا اندیشہ تھا۔ ریاست چھن جاتی۔ تو مولوی نہ ملیں۔ تمام ملک کے اندر مولویوں کی تلاش شروع ہوئی جتنے علماء، طلباء تھے سب ٹھکانے لگ گئے بڑی بڑی تنخواہیں جاری ہو گئیں اور ساتھ یہ

کہ جتنے امراء تھے انہیں مسائل معلوم ہوئے اور دین پر انہوں نے عمل شروع کر دیا تو یہ وہی بات تھی کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا، بادشاہ اگر خود دین کی طرف متوجہ ہو جائے تو ناممکن ہے کہ رعایا اور پبلک متوجہ نہ ہو، اس لئے کہ حکومت جو راستہ ڈالتی ہے پبلک اسی پر خوش دلی سے چلتی ہے۔

اس میں نیکی ہی کی بات نہیں بری سے بری بات ہو، بادشاہ اس کو رائج کر دے لوگ اس پر چلیں گے۔ آج کا تہذیب وتمدن چونکہ حکومتوں کی طرف سے آیا ہے، تو آج کے تہذیب وتمدن کے کیا معنی؟ اسلام میں تہذیب وتمدن کے یہ معنی تھے کہ اخلاق ہونا، صبر وشکر، حیاء وغیرت، شجاعت وسخاوت ہو، لیکن آج تہذیب کے معنی ہیں کلب گھروں میں جا کر ناچنا، عریانی اور ننگے پن کا مظاہرہ کرنا، فحش اور بے حیائی کی باتیں کرنا، آج کی تہذیب کے یہ معنی ہیں چونکہ حکمرانوں کی طرف سے یہ تہذیب آ رہی ہے، پبلک بھی اسی پر چل رہی ہے اب انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اچھی یا بری چیز ہے۔ ہر اچھی یا بری چونکہ اوپر والے کر رہے ہیں لہٰذا ہم بھی کر رہے ہیں۔ تو جس کے پیچھے شوکت اور قوت آ جاتی ہے۔ وہ چیز دل پذیر بن جاتی ہے، دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔

اسی واسطے اسلام نے جتنی نیکیاں ہیں ان کا ذمہ دار خود امیر المومنین کو بنایا ہے، یعنی حد کی بات یہ ہے کہ اگر جنازہ آ جائے۔ تو حق یہ ہے کہ امیر المومنین جنازے کی نماز پڑھائیں ظاہر ہے کہ جب امیر المومنین اور بادشاہ جنازے کی نماز پڑھائے گا تو امراء جاگیردار، نواب جتنے بھی ہوں گے یہ لوگ میت سے کنارہ کشی چھوڑ دیں گے کہ بھئی! میت کے پاس بھی جانا چاہئے، اس کی نماز جنازہ بھی پڑھنا چاہئے۔ تو دیندار ہو جائیں گے، امامت کریں گے تو مساجد بھر جائیں گی نماز جنازہ پڑھائیں گے تو لوگ میت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی شروع کر دیں گے۔ امیر زکوٰۃ دے گا تو دنیا میں زکوٰۃ رائج ہو جائے گی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ①

اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی قوت وسلطنت دے دیں تو وہ عیش نہیں اختیار کریں گے ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ یہ دین قائم کریں گے۔ ﴿وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، امر بالمعروف کا نظام قائم کریں گے۔ اچھی باتیں دنیا میں رائج کریں گے، منکرات کو مٹائیں گے۔ تو جب صاحب اقتدار منکرات کو مٹانے لگے تو پبلک میں کون رہے گا جو منکرات پر عمل کرے گا۔ وہ بھی مٹائیں گے۔ امیر المومنین معروف اور پاکیزہ خصلت کو رائج کرے تو ہر امیر وغریب رائج کرنے کی فکر میں لگے گا، دین پھیل جائے گا۔ اس واسطے امراء کے فرائض میں قرار دیا گیا ہے کہ نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں، مسجد میں امامت بھی وہی کرائیں۔ یہ منصب دراصل ایسا ہے جیسے آج دنیا میں گورنری کا عہدہ ہے جو کسی سلطنت یا صوبے میں بادشاہ کا نائب ہوتا ہے، امام اللہ کا نائب ہوتا ہے اللہ کے رسول کا قائم مقام ہو کے کھڑا ہوا ہے۔ تو دینی حکومت ہو تو یہ بڑے عہدے ہوتے ہیں۔

① پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱۔

اسی واسطے فرمایا گیا ”یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ“ ① امامت کا حق اس شخص کو ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہے اور ”فَإِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ“ ② اور اگر قرآن پڑھنے میں مقتدی اور امام سب برابر ہیں تو اسے امام بناؤ جو سنت کے علم سے زیادہ واقف ہو اور اگر قرآن وسنت میں سب کے سب ماہر ہوں پھر اسے امام بناؤ جو فقہ اور نماز کے مسائل زیادہ جانتا ہو اور اگر فقہ میں بھی سارے ماہر ہیں تو پھر اسے بناؤ جس کا نسب اونچا ہو اور اگر اس میں بھی سب برابر ہیں پھر اسے بناؤ جو خوبصورت ہو۔

مطلب یہ کہ امام کے اندر خصوصیت ایسی ہو کہ مقتدیوں کو اسکے پیچھے کھڑے ہونے میں کوئی عار نہ پیدا ہو۔ وہ اس کے ساتھ جھک جائیں اس کی بھی عزت کریں۔ اب اگر آپ جان بوجھ کر ایسے امام رکھیں جن کی صورت نہ شکل نہ علم نہ ہنر، کوئی چیز بھی ان کے اندر نہ ہو۔ جو ساری دنیا سے نکمے ہوں انہیں امام بنادو۔ تو پھر جیسا امام ہوگا، ویسی نماز ہوگی، ویسا ہی آخرت میں اجر ملے گا۔

بہر حال یہ عہدے ہیں اور ان عہدوں کی ذمہ داری امراء اسلام کے اوپر ڈالی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ وعظ، تقریر یا خطابت یہ امیر کے ہاتھوں میں دی گئی ہے، اور فرمایا گیا ”لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ“ ③ تقریر اور خطابت کا حق سب سے پہلے امیر المومنین کو ہے وہ خطیب بن کر وعظ کہے اور مسائل کہے۔ یا پھر وہ بیان کرے جس کو امیر حکم دے اور مامور کرے کہ تم جا کے وعظ وخطابت کرو اور مسائل پہنچاؤ، اور تیسرا جو کرے گا وہ دھوکہ باز ہوگا۔ وہ اپنی اغراض کے لئے وعظ وتقریر کرے گا۔ اس لئے جب نہ امیر نے اجازت دی اور نہ وہ خود امیر اور مامور، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ذاتی اغراض والا ہے۔

آج کے دور میں مجموعۂ علماء کو خلافت کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے...... آج کے دور میں جہاں امارت ہے خلافت نہیں ہے تو علماء کے مجموعے کو امیر کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ اگر وہ شہادت دیں کہ یہ اس قابل ہے کہ خطابت کرے، مسائل بیان کرے، اس کو حق ہے، لیکن جس کی کوئی سند نہ ہو، پڑھا ہوا نہ ہو، کوئی عالم شہادت نہ دے کہ اس میں علم ہے وہ اگر تقریر کرے گا ظاہر ہے دین کو فاسد کرے گا اس کو بھی آزاد نہیں رکھا گیا۔

تقریر وتحریر کی آزادی نہیں ہے بلکہ شہادت کے ساتھ تقریر وتحریر کی اجازت ہے اگر یہ عام ہو جائے جیسے آج ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک کچھ کہہ گیا، دوسرا کچھ کہہ گیا۔ عوام تشویشات میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کس کے مسائل پر عمل کریں۔ ایک جائز کہہ رہا ہے، ایک ناجائز کہہ رہا ہے، اب ان بے چاروں کو یہ خبر تو نہیں ہے کہ عالم کا لبادہ پہن کر آیا خود عالم نہیں ہے۔ عالم فلاں ہے۔ ان کے سامنے جو اللہ کا نام لے گا وہ کہیں گے یہ عالم ہے۔ امتیاز نہیں ہو سکے گا۔

---

① ② السنن للترمذی، ابواب الصلوة عن رسول الله ﷺ، باب ماجاء من احق بالامامة، ج: ۱ ص: ۳۹۷ رقم: ۲۱۸. ③ السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب فی القصص، ج: ۱۰ ص: ۸۴ رقم: ۳۱۸۰. حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۸ ص: ۱۶۵ رقم: ۳۶۶۵.

یہی وجہ ہے کہ دین کے ساتھ امارت اور خلافت قائم کی گئی تھی کہ وہ دینی چیزوں کو اپنے قبضہ اور اقتدار میں رکھ کے آگے چلائے اسی لئے فرمایا گیا "لَا یَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ" تقریر کرنے والا یا امیر ہوگا یا مامور ہوگا یا پھر دھوکے باز ہوگا اور امیر کے قائم مقام اہل علم ہیں۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں میں کچھ وقت پہلے یہ چیز تھی کہ جب کوئی باہر سے خطیب آتا تو علماء کی ایک مجلس جب تک پاس کر کے شہادت نہ دے کہ یہ اس قابل ہے کہ تقریر کر سکے تقریر کی اجازت نہیں ہوتی تھی اس کا ثمرہ یہ ہوتا کہ ریاست میں صرف ایک خیال کے لوگ تھے۔ خیالات میں پراگندگی نہیں تھی۔ ایک مسلک پر سب عمل کرتے تھے عوام میں تشویش نہیں تھی، دین پر چل رہے ہیں۔

حیدرآباد میں بھی یہ چیز تھی اور بھوپال میں بھی۔ اس لئے وہاں علماء کی کثرت تھی، علم کی عظمت بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی جب ریاست قدر دانی کرتی ہے تو دین پھیلتا ہے۔

بھوپال میں ایک عام دستور تھا کہ اگر کسی غریب آدمی نے اپنے بچے کو مکتب میں بٹھلایا تو آج مثلاً اس نے الٓـمٓ کا پارہ شروع کیا تو ریاست کی طرف سے ایک روپیہ ماہوار اس کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ جب دوسرا پارہ لگا تو دو روپے ماہوار ہو گیا۔ تیسرا پارہ لگا تو تین روپے ماہوار ہو گئے یہاں تک کہ جب تیس پارے ہوں تو تیس روپے بچے کا ماہوار وظیفہ ہوتا۔

اور اس زمانے میں ساٹھ ستر برس پہلے تیس روپے ماہوار ایسے تھے جیسے تین سو روپے ماہوار بہت بڑی آمدنی تھی۔ سستا زمانہ تھا، ارزانی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے غریب لوگ تھے جنہیں کھانے کو نہیں ملتا تھا وہ بچوں کو مدرسہ میں داخل کر دیتے تھے کہ قرآن کریم حفظ کرے گا تو اسی دن سے وظیفہ جاری۔ ہزاروں ایسے گھرانے تھے، اور ہزاروں ایسے حافظ پیدا ہو گئے۔ ساری مسجدیں حافظوں سے آباد ہو گئیں اس لئے کہ ریاست پشت پناہی کرتی تھی۔

تو یہ قاعدہ ہے کہ حکومت یا ریاست جس چیز کی پشت پناہی کرتی ہے وہ چلتی ہے اور عوام وخواص سب شوق کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ خلافت میں چونکہ اصل مقصود دین ہے، اس لئے امیر کے ذمہ فرائض عائد کئے گئے کہ جب بادشاہ دین پر چلے گا تو رعیت اور پبلک بھی دین پر چلے گی اور دین عام ہوتا جائے گا۔ جب تک خلافت قائم رہی، دین عام ہوتا رہا اور خلافت کے دوران تیس سال کے اندر اندر نصف دنیا سے زیادہ اوپر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ پورا ایشیاء، آدھا یورپ اور ایشیاء کو چک، ان سب میں اسلام کا پرچم اونچا کر دیا، اس لئے کہ سب کا مقصد یہ تھا کہ دین پھیلے۔

خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد علماء ربانی اور صوفیاء کرام نے اسلام پھیلایا...... خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد جب ملوکیت، بادشاہ پسندی اور اقتدار پسندی کا دور آیا تو سلاطین اسلام نے محض اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے آپس میں لڑنا شروع کیا، وہ جو دینی تبلیغ واشاعت تھی وہ قصہ ختم ہو چکا اور جو ملک صحابہ وتابعین وتبع

تابعین کے زمانے دین میں آئے وہ تو آئے اس کے بعد کسرویت وقیصرویت اور اقتدار پسندی غالب آئی تو سلاطین اسلام آپس میں تحفظ اقتدار کے لئے لڑنے لگے۔ دین کی اشاعت اور حفاظت بیچارے علماء نے سنبھال لی، جتنا اسلام پھیلا وہ صوفیاء کی بدولت پھیلا، علماء کی بدولت پھیلا، جو چٹائیوں پر بیٹھنے والے تھے انکے ہاتھ میں نہ کوئی اقتدار تھا نہ کوئی سلطنت کی باگ ڈور تھی۔ اسی لئے ان لوگوں کو تاکیدیں کی گئیں کہ امراء کے پاس مت جاؤ۔ بادشاہوں کی ہم نشینی اور صحبت مت اختیار کرو، ورنہ تم بھی دین سے جاؤ گے۔ ان سے ہٹ کر دین کو پھیلایا تو دین رحم وکرم اور نرمی ومروت کے اخلاق کے راستے آیا۔ سلطنت کے راستے ختم ہوگئے وہاں اقتدار پسندی رہ گئی۔

ہمیں مزاجِ نبوّت پر چلنا ہے...... تو میں نے اس پر عرض کیا تھا کہ دنیا میں دو مزاج ہیں، ایک نبوّت کا مزاج ہے اور ایک ملوکیت کا مزاج بادشاہ کا مزاج اقتدار پسندی ہے اور نبوّت کا مزاج خاکساری اور عجز ونیاز مندی ہے۔ نبی تمام سلاطین اور سارے لوگوں سے بالاتر ہوتا ہے لیکن ایسا جھک سکتا ہے جیسے عام آدمی جھک سکتے ہیں۔ بادشاہ ایک محدود خطہ میں رہتا ہے، وہ اپنے کو ''مابدولت'' کے ساتھ تعبیر کرتا ہے کہ ہم نے یوں کیا، ہم نے یوں کہا۔ تو لفظ لفظ کے اندر اقتدار اور رعونت ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے الفاظ میں انتہائی تواضع، خاکساری ہوتی ہے اور عجز ونیاز کا برتاؤ ہوتا ہے۔

اپنے سے چھوٹے کے سامنے بھی عجز ونیاز کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر پر جارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رخصت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''وَلَا تَنْسَانَا یَا اَخِیْ فِیْ دُعَاءِکَ'' ① اے میرے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں فراموش مت کرنا۔ اللہ اللہ! کہاں سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم! اور کہاں فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک خادم اور غلام ہیں ان کو فرماتے ہیں کہ میرے بھائی! مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔ تو یہ انتہائی عجز ونیاز کی بات ہے کہ سردار اولین وآخرین اور سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ایک خادم اور چھوٹے کو فرمارہے ہیں کہ مجھے دعاء میں یاد رکھنا یہ مزاج نبوّت کا ہے اور وہ مزاج بادشاہت کا ہے۔ ہمیں نبوّت کے مزاج پر چلنا ہے۔

جب بادشاہت اور ملوکیت دنیا کو فاسد کردے تو پناہ کی جگہ صرف نبوّت ہوتی ہے۔ اس واسطے ہم جتنا نبوّت کے دامن میں آئیں گے، اتنے ہی اخلاق بلند ہوں گے اتنا ہی علم ومعرفت آئے گی، اتنا ہی کریکٹر اور کردار عمدہ ہوگا۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر، ان کی تربیت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے راستے پر چلنا چاہئے۔ اس علم کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضعفاء قوی بن جاتے ہیں۔ جو پست ہوتے ہیں وہ شوکت والے بن جاتے ہیں جو مظلوم ہوتے ہیں انہیں عدل

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: اشركنا فی دعائک ولا تنسنا، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۴.

مل جاتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر ہی چلنے کا ثمرہ نکلتا ہے اس کے سوا پناہ کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے تاکہ دین کے اعتبار سے بھی نافع ہوں اور دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں اور حل کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ① ہمارے راستے پر چلو گے، ضعیف بھی ہو گے تو قوی بنادیئے جاؤ گے، بے شوکت ہو گے تو باشوکت کر دیئے جاؤ گے۔

اس واسطے یہ چند جملے میں نے اس آیت کے تحت عرض کئے۔ چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ عورتیں بھی مدعو کی گئی ہیں۔ اس لئے کچھ عورتوں کے متعلق بھی بیان کیا کہ انکے حقوق پہچاننے کی ضرورت ہے کہ ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں۔ ان عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے حقوق پامال نہ کریں تاکہ معاشرت صحیح طور پر چل سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمارے احوال بھی درست فرمادے، ہمارا دین و دنیا دونوں درست فرمادے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً. اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآاِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

ثمرات العلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَـهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ○ أَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ○ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ① صَدَقَ اللهُ الْعَظِيْمُ.

کچھ اپنے تعارف کے بارے میں...... بزرگانِ محترم! ابھی میرے محترم بزرگ نے میرا تعارف کراتے ہوئے بہت سی چیزیں دارالعلوم دیوبند اوراس کے بانیوں کے بارے میں ذکر فرمائیں۔ حقیقت میں اگر تعارف کے قابل کوئی چیز ہے، وہ دارالعلوم دیوبند اوراس کے علماء ہی ہیں۔ ہم جیسے ناچیز اور بے مقدار ذرے، وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے اور تعارف کا نام لے کرانہیں پیش کیا جائے، ہمارا تعارف یہی کافی ہے کہ ہمیں دارالعلوم دیوبند سے خادمی اور غلامی کی نسبت حاصل ہے۔ اصل میں تعارف کی چیز ادارہ وہ جماعت ہے۔ جس جماعت سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے ہمارا بھی نام لے لیا جاتا ہے۔ اگر اس جماعت سے تعلق نہ ہوتو ہم کوئی قابل ذکر چیز بھی نہیں ہیں۔ آپ نے استاذ غالب کا نام سنا ہوگا شاعروں میں بڑا مشہور شاعر گذرا ہے کلام بھی اس کا بڑا اونچا اور بے نظیر ہوتا ہے خاص شاہی شاعر تھا اور مغلیہ دربار جس کے آخری بادشاہ ظفر تھے، کا شاعر تھا۔ اس نے اپنے متعلق ایک بات کہی ہے وہ پوری طرح سے ہم پر منطبق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

بنا ہے شاہ کا ملازم پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

بادشاہ کا ملازم ہوگیا ہے اس لئے لوگ پوچھنے لگے۔ اگر اپنے آپ کو ملازمت سے قطع کرلے، شہر میں اس کی آبرو نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہی صورت ہماری بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے اکابر سے ایک خادمی اور غلامی کی نسبت ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے لوگ ہمیں پوچھ لیتے ہیں۔ اگر وہ نسبت نہ رہے تو ہم میں کوئی چیز ایسی

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱ تا ۸۔

نہیں ہے کہ اس کا کوئی تعارف کرایا جائے یا کوئی قابل ذکر چیز ہوں، ہم بھی اگر اتراتے پھرتے ہیں تو انہی بزرگوں پہ اتراتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مرتضی حسن رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر اساتذہ میں سے تھے، انہوں نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ لاہور میں ایک فقیر، بہت ہی بیچارہ حقیر، فقیر بھی اور اوپر سے حقیر بھی، وہ لاہور کے بازاروں میں یہ کہتے ہوئے پھرتا تھا کہ ''لاہور میری ہتھیلی پر ہے جب چاہوں اسے پلٹ دوں اور ختم کردوں''۔

رات دن اس کی یہ صدا تھی۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اس فقیر میں کیا طاقت ہے کہ لاہور جیسا شہر اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے جب چاہے پلٹ دے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اندر قوت ہے بھی یا یوں ہی خواہ مخواہ دعوے ہی کررہا ہے؟ تو ایک بزرگ وہاں سے گزرے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ صاحب! یہ فقیر رات دن یہی دعوے کرتا ہے کہ لاہور کوئی چیز نہیں۔ میرے اندر یہ طاقت ہے کہ جب چاہوں اسے پلٹ دوں۔ آپ ذرا دیکھئے کہ اس میں ہے بھی کوئی جان اور طاقت؟ یہ بزرگ مراقب ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ فقیر میں کچھ بھی نہیں خالی قلاش ہے نہ اس میں کوئی بزرگی اور نہ کمال۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس بے مائیگی کے عالم میں یہ دعویٰ کیسے کررہا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے پیر کو دیکھنا چاہئے۔ شاید اس کے پیر میں طاقت ہو اسی کے بل پر کہتا ہو۔ لیکن معلوم ہوا وہ بھی خالی ہے۔ اس میں بھی کچھ نہیں۔ انہیں اور حیرانی ہوئی کہ آخر اس میں کیا جان ہے جس کی بنا پر اتنا بڑا دعویٰ؟ انہوں نے پھر مراقبہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا دادا پیر بے شک اتنی طاقت رکھتا ہے کہ جب چاہے لاہور کو پلٹ دے۔ انہوں نے کہا اسی کے بل بوتے پر یہ دعویٰ کررہا ہے خود اس کے اندر کوئی کمال نہیں ہے۔

ہم بھی جو اتراتے پھرتے ہیں، یا کچھ کہتے ہیں، وہ انہی مشائخ کے بل بوتے پر کہتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی جان نہیں۔ اسی برتے پر آپ بھی کہتے ہیں کہ یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، اگر وہ نسبت قطع ہو جائے، نہ اچھے نہ برے یعنی قابل ذکر بھی نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ تعارف کرانے کے قابل وہی اکابر ہیں، وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں دین پھیلایا اور ہندوستان سے گزر کر کوئی ملک نہیں چھوڑا کہ ان کے پروردہ، ان کے فاضل اور ان کے فیض یافتہ وہاں موجود نہ ہوں۔ آج آپ کے افریقہ میں جو دیوبند سے آٹھ ہزار میل دور ہے، آپ دیکھیں تو ان کے نام لیوا اور ان کا ذکر خیر کرنے والے موجود ہیں۔ یہ مولانا محمد اسماعیل جو افریقی ہیں، ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ یہی اس جماعت کا تعارف ہے کہ آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر دین کی روشنی پھیلانے والے موجود ہیں۔ تو کوئی کام تو انہوں نے کیا ہوگا کہ ہزاروں میل پر انکے نام لینے والے موجود ہیں۔ اس طرح سے آپ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، جاوا، سماٹرا، ملایا اور حجاز میں پہنچیں، جگہ جگہ ان کے شاگرد اور نام لیوا موجود ہیں۔

میرا برما جانا ہوا، میں نے دیکھا کہ قصبے قصبے میں فضلائے دیوبند موجود ہیں مدارس قائم ہیں، تعلیم دے ہیں۔ افغانستان میں جانا ہوا، وہاں کوئی قصبہ خالی نہیں جہاں فضلاء موجود نہ ہوں، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال رکھا ہے،

کوئی شو، نمود دعوے اور پروپگنڈے نہیں لیکن عمل یہ ہے کہ ہزاروں کے ایمان سنبھلے ہوئے ہیں، محض ان کے چہرے اور قول وعمل دیکھ کر لوگوں کے ایمان محفوظ ہیں تو ان اکابر نے ایک عظیم الشان کام کیا اور علم کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا۔

دارالعلوم دیو بند کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا خواب مبارک...... حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیو بند سات برس کی عمر تھی، حضرت نے خواب دیکھا، جس کو ان کی سوانح میں نقل بھی کیا گیا ہے۔ حضرتؒ نے یہ دیکھا کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں کی دسوں انگلیوں سے اطراف عالم میں نہریں جاری ہیں اور پانی بہہ رہا ہے۔ حضرت کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم جو فارسی کے بڑے اچھے عالم اور متقی تھے، حضرت نے ان کو اپنا یہ خواب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اس کی تعبیر یہ کہ تم سے علوم نبوت اطراف عالم میں پھیلیں گے۔ اب اس وقت کوئی کیا سمجھ سکتا تھا کہ نانوتہ ایک معمولی سی بستی، جہاں نہ کوئی عالم نہ فاضل، اس میں ایک سات برس کا بچہ خواب دیکھ رہا ہے اور اتنا بڑا خواب کہ دنیا جہاں میں میرے سے علم پھیل رہا ہے۔ حضرت نے جب دارالعلوم دیو بند کی بنیاد رکھی، تب لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو آپ نے سات برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ تو دارالعلوم دیو بند فی الحقیقت علم کا ایک سمندر ہے جس کی نہریں اطراف عالم میں جاری ہیں اور پھیل رہی ہیں اور لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دارالعلوم دیو بند الہامی ادارہ ہے...... میرے محترم بھائی نے جس چیز کا ابھی تذکرہ کیا کہ دارالعلوم میں احاطہ مولسری میں ایک کنواں ہے اس سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب متعلق ہے۔ یہ دارالعلوم دیو بند کے سب سے پہلے مہتمم ہیں، لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، دستخط بھی کرنا نہیں جانتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کا اہتمام ان کے سپرد کیا تھا، انہوں نے عرض بھی کیا، حضرت! میں لکھنا پڑھنا اور دستخط کرنا بھی نہیں جانتا فرمایا نہیں آپ آکے اہتمام سنبھالیں۔ اہتمام کرتے تھے، میر منشی بیٹھ کر احکام لکھتا تھا، مہر لگا دی جاتی تھی۔ دستخط کرنا جانتے نہیں تھے، وہ احکام جاری ہو جاتے، اس طرح سے اہتمام شروع کیا۔

مولانا رفیع الدین صاحب نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں ان کی طریقت کا یہ سلسلہ آپ کے یہاں افریقہ میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، ان کے خلیفہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دارالعلوم دیو بند کے سب سے پہلے مفتی بنائے گئے ہیں۔ ان کے خلیفہ قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی ہیں، جن کی وفات ہو چکی، ان کے خلیفہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب جو مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) میں مقیم ہیں، مہاجر ہیں، بحمد اللہ ان سے افریقہ کے سینکڑوں لوگ بیعت ہیں اور مستفیض ہیں، تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقت کا سلسلہ آپ کے افریقہ میں پھیلا ہوا ہے گویا آپ بھی ان کی روحانی اولاد ہیں۔ آپ ان سے الگ نہیں ہیں۔ ان کا میں واقعہ ذکر کر رہا ہوں۔ تو

مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ جب اہتمام مجھے سپرد کیا گیا تو اتنا بڑا ادارہ اور میں بے پڑھا لکھا، مجھے پریشانی تھی میں اس نظم کو کس طرح سے چلاؤں گا؟ میرے اندر کیا طاقت ہے؟ کوئی علمی طاقت ہو تو میں پڑھا لکھا نہیں۔اور اگر آدمی جہلا کا انتظام کرے، تو چلو ایک جاہل آدمی جاہلوں کا انتظام کرلے، انتظام علماء کا اور کرنے وہ بیٹھا جو قطعاً علم نہیں جانتا، تو مولانا کو حیرانی تھی کہ میں کس طرح یہ کام انجام دوں گا، علم باطن اور علم لدنی حق تعالیٰ نے انہیں دیا تھا لیکن علم ظاہری نہیں تھا۔فرماتے تھے جب میں زیادہ پریشان ہوا تو میں نے ایک خواب دیکھا، وہ خواب مجھے سنانا ہے، خواب یہ دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو سب سے بڑا قدیم احاطہ ہے، اس کو احاطہ مولسری کہتے ہیں۔مولسری میں دو درخت مولانا رفیع الدین صاحب نے ہی بوئے تھے، جب عمارت کی بنیاد رکھی تو اسی تاریخ میں دو درخت بھی لگائے۔دارالعلوم دیوبند اور وہ دونوں درخت ہم عمر ہیں۔ایک ہی سال، ایک ہی دن کی پیدائش دونوں ہیں، بہرحال حضرت نے خواب میں دیکھا کہ احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے وہ دودھ سے بھرا ہوا ہے۔اس کی مَن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں اور ہزاروں آدمی دودھ لے کر جا رہے ہیں، کوئی بڑی بالٹی، کوئی گھڑا، کوئی پیالے ہی میں بھر کر لے گیا، کسی کے پاس کوئی برتن نہیں تو اس نے چلو ہی میں لیا اور پی لیا، غرض درجہ بدرجہ ہر ایک دودھ لے جا رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم فرما رہے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خواب دیکھنے کے بعد مراقب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا اس کا مطلب ہے؟ تو مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ کنواں دارالعلوم دیوبند کی اور دودھ علم کی صورت مثالی ہے اور علم کو تقسیم کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اور جو یہ دودھ لے کر جا رہے ہیں، یہ دارالعلوم کے طلباء ہیں۔تو فرمایا جب دارالعلوم میں شوال میں داخلہ ہوتا ہے اور طلباء ہجوم کر کے آتے ہیں، میں فوراً پہچان جاتا ہوں کہ اس میں یہ بھی موجود تھا۔ان دودھ لینے والوں میں یہ بھی موجود تھا، یہ بھی، ایک ایک کی شکل پہچانتا ہوں۔گویا ان کو ان تمام طلباء کی شکلیں دکھلائی گئیں، جو اس دارالعلوم سے آئندہ تک بھی فائدہ اٹھائیں گے اور علم حاصل کریں گے۔تو جب دارالعلوم کی بنیاد الہام پر رکھی گئی، وہاں کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ الہام ہی سے ہوتا ہے۔ان کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ جاؤ، اور جا کر علم پڑھو، جو جو وہاں کا فاضل ہے خواہ براہ راست فاضل ہے یا بالواسطہ فاضل ہے، وہ منجانب اللہ منتخب ہے جس کو چھانٹ لیا گیا ہے۔کہ وہ علم پڑھے اور پڑھائے۔اس طرح سے یہ ادارہ الہامی بنیاد پر قائم ہے۔

اور جیسے آپ نے ابھی واقعہ سنا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو نقشہ بنایا تھا۔جتنا اب صحن ہے وہ اس سے چھوٹا رکھا گیا تھا، بنیادیں تیار کرلی گئی تھیں تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رات کو خواب دیکھا بزرگوں کا خواب بھی آدھا کشف اور آدھا خواب ہوتا ہے۔ہمارے جیسا خواب نہیں ہوتا۔وہ تو ان کو ایک انکشاف ہوتا ہے، ان کی روحانیت اور نورانیت قلب ہوتی ہے وہ عالم مثال اور عالم غیب کی چیزیں دیکھتے ہیں۔تو درحقیقت وہ خواب نہیں ہوتا وہ کشف ہوتا ہے۔تو مولانا فرماتے ہیں کہ میں خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لائے اور آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو تم نے بنیادوں کے نشان لگائے ہیں اس سے صحن بہت کم رہے گا۔ مدرسہ چھوٹا ہو جائے گا، اس کو بڑا ہونا چاہئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اب بنیاد ہے وہاں جا کر اپنی لاٹھی مبارک سے نشان لگایا اور لمبی لکیر کھینچی فرمایا: ''یہاں تک صحن آنا چاہئے جب مدرسہ وسیع ہوگا''۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب صبح کو اٹھ کر میں گیا تو اسی طرح سے وہ نشان لگا ہوا تھا جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا اور میں نے خواب میں دیکھا تھا اسی پر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کھودی گئی۔ گویا مدرسہ کی بناء قائم کرنے کا تصور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور الہام کے ہوا۔ اس کی بنیاد کا نشان بھی الہام کے ساتھ لگایا گیا۔ اس کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز الہامی ہے رسمی مشوروں کے تابع نہیں ہے۔ جیسے دنیا میں لوگ کیا کرتے ہیں کہ باہم جمع ہو کے مشورہ کیا کہ بھئی! ایک ادارہ قائم کر لو یہ صورت نہیں بلکہ غیبی طور پر قلوب میں ڈالا گیا کہ تعلیم گاہ قائم کرو۔

قیامِ دارالعلوم کا محرک...... وجہ اس کی یہ تھی کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا انہوں نے علم اور دین کے راستے بند کر دیئے اور پادری مسیحیت کی اشاعت کے لئے کھڑے ہوگئے اور علماء کو عاجز کرنا شروع کر دیا۔ پیچھے حکومت کی قوت تھی۔ مسلمان بے بس ہو چکے تھے۔ اس وقت ان بزرگوں نے دیکھا کہ اگر تعلیم دین جاری نہ کی گئی تو اسلام کا وجود ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ کوئی مذہب بھی باقی نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی تعلیم باقی نہ ہو، تعلیم سے مذہب قائم ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی تعلیم مٹ جائے، مذہب مٹ جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے احساس کیا کہ کوئی تعلیم گاہ قائم ہونی چاہئے۔ تو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

اس وقت صورت حال کیا تھی؟ جب ابتداء میں ہندوستان میں انقلاب ہوا مسلمانوں کو انگریزوں سے ایک عام نفرت تھی اس لئے کہ انہی کے ہاتھ سے حکومت چھنی تھی تو طبعی طور پر نفرت ہونی چاہئے تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارا ملک برباد کیا، اقتدار چھینا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ نفرت نکل جائے، لیکن نفرت نہیں نکلی، قائم رہی بلکہ بڑھتی رہی۔ آخر وہاں کے مدبروں نے سوچ کر تدبیر نکالی اور وہ یہ کہ جب تک ان کے دل و دماغ کو بدلا نہیں جائے گا اس وقت تک یہ نفرت نہیں نکلے گی، تو نفرت نکالنے کی کوشش نہ کرو، ان کے دل و دماغ کو بدل دو اور دل و دماغ تعلیم کے ذریعہ بدلے جاتے ہیں تو اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم شروع کی گئی تاکہ ان کے دماغوں کے اندر سے وہ خوبی نکال دی جائے جو اسلام نے بھری ہوئی ہے۔ تو لارڈ میکاڈ لے تعلیمی اسکیم لے کر ہندوستان آیا اور اس نے اعلان کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور فکر اور دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

اس نے گویا چیلنج کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان بزرگوں نے دیکھا اگر یہ تعلیم پھیل گئی تو الحاد و بے دینی اور انگلستانیت اتنی پھیل جائے گی کہ چاروں طرف سے بہالے جائے گی، اسلام کا وجود باقی

نہیں رہے گا۔ تو حضرت نے دارالعلوم دیو بند کی بنیاد ڈالی اور انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں لیکن فکر اور دماغ کے لحاظ سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں اور ان کا دل و دماغ اسلامی بنے''۔

کوئی ہندی ہو، چینی ہو، کوئی ایرانی ہو، تورانی ہو، کوئی مصری ہو، کوئی حجازی ہو لیکن دل سب کے یکساں ہوں کہ وہ اسلامی ہوں، ان کے اندر ایمان بھرا ہوا ہو، اس لئے کہ دین اسلام ایک ایسا رشتہ ہے جو مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو ایک نکتے پر جمع کر دیتا ہے۔ رنگ اور نسل ہمیں ایک نکتے پر جمع نہیں کر سکتے، کالے اور گورے کا اگر فرق ہوگا تو تنفر پیدا ہوگا۔ یہ فطری چیز ہے، جس کو آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں، اگر نسل کا لحاظ کیا جائے تو نسلیں نہیں جمع ہوا کرتیں وطن کا لحاظ کیا جائے تو وطن میں حد بندی ہوتی ہے، دلوں میں بھی حد بندی ہو جائے گی، دلوں کو وہ چیز جمع کر سکتی ہے جس میں کوئی حد بندی نہ ہو، عالمگیر چیز ہو اور پورے عالم پر پھیلنے والی ہو وہ سوائے اسلام کے کوئی دوسری چیز نہیں۔ فرمایا گیا: ''لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰی عَرَبِيٍّ، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ'' ① کسی عرب والے کو کسی عجم والے پر کوئی بزرگی اور فضیلت حاصل نہیں ہے اگر ہے تو دین اور تقویٰ کے لحاظ سے ہے۔

آپ نے فرمایا بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں کالے اور گورے دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، میری نگاہ میں دونوں یکساں ہیں۔ آپ نے فرمایا میں عرب اور عجم، ہند اور سندھ اور ایران اور توران سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ ② حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے پیغمبر کہہ دے کہ میں تمام انسانوں کی طرف، سارے کنبے اور برادریوں کی طرف رسول ہوں تو اسلام نے سب کو ایک نکتے پر لا کر جمع کیا۔

یہی وجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اگر مشرق میں ایک مسلمان ہو اور اس کو کانٹا چبھے تو وہ ٹھیس محسوس کرتا ہے جو مغرب کے اندر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ دونوں میں رشتہ اسلام کا جڑا ہوا ہے۔ اگر وطن کا رشتہ ہو تو ایران والوں کو توران والوں سے کیا تعلق؟ ہندیوں کو افریقیوں سے اور افریقیوں کو حجازیوں سے کیا تعلق، لیکن اگر اسلام کا رشتہ ہے تو ہند اور سندھ سب ایک ہیں، افریقہ، امریکہ، ہندوستان و انگلستان سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ رشتہ ایک ہے۔ یہ رشتہ جب تک قائم ہے مسلمان یقیناً متحد ہیں، جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا، تفریق کا پیدا ہو جانا اور سر پھٹول لازمی ہے۔ تو دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے سب کو ایک نکتے پر جمع کیا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو نہ ماننے پر بنی اسرائیل کا انجامِ بد...... اس پر مجھے بنی اسرائیل کا ایک (واقعہ

① مسند احمد، باقي مسند الانصار، ج:۴۷ ص:۴۷۸.

② پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸ .

جو حدیث میں ہے) یاد آیا۔ اللہ نے ان کو بڑی برگزیدگی دی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ: ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① اے نبی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعامات کئے دنیا جہاں کی قوموں پر تم کو فضیلت اور برگزیدگی دی۔ اپنے وقت میں بنی اسرائیل سے باعظمت کوئی خاندان نہیں تھا۔ ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے۔ اللہ نے سب کچھ دیا لیکن جب یہ دولت وثروت زیادہ آ جاتی ہے تو عیش پسندی کی طرف طبیعتیں مائل ہو جاتی ہیں اور جتنا عیش بڑھتا جاتا ہے اتنی غفلت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی پھر ذلت سامنے آتی ہے۔ بنی اسرائیل اس میں مبتلا ہوئے۔ دولت کی کثرت کی وجہ سے عیاشی کی طرف مائل ہوئے، سیاہ کاری، شراب خوری، زنا کاری تمام چیزیں شروع کیں، اس زمانے میں حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر تھے، حضرت دانیال علیہ السلام نے وعظ کہنے شروع کئے۔ فرمایا:

''اے لوگوں اس غفلت کو چھوڑو، اس غفلت کا نتیجہ بہت برا ہے، قوم تباہ و برباد ہو جائے گی، نسلیں برباد ہو جائیں گی، تمہارے چار دن کے عیش کی وجہ سے نسلیں بدترین جائیں گی، تو اپنے اوپر بھی رحم کھاؤ اور اپنی آنے والی نسلوں پر بھی۔ اس تعیش کو چھوڑ دو، اس دولت کو حکم خداوندی کے ماتحت استعمال کرو، اپنی ذاتی ملک مت سمجھو اور اس کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرو، نفس کے کہنے سے تصرفات مت کرو''۔

لیکن جب کوئی قوم عیش میں مبتلا ہو جاتی ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے، پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی تھی۔ اندھے ہو کر عیاشی میں پڑے رہے۔ آخر کو اس کا نتیجہ نکلا تو بخت نصر مسلط ہوا۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا، سورج پرست تھا، کوئی توحید اس میں نہیں تھی لیکن جب موحدین میں سے توحید نکل جاتی ہے اور جرائم بڑھ جاتے ہیں تو دلوں میں جان باقی نہیں رہتی، پھر مشرک موحدوں کے اوپر تسلط کر سکتے ہیں، ورنہ جب تک موحدوں میں توحید ہے ان کی قلبی قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہیں آ سکتی، جب خود میں جان نہ رہے تو دوسرے غالب آ جاتے ہیں۔ تو بخت نصر نے زبردست حملہ کیا اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، عورتوں کو تہہ تیغ کیا، گھروں میں گھس کر عورتوں کے پیٹ چاک کئے اور جو بچے تھے ان کو نیزوں کے اوپر ٹانگا تورات اور اس کے اوراق کو جوتوں سے روندا، بیت المقدس میں گندگی اور پلیدی ڈالی اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قیدی اور غلام بنا کر بغداد لے گیا۔ فلسطین، جو یہود کا وطن بنایا گیا تھا اس پر قبضہ کیا۔ تو ستر ہزار کو قتل کیا، لاکھوں عورتوں کی آبروریزی کی، لاکھوں بچوں کو قتل کیا۔ جن ستر ہزار کو گرفتار کیا ان میں حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، ان کی بھی مشکیں کسی گئیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا خود بھی تباہ ہوئے اور مجھے بھی خراب کیا۔ اب بنی اسرائیل کو ہوش آیا۔ اب معذرت کی اور کہا کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ فرمایا، اب توبہ کرنے سے کیا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۷۔

ہوتا ہے۔ توبہ کا وقت نکل گیا۔

اب کیا ہوتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

دانہ ہی سارا چگ گئیں، تو اب بھوسے پر قناعت کرلو۔ مگر بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شفقت ماں باپ سے زیادہ ہوتی ہے، کوئی قوم جب رجوع کر کے آتی ہے پھر ان کا دل پگھلتا ہے۔ پھر شفقت بڑھتی ہے۔

فرمایا کہ اچھا میں اللہ سے دعا کروں گا۔ میری جدوجہد ہوگی کہ اللہ تمہیں قید سے نکال کر پھر وہی عروج اور ترقی دے۔ یہ ستر ہزار قیدی بغداد کے بڑے جیل خانے میں ڈالدئے اور غلام بنائے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ اس لئے کہ اس زمانے کی قید وبند آج کے ترقی یافتہ دور کی طرح تو نہ تھی کہ قیدیوں کے لئے اے کلاس، اور بی کلاس ہو کہ قیدیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہاں تو اندھے کنویں میں ڈالدیتے تھے کیڑے مکوڑے کاٹتے تھے، آدھا ریتا اور آدھے آٹے کی روٹی دی جاتی تھی جس سے آدمی مرنے سے پہلے مرجاتا تھا۔ کوئی بارکیں وہاں بنی ہوئی نہ تھیں بہر حال قید میں ڈالدیئے گئے، مگر حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں، چہرے پر نبوت کا جلال و جمال، عبادت اور زہد، تو ان کی عبادت اور اطاعت کو دیکھ کر جو جیل کا سب سے بڑا حاکم تھا، وہ ان کا معتقد ہوگیا اور بڑی عظمت کرنا شروع کی۔

کافر ہو یا مسلم، مگر ہر انسان کے دل میں ایک نور دیا گیا ہے جس سے وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے، تعصب کی وجہ سے اس کا نفس مانے یا نہ مانے یہ الگ بات ہے مگر دل قبول کرتا ہے کہ سچائی یہی ہے۔ تو حضرت دانیال علیہ السلام کی عظمت، عبادت، زہد، قناعت اور برکت دیکھی، ادھر بنی اسرائیل کو بھی ہوش آیا جب دولت نہ رہی عیش کے سامان بھی نہ رہے اور پیغمبر ساتھ ہیں تو انہیں بھی عبادت ہی کرنی تھی عیش کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی رات دن عبادت میں مصروف۔ تو وہ جیل خانہ کیا ہوا وہ تو خانقاہ بن گیا ہر جگہ سے ذکر اللہ کی آوازیں آرہی ہیں تو جیل کے جتنے حکام تھے سب معتقد ہوگئے اور اس وجہ سے پورے بنی اسرائیل کی بڑی رعائتیں کرتے تھے ادھر حضرت دانیال علیہ السلام کی دعا جاری کہ اے اللہ! ان کو رہائی بخش۔ آخر رہائی کے اسباب پیدا ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لئے دوبارہ اقتدار کی راہ ہموار ہونا شروع ہوئی ...... وہ ایسے کہ بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور دیکھ کر بھول گیا کہ میں نے کیا خواب دیکھا تھا، مگر خواب کچھ ہیبت ناک اور ڈراؤنا تھا تو اس کے دل میں الجھن اور پریشانی پیدا ہوئی، اس نے اپنے دربار کے کاہنوں، منجموں اور جو اس زمانے کا علم تھا، اس کے فاضلوں کو جمع کیا اور کہا میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔ انہوں نے کہا، خواب کیا ہے؟ کہا کہ خواب میں بھول گیا۔ انہوں نے کہا پھر تعبیر کا ہے کی بتائیں؟ اس نے کہا میں نے لاکھوں روپیہ تمہارے اوپر خرچ کیا، تم غیب دانی کے دعوے کرتے تھے تم میرا ایک خواب بھی نہیں بتا سکتے، تو تم کیسے غیب دان ہو؟ یا تو تین دن کے اندر خواب بتلاؤ، ورنہ تمہارے خاندانوں کو بھی تہس نہس کر دوں گا۔ ان کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ تو کل تین دن کی میعاد رہ گئی، ہمارا

سب گھر بار ختم ہوا۔ اس لئے کہ وہ محض بناوٹی باتیں ہوتی تھیں کوئی غیب دانی نہ تھی، نہ کچھ معلوم تھا، بس پیسے وصول کرنے کے لئے سارے دعوے کرتے تھے، جب وقت پڑا تو ساری قلعی کھل گئی۔ خیر یہ خبر عام ہوئی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے سامنے پہنچی۔

حضرت دانیال علیہ السلام جیلر کے پاس تشریف لائے، فرمایا، بادشاہ نے خواب دیکھا ہے اس کا خواب اور تعبیر مجھے معلوم ہے۔ تو جا کے اطلاع کرتا کہ بادشاہ مجھے بلائے اور میں خواب کی تعبیر دوں۔ اور فرمایا یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس میں میرا بھی نفع ہے اور تیرا بھی نفع ہے۔ تو جب جا کے کہے گا کہ میرے قیدیوں میں ایک شخص ہے جو تیرے خواب کو جانتا ہے اور خواب کی تعبیر بھی جانتا ہے۔ تو بادشاہ پریشانی میں گرفتار ہے، خواب بھول گیا ہے، اس لئے بہت خوش ہوگا کہ جلدی بلاؤ، تو میرا یہ فائدہ ہے کہ میری رہائی ہو جائے گی اور رہا ہو کے میں اپنی قوم کی رہائی کی سعی کروں۔ تیرا فائدہ یہ ہے کہ جب تو بادشاہ کو الجھن سے نکال دے گا تیرا عہدہ بڑھے گا، ترقی ہوگی، عزت بڑھے گی۔ تو دونوں کا فائدہ ہے۔

جیلر بہت خوش ہوا کہ عجیب وغریب قیدی ہے معتقد پہلے ہی سے تھا۔ جب یہ غیب دانی دیکھی، عقیدت اور بڑھ گئی۔ جیلر نے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں اگر کوئی بادشاہ کا خواب بتا سکتا ہے تو وہ تو ہے لیکن سچ بتایئے، ہے بھی معلوم، یا ایسے ہی بات کہہ دی ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات واقعی نہ ہو تو میں پٹوں اور تمہاری بھی پٹائی ہو۔ فرمایا، تو بے کھٹکے جا کے کہہ، مجھے خواب معلوم ہے اور تعبیر بھی معلوم ہے۔

اس نے بڑی خوشی میں جلدی سے جا کر بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور! آپ جس الجھن میں گرفتار ہیں کہ خواب دیکھ کر بھول گئے ہیں۔ میرے قیدیوں میں ایک بڑا بزرگ قیدی ہے اور میں اس کی بزرگی سال بھر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تو ایسا انسان نہیں دیکھا، وہ آپ کا خواب جانتا ہے۔ اچھا میرا خواب جانتا ہے؟ اس نے کہا جلدی رہائی کر۔ اس کی قید و بند کاٹ کر اعزاز و اکرام سے اس کو میرے دربار میں لے کے آ، اور اگر اس نے میرا خواب بتلا دیا تو تیرا عہدہ بہت بلند کروں گا، تیری تنخواہ بہت بڑھا دی جائے گی، تیرا اعزاز بڑھ جائے گا۔

جو پیغمبر علیہ السلام نے پیشین گوئی کی تھی وہ بات صحیح نکلی، جیلر کا تو دماغ آسمان پر پہنچ گیا۔ بہت خوش ہوا وہ دوڑا آیا۔ آ کر حضرت دانیال علیہ السلام کی قیدیں کاٹیں، ہتھکڑیاں بیڑیاں جدا کیں اور فاخرہ لباس رکھا کہ اسے پہن کر آپ تشریف لے چلیں میری تو دنیا بن گئی، مجھے آپ نے بہت کچھ دلوا دیا۔ فرمایا: ''تیرا ہی نہیں میرا بھی سب کچھ بنے گا''۔

حضرت دانیال علیہ السلام تشریف لے گئے۔ دربار شاہی میں امراء، وزراء، کاہن اور منجم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی جان میں جان یوں آ گئی کہ ہماری جان بچ گئی، ورنہ تیسرے دن ہم تہہ تیغ کیے جاتے۔ چلو بادشاہ کے خواب معلوم ہونے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ دربار میں پہنچے تو حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے دین کے مطابق

بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے تعظیم وتوقیر سے اپنے پاس برابر بٹھلایا، دل میں اس کے بے چینی اور اضطراب تھا۔ فوراً دربار برخاست کیا اور تخلیہ کیا۔ تو تخلیئے میں ایک حضرت دانیال علیہ السلام، بادشاہ اور وہ جیلر، تاکہ اگر بات سچی ہو تو جیلر کی عزت افزائی کی جائے اور اگر غلط ہو تو پہلے اس کی گردن ناپی جائے اس نے آ کر جھوٹ بولا۔

بخت نصر نے کہا کہ سب سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میرے دربار کا قاعدہ یہ ہے کہ جو درباری آتا ہے وہ مجھے سجدہ کرتا ہے، آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے مذہب اور طریق کے مطابق مجھے سلام کہا۔ لیکن میرے دربار کا قانون سجدہ کرنا ہے، آپ نے کیوں نہ کیا؟

انبیاء علیہم السلام کامل العقل بھی ہوتے ہیں...... حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر جیسے عارف کامل ہوتے ہیں، عالم کامل، عاقل کامل بھی ہوتے ہیں، پیغمبر کی عقل اتنی بلند ہوتی ہے کہ ساری امت کی عقلیں ملا کے جمع کی جائیں تو بھی پیغمبر کی عقل زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک کے سلسلے میں کتابیں لکھی گئی ہیں، آپ کی عقلمندی کے واقعات جمع کئے گئے، اس لئے کہ آپ سیدالانبیاء، نبیوں کے بھی سردار ہیں جن کی نبوت سب سے بڑی، ان کی عقل بھی سب سے بڑی۔ تو تمام انبیاء علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک زیادہ ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری امتوں کے عقلاء اور حکماء جمع ہوں ان سب سے تنہا ذات نبوی کی عقل فائق ہے۔ اس لئے آپؐ نے بہت سے فیصلے وحی اترنے سے پہلے اپنی عقل مبارک سے فرمائے ہیں۔

حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے اتنا ستاتا ہے کہ اس نے میری زندگی تلخ کر دی۔ میں نے خوشامدیں کر لیں، سب کچھ کر لیا، مگر ایسا موذی ہے کہ رات دن مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ یا رسول اللہ میں کیا کروں، میں تو عاجز آ گیا۔ فرمایا میں تدبیر بتلاتا ہوں، وہ یہ کہ سارا سامان گھر سے نکال کے سڑک پہ رکھ دے اور سامان کے اوپر بیٹھ جا، اور جو آ کے پوچھے کہ بھائی گھر کے ہوتے ہوئے سڑک پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے کہا ہے کہ بھائی گھر چھوڑ دو، اس واسطے میں نے گھر چھوڑ دیا۔ چنانچہ لوگ آئے۔ پوچھا کہ بھئی! گھر کیوں چھوڑ دیا؟ گھر موجود ہے، سامان یہاں کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ جی کیا کروں، پڑوسی نے ستانے میں انتہا کر دی، اللہ کے رسولؐ نے کہا کہ بھئی گھر چھوڑ دے۔ تو جو سنے وہ کہے لعنت اس پڑوسی کے اوپر، جو آ رہا ہے، واقعہ سن رہا ہے، لعنت لعنت کرتا ہے۔ مدینہ میں صبح سے شام تک ہزاروں لعنتیں اس پر ہوئیں۔ لعنتوں کی تسبیح پڑھی جانے لگی۔

وہ پڑوسی موذی عاجز آیا۔ اس نے آ کے ہاتھ جوڑے اور کہا خدا کے واسطے گھر چل، میری تو زندگی تباہ و برباد ہو گئی، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اب کبھی نہیں ستاؤں گا، بلکہ تیری خدمت کروں گا۔ اب انہوں نے نخرے کرنے شروع کر دیئے کہ بتا پھر تو نہیں ستائے گا، اس نے کہا حلف اٹھاتا ہوں کبھی نہیں ستاؤں گا۔ تو اسے گھر میں لایا سارا سامان خود رکھا اور روزانہ ایذا پہنچانے کی بجائے خدمت شروع کر دی۔ تو تدبیر کارگر ہوئی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ تدبیر عقل سے بتلائی تھی۔وحی کے ذریعہ سے نہیں۔

تو پیغمبر عقلمند بھی اتنے ہوتے ہیں کہ ان کی عقل کے سامنے دنیا کی عقل گرد ہوتی ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اللہ سے تعلق قوی ہونے کا نام ہے،اللہ سے تعلق ہوگا تو دل کا راستہ سیدھا سیدھا ہوگا۔عقلمندی یہی ہے کہ اخیر تک کی بات آدمی کو سیدھی نظر آ جائے۔وہ بغیر تعلق مع اللہ کے نہیں ہوتی،تعلق اللہ سے نہیں ہے،پھر آدمی عقل مند بنے،وہ عقل نہیں چالاکی وعیاری ہوتی ہے۔عیاری اور چیز ہے،عقلمندی اور چیز ہے،چالاکی میں دھوکہ دہی ہوتی ہے۔دھوکہ دہی سے اپنی غرض پوری کی جاتی ہے۔عقل میں کسی کو دھوکہ نہیں دیا جاتا،سیدھی بات تدبیر سے انجام دی جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی نسبت اللہ سے کس کا تعلق زیادہ مضبوط ہوسکتا ہے؟ تو ان سے زیادہ عقل بھی کس کی کامل ہوسکتی ہے؟

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو غزوۂ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمان تین سو تیرہ تھے،مگر مسلمانوں کو معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے۔جب جنگ کے لئے گئے اس وقت پتہ نہیں تھا بعد میں پتہ چلا۔تو مشرکین مکہ یعنی دشمن کے کیمپ سے کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کے لشکر میں آ نکلا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے پکڑ لیا اور کہا،بتا تمہارے لشکر کی تعداد کتنی ہے؟ ٹوہ ہوتی ہے کہ بھئی دشمن کی تعداد،سامان اور طاقت کتنی ہے؟ اس کا اندازہ ہوجائے۔صحابہؓ نے اس سے پوچھا۔وہ ہوشیار اور اپنے لشکر کا خیر خواہ تھا۔اس نے تعداد نہیں بتلائی یوں کہا کہ وَاللّٰهِ لَكَثِيْرٌ خدا کی قسم بڑی بھاری جمعیت اور بڑا جتھہ ہے۔

صحابہ کرام نے اسے ستانا شروع کیا،مارا،ڈانٹا،ڈپٹا۔غرض صحابہؓ نے ساری تدبیریں کرلیں،مگر وہ بول کے نہیں دیا۔یوں کہتا رہا کہ وَاللّٰهِ لَكَثِيْرٌ.

یہ جو آوازیں اٹھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے نکلے۔فرمایا،یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی آ پھنسا ہے۔صحابہ اس سے لشکر کی تعداد معلوم کرنا چاہتے ہیں تا کہ دشمن کی قوت کا پتہ چل جائے۔وہ بتاتا نہیں۔

فرمایا چھوڑ دو،کیوں پریشان کرتے ہو اسے یہاں لاؤ۔وہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔یہ نہیں کہ کہ تعداد کتنی ہے۔فرمایا،تمہارے لشکر میں گوشت تو ہوتا ہوگا؟ اس نے کہا جی ہاں روز ہوتا ہے۔فرمایا کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔اس نے کہا دس فرمایا بس معلوم ہوگیا ایک ہزار آدمی ہے۔اس لئے کہ ایک اونٹ میں سو آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔منٹ بھر میں پتا چلا لیا کہ ایک ہزار کی تعداد ہے۔تو سارے صحابہؓ عاجز آ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پل بھر میں اس سے بات نکالی یہ وحیؑ سے نہیں بلکہ عقل سے پتہ چلایا۔

تو انبیاء علیہم السلام کا جیسے علم اور دین کامل ہوتا ہے۔ایسے ہی ان کی عقل کامل ہوتی ہے۔کوئی عقلمند ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور انہی کی عقل کے اوپر علم کی وحی اترتی ہے۔اگر عقل کامل نہ ہو تو وہ اتنا علم کیسے برداشت کرسکتے ہیں،کسی

استاد کے سامنے دو طالب علم ہوں ایک عقلمند ہو اور ایک بیوقوف ہو۔ استاذ دونوں کے سامنے ایک تقریر کرے گا۔ عقلمند تو اس سے دوگنا علم لے کے جائے گا اور بے وقوف کو جتنا پہلے سے تھا، اسے بھی کھو کر جائے گا تو عقل کے بقدر آدمی علم قبول کرتا ہے تو انبیاء کی عقلیں اگر غالب نہ ہوں تو اللہ کا اتنا بڑا علم ان کے قلوب کے اندر کیسے کھپ سکتا تھا۔ شریعت کا عمل ان کی طبیعت کے اوپر اترتا ہے اور علم ان کی عقل کے اوپر اترتا ہے۔ اس لئے علم بھی چوگنا ہوتا ہے جیسے عقل چوگنی، عمل بھی مضبوط ہوتا ہے کیونکہ سچا عمل ان کی طبیعت کا تقاضا ہے، پیغمبر کی طبیعت برائی کی طرف نہیں جاسکتی تو طبیعت پر شریعت اور عقل پر وحی اترتی ہے۔ اس لئے علم بھی کامل اور دین و عمل بھی کامل ہوتا ہے۔

میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ بخت نصر نے سوال کیا کہ آپ نے میرے قانون کے مطابق مجھے سجدہ کیوں نہ کیا؟ تو دانیال پیغمبر ہیں، جیسے عامل کامل ہیں، عاقل بھی کامل ہیں۔ سبحان اللہ! کیا جواب دیا۔ فرمایا میں نے قصداً سجدہ نہیں کیا، اس لئے کہ سجدہ نہ کرنے میں میرا بھی نفع تھا، تیرا بھی نفع، اگر میں سجدہ کر لیتا تو تو بھی مارا جاتا اور میں بھی مارا جاتا؟ اس نے کہا یہ کیا بات ہے، سجدہ کرنے میں میری عزت تھی میں کیسے مارا جاتا؟ فرمایا اس کی وجہ ہے، وہ یہ کہ ایک میرا رب ہے اس نے مجھے علم دے رکھا ہے۔ یعنی بات تدبیر سے کی اور کتنی سچی اور سیدھی۔ تو اس نے مجھے علم دیا اور تیرا خواب بھی مجھے بتایا میرے ذہن میں جو تیرا خواب ہے۔ وہ میرا ذاتی علم نہیں وہ میرے رب کا بتلایا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ کہیں وہ کہے کہ یہ تو پیغمبر ہیں اور مجھے تبلیغ کرنے آ[illegible] تو اگر میں تجھے سجدہ کر لیتا وہ مجھ سے خفا ہو جاتا۔ میرا علم مجھ سے چھین لیتا تو میں تو یوں گیا جب علم ہی ختم ہو گیا، میری حیثیت عرفی ختم ہو گئی اور میرے سوا تجھے خواب بتانے والا کوئی نہیں تو تو الجھن میں گرفتار رہتا تو بھی مارا جاتا۔ اس لئے میں نے سجدہ نہیں کیا تاکہ میرا علم باقی رہے اور میں تجھے خواب بتا سکوں میں بھی محفوظ رہوں تو بھی محفوظ رہے۔

اس نے ہاتھ چومے اور کہا میں نے دنیا میں اتنا دانشمند آدمی نہیں دیکھا جتنا کہ آپ ہیں اور اپنے رب کا ایسا خادم میں نے نہیں دیکھا کہ غائبانہ بھی اپنے رب کی خدمت کرے۔ تیرا رب یہاں میرے سامنے ہے نہ تیرے سامنے اس کے باوجود تو اپنے رب کی اتنی عظمت کرتا ہے میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک میرا رب سامنے نہیں آتا پیٹھ پیچھے تو میں بھی اس کو گالیاں دیتا رہتا ہوں۔ برا بھلا کہتا ہوں سامنے آتا ہے تو ڈرتا ہوں، مگر حقیقی معنی میں عابد تو ہے کہ تیری آنکھوں کے سامنے رب نہیں ہے، اس کے باوجود تیرے دل میں عظمت موجود تو تیرے سے زیادہ عقلمند اور تیرے سے زیادہ امانت دار بھی میں نے نہیں دیکھا، تو کیا واقعی تجھے میرا خواب معلوم ہے؟ فرمایا، ہاں واقعی مجھے تیرا خواب معلوم ہے۔ اس نے کہا، میرے دل میں بے چینی ہے بس جلدی بتلا۔ میں تو گھٹن میں مبتلا ہوں۔

بخت نصر کا خواب...... فرمایا کہ: سن تو نے خواب یہ دیکھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان میں ایک عظیم الشان بت ہے جس کا سر آسمان پر اور پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک مونڈھا مشرق میں ہے ایک مغرب میں۔

پوری فضا اس سے گھری ہوئی ہے تو اس کو حیرانی سے دیکھ رہا ہے کہ کتنا خوبصورت بنایا گیا ہے اور بنانے والا کیسا کاریگر ہے، اتنا بڑا بت کہ زمین وآسمان کے درمیان ساری فضا گھیرے ہوئے ہے۔

پھر اس بت کی شان یہ ہے کہ چہرہ تو اس کا سونے کا ہے اور سینہ چاندی کا اور پیٹ پیتل کا ہے، رانیں تانبے کی ہیں اور پنڈلیاں لوہے اور سیسے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ ہر دھات الگ الگ چمک رہی ہے سونا سب سے زیادہ باقیمت ہے وہ اوپر ہے، چاندی اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، پیتل اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، تانبا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، لوہا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے اور مٹی کی کوئی قیمت نہیں تو وہ قدم بنی ہوئی ہے ہر دھات اپنی اپنی جگہ چمک رہی ہے۔

تو ابھی اسی حیرت میں ہی تھا، تو نے دوسری بات یہ دیکھی کہ آسمان سے پتھر گرا اور اس زور سے اس بت کے سر پر آ کر پڑا کہ بت چکنا چور ہو گیا۔ صرف یہی نہیں کہ ٹوٹ گیا بلکہ اوپر سے لے کر نیچے تک ریت کی طرح گر گیا اور وہ جتنی دھاتیں تھیں سب مل کر یک جان ہو گئیں۔ نہ سونا سونا رہا، نہ چاندی چاندی سب گڈمڈ ہو کر ایک ذات بن گئے۔ اب اس ذات میں سب کی تھوڑی تھوڑی چمک تھی مگر الگ الگ نمایاں نہیں تو اس سے اور زیادہ حیرت میں ہے کہ یہ پتھر کیا ہے؟ کہ ایک ضرب میں اس نے سارے بت کو توڑ دیا اور محض ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ پیس کر ایک ذات کر دیا ابھی تو دوسری حیرت میں تھا تو تو نے یہ دیکھا کہ وہ فضا جو بت سے خالی ہو گئی۔ اب وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا پھیلتے پھیلتے وہ ساری فضا میں پھیل گیا جہاں تک وہ بت پھیلا ہوا تھا وہ پتھر پھیل گیا۔ اس پر تیری آنکھ کھل گئی۔ اس نے کہا میں اپنے رب کی قسم کھاتا ہوں، میرا خواب یہی تھا۔ تو نے بیان کرنے میں ذرہ برابر کمی کی، نہ زیادتی کی۔ ہو بہو یہی واقعہ ہے اور یہی میرے قلب کی حیرت کی کیفیت تھی جو تو نے کھول دی۔

حضرت دانیال علیہ السلام سے تعبیر...... پھر کہنے لگا کہ خدا کیلئے تعبیر جلدی بتا، میں تو مضطرب اور بے چین ہوں۔ فرمایا سن یہ جو تو نے بت دیکھا یہ دنیا کی قومیتیں ہیں۔ سب سے اوپر جو سونا دیکھا وہ تیری عراقی قوم ہے جس میں سب سے پہلے دنیا کا تمدن آیا۔ تمدن کے متعلق مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ سب سے پہلی متمدن قوم عراق کی ہے۔ بغداد سے تمدن شروع ہوا ہے تو یہ تیری قوم ہے جو اعلیٰ ترین تمدن لئے ہوئے ہے اور سونے کی طرح چمک رہی ہے تیرے گزرنے کے بعد دوسری قوم آئے گی۔ تیرے بیٹے کی ہوگی وہ چاندی کی طرح سے ہوگی گویا اس کا رتبہ گھٹ جائے گا اور یہ جو تو نے پیتل دیکھا ہے یہ زرد رنگ کی قومیں ہیں جیسے چینی جاپانی ہوتے ہیں کہ انکے چہروں کی رنگتیں زرد ہوتی ہیں اور یہ جو تو نے تانبا دیکھا، یہ سرخ رنگ کی اقوام ہیں۔ جیسے عربی حجازی اور شامی، ان کے چہرے سرخی مائل ہوتے ہیں اور جو یہ تو نے لوہا دیکھا یہ کالی قومیں ہیں جیسے تر ونی اور حبشی، یہ جو تو نے قدموں میں مٹی دیکھی یہ دو ملکائیں پیدا ہوں گی، دو عورتیں بادشاہ بنیں گی۔ جو بہت کمزور حالت میں ہوں گی۔ ان کی قوم کو کمزور دکھایا گیا۔ دنیا انہیں نیچ سمجھے گی۔ تو تیری قوم سب سے زیادہ اونچی اور مٹی کی، یہ قوم سب سے زیادہ نیچی

جنہیں سب نے پامال کیا ہوگا، اور باقی دوسری قومیں درجہ بدرجہ فرق مراتب میں ہیں۔ تو تو نے یہ دیکھا کہ دنیا کہ قومیتوں کی اونچ نیچ ہے۔ کوئی قوم کہتی تھی کہ میں سونا ہوں، کوئی کہتی تھی میں چاندی ہوں وغیرہ، تو دنیا میں اونچ نیچ، قومیت اور برتری پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر والی قوم نیچے والی قوم کو حقیر جانتی تھی۔ دنیا میں حقارت اور کبر ونخوت کا دور دورہ تھا۔ کوئی کہتی تھی کہ ہم برما جی کے منہ سے نکلی ہوئی قوم ہیں، ہم برہمن ہیں، ہمارا مقام اونچا ہے، یہ جو اچھوت اقوام ہیں یہ نیچی ہیں یہ برما جی کے قدموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ہمیشہ ذلیل ہونے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو اونچ نیچ میں دنیا گرفتار تھی اور قومیتیں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح چمک رہی تھیں کہ اچانک پتھر گرا۔ یہ پتھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تھا۔ یہ دین اسلام تھا جس نے آکر دنیا کی قومیتوں کے اوپر ضرب لگائی اور اس درجہ پامال کر دیا کہ اونچ نیچ یکساں ہو کر سب گڈمڈ ہو گیا۔ نہ سونا سونا نظر آیا نہ چاندی چاندی، خلط ملط ہو کر دنیا میں یکسانیت اور مساوات پیدا ہو گئی اور قانونی طور پر مساوات دنیا میں پھیل گئی۔

اس کے بعد تو نے دیکھا کہ وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا۔ یہ اس دین کا انجام ہے کہ انجام کار دنیا کے آخری حصے میں یہی دین پورے عالم میں پھیل کر رہے گا اور پوری دنیا اسی کے اوپر آئے گی۔ جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ تو جذبات عالمگیری کی طرف جا رہے ہیں کہ سب قومیں ایک پلیٹ فارم کے اوپر آئیں۔ سب کا مسلک اور نصب العین ایک ہو تو یکسانی، مساوات اور وحدت اقوام ہو۔ تو یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے جو انجام کار پورے عالم میں پھیل کر رہے گا۔ یہ تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

علم نبوت کی وجہ سے بنی اسرائیل کو دوبارہ عروج ملا...... اس نے ہاتھ چومے اور کہا کہ میں نے دنیا میں نہ اتنا دانشمند دیکھا نہ اتنا عارف کامل دیکھا اور آج سے میں نے حکم جاری کر دیا کہ میری سلطنت کا کوئی کام تیرے مشورے کے بغیر نہ ہو، وزارت کا قلمدان تیرے ہاتھ میں ہو، میرا بھی کوئی حکم اس وقت تک نہیں چلے گا جب تک تو اس پر صادر نہ کرے گا، اس لئے کہ میں نے آج تک ایسی کامل عقل نہیں دیکھی۔ چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام عملی طور پر خود بادشاہ ہو گئے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں برتری دلانے والی طاقت علم کی طاقت ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے پاس نہ دولت نہ حشمت نہ کروفر تھا، وحی کا علم تھا۔ اس علم سے وہ برتری پھیلی کہ دنیا کے بڑی سے بڑی قوم ان کے سامنے پست ہو گئی اور قلمدان وزارت ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم قلم کش را بدولت می رسانم

قلم کہتا ہے کہ میں دنیا کا اصل بادشاہ ہوں جو قلم چلاتا ہے میں اس کو بڑی بڑی حکومتوں پر اور بڑی بڑی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہوں۔ تو جس قوم نے دنیا میں برتری حاصل کی وہ محض صورت اور خوبصورتی سے نہیں ہوتی بلکہ خوبصورتی فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ علم فتنوں کے مٹانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

محض حسن صورت فتنہ کا پیشہ خیمہ ہے...... حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ حسین دنیا میں کوئی نہیں گزرا

حدیث میں فرمایا گیا ہے "فَإِذَا قَدْ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ" ① دنیا میں جب اللہ نے حسن پیدا کیا، تو آدھا حسن و جمال پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ زنانِ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھا، تو یک زبان ہو کر کہا تھا کہ ﴿وَاللّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا. اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ﴾ ② یہ کوئی بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ گویا ان کا حسن و جمال یہ ہے کہ قرآن بھی شہادت دے رہا ہے۔ اور حدیث بھی شہادت دے رہی ہے لیکن جتنی مصیبتیں اور فتنے یوسف علیہ السلام پر آئے، حسن صورت کی بدولت آئے۔ کنعان کے کنویں میں بھائیوں نے حسد کر کے ڈالا۔ انہیں ان کی خوبصورتی پر حسد تھا، قافلہ نے نکالا اور مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ حسن صورت نے غلام بنوایا بیگمات مصر میں سے زلیخا عاشق ہوگی جو بادشاہ مصر کی بیوی تھی اس نے برا ارادہ کیا، پیغمبری کی وجہ سے بچے مگر اس نے جیل خانے میں ڈالا تو خوبصورتی کی بدولت نو برس جیل بھگتی، تو غلامی، جیل خانہ اور کنویں میں ڈالا جانا، یہ ساری مصیبتیں خوبصورتی کی بدولت آئیں اور مصر کی بادشاہت لینے کا وقت آیا۔ تو کیا فرمایا؟ ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ③ اگر ملک سنبھالنا ہے اور ملک کا نظم درست کرنا ہے تو ملک کی کنجیاں میرے سپرد کرو۔ میں انتظام کر کے دکھلاؤں گا کیوں؟ یہ نہیں فرمایا کہ اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ میں بڑا خوبصورت ہوں، بڑی عمدہ سلطنت چلاؤں گا۔ یہ فرمایا ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ④ میرے اندر علم ہے اور حفظ کا مادہ موجود ہے۔ تو فتنہ کا وقت آیا تو صورت کی خوبی آگے بڑھی اور سلطنت لینے کا وقت آیا تو علم اور کمال آگے بڑھا۔ دنیا میں فرد ہو یا قوم، اسے ترقی علم کی بدولت ہوتی ہے۔ حسن صورت، ظاہری آرائش اور جمال کی وجہ سے آدمی نہیں بڑھتا۔

جہالت تمام برائیوں کی جامع ہے...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوتی ہے تو آپ سے پہلے کا زمانہ سب سے برا زمانہ ہے۔ تاریخ میں موجود ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی برائی ایسی نہ تھی جو موجود نہ تھی۔ بدکاری، بداعتقادی، بدعملی اور قساوت قلبی وغیرہ ان میں تھی۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں ذبح کر دیتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے ان کے دل میں کوئی رحم نہیں آتا تھا۔ ڈکیتی ان کا رات دن کا شیوہ تھا۔ لڑائی جھگڑے اور فتنے رات دن کا قصہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دو خاندانوں میں جنگ شروع ہوتی جن دو میں لڑائی ہوتی تھی۔ جب وہ مرتے تھے وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی مت بند کرنا، کہیں خاندان کی ناک کٹ جائے۔ تو خاندان کی ناک کٹنے کی وجہ سے پچاس پچاس برس تک جنگ جاری رہتی تھی لڑتے، بدعملی اور بداعتقادی سے انہیں عار نہیں تھا۔ شرک انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ کے ارد گرد مطاف میں رکھے ہوئے تھے۔ تو تین سو ساٹھ بتوں کی تو وہاں عبادت

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ ......، ج: ۱ ص: ۱۴۶ رقم: ۱۶۲.

② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ③ ④ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

ہوتی تھی کثاف اور نائلہ کے دو بت بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے، وہاں ان کی عبادت ہوتی تھی۔ گھر آتے تھے تو ہر خاندان اور قبیلہ کا بت الگ تھا۔ ایک خاندان کو عار آتا تھا کہ میں اس کے بت کو کیسے پوج لوں۔ یہ چھوٹا خاندان ہے میرا خاندان بڑا ہے، تو اس کا بت چھوٹا، میرا بت بڑا تو تعصبات چلتے تھے اور خاندانوں کے بت الگ تھے۔ پھر گھر گھر میں الگ الگ بت تھے۔ ایک گھر والا دوسرے گھر والے کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا کہ میرا خدا میرے گھر میں موجود ہے میں اس کے گھر کی طرف کیوں رجوع کروں؟ پھر ہر شخص کا خدا الگ تھا۔ پھر ہر شخص کے سفر کا الگ اور حضر کا الگ خدا تھا۔ پھر ایک شخص سفر کرتا تھا تو خدا کو جیب میں ڈال کے لے جاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہاں نہ ملے، تو عبادت دیوجا کس کی کروں گا؟ وہاں پہاڑ پہ بیٹھ کے عبادت شروع کی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اتفاق سے نظر پڑی کہ میرے سامنے جو پتھر ہے اس سے زیادہ خوبصورت وہ پڑا ہوا ہے اسے پھینک دیا، اسے اٹھا کے آگے رکھ لیا، اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے جیسے ایک بیوی تھی اسے طلاق دیدی۔ دوسری کرلی۔ یہ حالت خداؤں کی کر رکھی تھی کہ عابدوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی خداؤں اور معبودوں کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ شرک انتہائی، بدعملی، بداعتقادی اور بے رحمی انتہائی سارے برے اخلاق جمع ہوگئے تھے۔ لیکن اس زمانے کا جو نام رکھا گیا تو یہ نہیں رکھا گیا کہ زمانہ بدکاری، زمانہ قتل وغارت، زمانہ ڈکیتی اس کا نام زمانہ جاہلیت رکھا گیا جس سے بتلانا ہے کہ ساری برائیوں کا سرچشمہ جہالت ہے اگر وہ زمانہ جاہلیت نہ ہوتا۔ یہ بدکاریاں بھی نمایاں نہ ہوتیں ہر بدکاری الگ الگ ہے اور سب کی جامع جہالت ہے جس سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

علم تمام کمالات کا سرچشمہ ہے ...... اس زمانے کے خلاف جب اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کو بھیجا اور آپ نور لے کر آئے تو سب سے پہلی آیت قرآن کریم کی کیا اتری؟ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ ① پڑھو، یعنی جہالت دور کرو۔ اگر یہ چیز تمہیں رفع کرنی ہے، دنیا کی قومیں عربوں کو ذلیل وحقیر جانتی تھی۔ اگر یہ ذلت اور حقارت اپنی قوم سے مٹانی ہے۔ تو وہ جہالت سے آئی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اِقْرَأْ پڑھو اور پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہو جاؤ، جہالت کے جب یہ کرشمے تھے تو علم کا یہ کرشمہ ہوگا کہ ذلت کی بجائے عزت آئے گی۔ برائی کی جگہ بھلائی آئے گی۔ غلط اعتقاد کی بجائے صحیح اعتقاد آئیں گے، بدعملی کی بجائے صحیح عمل آئیں گے۔ شرک کی بجائے توحید پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جن جن سعادت مند قلوب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو سنا اور مانا اور قرآن کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ تو وہی زمانہ جس کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ اس کا نام خیر القرون ہوا کہ سب زمانوں میں بہترین زمانہ جن لوگوں کا نام جہلائے مکہ تھا، ان کا نام صحابہ کرامؓ ہوا، جن کا نام لے کر قوموں میں لعنت بھیجی جاتی تھی ان کا نام لے کر اب رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا جاتا ہے، اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی جن کی ذلت کا یہ عالم تھا کہ قومیں ان کو کہتی تھی کہ چرواہے، مینگنیوں میں کھیلنے والے، گندگیوں میں بسر کرنے والے،

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۔

اب ان کا لقب عارفین کاملین ہوا، صفائی ستھرائی ان میں، طہارت وعبادت ان میں، ذہانت وکمالات ان میں۔ بالکل زمانہ لوٹ گیا کہ یا بدتھا یا بہتر ہوگیا۔ یا جہالت کا تھا یا علم کا ہوگیا۔ یہ قرآنی تعلیم کی بدولت تھا، تو پہلی آیت قرآن کریم کی یہی نازل ہوئی کہ اِقْـرَأْ جس سے واضح ہے کہ جب کوئی قوم ذلت میں گرفتار ہو جائے پریشانیوں میں مبتلا ہو اس کا علاج یہ ہے کہ علم کے ذریعے پہلے اپنے اخلاق اور اعمال درست کرے۔ چاہے اس میں کچھ مدت لگے لیکن انجام جبھی صحیح نکلے گا جب یہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ برس تک تعلیم دی مکہ میں تیرہ برس کی زندگی کیسی تھی؟ مسلمان انتہائی کمزور، کھانے کی نہیں، پینے کو نہیں، شوکت ان کے ہاتھ میں نہیں، تعداد ندارد، ہر چیز کے محتاج حتیٰ کہ مارے پیٹے جاتے تھے۔ صحابہؓ پر زیادتیاں، بدگوئیاں اور گالم گلوچ ہوتی تھی حکم یہ تھا کہ صبر کرو، تحمل کرو۔

مگر صبر وتحمل کے معنی یہ نہیں کہ پٹتے رہو۔ یہ بزدلی ہے۔ اسلام نے بزدلی نہیں سکھلائی۔ اسلام اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے محض پٹتے رہنا۔ یہ بزدلی تھی۔ تو جہاں یہ حکم آیا کہ پٹتے رہو، مار کھاتے رہو۔ مگر ساتھ میں حملہ بھی کرو اور حملہ کیا۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ① کلمۂ حق کا اعلان کرتے رہو۔ اللہ کی طرف دعوت دیتے رہو، اللہ کی طرف بلاتے رہو، ماریں تو پٹتے رہو۔ برا بھلا کہیں، سنتے رہو، قتل کریں، مقتول ہو جاؤ۔ مگر کلمہ حق کی تبلیغ و دعوت مت چھوڑو۔ تو فقط پٹنا نہیں بتلایا بلکہ حملہ بھی بتلایا۔ مگر یہ حملہ تلوار، لاٹھی اور ہاتھ پیر سے نہیں حملہ زبان اور کلمہ حق کے ذریعے سے تھا۔

اس کے جواب میں تو تلوار چلتی تھی۔ اگر صحابہ کلمۂ حق بلند نہ کرتے، تو وہ خاندانی لوگ تھے سب آپس میں رشتہ دار تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف کون کھڑا ہوتا؟ یہ جو حملہ ہوتا تھا یہ ان کے حملہ کے جواب میں ہوتا تھا۔ مگر یہ حملہ کلمہ حق سے کرتے وہ ہاتھ سے کرتے تھے، اس لئے کہ اِدھر علم تھا اور علم والا سچی بات سے حملہ کرتا ہے جاہل ہاتھ سے جواب دیتا ہے اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تو لڑائی جاری تھی مگر اُدھر سے حملہ علم کے راستے سے اور اِدھر سے جہالت کے راستے سے ہوتا تھا۔ اس راستے میں فرمایا گیا کہ مار کھاؤ پٹو، کوئی پرواہ مت کرو۔ جواب بھی مت دو آیتیں جو نازل ہوتی تھیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا تھا: ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ② ﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ③ ''اے نبی صبر جمیل اختیار کر، ان مشرکوں سے اعراض کرو، ان کے برا بھلا کہنے پر مت جاؤ۔ یہ کہتے رہیں، آپؐ اپنا کام کریں''۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ ④ اے نبی! ہم جانتے جب یہ آپ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ تو آپ کا دل گھٹتا ہے، بشری طبیعت کے مطابق کوفت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کو رنج

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۵۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المعارج، الآیۃ: ۵.
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۶. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۷، ۹۹.

ہوتا ہے لیکن ان بے تمیزوں کو بکنے دو۔ آپ اللہ کی تسبیح و تہلیل اور اس کے ذکر میں لگیں۔ ان کو یہی توفیق ہے کہ یہ برا کہیں۔ آپ کی توفیق یہ کہ آپ کلمات حقہ زبان سے ادا کریں۔ تیرہ برس آپ نے اور صحابہؓ نے اس مصیبت میں گزارے۔ تیرہ برس کے بعد جو زمانہ لوٹا تو جو اقلیت تھی وہ اکثریت بن گئی، جو بے عزت تھے وہ عزت والے بن گئے، جن کے ہاتھ میں شوکت نہیں تھی وہ شوکت والے بن گئے، جو بے زر اور بے کس تھے ان کے ہاتھ میں قیصر و کسریٰ کے خزانے آنے شروع ہو گئے۔ ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔

تعمیر باطن سے دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے...... یہ کب ہوا؟ جب پہلے انہوں نے اپنے اندر انقلاب پیدا کیا۔ دنیا میں انقلاب باہر سے نہیں اندر سے چلتا ہے اپنے اندر کی تعمیر کرے، اپنے اخلاق درست کرے، اپنا کیرکٹر سنوارے، دنیا کی قومیں خود اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔ ہم اگر برا کردار پیش کریں گے اس کے جواب میں دنیا توہین و تذلیل کرے گی۔ لیکن اگر ہم وقار و متانت و سنجیدگی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کریں گے تو کیا دنیا کے دماغ میں پھوڑا اٹھا ہے کہ پھر بھی خواہ مخواہ بدگوئی کرے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ کرے گی تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ اس کا مستحق نہیں ہے، یہ سچا آدمی ہے تو اندورنی اخلاق جب اعلیٰ طریق پر ظاہر ہوتے ہیں تو میں خود جھک جاتی ہیں۔

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے، میرے قانون کو چھوڑ دیتی ہے۔ رات دن گناہوں میں اور معصیتوں میں مبتلا ہوتی ہے تو میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں اس کی عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ قومیں کھڑی ہوتی ہیں، انہیں سزا دیتی ہیں۔ تلوار اور ہاتھ سے بھی، دولت و شوکت چھیننے سے بھی، وہ میری طرف سے جلاد کے طور پر کام کرتی ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں ہیں میرا حکم چل رہا ہے۔ فرمایا اگر یہ تمہیں ناگوار ہے کہ دنیا کی قومیں تم پر مسلط ہو کر تمہیں تباہ و ذلیل کریں۔ انہیں برا بھلا مت کہو میرے سے معاملہ درست کر لو۔ میں ان کے قلوب میں عداوت کی بجائے محبت ڈال دوں گا۔ وہی قومیں جو تمہارے مدمقابل تھیں وہ سرنگوں ہو جائیں گی۔ قلوب میرے ہاتھ میں ہیں“ اَلْقُلُوْبُ بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ یُصَرِّفُهَا حَیْثُ یَشَآءُ۔ ”①

فرماتے ہیں دنیا کے قلوب رحمٰن کی دو انگلیوں کی بیچ میں ہیں۔ جدھر کو چاہیں پلٹ دیں۔

شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے، بڑی کامل اور جامع نصیحت کی ہے۔

گرگز ندت رسدز خلق مرنج   کہ نہ راحت رسدز خلق نہ رنج

اگر تمہیں دنیا سے تکلیف پہنچے رنجیدہ مت ہو، اس لئے کہ دنیا کے ہاتھ میں نہ رنج پہنچانا ہے نہ خوشی پہنچانا۔ اگر کوئی تمہاری جائیداد چھیننے کے لئے کھڑا ہو تو اس کے قبضۂ قدرت میں ہے کب؟ وہ تو اللہ کی طرف سے مامور ہے جو کر رہا ہے۔ تو ؎

① السنن للترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن، ج:۸ ص: ۲۹ رقم: ۲۰۶۶.

گر گزند ت رسد زخلق مرنج ۔۔۔۔۔ کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست ۔۔۔۔۔ کہ دل ہر دو در تصرف اوست

دشمن کا خلاف اور دوستوں کی موافقت خدا کی طرف سے سمجھو، اس لئے کہ دل اس کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے کسی کو کسی کا دشمن بنادے، چاہے دوست بنادے، تو بجائے اس کے کہ دوستوں اور دشمنوں کے پیچھے پڑے رہو کہ یہ ہمارا دشمن ہے اس کو کس طرح سے ماریں اور یہ ہمارا دوست ہے اس کو کس طرح سے سر پر اٹھائیں، تم اس سے معاملہ کیوں نہیں درست کرتے کہ دوست دشمن دونوں کے قلوب اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ دوستوں کو پکا دوست بنادے گا۔ دشمنوں کو دوستی کی طرف مائل کردے گا۔

دنیا میں **حقیقی دانشمند اہل اللہ ہیں**...... دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ایک ایک سے معاملہ کرو، ایک ایک کی خوشامد کرو، ہزار کی کرو، ایک ذات کی کیوں نہ کرلو کہ سب کی ضرورت ہی نہ پڑے سیدھا سیدھا معاملہ ہے۔

ہارون رشید دربار میں بیٹھا ہوا تھا، اسے جوش آیا تو درباریوں سے خطاب کر کے کہا، آج جس کا جو جی چاہے مانگے میں اس کو وہی دوں گا۔ کسی نے کہا حضور! مجھے دس لاکھ دیدیجئے۔ خزانچی کو حکم دیا، دیدو۔ کسی نے کہا، مجھے فلاں صوبے کی گورنری کا عہدہ دے دیجئے اس نے کہا دے دیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں فلاں قلعہ بخش دیجئے۔ اس نے کہا دیدیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں باغ دیدیجئے اس نے کہا دیدیا۔ غرض جتنے درباری تھے، منہ مانگی مرادیں مانگ رہے ہیں۔

ہارون رشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ ہارون رشید نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔ تو نے کچھ نہیں مانگا، اس نے کہا ان گدھوں کو نمٹ لینے دیجئے۔ اس کے بعد میں مانگوں گی۔ یہ احمق جب نمٹ جائیں گے، جب میں مانگوں گی۔

ہارون رشید نے کہا اچھا! یہ دربار کے سب امراء، وزرا، حکام، یہ سب گدھے اور احمق ہیں؟ اس نے کہا سب گدھے اور احمق ہیں۔ انہیں تمیز تو ہے ہی نہیں۔ ہارون رشید حیران ہوا کہ یہ عورت ذات تو بن گئی عقلمند اور یہ جتنے وزراء ہیں بے وقوف بن گئے، یہ خود احمق معلوم ہوتی ہے کیا تیرے دماغ میں مالیخولیا ہے۔ یہ سب میرے وزراء ہیں اور میرے ملک کا انتظام چلا رہے ہیں خزانوں کے مالک ہیں یہ سارے گدھے ہیں؟

اس نے کہا: حضور! سارے گدھے ہیں، ان میں تمیز نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ ہارون رشید نے بھی یہ سمجھا کہ عورت ذات ہے بکواس کر رہی ہے۔ میں کہاں اس کے منہ آؤں؟ تو اب ہارون نے باندی کی طرف دیکھا اور کہا کیا تو کچھ مانگنا چاہتی ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ بے وقوف نمٹ چکے ہیں اب میرا موقع آیا ہے۔ اب میں مانگوں گی۔ ہارون نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے؟ کہا جو میں مانگوں گی دو گے؟ اس نے کہا میرا وعدہ واعلان ہے۔ اس نے ہارون کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں کہ آپ میرے ہو جائیں۔ تو اس نے واقعی عقلمندی کا ثبوت دیا، اس لئے کہ جس نے دس لاکھ مانگے مل گئے اور کچھ نہیں ملا۔ جس نے قلعہ مانگا اس کا کو قلعہ مل گیا باقی کچھ نہیں

ملا۔عہدہ مانگا، ایک عہدہ مل گیا۔باقی کچھ نہیں۔

اس نے ہارون رشید کو مانگ لیا کہ جب بادشاہ میرا تو عہدے بھی میرے، قلعے بھی میرے، خزانے بھی میرے، قوم بھی میری۔تو دانشمندی کی بات یہ تھی کہ اس نے جڑ بنیاد کو پکڑ لیا اور انہوں نے شاخوں کو پکڑا۔کسی نے پتہ لے لیا۔کسی نے پھل توڑ لیا۔اس نے کہا میں درخت ہی پر قبضہ نہ کروں کہ سارے پتے بھی اور سارے پھل بھی میرے ہو جائیں تو حقیقتاً اس باندی نے عورت ہو کر دانشمندی اور عقل کا ثبوت دیا۔

میں کہتا ہوں دنیا میں اہل اللہ حقیقت میں عقلمند ہیں جنہوں نے بجائے اس کہ یہ دولت لیں، وہ دولت لیں، اللہ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے ہو جایئے۔جب آپ ہمارے ہیں تو ساری دنیا ہماری، ساری آخرت ہماری، ساری جنتیں ہماری۔عرش و کرسی اور لوح قلم ہمارے اور آپ ہمارے نہیں ہیں تو اگر کسی نے دولت لے لی تو چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔آگے اس کے لئے کچھ بھی نہیں۔بڑی سے بڑی دولت حتیٰ کہ ہفت اقلیم کی دولت بھی مل جائے مگر اللہ سے تعلق نہ ہو تو دنیا میں بھی ممکن ہے کہ وہ ختم ہو جائے ورنہ موت تو ختم کر ہی دے گی۔آخرت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔کوئی چیز اس کی قسمت کی نہیں ہے۔تو واقعہ یہ ہے کہ باندی نے عقلمندی دکھلائی۔اسی طرح اللہ والے عقلمند ہیں جنہوں نے جڑ بنیاد پکڑ رکھی ہے۔یہی میں عرض کر رہا ہوں کہ بجائے اس کے کہ پچاس ہزار کو راضی کرنے کے کی کوشش کی جائے، ایک کو کیوں نہ راضی کر لیا جائے کہ وہ سارے پچاس ہزار غلام بنیں۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق بندگی کا ہونا چاہئے......مگر ساتھ میں یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کو جو راضی کیا جائے اور اس سے جو تعلق رکھا جائے وہ خود غرضی سے نہ رکھا جائے اس وجہ سے اللہ کو راضی کریں کہ میرا گھر بن جائے، میری دولت بڑھ جائے، تو اللہ مقصود نہ ہوا وہ تو گھر دولت مقصود ہو گئی۔اللہ کو راضی اس لئے کرو کہ حق یہی ہے کہ وہ راضی ہو۔جب وہ راضی ہو گیا تو سب کچھ مل گیا اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو آخرت تو مل گئی۔فرض کرو کہ آخرت بھی نہ ملے۔اللہ یوں کہہ دے کہ میں راضی ہوں، سب کچھ مل گیا۔اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مزد مکن ۔۔۔ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اللہ کی بندگی اور عبادت مزدوروں کی طرح مت کرو کہ صاحب! اجرت ملے گی تو سجدہ کریں گے۔ذرا کمی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔یہ اپنی مجبوری کی بندگی ہے خدا کی بندگی نہیں ہے۔اس لئے اللہ کی بندگی کرو کہ وہ راضی ہو جائے ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے تو خود سارے خزانے مل جائیں گے۔مگر خود طمع مت رکھو۔

جب محبوب حقیقی اپنا ہو گیا، جو ساری برکتوں کا سرچشمہ ہے وہ اگر ہمارا ہے تو ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔تو ایک تو یہ کہ آپ اللہ کی عبادت کریں کہ مجھے دنیا میں فلاں قلعہ، کوٹھی مل جائے۔یہ بہت ہی کم جذبے کی خواہش ہے اور ایک یہ کہ آپ یوں کہیں کہ چاہے سارے جہاں مجھ سے چھوٹ جائیں مگر میرا اللہ مجھ سے راضی ہو یہ ہے مانگنے

کی چیز اللہ میاں کا امتحان مت لو امتحان تو وہ لے کہ تم نے دعویٰ سچا کیا کہ تم اللہ والے بننا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟ تم کون ہوتے ہو قدرت کا امتحان لینے والے؟ وہ امتحان لیں گے تم مفلس اور بندے بن کر ان کے سامنے اپنے کو ڈالدو کہ جو آپ چاہیں گے وہ ہی ہم بھی چاہیں گے۔

کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی پر دونوں جہاں چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کیا آپ اس درجہ کے ہیں کہ ساری دنیا وآخرت آپ کی مرضی پہ چل رہی ہے؟ فرمایا الحمد اللہ میں اسی درجے کا ہوں۔ میری مرضی پر دنیا وآخرت کے سارے واقعات چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا، یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہاں کے واقعات اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، جو اس کی مرضی ہے وہ میری مرضی ہے تو سارے جہاں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں۔ میری مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ کوئی مرے میں گھٹ کے بیٹھ جاؤں تو میں کوئی خدا سے لڑنے کے لئے جا رہا ہوں کہ وہ تو کہیں اس کی موت ہونی چاہئے۔ میں کہوں نہیں صاحب!۔ موت نہیں ہونی چاہئے یہ تو غلط بات ہے یہ تو لڑائی ہوگی اللہ میاں سے۔ آدمی بندہ بن کے بندگی دکھلائے بندگی کے معنی یہ ہیں کہ اپنی رضا اور خواہش کو فنا کر دے۔ جو آپ کی مرضی وہی میرے مرضی میں کون ہوں جو آپ کی مرضی کے خلاف کروں؟

ہمارے ہاں پنجاب میں شاہ دولہ ایک بزرگ گزرے ہیں، جمنا کے کنارے پر ایک بستی تھی، اس میں وہ رہتے تھے۔ برسات کا زمانہ آیا جمنا کا پانی چڑھا اور پانی چڑھ کر گاؤں کی طرف بڑھا۔ تو اس زمانے میں گاؤں میں چہار دیواری بنائی جاتی تھی۔ بستیاں گویا قلعہ بند ہوتی تھیں۔ تو وہاں ایک مضبوط دیوار تھی جس سے پانی ٹکرا رہا تھا اگر وہ نہ ہوتی تو گاؤں غرق ہوگیا ہوتا۔ مگر پانی جو آنا شروع ہوا تو آدھی دیوار تک پہنچ گیا اور اندیشہ ہوا کہ اب ذرا اوپر گیا تو اندر آیا اور بستی غرق ہوئی، لوگ گھبرا کے دوڑتے ہوئے شاہ دولہ کے پاس آئے اور کہا حضرت! دعا کیجئے، دست گیری کیجئے، گاؤں تو تباہ ہوا جمنا چڑھ رہی ہے اور دیوار تقریباً ڈوب چکی گز بھر باقی رہ گئی۔ اگر تھوڑا اور پانی آ گیا تو پھر گاؤں کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ فرمایا اچھا پانی زیادہ چڑھ گیا؟ عرض کیا بہت چڑھ گیا۔ فرمایا ایک پھاؤڑا اٹھا کے لاؤ (جس سے مزدور مٹی کھودتے ہیں) پھاؤڑا لایا گیا۔ شاہ دولہؒ نے اپنے کندھے پہ پھاؤڑا رکھا اور کہا چلو میرے ساتھ لوگ ساتھ آئے بیچارے خوش خوش کہ اب یہ کوئی تدبیر کریں گے۔ شاہ دولہؒ نے آتے ہی اس دیوار کو توڑنا شروع کیا جس سے پانی رک رہا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو گاؤں جلدی غرق ہو جائے گا۔ اسی نے تو گاؤں بچا رکھا ہے۔ فرمایا ''جدھر مولیٰ اُدھر شاہ دولہ''

نامعقولو! تم مجھے کیا اللہ میاں سے لڑوانے لائے ہو؟ کہ اللہ میاں تو چاہیں یہ بستی غرق ہو اور میں چاہوں غرق

نہ ہو۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ بستی غرق ہو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہؒ۔ تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جب منشاء خداوندی سامنے آئے اپنا ارادہ اور رضا فنا کر دے کہ میں تابع حق ہوں۔ حق کے مقابلے پر اپنی مرضی جتلانا، اپنی تجویزیں رکھنا کہ یوں ہونا چاہئے۔ یہ اللہ میاں کو مشورہ دینا ہے۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ یہ نہایت ہی غلط مقولہ ہے۔ کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو لوگ تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ اس میں لکھا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت پہ مجھے بے حد قلق ہوا۔ اس جاہل سے آدمی پوچھے کہ موت بھی کبھی بے وقت آتی ہے۔ موت کا وقت تو مقرر ہے۔ گویا اس وقت مرنا مناسب نہیں تھا۔ یعنی عیاذ باللہ۔ اللہ میاں ان سے مشورہ کرتے کہ ان صاحب کو اس وقت موت دوں یا نہ دوں؟ اور آپ مشورہ دیتے کہ ابھی موقع نہیں ہے دو چار دن کے بعد دے دیجئے گا۔ بندے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کوئی لفظ بھی ایسا بولے جس سے معلوم ہو کہ حق تعالیٰ کی رضا اور تقدیر کے مقابلہ میں اس کی کوئی تجویز ہے۔ یہ جو ساری آفتیں آتی ہیں اس لئے آتی ہیں کہ ہم اپنی تجویز کو آگے رکھتے ہیں۔ تقدیر کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور راضی نہیں ہوتے کہ جو اللہ کی تقدیر ہے وہی حق ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک غلام کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی کا کوئی غلام تھا اس سے پوچھا کہ بھئی تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ جو آقا کھلا دے۔ پہنے گا کیا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دیدے۔ اس نے کہا آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا میری اپنی مرضی ہوتی، میں غلام ہی کیوں بنتا۔ آقا ہی نہ ہو جاتا۔ غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری رائے بھی غلام، میری مرضی بھی غلام اور میری خواہش بھی غلام۔ جب ایک بندہ، بندہ کا غلام بن کر اتنا فنا ہو جائے کہ اپنی مرضی اور رائے کو بھی چھوڑ دے۔ تو ایک بندہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کا غلام ہوں اور پھر اپنی مرضی بھی چلائے۔ یہ اجتماع ضدین ہے۔ بندگی کے معنی ہیں کہ میں فنا ہوں اور تجویز پیش کرنے کے معنی ہیں کہ اللہ میاں مجھ سے مشورہ لے۔ یہ کام کیوں ہوا؟ میری تجویز کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ یہ سخت گستاخی کے الفاظ ہیں۔

مطیع کو سب کچھ اور مدعی کو کچھ نہیں ملتا...... بندہ کا کام یہ ہے کہ مرضی اور تجویز کو تو چھوڑ دے۔ جو انہوں نے قانون بتلا دیا اس پر عمل کرنا شروع کر دے۔ اطاعت کا ثمرہ یہ ہے کہ اس سے محبت پیدا ہو جائے گی۔ دنیا میں مطیع کو سب کچھ ملا ہے۔ جو طالب ہوا اور دعویٰ کرے اسے کبھی نہیں ملتا۔ اطاعت کا راستہ اختیار کرے خود بخود ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ صاحب! آپ ہمیں اپنے گھر کے راز بتلا دیجئے وہ کہے گا کہ نامعقول! تم کون ہوتے ہو میرے گھر کے راز پوچھنے والے؟ اور اگر آپ اس کے خادم بن جائیں چند دن کے بعد خود ہی سارے گھر کے راز کہہ دے گا۔

بادشاہ کے دربار میں ایک شخص جائے اور کہے کہ حضور اپنی بیگمات کو میرے سامنے کر دیجئے اور بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں چاندی کتنی اور سونا کتنا ہے؟ وہ کہے گا اس نامعقول کو کان سے پکڑ کے نکال دو یہ ہماری

بیگمات اور خزانے کا نام لے؟ اور یہ ہمارے توشے خانے کا نام لے کہ اس میں لباس کتنے اور ہتھیار کتنے؟ یہ کون بے ادب اور گستاخ ہے۔ کان پکڑ کر دربار سے نکال دیا جائے گا۔ یہ تو طالب کا انجام ہے جو مانگ رہا تھا۔

اور ایک وہ شخص ہے جو دربار میں آیا۔ بادشاہ نے کہا کھڑے ہو جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا حضور، کہا بیٹھ جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا حضور، غرض جب اطاعت مطلق ہوگی، بادشاہ کہے گا۔ بڑا نیاز مند ہے، بڑا مطیع ہے۔ تو اعتماد قائم ہوگا۔ بادشاہ کہے گا معلوم ہوتا ہے تو مخلص ہے اور نہایت مطیع اور وفادار ہے۔ اس واسطے شاہی محلات میں جس وقت تمہارا جی چاہے آ ؤ جاؤ، تم سے کوئی خطرہ نہیں۔ اندر جانا شروع ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بیگمات بھی اس سے پردہ چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ یہ ہمارا خاص آدمی ہے تو بیگمات نے باتیں شروع کیں۔ دو برس میں جب نیاز مندی اور اطاعت ظاہر ہوئی۔ بادشاہ نے کہا آ ؤ، آج تمہیں خزانے کی سیر کرائیں۔ تو شاہی خزانے پر لے گئے۔ سونا چاندی اور جواہرات دکھائے۔ اس نے اور زیادہ اطاعت شروع کی۔ جب ایک برس اور گزرا۔ بادشاہ نے کہا اس سے بہتر معتمد علیہ آدمی نہیں۔ لو اب تم پر سلطنت کی پالیسی اور راز بھی کھول دیتے ہیں۔

یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ اطاعت کا راستہ اختیار کیا اور پہلے کو دھکے دے کر کیوں نکال دیا گیا؟ اس لئے کہ اطاعت تو تھی نہیں اور خود مطالبہ کیا کہ اپنے اسرار مجھ پر کھول دیجئے۔ تو مطالبہ کرنے والے کا جواب کان پکڑ کے نکال دینا ہے اور اطاعت کرنے والے کا جواب یہ ہے کہ خود بادشاہ بلا بلا کر کہے کہ میرے راز معلوم کرو۔ ایک مومن کی یہ شان ہونی چاہئے کہ رات دن اطاعت میں سرگرم ہو۔ رات دن یہ معلوم کرے کہ جو شریعت اور قانون ہمارے لئے بھیجا گیا ہے۔ جب دین و دنیا کی بھلائی کے اس میں وعدے دیئے گئے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم اللہ کے وعدے پر اطمینان کریں۔ معاذ اللہ یہ وعدے غلط بھی ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ① اللہ ان لوگوں سے وعدہ کرتا ہے۔ جو ایمان کو قبول کریں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔ ہم انہیں زمین کی طاقت عطا کریں گے۔ یہ اللہ کا سچا اور اٹل وعدہ ہے۔ کوئی کر کے دکھلائے یقیناً اس کے سامنے وعدہ آئے گا۔ کر کے نہ دکھلائے، تجربہ ہی نہ کرے اس کا کوئی علاج نہیں۔ اگر ایک طبیب آپ سے یوں کہے کہ بھئی تمہیں زکام ہو رہا ہے۔ دہی بھی چھوڑ دو اور دودھ پینا بھی چھوڑ دو۔ ملٹھی اور بنفشہ استعمال کرو، اگر وہ طبیب کی اطاعت کرے، استعمال کرے، جبھی زکام جائے گا۔ اگر اس نے کہا، بات تو آپ نے سچی کی۔ باقی مجھے دودھ دہی سے فرصت نہیں۔ میرے گھر پہ تو گائے بھینس بندھی ہوئی ہے۔ جب بنٹے کے بنٹے دودھ کے بھرے ہوئے آئیں گے تو کس سے جی رہے گا۔ وہ تو پینے ہی کو جی چاہے گا۔ کون گل بنفشہ اور ملٹھی کی مصیبت میں پڑے۔ میں تو صاحب دودھ پیوں گا۔ قانون اپنی جگہ بالکل حق ہے۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

یہی شان اس وقت مسلمانوں کی ہے کہ شریعت کا حکم پیش کیا جائے تو کہتے ہیں کہ بات بالکل سچی ہے۔ حکم سرآنکھوں پر ہے۔ باقی دوکان، جائیداد، مکان اور اپنی عیش سے فرصت نہیں ہے۔ قانون حق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد بھی اچھی چیز ہے، نماز بھی اچھی چیز ہے، روزہ، زکوۃ اور اطاعت خداوندی بڑی عمدہ چیزیں ہیں مگر کیا کریں کچھ فرصت نہیں ملتی ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ بات سچی ہے کہ جنت ملے گی۔ اب طبیعت نہ چاہے تو اس کا کیا علاج ہے؟ یہ ہماری مثال ہوگئی کہ سب کچھ جانتے ہیں سب کچھ کہتے ہیں مگر طبیعت کی غلامی اختیار کریں گے، شریعت کی غلامی کی طرف نہیں آئیں گے۔

تو جب طبیب کا کہنا ہی نہ مانے پھر زکام کیسے جائے گا؟ یہ کہنے سے کہ طبیب نے نسخہ سچ اور حق لکھا۔ اس سے زکام نہیں جائے گا۔ اس سچ کو استعمال کرنے سے جائے گا۔ تو شریعت ایک نسخہ ہے آپ اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیں، استعمال نہ کریں۔ بیماری نہیں جائے گی اور ایک تعریف کا کلمہ نہ کہیں۔ اطاعت شعاری سے نسخہ استعمال کرنا شروع کردیں، صحت کے آثار خود بخود آنے شروع ہوں گے۔ آخر ہمارے اور آپ کے بزرگ ہی تھے، ہمیں آج اتنا سکھ نصیب نہیں جتنا ہمارے بزرگوں نے اٹھایا۔ چاہے ان کے پاس اس درجے کے کوٹھی بنگلے نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں۔ مکان سادہ ہوں۔ لیکن مکان کی آرائش سے دل کے سکھ کا کوئی تعلق نہیں، دل کا عیش الگ چیز ہے۔ اصل عیش اور راحت دل کا سکون ہے۔ اگر لاکھوں کروڑوں روپیہ، ہمارے اردگرد جمع ہو اور دل میں گھٹن، بے چینی اور پریشانی ہے۔ معلوم ہوا کہ عیش نہیں ہے اور دن میں چکنی روٹی بھی نہ ملے مگر دل مطمئن ہو کہ کسی کا ہمارے اوپر حق استحقاق نہیں، وہ شخص بادشاہ ہے۔ تو عیش دل کی راحت اور سکون کا نام ہے۔ ہمارے اور آپ کے بزرگوں کو اللہ نے دولت بھی دی تھی اور دل کا سکون بھی دیا تھا۔ جو اطاعت خداوندی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے دولت میں پڑ کے اطاعات کو کھو دیا تو عیش کا سامان تو بہت ہے مگر جسے عیش کہتے ہیں وہ نہیں ہے، قلب میں راحت نہیں ہے بے چینی ہے۔ ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اللہ کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں۔ دولت بھی جبھی چین بخشتی ہے جب دل کے اندر اللہ کا نام ہو اور یہ نہ ہو تو دولت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ یہ خود پریشانیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں افلاطون گزرا ہے۔ آپ نے نام سنا ہوگا۔ ایران کا بڑا طبیب ہے۔ ہم تو یہی سمجھا کرتے تھے کہ یہ ایک حکیم اور فلسفی ہے۔ مگر ایک بڑے محقق عالم شیخ عبدالکریم ہیں، انہوں نے ایک کتاب ''الانسان الکامل'' لکھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا۔ تو اس کی قبر کے اوپر انوار و برکات کی بارش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص مقبولان الٰہی میں سے تھا محض فلسفی نہیں تھا۔ بہرحال

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

افلاطون کا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ایک ہے۔ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تعارف نہیں تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ افلاطون بھی ہے اور افلاطون جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ ایک دن اتفاق سے ایک جگہ جمع ہوئے۔ سر راہ ملاقات ہوئی۔ افلاطون چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چہرے پر نبوت کا جلال و جمال اور انوار، دل میں ایمان کی چمک، اس سے وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہے۔

یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں۔ مگر بہر حال یہ سمجھا کہ یہ کوئی بڑا حکیم ہے۔ بڑی نیاز مندی سے ملاقات کی۔ گفتگو سے واضح ہوا کہ یہ کوئی عالی مقام ذات ہے۔ کہنے لگا برسوں سے میرے ذہن میں ایک سوال ہے جو میرے اندر کھٹک پیدا کرتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے آگے میں نے پیش کیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ ضرور جواب دیں گے علم وفضل آپ کے اندر بھرا ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا سوال ہے؟ بڑا انوکھا اس نے سوال کیا۔ اس نے کہا سوال یہ ہے کہ اگر آسمان کو ہم کمان فرض کرلیں جس سے تیر چلائے جاتے ہیں اور یہ جو مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کرلیں اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کریں تو شکل ایسی بنی کہ آسمان کی کمان سے اللہ میاں مخلوق کے اوپر مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی صورت کیا ہے؟ یہ سوال ہے۔

واقعی عقل عاجز ہے، جواب نہیں دے سکتی اس واسطے کہ جب آسمان کمان ہے، تو آسمان کے نیچے سے آپ کہاں چلے جائیں گے؟ زمین کے اوپر آسمان سرپوش کی طرح سے ڈھکا ہوا ہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ آپ زمین چھوڑ دیں۔ مگر آسمان کی زد سے تو نہیں جاسکتے۔ عقل جب غور کرے گی تو کہے گی کہ مصیبت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اور اگر مان بھی لیں کہ آپ کو کوئی راستہ مل گیا کہ آپ آسمان سے نکل کے بھاگ گئے۔ مگر اللہ میاں کی حکومت کے نیچے سے کہیں نہیں جاسکتے؟ کہیں بھی پہنچیں گے اللہ میاں کی حکومت موجود ہے۔ تو جب وہ تیر چلانا چاہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ جواب سے عقل عاجز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فلسفی اور حکیم اس کا جواب نہیں دے سکا۔ افلاطون یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی جواب نہیں دے سکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بچنے کی بڑی آسان صورت ہے۔ بڑے اطمینان سے پل بھر میں آدمی بچ جائے گا۔ افلاطون حیران ہوا کہ سارے حکماء تو عاجز ہوگئے اور ان کے نزدیک بڑا آسان جواب ہے۔ اس نے کہا کیا جواب ہے؟

آپ نے فرمایا جب تیر چلانے والا تیر چلائے، تو اس کے سامنے کی بجائے اس کے پہلو میں آکر کھڑے ہوجاؤ تیر لگے گا ہی نہیں۔ فرمایا جب اللہ میاں تیر چلائیں تو اللہ میاں کے پہلو میں آجاؤ اور اللہ میاں کا پہلو ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ جب دل میں یاد بھر جائے گی، اللہ میاں کو اعتماد پیدا ہوجائے گا ہزاروں مصیبتیں برسیں گی قلب میں کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوگی اگر مصیبت آئی بھی تو آدمی کہے گا۔

ہرچہ از دوست می رسد نکو ہست

پروردگار نے بھیجی ہے۔ یقیناً اس میں مصلحت ہے۔ میں اس کے اوپر راضی ہوں۔ مصیبت تو مصیبت تب ہی بنتی ہے جب دل اس سے اثر لے اور جب دل خوش ہو کہ مجھے اللہ نے یاد کیا ہے۔ یہ مصیبت تھوڑا ہی ہے یہ تو نعمت ہوگئی۔ ہم بیماری کو، مفلسی کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ یہ مصیبتیں نہیں، مصیبت کے اسباب ہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ قلب متاثر ہو کے پریشانی کا اثر قبول کرے وہ مصیبت ہے اور اگر مصیبتیں آئیں اور آپ اثر نہ لیں تو آپ مصیبت زدہ نہیں ہیں۔

ایک بزرگ جیل میں چلا جائے اور کہے کہ سبحان اللہ میرے لئے بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کہ باہر تو لوگوں کو سر مارنا پڑتا تھا۔ یہاں صبح سے شام تک اللہ اللہ کروں گا اس سے بہتر میرے لئے نعمت کیا ہے؟ اس کے حق میں وہ جیل خانہ مصیبت کب رہا؟

ایک شخص مفلس ہوگیا، وہ کہے الحمدللہ جب دولت تھی تو کہیں حفاظت کی فکر، کہیں ڈاکے کا خوف، کہیں گورنمنٹ کے ٹیکسوں کا خوف، یہ ساری مصیبتیں تھیں جو ٹل گئیں۔ اب میں تنہا اللہ کو یاد کروں گا۔ بڑا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ہلکا کر دیا۔ تو مفلسی اس کے حق میں مصیبت کہاں رہی وہ تو نعمت بن گئی۔ تو مصیبت درحقیقت نہ بیماری، نہ مفلسی اور نہ ناداری ہے بلکہ دل کا تاثر مصیبت ہے۔ جب اللہ سے دل متاثر ہو جائے اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو۔ پھر کبھی مصیبت زدہ نہیں بنے گا۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ مصیبتوں کے جب تیر برسنے لگیں تو اللہ کے پہلو میں آ کھڑے ہو اور اللہ کا پہلو اس کی یاد اور اس کا ذکر ہے۔ جب اس میں آ گئے پھر مصیبت اثر نہیں کرے گی۔

جس سے رب کا تعارف نہ ہو، وہ علم جہالت ہے۔۔۔۔۔ تو بات سیدھی یہی ہے کہ سب سے ہٹ کر ایک کے ساتھ تعلق بڑھا لو، ہزاروں کی خوشامد نہ کرنی پڑے ایک کا آدمی ہو رہے۔ ''یک در گیر، محکم گیر'' اور یہ جبھی ہوتا ہے جب اس ذات کا علم صحیح ہو جائے کہ مجھے کس کا ہونا ہے؟ جب علم ہی نہیں ہوگا تو کبھی ادھر اور کبھی ادھر علم کے ذریعے یہ روشن ہو جائے گا کہ مجھے ادھر ہونا ہے۔ متعین ہو جائے گا کہ مجھے فلاں سے ملنا ہے اور وہ ذات بابرکات حق ہے جو کہ پروردگار، مالک اور خالق بھی ہے اس واسطے فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ﴾ ① پڑھو کونسی پڑھائی پڑھو؟ جس میں پہلے اللہ کا نام آئے۔ اللہ کا تعارف ہو، وہ پڑھائی پڑھو۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا۔ کیٹ، بلی، فین، پنکھا اس سے مخلوقات کا تعارف ہوا خدا کا تعارف نہ ہوا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اللہ وہ ذات ہے جو خالق اور مالک ہے۔ یہاں سے علم کی ابتداء ہوئی تو پروردگار کی ذات کا اور اس کی عظمت کا تعارف ہوا، جب عظمت دل میں بیٹھ گئی تو بندگی کا جذبہ دل میں اٹھے گا اور

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱.

جب بندگی ہوگی تو طمانیت قلب، سکون اور بشاشت قلبی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے اللہ نے فرمایا کہ: تم اور علم حاصل کرو نہ کرو تمہاری مرضی ہے۔ مگر پہلے وہ علم حاصل کرو جس سے پروردگار کا تعارف حاصل ہو جائے، وہ کونسا علم ہے؟ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو جو تمہارا پالنے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ماں باپ یوں کہیں کہ ہم پالنے والے ہیں؟ لہٰذا ہمارے نام سے پڑھا کرو۔ ہمارا تعارف حاصل کرو، اس لئے آگے فرمایا کونسا پروردگار؟ ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ﴾ جس نے پیدا کیا وہ رب مراد ہے۔ ماں باپ رب نہیں وہ خالق نہیں ہیں۔ خلق کرنے والا اصل رب ہے۔ ماں باپ جو پالتے ہیں وہ بھی اللہ کی شفقت ہے جو اس نے دلوں میں ڈال دی ہے۔ اگر ماں کے دل میں بچے پر رحم و کرم اور شفقت نہ ہو وہ کبھی نہیں پال سکتی ایک ہی خاوند کی دو بیویاں ہوں، ماں تو پال دے گی، سوکن نہیں پالے گی، سوکن کے آگے بچہ آئے گا تو ایسی چٹکی بھرے گی کہ بچہ بلبلاتا ہوا رہ جائے گا۔

فرق یہی ہے کہ ماں کے دل میں شفقت اور سوکن کے دل میں عداوت ہے، پال پرورش سے نہیں ہوتی، رحم وشفقت سے ہوتی ہے حالانکہ اولاد اسی کی ہے جو دونوں کا خاوند کہلاتا ہے۔ تو ماں باپ کے دل میں رحمت وشفقت کس نے ڈالی؟ اس نے ڈالی، بعض دفعہ ماں باپ کے دل میں بھی عداوت ہو جاتی ہے اگر اولاد انتہائی نافرمانی کرے، ستاوے ماں باپ بدعا کرتے ہیں گھر سے نکال دیتے ہیں پھر اس کی خبر گیری نہیں کرتے۔

اس لئے فرمایا کہ پڑھو اس رب کے نام سے پڑھو جو خالق ہے۔ اگر ماں باپ کہنے لگیں کہ ہم ہی اولاد کے خالق ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے، اولاد کہاں سے آتی؟ آگے اس کا جواب دیا ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ ① جس نے خون کے لوتھڑے سے بنایا ہے۔ ماں باپ میں یہ قوت نہیں کہ وہ خون کے قطرے پر تصویر کشی کریں۔ وہ جو ماں کے پیٹ میں گندہ قطرہ جاتا ہے کیا باپ وہاں نقاشی کرنے کے لئے پہنچتا ہے؟ صورت وہ بناتا ہے؟ کون ذات ہے جس نے اندر پہنچ کر پالنا شروع کیا، اندر تصویر کشی کی اور ایسا پاکیزہ نقشہ بنایا کہ ایک گندے قطرے سے جوہر پاک بنا دیا۔ ایک گندی چیز ہے مگر اپنی حکمت سے کیا پاکباز انسان بنا دیا۔ اگر سونے، چاندی اور جواہرات سے انسان کو بناتے، تو اللہ کو بنانے والا کوئی نہ سمجھتا۔ سب یہ سمجھتے کہ جوہر کی خاصیت یہ ہے کہ اچھا انسان پیدا ہو، لیکن گندے قطرے سے پیدا کیا تا کہ اس کی صناعی واضح ہو کہ ہم وہ ہیں جو گندگی میں سے پاکی نکالتے ہیں، پاکی میں سے گندگی پیدا کرتے ہیں۔ تو ماں باپ خلق کے سبب ہیں خالق نہیں ہیں۔ خلق اور پیدائش حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں سبب تخلیق ہونا اور بات ہے خالق ہونا اور بات ہے۔

جب متعین ہو گیا کہ اصل میں پالنے والا اللہ ہے جو خالق ہے۔ تو اسی کا تعارف ہونا چاہئے۔ اسی کو علم کہا جائے گا جس سے آدمی اپنے خالق کو پہچانے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۲.

علمے کہ راہ حق نماید جہالت است

جوعلم، راہ حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہالت ہے علم نہیں ہے، علم وہی ہے جو سیدھا اور حق کا راستہ بتائے۔تو فرمایا کہ: اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو تا کہ اس کی پہچان پیدا ہو۔باقی رب کا تعارف کس طرح سے ہو؟

تعارف کا طریق...... آگے اس کا طریقہ بتلایا کہ: ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔قلم لکڑی یا لوہے کا ہوتا ہے یا پلاسٹک کا ہوتا ہے۔مگر ان میں سے کسی میں شعور وعقل نہیں ہے۔قلم سے بڑے بڑے علوم نکلتے ہیں۔مگر قلم کو خود کچھ پتہ نہیں وہ جاہل مطلق ہے۔تو حق تعالیٰ نے بتلایا کہ قلم خود کچھ نہیں قلم کے ذریعے سے ہم علم دے رہے ہیں۔تو گویا ہم سے پوچھو، مگر قلم سے مت پوچھو۔مگر علم کے پہنچانے کا سبب قلم کو بنا دیا۔اسی طرح فرمایا ماں باپ کو ہم نے تخلیق کا سبب بنا دیا۔وہ خالق نہیں ہیں، ان میں کیا قوت ہے کہ یہ کسی میں خلق کریں۔تخلیق کے معنی وجود دینے کے ہیں۔ان کا اپنا وجود تو ان کے اپنے ہاتھ میں ہے نہیں، تو بچے کو کیا وجود دیں گے۔اگر ان کا وجود ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ماں باپ مرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔لیکن سب کو جانا پڑتا ہے۔جب ان کا اپنا وجود ہاتھ میں نہیں تو دوسروں کو کیا وجود دیں گے؟ اب آپ کہیں گے انکے ماں باپ نے انہیں وجود دیا۔تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔جب وہ جانے پہ آئے تو چلے گئے اپنے وجود کو نہیں سنبھال سکے۔آدم علیہ السلام تک چلے جاؤ، کسی کا وجود اس کے ہاتھ میں نہیں آخر میں اللہ ہی کی ذات نکلے گی جس کے ہاتھ میں سب کے وجود ہیں۔

اسی لئے فرمایا کہ: جب قلم کو علوم کا راستہ بنا دیتے ہیں اور خود قلم کو بھی پتا نہیں۔اس طرح ماں باپ کو پال پرورش کا واسطہ بنا دیتے ہیں، خود ماں باپ کے اندر کوئی جوہر نہیں شفقت، رحم وکرم، تدبیر ہم ڈالتے ہیں تا کہ بچے کی پرورش کریں۔تو اس رب کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ اور تعلیم دی تو وہ قلم کا بھی محتاج نہیں۔زبان کے ذریعہ علم پہنچاتا ہے۔بولنے سے، آنکھ سے دیکھ کر صورت کی نقل وحرکت سے اور دنیا کے تغیرات کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے، تو اس سے علم ملتا ہے۔تو ہم نہ قلم کے نہ زبان کے محتاج، جس طرح چاہیں علم دیدیں۔وہی ذات بابرکات تعارف کے قابل ہے جو اتنی باکمال ذات ہے تو اسی کے نام سے پڑھو۔

خلاصہ ساری بات کا یہ نکلا کہ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ علم حاصل کرنا ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ جاہلیت کو ختم کیا تو اقـــراء کے ذریعے سے ختم کیا۔پڑھنے سے ہی آدمی آگے بڑھتا ہے۔اس سے اونچ نیچ اور مرضی خداوندی کا پتہ چلتا ہے۔اس سے بندگی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔تو ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ جو انسان نہیں جانتا تھا اللہ نے اس کے اندر علم ڈالدیا۔

افراط دولت علم سے محرومی کا ذریعہ ہے......اور آگے یہ بھی فرمادیا، ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۝ اَنْ

رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ علم سے محروم کیا چیز رکھتی ہے؟ جب وسائل زندگی قبضہ میں آ جائیں اور آدمی سمجھے کہ میں مستغنی ہوں، مجھے خدا کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ خزانہ میرے پاس بھرا پڑا ہے۔ سونا، چاندی، غلہ، باغات سب کچھ میرے پاس، اب میں قابو یافتہ ہوں، اب مجھے خدا کی کیا ضرورت پڑی؟ جب خدا ہی کی ضرورت نہیں تو خدا کے علم کی کیا ضرورت ہوگی؟ تو علم سے محروم رکھنے والی زیادہ تر دولت کی افراط ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی اپنے دل کو اس میں اٹکا دے۔ اس کو فقط ایک خادم کا درجہ دے۔ خدا نہ بنائے اور یہ سمجھے کہ یہ میری نہیں ہے میرے خدا کی ہے، اسی کے حکم کے تحت مجھے اسے خرچ کرنا ہے جب اس پر آ جائے گا تو خدا کی مرضی کی ضرورت پڑے گی کہ وہ کیسے خرچ کرانا چاہتا ہے، اس کی منشاء کیا ہے، کس کو دوں؟ کس کو نہ دوں؟ پھر اس کو ٹوہ لگے گی کہ مرضیات خداوندی معلوم کروں۔ مرضیات معلوم کرے گا تو پھر تعلیم ہی آ جاتی ہے علم شریعت ہی آ جاتا ہے جس کے ذریعہ سے معلوم ہو کہ اللہ فلاں کام سے خوش اور فلاں سے ناراض ہوتا ہے۔

اہل حق قابل تعارف ہیں...... یہی تعلیم تھی جس کے دینے کے لئے بزرگوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ جس پر میں نے کہا تھا کہ اصل تعارف انکا ہونا چاہئے۔ ہم جیسوں کا کیا تعارف، ہم جیسے ہزاروں نالائق انکے خدام ہیں؟ اصل میں وہ قابل تعارف ہیں۔ انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کرا دیا کہ علم کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا۔ اس کے ذریعے سے ہزاروں کو عالم بنا دیا۔ اس سو برس کے اندر دارالعلوم سے بیس ہزار علماء تیار ہوئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے ہزاروں افراد اور علماء تیار کئے یہ تعارف کے قابل ہیں اور وہ سرچشمۂ علم ہے۔ ہم تو اپنا تعارف ان کا نام لے کر کراتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لوگ ہمیں بھی پہچان لیتے ہیں۔ انہیں نہ پہچانیں تو ہمیں کوئی پہچاننے والا نہیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حدیث کے استاذ طلباء کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ طلباء کو اکثر پیار سے جاہلین کہا کرتے تھے۔ فرماتے: "جاہلین! ہمیں تو روٹی بھی ملتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملتی ہے۔ ان کا نام لے لیتے ہیں لوگ قدر کر کے ہمیں روٹی کھلاتے ہیں ہماری تو روٹی بھی ان کے نام سے ہے۔ ان کا نام نہ ہو تو ہمارے پاس روٹی بھی نہ ہو"۔

تو تعارف کے قابل پیغمبرؑ خلفائے راشدین اور علمائے ربانی کی ذات ہے ہم جیسے کیا قابلیت رکھتے ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے۔ چونکہ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑ گیا تھا اس واسطے میں نے بھی اسی پر بولنا شروع کر دیا بہر حال کوئی موضوع ہاتھ لگنا چاہئے اس سے پہلے میں خود بھی سوچتا تھا کہ کیا بیان کروں کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر اللہ تعالیٰ ہمارے محترم بھائی کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے موضوع متعین کر دیا۔ تو چار کلمات میں بھی آپ کے سامنے عرض کر سکا۔ بہر حال یہ ان کا تعارف ہے اور یہ ان کی تعلیم ہے کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ

خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو زمانہ جاہلیت اور جاہلیت کو ختم کرو علم آئے گا۔ تو جیسے زمانہ جاہلیت کی ذلتیں مٹ کر عزتیں آئیں، اب بھی عزتیں آسکتی ہیں۔ زمانہ یکساں رہا ہے جو آثار اس وقت آئے تھے وہ آج بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے خوب کہا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

ہم آج بھی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز برتیں، تو آج بھی آگ بردوسلام بن سکتی ہے۔ وہی آگ جو جلانے کے لئے کھڑی ہوئی ہے وہ ٹھنڈی ہو کر باغ و بہار بن جائیگی، ہم اپنے اندر کوئی تغیر پیدا کریں۔ اس طرح تو کام نہیں چلتا کہ ہم تو اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوں اور چاہیں فلاں میں بھی تغیر آجائے، پبلک اور حکومت میں بھی تغیر آجائے مگر ہم اپنی جگہ قائم رہیں۔ ہم اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔ تو آپ ایسے قطب کہاں ہیں کہ دنیا ہل جائے مگر آپ نہ ہلیں۔ پہلے تو آپ کو ہلنا پڑے گا جب آپ حرکت میں آئیں گے، جب دنیا میں ہلچل آئے گی اس سے پہلے نہیں آئے گی۔ بس یہی چند باتیں عرض کرنی تھیں اسے وعظ و نصیحت سمجھ لیجئے، شکوہ یا علاج و تدبیر سمجھ لیجئے اس میں ساری چیزیں آگئیں۔ جو آپ کا جی چاہے سمجھ لیں۔

عورت کے ذریعے پورے گھر میں تعلیم آسکتی ہے......اور آپ ہی کے ساتھ اپنی بہنوں کو یہ خصوصیت سے خطاب ہے کہ سب سے پہلا مدرسہ بچے کے لئے ماں کی گود ہے۔ اگر ماں کی گود میں علم ہے تو سمجھو کہ بچہ عالم بنے گا۔ ماں کی گود میں اگر کوئی سمجھداری ہے سمجھو کہ بچہ سمجھدار پیدا ہوگا۔ تو سب سے زیادہ ہماری ماؤں، بہنوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی گود کو علم سے بھریں۔ خود مسائل سیکھیں بچہ ابتداءً جو کچھ سیکھے گا، انہی سے سیکھے گا۔ اگر ماں کی زبان پر علم کا چرچہ ہے۔ بچہ بھی وہی چرچہ لے کر کھڑا ہوگا اور ماں کی زبان پر جہالت ہے بچہ بھی جہالت لے کر چلے گا۔ اس لئے ہماری بہنوں کو اپنی وجہ سے اور اپنی نسلوں کی وجہ سے خود بھی بدلنے کی اور اپنی اصلاح کی ضرورت ہے کہ وہ علم کی طرف متوجہ ہوں اور اگر وہ متوجہ ہوگئیں تو ان مردوں کی کیا مجال ہے کہ یہ متوجہ نہ ہوں۔ اس واسطے کہ یہ تو ان کے زرخرید غلام ہیں۔ جتنی شادی اور غمی کی رسمیں ہوتی ہیں جن میں مسلمان تباہ ہوئے۔ جب پوچھا جائے کہ بھئی! تم عقلمند سمجھدار ہو پھر یہ کیا کر رہے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ جی! عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں لیڈر اور حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور ان کا فرض ہے کہ تعمیل کریں۔ یہ غلامی میں گرفتار ہیں۔ بہر حال یہ ایسے ہی غلام ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اگر عورتیں انہیں خیر پہ لگانا چاہیں تو یہ ضرور لگ کے رہیں گے۔ آخر عورتوں کو جب کچھ بنوانا ہوتا ہے، زیور یا کپڑا وہ ضد کرتی ہیں اور اتنا اصرار کرتی ہیں کہ وہ چوری کرے ڈکیتی کرے، مگر انکی فرمائش پوری کرے۔ اگر عورتیں یوں کہہ دیں کہ جناب جب تک آپ صبح کو ایک سپارہ تلاوت نہیں کریں گے، نماز نہیں پڑھیں گے تو ہم نہ روٹی پکا کے دیں گی نہ کپڑا سی کے دیں گی سب کو چند دن کے بعد نانی یاد آجائیگی۔ جھک ماریں گے، تلاوت کریں گے۔ نماز پڑھیں گے۔ تو جب تم ضد کر کے دنیوی اغراض پوری کرالیتی ہو تو ضد

کر کے دینی اغراض کیوں نہیں پوری کرائی جاتیں؟ ہم نے بہت سے خاندان دیکھے ہیں کہ دیندار عورت آئی تو خاوند کو مجبور کر دیا اور اس کو دیندار بنا پڑا۔ بددین آئی تو اس نے بددین کر کے چھوڑا۔ تو عورت کا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اثرات کو صحیح طور پر استعمال کریں تو اپنی اور خاوند دونوں بلکہ اولاد کی بھی دین و دنیا بن جائے۔ بس ذرا سی ضد کر لیا کرو کہ یہ کام نہیں ہوگا جب تک کہ یہ دینی کام نہ ہو۔ خاوند مجبور ہوگا اس لئے کہ جس کے ہاتھ میں ہانڈی، ڈوئی ہوتی ہے اس کے سامنے ہر کوئی مجبور ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جس کے ہاتھ میں ہانڈی ڈوئی اس کا سب کچھ''۔

اب مرد تو بیٹھ کے نہیں کھانا پکا سکتا۔ وہ دکان پر کمائے گا یا گھر داری کرے گا؟ یہ عورت کا کام ہے اگر عورت یہ کام چھوڑ دے اور کہے کہ یوں کرنا پڑے گا۔ مرد اس کے کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ تو جب آرڈر ہی جاری کرنا ہے تو کچھ دین کے لئے بھی آرڈر جاری کر دیا کرو۔ فقط زیور، کپڑے کے لئے نہیں، کبھی کبھی دین کے لئے بھی ان زرخرید غلاموں کو آرڈر دیدیا یہ تو ماننے کے لئے مجبور ہیں، اس واسطے مجھے یہ چند باتیں اپنی بہنوں سے بھی عرض کرنی ہیں کہ وہ بھی ادھر توجہ کریں۔ وہ اگر مردوں کو آمادہ کر دیں گی تو یہ جلد آمادہ ہو جائیں گے اور ان کے اوپر زیادہ اثر پڑے گا۔ اس لئے کہ جب عورتیں اس پر آجائیں کہ تعلیم حاصل کرو۔ جن کا کام گھر میں رہنا ہے۔ تو مرد سوچے گا جب میرے گھر کے ذرے ذرے میں یہ چیز آگئی تو میں کیسے جدا رہوں؟ بیوی، لڑکیاں اور بچے بھی کہنے لگے۔ اب میں اگر یہ کام نہیں کروں گا تو آخر جاؤں گا کہاں؟ کس سے ملنا ہوگا؟ مجبور ہو کے چلے گا۔ اس لئے اپنی بہنوں سے بہت ادب سے گذارش ہے کہ کبھی کبھی تھوڑی تھوڑی ضد، دیندار بنانے کے لئے بھی کر لیا کرو اور جو ناز نخرے دنیا کے لئے ہیں وہ دین کے بارے میں بھی جتادیا کرو۔ گھروں میں دینداری آجائے گی۔

ورنہ حدیث میں فرمایا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کیا، فرمایا: ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ'' اے لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور تمہاری عورتیں آزاد اور سرکش بن جائیں گی؟ صحابہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ تو خیر محض کا زمانہ تھا۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یارسول اللہ! کیا ایسا بھی وقت آنا ہے؟ کہ ہماری عورتیں آزاد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان لڑکے فاسق و فاجر بن جائیں دین پر نہ چلیں؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ فرمایا، یہ ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت باتیں ہوں گی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ'' اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم اچھی باتوں کی نصیحت چھور دو گے اور بری باتوں سے روکنا چھوڑ دو گے۔ تمہارے سامنے برائیاں ہوں گی اور کسی کو توفیق نہیں ہوگی کہ ٹوک دے کہ یہ حرکت بری ہے، اسے چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خود اس میں مبتلا ہے تو کسی دوسرے کو کیا کہے گا؟ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جائے گا۔ اب صحابہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! عرض کیا یارسول اللہ! ایسا بھی دن آنا ہے کہ اچھی بات کی نصیحت چھوٹ جائے، بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے، دنیا سے روک ٹوک اٹھ جائے؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔

''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ'' جب تم برائی کا حکم دو گے اور بھلائی سے روکو گے صحابہ کو اور حیرت ہوئی (عرض کیا): ''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یارسول اللہ! ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا: ''قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ'' یہ بھی ہوگا اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا.'' ① جو کسی زمانے میں اچھی باتیں تھیں۔ آج لوگ ان کو برا سمجھ رہے ہیں۔ اور جو بری باتیں سمجھی جاتی تھیں آج لوگ ان کو اچھا سمجھ رہے ہیں۔ کام جب الٹتا ہے جب آدمی بدعملی کی مشق کرے۔ تو کرتے کرتے فہم خراب ہو جاتا ہے۔ علاج وہی ہے کہ آدمی پھر لوٹ کے آئے اور اسی نیکی سے ابتداء کرے۔ اتباعِ شریعت، اتباعِ سنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ابتداء کرے، وہیں آ کے بات بنے گی۔

صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اچھے انسان پیدا کرتی ہیں...... آج سائنس نے آنکھوں کو چکا چوند کر رکھا ہے بجلیوں سے شہر روشن، فضائیں ہوائی جہازوں سے بھری ہوئی ہیں، دریا بڑے بڑے بحری جہازوں سے آباد ہیں۔ گویا بر اور بحر کے اندر چاندنا ہو رہا ہے۔ مگر یاد رکھیے۔ سائنس اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتی۔ اچھے انسان انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پیدا کرے گی جس سے کریکٹر اور اخلاق ربانی درست ہوں۔ میں مخالف نہیں ہوں، ضرور جہاز بنائیے۔ مگر اپنے کو درست بھی کیجئے اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے، لسان العصر بڑا حکیم ہے، خوب اس نے بات کہی ہے کہ ۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو ۔۔۔ جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

ہزاروں فٹ کی بلندی پر پہنچ جاؤ، چاند پر پہنچ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں، جائز ہے ۔

پر ایک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد ۔۔۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

یہ دو چیزیں پیش فرمائیں۔ اللہ کی عظمت اور نفس کی حقارت کہ ہم ایک گندہ قطرہ ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی حقیقت کو فراموش مت کرو اور اللہ کی عظمت و بزرگی کو دل سے مت کھوؤ۔ جب یہ دو چیزیں یاد ہو جائیں گی تو سائنس، فلسفہ، سامان سب چیزیں اچھی بن جائیں گی۔ تمہارا دل اگر مسلم بن جائے تو ہوائی جہاز، بحری جہاز بھی مسلمان ہوگا، یہ سب چیزیں مسلمان ہوں گی اور اگر تمہارا دل کافر ہے تو یہ ساری چیزیں کفار ہیں اور مضرت رساں ہیں۔ تو درست کرنا اپنے آپ کو ہے۔ سامان تو پہلے ہی درست ہیں۔ ان کا کیا درست کرنا؟

ہم چاہتے ہیں کہ سائنس کے ذریعے ساری دنیا پر کنٹرول حاصل کر لیں۔ لیکن وہ انسان کیا کنٹرول حاصل

① المعجم الاوسط للطبرانی، باب الهاء، من اسمه همام، ج: ۲۰ ص: ۱۷۲.

کرے گا جس نے اپنے نفس کے اوپر کنٹرول حاصل نہیں کیا۔ اس کا نفس تو اس کے قبضے میں ہے ہی نہیں۔ نفس کی نکیل ہاتھ میں ہے نہیں۔ نفس نے کہا میں حرام کی غذا کھاؤں گا۔ اس نے کہا اچھی بات ہے، میں فلاں ناجائز کام کروں گا۔ اس نے کہا اچھی بات ہے۔ تو جو اپنے نفس پر قابو نہیں پاسکا، وہ دنیا پہ کیا قابو پائے گا؟ آج ہر آدمی اس فکر میں ہے کہ پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرے لیکن پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے اوپر تو کنٹرول حاصل کرو۔

تو کارے زمین رانکو ساختی چہ باسماں نیز پر داختی

پہلے زمین کا انتظام صحیح کرلو پھر آسمان پر جانا۔ زمین پر تو کوے اڑ رہے ہیں اور آسمانوں پر جانے کی سوجھ رہی ہے۔ جو خاک کو نہ درست کرسکا، وہ جوہر پاک کی درستی کیا کرے گا؟ بہرحال یہ چند باتیں مجھے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرنی تھیں وہ یہ کہ اپنی درستگی اور اپنی اصلاح کی فکر کیجئے۔ وہ علم ربانی اور اخلاق ربانی سے ہوتی ہے۔ سامانوں سے نہیں ہوتی۔ سامان شوق سے استعمال کرو، مگر اپنے کو درست بنا کر، جبھی یہ کارآمد ہوں گے۔ بس یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو نیکی کی راہ پر چلنے، حق کے راستے کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرماوے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

عمل صالح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

تمہید:...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے، جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ اس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو عمل کے اوپر آمادہ کیا اور ابھارا ہے کہ عملی زندگی اختیار کرو۔ محض قولی اور باتیں کرنے کی زندگی، یہ آخرت کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک عملی جدوجہد اور سعی عمل انسان میں نہ ہو۔ اسی مقصد پر آمادہ کرنے کے لئے یہ آیت حق تعالیٰ شانہ نے اتاری۔ میں اسی کے متعلق چند جملے مختصر طریق پر گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

اس سے پہلے کہ آیت کا مضمون شروع کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں حدیث شریف کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس مثال کے ذریعے اس آیت کا مضمون بہت زیادہ واضح اور کھل جائے گا۔ کیونکہ مثال میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ باریک سے باریک مضمون بھی جب مثال کے ذریعے سمجھایا جائے تو وہ بالکل کھل جاتا اور نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ علم کی خاص قوت حق تعالیٰ شانہٗ نے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہے۔ وہ بڑے بڑے دقیق مسئلوں کو موٹی موٹی مثالوں سے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ایک جاہل سے جاہل اور بے پڑھے سے بھی بے پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکے۔ یہ خاص قوت سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت سے اولیائے کاملین اور علمائے ربانی میں بھی یہ قوت ہوتی ہے۔

مثال ایک کھلی دلیل ہوتی ہے...... مجھے اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، جن کا نام نامی آپ نے ابھی سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اپنے اعوان وانصار کے ساتھ اس

ادارے کو قائم کیا اور چلایا۔ انہی کا ایک واقعہ مثال کے سلسلے میں مجھے یاد آیا۔ ان کے مریدین میں ایک شخص اللہ دین تھا، میں نے بھی دیکھا ہے، بوڑھا آدمی بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا اس کی گوشت کی دکان تھی۔ بے پڑھا لکھا بھی تھا اور تجارت بھی اس کی ایسی تھی جس میں پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ گائے، بھینس ذبح کی، اس کا گوشت بیچ دیا۔ وہ حضرت سے بیعت تھا۔ مگر میں نے اس کو دیکھا کہ اس میں دین کی سمجھ اتنی اعلیٰ تھی کہ آج علماء میں بھی وہ نہیں ملتی۔ جو اس جاہل میں صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس نے خود ہی یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی حضرت کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے حضرت سے ایک سوال کیا کہ:

حضرت! یہ جو سننے میں آیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرنے کے بعد بزرگوں کے قرب جوار میں دفن ہونے کی کوشش کی جائے، اولیاء کے مزارات کے پاس اپنی قبر بنوائیں اس کی لوگ کوشش کریں تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ مرنے والا اگر نیک ہے اور اعمال صالحہ اس کے ساتھ ہیں، اسے کہیں بھی دفن کردو، اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے، قبر اس کی روشن ہو جائے گی اور اگر وہ بدعمل ہے، اسے نبی کے قریب بھی دفن کردیں، تب بھی اس کی بدی سامنے آئے گی۔ تو انبیاء و اولیاء کے قرب و جوار میں دفن کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟

یہ اس نے سوال کیا۔ اب سوال کرنے والا بالکل ان پڑھ جاہل آدمی اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے۔ اس کو اگر حقائق سمجھائے جائیں اور علم کی باریک باتیں بتائی جائیں، وہ کچھ بھی نہ سمجھتا۔ موٹی سمجھ کا آدمی تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سمجھایا اور ایک مثال کے ذریعے مسئلے کو واضح کر دیا کہ وہ جاہل بھی سمجھ گیا اور دوسرے بھی سمجھ گئے۔ جب وہ سوال کر چکا، حضرت نے فرمایا، اچھا ہم اس کا جواب دیں گے۔ ابھی جواب نہیں دیا۔ موقع پر جواب دیں گے وہ بھی خاموش ہو گیا۔ گرمی شدید پڑ رہی تھی، وہ پنکھا لے کر حضرت کو جھلنے کھڑا ہو گیا اسے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گذر چکے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا میاں اللہ دین! تم یہ پنکھا کسے جھل رہے ہو؟ کہا حضرتؒ! آپ کو جھل رہا ہوں۔ فرمایا یہ جو لوگ مجلس میں ساتھ بیٹھے ہیں انہیں تو نہیں جھل رہا؟ کہا نہیں، انہیں تو نہیں جھل رہا۔ اس واسطے کہ نہ میں ان کا شاگرد نہ ان کا مرید۔ یہ تو سارے میرے برابر ہیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ ان کو پنکھا جھلوں اور ان کا خادم بنوں۔ میں تو آپ کو پنکھا جھلنے کھڑا ہو گیا۔ فرمایا ہوا ان سب لوگوں کو لگ رہی ہے؟ کہا کہ جی ہاں، ہوا تو لگ رہی ہے۔ فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔

تم نے یہ سوال کیا کہ انبیاء و اولیاء کے قریب دفن کرنے سے کیا فائدہ؟ فرمایا: اولیاء اللہ کی قبروں پر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں، رحمت کی ہوائیں اترتی ہیں مقصود اصلی وہ ہوتے ہیں لیکن آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے۔ رحمت کے اثرات سب کو پہنچتے ہیں۔ اس واسطے دفن کرنے کے بارے میں فرمایا گیا کہ کوشش کرو اہل اللہ اور

صالحین کے پاس دفن ہوں، ان پر رحمت کی ہوائیں چلیں گی۔ آس پاس والوں کو بھی لگیں گی، چاہے وہ مقصودِ اصلی نہ ہوں۔ مقصود فقط وہ نبی یا ولی کامل ہوں۔ فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ تو قبر اور برزخ کے عالم کا باریک مسئلہ پوچھنے والا ایک ان پڑھ تھا، مثال کے ذریعے جواب دیکر ایک باریک مسئلہ اسکے دل میں اتار دیا۔ سب لوگ سمجھ گئے۔ تو مثال ایک ایسی دلیل ہوتی ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل جو سمجھ میں نہ آسکیں، وہ مثال کے ذریعے سمجھائے جاسکتے ہیں۔

اسی اللہ دین نے حضرت سے ایک اور بھی سوال کیا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مظفر نگر تشریف لے گئے یہ دیوبند سے کوئی سولہ میل دور ایک ضلع ہے۔ حضرت کے ایک مرید ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تھے، جو جیل کے ڈاکٹر تھے، وہیں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہوئے، یہی اللہ دین ساتھ تھا، پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ اس نے پھر حضرت سے اس سے بھی زیادہ باریک سوال کیا۔ واقعی باریک سوال کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ حدیث میں ہے کہ "اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ" ① سوال کرنے کے لئے بھی آدھے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جاہل آدمی سوال بھی نہیں کرتا، کچھ نہ کچھ معلومات ہوں گی، جبھی سوال کرے گا۔ محض جاہل ہو تو آدمی کو سوال بھی سمجھ نہیں آتا۔ یہ بظاہر جاہل تھا، مگر صحبت یافتہ تھا، اس لئے بڑے باریک باریک سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے اور ان کے جواب میں جب علم کھلتا، لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ تو حضرتؒ مظفر نگر میں جیل کی طرف جا رہے تھے یہ بھی ساتھ تھا اس نے پھر ایک سوال کیا۔ اس نے کہا، حضرت جی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پیشین گوئیاں انبیاء بھی کرتے ہیں، اولیاء بھی کرتے ہیں انبیاء بھی خبریں دیتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہونے والا ہے بلکہ مدت بتلا دیتے ہیں کہ سو یا دو سو برس کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ جیسے حدیث میں آپ نے خبر دی کہ مجھے میری امت کی عمر پانچ سو برس دکھلائی گئی۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ ہزار برس دکھلائی گئی۔ اس کا علماء نے جواب دیا کہ پانچ سو اور ہزار کو کیسے جمع کیا جائے، اس وقت مجھے وہ بیان کرنا مقصود نہیں، مطلب یہ تھا کہ آپ نے پیشین گوئی کی اور مدت متعین کر دی، ٹھیک پانچ سو برس کے بعد وہ واقعہ پیش آ گیا، جس کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا تھا۔ اور دوسرا واقعہ بھی ٹھیک ہزار برس کے بعد پیش آ گیا۔

تو اللہ دین نے کہا کہ انبیاء بھی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور وقت بھی متعین کر دیتے ہیں اور ٹھیک مقرر وقت پر وہ بات پیش آتی ہے۔ مگر اولیاء اللہ پیشین گوئی کرتے ہیں اور وقت متعین کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وقت سے پہلے ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وقت کے بعد ٹھیک وقت پہ نہیں ہوتی کیا یہ لوگ غلط دیکھتے ہیں؟ کیا اولیاء اللہ معاذ اللہ غلط

---

① شعب الایمان للبیهقی، ولفظه: وحسن السوال نصف العلم، الثانی والاربعون من شعب الایمان، ج: ۱۴ ص: ۸۶ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه مخیس بن تمیم عن حفص بن عمر، قال الذهبی: مجهولون، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱ ص: ۱۶۰۔

گوئی کرتے ہیں اور جھوٹ بیان کر دیتے ہیں؟ جب ان کے بیان کئے ہوئے وقت پہ کام نہیں ہوتا، کبھی پہلے ہو گیا، کبھی بعد میں، معلوم ہوا وہ غلط اطلاع دیتے ہیں اور جو غلط اطلاع دے اور معاذ اللہ جھوٹ کہہ دے، وہ ولی کیسا ہوا؟ ہاں انبیاء جو بات کہتے ہیں۔ ٹھیک وقت متعین پر وہ بات پیش آ جاتی ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نبی جو وقت مقرر کرے، وہ بات تو ٹھیک وقت پہ پیش آئے اور ولی جو مقرر کرے۔ اس میں بات آگے پیچھے ہو جاتی ہے، تو ولی کی سمجھ میں نہیں آتا وہ غلط گوئی کرتے ہیں یا انہیں خبر نہیں ہوتی؟ تو کیا ضرورت ہے پیشین گوئی کرنے کی، جب انہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔

اب یہ سوال بہت باریک، نبی اور ولی کے کشف کا سوال ایک جاہل آدمی پوچھ رہا ہے، جسے نہ کشف کی خبر نہ کشف کے اوقات کی خبر نہ اس کے تعینات کی خبر اور وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کر رہا ہے۔

اب اگر حضرت کشف کی حقیقت بیان کرتے اور کشف کی میعاد اور مدت سے بحث کرتے وہ کوندن کیا سمجھتا؟ وہ ایسے دیکھتا رہتا جیسے دیوار کھڑی رہتی ہے۔ مگر حضرت نے اس کے مناسب حال جواب دیا اتنا باریک مسئلہ ایک مثال سے سمجھا دیا۔

فرمایا: میاں اللہ دین! یہ سامنے جو عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہ کیا عمارت ہے؟ اس نے کہا کہ جیل خانہ ہے جیل خانہ وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر تھا۔ فرمایا یقینی بات ہے کہ جیل خانہ ہے؟ کہا کہ جی ہاں بالکل یقینی ہے۔ میں حلف اٹھالوں کہ یہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یہاں سے کتنی دور ہوگا؟ اس نے کہا اندازاً چار سو قدم ہوگا۔ فرمایا چار سو کے، تین سو پچانوے اور چار سو پانچ بھی ہو سکتے ہیں؟ کہا کہ جی ہاں ہو سکتے ہیں۔ یہ تو میرا ایک تخمینہ ہے۔ پانچ کم ہو جائیں یا پانچ زیادہ ہو جائیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ جیل خانہ ہے۔ حضرت خاموش ہو گئے اور برابر چل رہے ہیں۔

جب جیل خانہ کے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس کی دیوار بالکل ایک گز رہ گئی۔ فرمایا: اللہ دین یہ کیا عمارت ہے؟ کہا کہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یقینی ہے؟ کہا کہ جی اب تو اور بھی یقینی ہے۔ فرمایا کتنا دور ہوگا؟ اس نے کہا، جی ایک گز فرمایا، گز کی ڈیڑھ بھی ہو سکے یا پونے دو؟ اس نے کہا نہیں ٹھیک گز ہے۔ کہو تو میں ناپ کے بتلا دوں؟

فرمایا: یہی نبی اور ولی کے کشف میں فرق ہے۔ یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ جو چیز نبی دیکھتا ہے، وہی ولی بھی دیکھتا ہے۔ مگر ولی دور سے دیکھتا ہے، اپنے اندازہ اور تخمینے سے مدت متعین کرتا ہے اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور نبی کو شے کے سر پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، وہ جو مدت مقرر کرتا ہے، ٹھیک نپی تلی ہوتی ہے۔ اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسے تم نے دو فرلانگ کے فاصلہ پر کہا کہ چار سو قدم ہیں، مگر چار سو کے تین سو پچانوے بھی ہو سکتے ہیں اور چار سو پانچ بھی اور جب جیل خانے کے سر پر پہنچ گئے، تم نے کہا صاحب! گز کا پون گز اور سوا گز نہیں ہو سکتا، گز بھر ہی رہے گا۔ فرمایا نبی اور ولی کے کشف میں یہی فرق ہے۔ اب کتنا دقیق مسئلہ تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کیسی سہولت سے اسے حل کر دیا کہ اس جاہل کو بھی سمجھ آ گیا اور ہم جیسے جاہلوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔

اگر یہ سوال نہ کرتا، ہماری بھی سمجھ میں بات نہ آتی۔

تو مثالوں کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بڑے بڑے باریک مسائل موٹی عقل والوں کو سمجھا دیتے ہیں۔

اسی پر مجھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا، حضرتؒ ایک دفعہ مظفر نگر تشریف لے گئے۔ تو مظفر نگر کے اسٹیشن پر حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ اس زمانے کا سب سے بڑا مہندس، ریاضی دان، اقلیدس کا جاننے والا ایک ہندو تھا، اسے ناز تھا کہ میں فن ریاضی میں بڑا ماہر ہوں، اسے جو معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی اسٹیشن پر موجود ہیں۔ حضرت بھی فن ریاضی میں بڑے مشہور تھے حتیٰ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اقلیدس پر اعتراضات کئے ہیں، جس کے بارے میں یہ عام مسلّم تھا کہ اقلیدس پر اعتراض ممکن نہیں ہے، یہ تو بدیہی چیزیں ہیں۔ حضرت نے اس پر اعتراض کیا اور اس زمانے کے ریاضی دان حیران ہوئے کہ اس کا جواب کس طرح سے دیں۔ تو اس ہندو کو معلوم ہوا کہ حضرت بھی اسٹیشن پر ہیں، وہ جلدی سے آیا اور بڑی نیاز مندی سے ملا، کچھ بات چیت کی، اس کے بعد اس نے کہا حضرت جی! مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ لوح محفوظ میں ساری چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر ہر انسان کی ہر ہر حرکت اور ہر ذرہ ذرہ اس میں قیامت تک کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ تو ایک انسان کی اتنی بڑی زندگی ہے کہ اس میں ہزاروں واقعات ہیں تو ایک ایک واقعہ اور ایک ایک ہوں، ایک ایک چوں اس میں لکھی ہوئی ہے تو لوح محفوظ کہاں تک پھیلی ہوئی ہوگی، اس کی تو کوئی حد نہیں ہوگی اس لئے کہ سارے انسانوں، جانوروں، درختوں اور پتھروں کے واقعات، ایک ایک پتھر کا ہلنا جب یہ سب کچھ ہوگا' تو کتنی بڑی لوح محفوظ ہوگی؟ وہ کہاں رکھی ہوئی ہوگی؟ آسمان کتنا بھی بڑا سہی، مگر لوح محفوظ میں تو آسمان بھی لکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہیں آ ہی نہیں سکتی؟ یہ اس نے سوال کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ: صاحب! آپ کی عمر کتنی ہے اس نے کہا ساٹھ برس۔ فرمایا ساٹھ برس میں آپ کی زندگی میں ہزاروں واقعات پیش آئے ہوں گے؟ کہا کہ بالکل۔ فرمایا آپ کو کچھ یاد بھی ہیں؟ کہا کہ جی بہت یاد ہیں، بس وہ جو بچپن کی چار، پانچ برس کی زندگی تھی، اس کو چھوڑ کے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا، تو حافظہ میرا قوی ہے، مجھے سارے واقعات یاد ہیں۔ فرمایا، اگر تم ان کو لکھنا شروع کرو تو کتنے کاغذوں پر لکھے جائیں گے؟ اس نے کہا کہ جی ایک کاغذ؟ اگر میں لکھنا شروع کروں، دس بیس پچاس میل تک وہ سلسلہ چلا جائے گا، وہ تو ساری زندگی ہے فرمایا اتنے لمبے چوڑے واقعات تمہیں یاد ہیں؟ تو وہ کہاں محفوظ ہیں؟ وہ جو اتنے واقعات ہیں وہ کہاں لکھے ہوئے ہیں؟ کہ تم فوراً سنا دیتے ہو۔ اس نے کہا جی میرے دماغ میں محفوظ ہیں؟ فرمایا زندگی اتنی سی اور اس کے واقعات لکھنا شروع کرو تو میلوں تک سلسلہ چلا جائے اور دماغ کی اتنی چھوٹی سی ڈبیہ میں وہ سارے واقعات (قوت حافظہ میں) محفوظ ہیں۔ فرمایا: یہ تمہاری قوت حافظہ ہے، لوح محفوظ اللہ کی قوت حافظہ ہے۔ جیسے تمہاری زندگی کے واقعات اس

میں محفوظ ہیں، کائنات کی زندگی کے واقعات اس میں محفوظ ہیں وہ بہت بڑی سہی لیکن جیسے تم کہہ رہے ہو کہ کہیں حد و نہایت نہیں۔ یہ بات نہیں جیسے تمہارے دماغ کی بھی ایک حد ہے کہ اتنی سی ڈبیہ ہے، جو پورے سر میں نہیں، سر کے پیچھے گدی میں ہے، اس لئے کہ اگلا حصہ حس مشترک کا ہے اس میں دیکھنے، سننے، اور سونگھنے کی طاقت جمع ہے اِدھر اُدھر کچھ نالیاں ہیں، جن میں علم وغیرہ گھومتا رہتا ہے یعنی فکر کی طاقت، پچھلے جو واقعات ہیں وہ گدی کے قریب ایک چھوٹے سے حصہ میں ہیں۔ تو جس اللہ کو یہ قدرت ہے کہ انچ بھر کی ڈبیہ میں ہزاروں لاکھوں واقعات لکھ دے، جنہیں کاغذ پر لکھو تو پچاسوں میل تک کاغذ چلا جائے۔ اسے یہ قدرت بھی ہے کہ ساری دنیا کے ذرے ذرے کے واقعات لوحِ محفوظ میں لکھ دے۔ اور وہ لوحِ محفوظ اتنی بڑی نہ ہو، جتنی تم سمجھ رہے ہو۔

تو کتنا باریک مسئلہ تھا اور حضرت نے کس سہولت سے مثال دے کر سمجھا دیا۔ تو مثال بڑی عجیب وغریب دلیل ہوتی ہے کہ دقیق مسائل جو عقل وفہم میں نہ آسکیں مثال کے ذریعے واضح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے دنیا و آخرت کے لئے بڑی بڑی مثالیں دی ہیں اور ان مثالوں سے سمجھا دیا ہے۔ احادیث میں بھی باریک مسائل کی ہزاروں مثالیں دی گئی ہیں۔ تو مثال یہ خاص قوت ہوتی ہے علم کی، جو انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور ان کے طفیل میں اولیاء اور علماء ربانی کو دی جاتی ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بھائیوں کی مثال...... مجھے ایک مثال حدیث کی یاد آئی، جو اس آیت سے متعلق ہے، جو میں نے تلاوت کی تھی۔ میں آیت کا مضمون اس مثال ہی سے شروع کرتا ہوں، جو حدیث میں فرمائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! ایک مثال سنو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متوجہ ہوئے۔

فرمایا: ایک شخص کے تین بھائی تھے۔ ایک بڑا، ایک منجھلا، ایک چھوٹا۔ تینوں حقیقی بھائی تھے اور ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ اس شخص کے مرنے کا وقت آیا، تو مرنے کی حالت میں انسان بے کس و بے بس ہوتا ہے، نہ خود کچھ کر سکتا ہے نہ کوئی دوسرا بنا سکتا ہے۔ محض اللہ کے رحم وکرم پر ایک بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ کوئی سہارا معاون اور مددگار اس کو نظر نہیں آتا۔

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ٥ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ ﹰ الْمَسَاقُ﴾ ① . جب پنڈلی پر پنڈلی مارتا ہوا ہوتا ہے تشنج ہوتا ہے اور جان کھنچتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب پروردگار کی طرف روانگی ہے۔ اب کون ہے بچانے والا اور مدد کرنے والا؟ وہ انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس شخص کے اوپر بے کسی کا عالم طاری ہوا اور مرنے کا وقت آیا۔ تو سب سے پہلے اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا اے بھائی! میں نے ہمیشہ تیرے ساتھ احسان وسلوک کیا۔ اپنے کو نعمتوں میں پیچھے اور تجھے آگے رکھا۔ کوئی بھی آڑا وقت آن پڑا، میں نے تیری حفاظت، تیرے بچانے اور تجھے آرام پہنچانے میں جان لگا دی اب یہ میرے اوپر آخری اور انتہائی

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۹، ۳۰.

بے کسی کا وقت ہے۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی وہ جس کے ساتھ عمر بھر میں نے سلوک اور احسان کیا، میں چاہتا ہوں تو اس وقت میری مدد، کہ میرا کوئی مددگار نہیں ہے میں اس وقت کسی کو بھی نہیں پکار سکتا۔ وقت پڑنے پر بھائی ہی یاد آتا ہے تجھ سے میری توقع ہے کہ تو میری کچھ مدد کریگا۔ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ تیرا بالکل غلط خیال ہے میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آسکتا ہوں تو نے اگر میرے ساتھ احسان کیا تو تو نے جھک مارا، برا کیا، میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا۔ صاف ٹکا سا جواب دے دیا۔ زیادہ سے زیادہ اگر میں تیری مدد کرسکتا ہوں تو اتنی کہ جب تک تیرے دم میں دم ہے میں تیرے پاس بیٹھا رہوں گا لیکن یہ کہ میں تیرا کوئی کام بنادوں، تیری مصیبت کو ٹلا دوں، یا اپنے اوپر لے لوں، اس کی کوئی توقع مت رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں اسے بڑا صدمہ ہوا کہ جس بھائی کے ساتھ میں نے عمر بھر سلوک کیا۔ جب مجھ پر وقت پڑا، تو ٹکا سا جواب دے دیا۔

تو مایوس ہو کر منجھلے بھائی کو بلایا۔ اس کے سامنے بھی یہی تقریر کی اور کہا کہ یہ میرا آخری وقت ہے، کڑا وقت ہے، کوئی مددگار نہیں ہے۔ میری توقع ہے کہ تو میری مدد کریگا اس لئے کہ تیرے ساتھ بھی میں نے ساری عمر سلوک و احسان کیا، خود تکلیف اٹھائی مگر تجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے؟

اس نے کہا کہ بالکل تیرا خیال فاسد ہے میں بالکل تیری مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آؤں گا۔ تو نے میری مدد کی یا احسان کیا، کیا ہوگا، اچھا کیا یا برا کیا۔ بہرحال مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں۔ بہت اگر کام آیا تو اتنا کام میں کردوں گا کہ جب تیرا دم نکل جائے گا، تو تجھے لے جا کر گھڑے میں دفن کردوں گا، اس سے زیادہ کوئی توقع مت رکھنا۔ اس نے کہا افسوس اِنّا لِلّٰہ جن بھائیوں سے توقع تھی انہوں نے وقت پر جواب دے دیا جن کے ساتھ سلوک کیا، انہوں نے وقت پر ٹکا سا جواب دیدیا۔ تب اس نے سب سے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا بھائی! مجھ پر آڑا وقت ہے، میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے اور میرا منہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے مدد مانگوں۔ اس لئے کہ میں نے عمر بھر تجھے تکلیف پہنچائی، ہمیشہ تجھے ایذائیں پہنچائیں۔ عمر بھر تیرے ساتھ کوئی بھلا سلوک نہیں کیا مگر بہرحال تو پھر بھائی ہے۔ شاید تو میرے کام آجائے۔

چھوٹے بھائی نے جواب دیا، تو ذرا پریشان مت ہو۔ میں تیرے کام آؤں گا کوئی مصیبت تجھ پر پڑے گی پہلے میں اپنے پر جھیلوں گا، بعد میں تجھ تک آنے دوں گا۔ اگرچہ تو نے عمر بھر مجھے ستایا اور پریشان کیا بلکہ میری تذلیل و توہین کی اور مجھے ذلیل رکھا۔ مگر میں شریف الطبع ہوں۔ میں تیرے کام آؤں گا، تو بالکل مت گھبرا کوئی مصیبت آئے گی، پہلے میں ہوں، بعد میں تو ہے۔ اس نے کہا اللہ تجھے جزائے خیر دے، مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر واقعی تیرا حوصلہ بہت بلند ہے۔ میں نے ساری عمر تجھے ستایا اور وقت پر تو کام آیا تو نے مجھے تسلی دی۔ ①

یہ تین بھائیوں کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! سمجھے بھی یہ تین بھائی کون

① فضائل اعمال مولفہ از برکۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

ہیں؟ عرض کیا: اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ.

فرمایا: بڑا بھائی کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا، بڑا کمینہ اور بدخصلت تھا کہ وقت کے اوپر کام نہ آیا۔ بھائی تو وہ ہے جو وقت کے اوپر کام آئے۔

فرمایا: منجھلا کیسا تھا؟ عرض کیا وہ بھی بہت خراب وخستہ اور بڑا بدنیت اور بے مروت۔ جس نے عین وقت کے اوپر جواب دے دیا۔

اور فرمایا: چھوٹا بھائی کیسا تھا؟ عرض کیا بڑا شریف، بڑا عالی حوصلہ اور بڑا عالی ظرف۔ باوجودیکہ اس کے ساتھ برائی کی گئی، لیکن کام آیا تو وہی آیا۔

بڑے بھائی کا سلوک...... فرمایا: سمجھے کہ یہ تین بھائی کون ہیں؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ تین بھائی کون ہیں۔

فرمایا: وہ بڑا بھائی جس کے ساتھ آدمی عمر بھر سلوک واحسان کرتا ہے، وہ اس کا مال ودولت ہے۔ عمر بھر اس کے حاصل کرنے میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایمان رہے نہ رہے، مگر پیسہ ہاتھ میں آنا چاہئے۔ اس کی عزت افزائی میں جان پہ مصیبت اٹھاتا ہے۔ اپنے کو ذلیل بنالیتا ہے۔ مگر مال پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ دنیا میں اتنی خدمت کسی چیز کی نہیں کی جاتی، جتنی مال کی کی جاتی ہے، جتنی رغبت اس کی طرف ہے، کسی چیز کی طرف نہیں کی جاتی۔ فرمایا بڑے بھائی سے آدمی جتنا اچھا سلوک کرسکتا ہے، اس سے زیادہ مال سے کرتا ہے۔ لیکن جب مرنے کا وقت آتا ہے، سب سے پہلے بیگانہ یہی مال ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی مال ودولت کی طرف رجوع کرے، تو وہ کہتا ہے، مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کرسکتا ہوں، جب تک تیرا سانس چل رہا ہے، میں تیرے پاس بیٹھا رہوں اور جب سانس نکل گیا، میرا تیرا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں، تو اور عالم میں جائے گا، میں اور عالم کی چیز ہوں، تو کسی اور کی چیز بنے گا، میں کسی اور کا بنوں گا۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: جب انسان کا جنازہ نکلتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام پکارتے ہیں، ''مَاقَدَّمَ فُلاَنٌ مَاقَدَّمَ فُلاَنٌ'' فلاں نے کیا چیز آگے بھیجی جو آخرت میں کام آئے، اور توشہ وزادِ راہ بنے۔

اور وارث کیا پکارتے ہیں؟ ''مَآاَخَّرَ فُلاَنٌ، مَآاَخَّرَ فُلاَنٌ'' فلاں نے پیچھے کیا چیز چھوڑی جو ہم اس پر قبضہ کریں اور اس کو بانٹیں۔ مرنے والا ابھی قبر میں پہنچنے نہیں پاتا اور وارثوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں کہ یہ چیز میں قبضاؤں گا۔ یہ چیز میرے قبضے میں آئے گی۔ بہت سے لوگ فرضی وارث بن کے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ اس کے مال کے وارث ہم ہیں، حتیٰ کہ بیویوں تک یہ نگاہ پہنچتی ہے کہ اس بیوہ سے میں نکاح کروں گا۔ کوئی کہتا ہے میں نکاح کروں گا۔ مالدار عورت ہے۔ تو مرنے والا ابھی قبر میں بھی نہیں پہنچتا اور وارثوں کی رال ٹپکنی شروع ہوجاتی ہے۔ تو مال ودولت سب سے پہلے بیگانہ بنتا ہے اور دوسروں کی گود میں چلا جاتا ہے۔ اصل

مالک پوچھتا ہوا رہ جاتا ہے کہ کوئی ہے میرے کام آنے والا؟ وہ کہتا ہے مجھ سے بالکل توقع مت رکھنا۔

بہرحال دولت کے مالک ورثاء اور پس ماندگان بن جاتے ہیں اور وہ اس بیچارے سے بیگانہ بن جاتی ہے، جس نے ساری عمر اس کو کمایا تھا، محنت کی تھی۔ حتیٰ کہ ایمان اور جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کتنی ہو، مگر دھوپ اور چھاؤں کی طرح سے ہے۔ آج ایک کے ہاتھ میں ہے، کل دوسرے کے ہاتھ میں ہے، ہزاروں امیر اس دنیا میں غریب بنتے دیکھے گئے ہیں اور ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے گئے۔ دولت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی اس کو آدمی خادم بنا کے رکھے، مخدوم نہ بنائے، قبلہ و کعبہ نہ بنائے کہ اس کی پرستش و پوجا شروع کر دے۔ اس کی محبت کو دل سے وابستہ نہ کرے، ایک خادم کی حیثیت سمجھے، جیسے اللہ نے اور خدمت گذاری کے سامان پیدا کئے ہیں، یہ بھی استعمالی سامان ہے، اسے استعمال کرتا رہے اور خدا کا شکر ادا کرتا رہے، لیکن یہ کہ اپنی امیدوں کا مرکز بنالے، جب یہ چھوڑنے پہ آتی ہے، ساری امیدیں دھری رہ جاتی ہیں۔ اس واسطے دولت اور مال کو حق تعالیٰ نے یہ حیثیت دی ہے کہ اسے دین کا ایک وسیلہ اور خادم بنایا ہے، خود مقصود نہیں رکھا دنیا کا سامان انسان کا مقصود نہیں۔ مقصود دوسری چیز ہے، یہ اس کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا دولتیں کمائیں، تجارتیں کیں، زراعتیں کیں اللہ نے دولت دی مگر اس کو مقصودِ اصلی نہ سمجھا، مقصود کا وسیلہ سمجھا۔ مقصودِ اصلی حق تعالیٰ شانہٗ اور ان کی محبت کو سمجھا۔ اس کو ایک ذریعہ اور راستہ بنایا کہ اس کے ذریعے اللہ تک پہنچیں۔ دولت مند دولت کے راستے سے اگر دین کمانا چاہے، تو کما سکتا ہے۔ ایک غریب آدمی اپنی جان اور جسم کے ذریعے دین کماتا ہے۔ اور دولت مند دولت کے ذریعے۔ اس کو جان دی۔ اس کو مال دیا۔ بنایا دونوں کو وسیلہ۔

انبیاء علیہم السلام نے دولت کمانے کا حکم بھی دیا فرمایا: ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' [1] حلال کمائی کرنا، یہ بھی ایسا ہی فریضہ ہے، جیسے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا۔ مگر ساتھ یہ بتلایا کہ قلبی محبت کا تعلق اس سے نہ پیدا کرو۔ محبت کا تعلق صرف اللہ کی ذات سے رکھو، کام کاج کا تعلق اپنی دولت سے رکھو ؎

دل بیار دست بکار

دل مالک کے اندر لگا ہوا ہو۔ ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہوں۔ دل کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو۔ دل میں اللہ کی محبت ہو۔ اس لئے کہ دل ایک پاکیزہ ظرف ہے۔ پاک ظرف میں پاک ہی چیز بھرنے کی ضرورت ہے۔ اور اللہ کی محبت سے بڑھ کر پاک چیز کوئی نہیں ہے۔ تو دل اس کا مستحق ہے کہ وہی پاک چیز اس میں بھری جائے۔ دولت

---

[1] شعب الایمان للبیهقی، الستون من شعب الایمان وهو باب فی حقوق الاولاد والاهلین علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الطبرانی والبیهقی فی الشعب والقضاعی عن ابن مسعود مرفوعاً وقال البیهقی: تفرد به عباذ وهو ضعیف لکن له شواهد کثیرة: منها ما رواه الطبرانی فی الاوسط عن انس.. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۱۱۰.

حلال ہونے کی وجہ سے پاک بن جائے، مگر اپنی ذات سے کوئی اعلیٰ چیز نہیں ہے کہ قلب کے اندر بھری جائے۔

قلب فقط آخرت کا عضو ہے...... وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کے سارے بدن میں اگر آخرت کا کوئی عضو ہے، تو وہ قلب ہے۔ باقی سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ ہاتھ، پیر، دماغ سر یہ سب دنیوی اعضاء ہیں۔ صرف ایک ہی عضو ہے جو آخرت کا ہے۔

اور یہ فرق کیسے معلوم ہو؟ اس طرح کہ قلب صرف حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو کبھی قبول نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ جائیں۔ مگر دل حق ہی سمجھ کر قبول کرے گا۔ باطل کو باطل سمجھے اور قبول کرے۔ جھوٹ کو جھوٹ سمجھے اور پھر قبول کرے، مطمئن ہو جائے ایسے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ جب سچی بات دل میں آئے گی، تبھی اطمینان ہوگا۔ ملمع سازی سے آپ جھوٹ کہتے رہیں، دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ برائی کی بات کریں تو قلب مطمئن نہیں ہوگا۔ چور، چوری کرتا ہے، لیکن اندر سے اس کا دل ملامت کرتا ہے، یہ بہت بری حرکت کر رہا ہے۔ اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے، مگر دل اعلان کر دیتا ہے کہ یہ بات بری ہے۔

آپ کسی کو بری نگاہ سے دیکھیں، دل ملامت کرے گا کہ غلط ہے، ناجائز کام ہے، بدنگاہی مت کرو۔ تو دل ملامت کرے گا، اگر آپ دیکھ لیں گے، دل میں گھٹن ہوگی کہ بہت بری حرکت ہوئی۔ تو قلب جب بھی قبول کرتا ہے، حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو، جھوٹ کو، فریب کو کبھی نہیں قبول کرتا۔ تو اس سے زیادہ مخلص کوئی دوسرا نہیں ہے کہ سچائی کا ماننے والا ہے، جھوٹ اور باطل کا ماننے والا نہیں ہے۔

بخلاف اور اعضاء کے، وہ سچ بھی قبول کرتے ہیں، جھوٹ بھی، حلال بھی قبول کرتے ہیں، حرام بھی اسی ہاتھ سے آپ پاک کمائی اٹھالیں گے اور ناجائز کمائی چوری، ڈکیتی کی وہ بھی جب اٹھائیں گے تو ہاتھ میں چبھے گی نہیں، ہاتھ اسے بھی پکڑ لے گا، دل قبول نہیں کرے گا، مگر ہاتھ قبول کرلے گا۔ حلال کی کمائی رکھ دو تب، حرام کی رکھ دو تب، دونوں کو لے کر گھر چلا آئے گا۔ منہ میں آپ کچھ ڈالیں تو جیسی لذت حلال چیز کے کھانے سے آئے گی، ویسی لذت حرام کمائی سے بھی آئے گی۔ مٹھائی اگر حرام کی ہے، تو یہ نہیں کہ وہ کڑوی ہو جائے۔ ویسی میٹھی لگے گی جیسی حلال کی مٹھائی۔ زبان دونوں کو قبول کر لیتی ہے، حلال کی مٹھائی کو بھی، حرام کی مٹھائی کو بھی حرام کی چیز سے کانٹے نہیں چبھتے، وہ کھا جاتی ہے اور اسے ذائقہ آتا ہے۔ لیکن قلب حرام کی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے بڑی بری حرکت کی، جانے آخرت میں کیا بنے گا، کیا میری درگت ہوگی، ۔ اسی طرح سے پیر ہیں، جس طرح سے آپ کو مسجد کی طرف لے جاتے ہیں اگر کوئی شراب کی بھٹی کی طرف جائے گا، پیر اسے بھی لے جائیں گے، پیروں میں کانٹے نہیں چبھیں گے۔ قطعاً نہیں رکیں گے، حرام موقع پر لے جاؤ، حلال موقع پر لے جاؤ، اپنی کارگذاری دکھلا دیں گے، تو ہاتھ، منہ، پیر جائز ناجائز دونوں کو قبول کرتے ہیں۔

اس آنکھ سے اگر اپنی ماں اور بیوی کو دیکھے تو پاک نگاہ ہوگی۔ لیکن اجنبی عورت کو دیکھے، ناپاک نگاہ ہوگی۔ مگر

آنکھ دونوں کو دیکھ لے گی۔ اجنبی عورت کے دیکھنے میں تو وہ نہیں آئے گا۔ آنکھ کے اندر کانٹے نہیں چبھیں گے، وہ ویسی ہی لذت لے گی، جیسے حلال عورت کو دیکھنے میں لذت آتی ہے۔ لیکن دل مطمئن نہیں ہوگا۔ دل کہے گا، بڑی غلط حرکت کی، خدا جانے آخرت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ تو دل ہمیشہ حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو قبول نہیں کرتا اور دل کے سوا جتنے اعضاء ہیں، حق و باطل دونوں کو قبول کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کا عضو صرف دل ہے، باقی اعضاء حقانی بھی ہیں باطل پرست بھی ہیں۔ نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں، انہیں حق بات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے یہ فقط قلب کا کام ہے۔ تو قلب جیسے حقانی عضو میں اگر آدمی ایسی چیزیں بھر لے، جو حلال بھی بن سکتی ہوں اور حرام بھی، تو اس نے قلب کو گندہ کر دیا۔ قلب میں ایسی چیز بھرنی چاہئے کہ جیسے یہ پاک ہے ویسے ہی وہ چیز بھی پاک ہو۔ وہ چیز اللہ کی محبت، علم و معرفت خداوندی اور پاکیزہ اخلاق ہیں کہ یہ حق ہی حق ہیں، ان کی جگہ قلب میں ہونی چاہئے۔ دولت کی جگہ قلب میں نہیں ہونی چاہئے، ہاتھ پیر میں ہونی چاہئے، اس لئے کہ وہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک بھی بن سکتی ہے۔

قلب میں خالص پاک چیز آنی چاہئے۔ اہل اللہ کا مذاق ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے کمایا، دولت ہاتھ میں آئی، لیکن دولت کو قبلہ و کعبہ نہ بنایا کہ اس کی پوجا میں لگ جائیں، اسے ایک ضرورت کا زیرِ استعمال سامان سمجھا، جائز مواقع پر خرچ کیا، حکم خداوندی کے تابع رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ دولت کو اپنا خدا بنالینا کہ اگر وہ پاس ہے تو دل کو چین ہے اور ذرا اس میں کمی آئی، دل بے چین اور ڈانواں ڈول۔

یہ شان اللہ کی محبت کی ہونی چاہئے کہ حق تعالیٰ سے ذرا بعد ہو جائے، تو دل بے چین ہو جائے، اور قرب میسر آئے تو فرحت و انبساط پیدا ہو جائے۔

بازار اگر ذرا مندا (سُست) پڑ جائے، لوگ پریشان ہو جاتے ہیں، اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ جیسے معلوم ہو سارا چین و آرام چھن گیا، یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کمانے کی چیز ہے، اسے جائز طریق پر آدمی کمائے۔ لیکن اس کو خادم سمجھے، مخدوم نہ بنائے۔ خدمت اللہ ربّ العزت کی اور اس کی محبت کی کرے۔

حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی اور بہت بڑے تاجر ہیں۔ انکی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی، تو کیفیت یہ تھی کہ روم، شام اور مصر میں جگہ جگہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں تھیں اور مال سپلائی ہوتا تھا اور نفع کی رقم جب آتی تھی تو یہ نہیں تھا کہ ایک دو آدمی لے کر چلے آئیں۔ لاکھوں روپے کا خزانہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی، تو تنگ آ کے کہتے کہ بھئی! کونے میں ڈھیر لگادو۔ تو روپیہ، سونے اور چاندی کے ٹکے اس طرح چھت تک بھرے ہوتے جیسے غلہ بھر دیا جاتا ہے، تو حضرت عبدالرحمن ابن عوف ؓ کروڑ پتی صحابہ میں سے تھے۔ مگر قلب کی کیا کیفیت تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمانداری کثرت سے تھی، تین تین سو، چار چار سو مہمان دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور کئی کئی قسم کے کھانے دسترخوان پر

چنے جاتے، مدارات ہوتی تھی۔ جب دستر خوان پر کھانے چن دیئے جاتے اور اب قریب ہوتا کہ کھانا شروع ہو، تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا دل ایک دم روتا، آنکھوں سے آنسو جاری۔ اور فرماتے، اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دستر خوان پر اتنے کھانے؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جا رہیں؟

کہیں مجھے آخرت سے محروم تو نہیں کیا جا رہا۔ یہ کہہ کر روتے سارے حاضرین اور مہمان روتے۔ اس لئے کہ صحابی ہیں، صاحب دل ہیں۔ ان کے دل کا اثر دوسروں پر پڑتا اب چار سو آدمی کی ساری مجلس بیٹھی رو رہی ہے، گڑگڑا رہے ہیں اور اپنی آخرت کو یاد کر رہے ہیں۔ روتے روتے بدحال ہو جاتے اور سارا دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ مہمان اور میزبان بھی فاقے سے اٹھ جاتے۔ رات کو پھر دستر خوان چنا جاتا، پھر کھانے کا وقت آتا تو بے اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کا دل دھڑکنا شروع ہوتا اور رونا شروع کرتے، اور کہتے:

''اے اللہ! مہاجرین اولین اس دنیا میں اس غربت سے گئے کہ کھانے کو ان کو پانی میسر نہیں تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا، اس غربت میں انہوں نے وفات پائی کہ کفن پورا میسر نہیں آیا، سر ڈھانپتے تھے، تو پیر کھل جاتے تھے پیر ڈھانپتے تھے، سر کھل جاتا تھا۔ آخر سر کو ڈھانپا گیا اور پیروں پر گھاس ڈال دی گئی، اس طرح سے دفن کیا، جن کا لقب ''سَیِّدُ الشُّھَدَآءِ حَمْزَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ'' ہے''۔

تو روتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے غربت کا یہ عالم اور عبدالرحمٰن کا یہ عالم کہ دس دس قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کہیں میری آخرت تو نہیں ختم کی جا رہی ہے۔ حاضرین بھی روتے اور پھر دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ تین تین وقت کا فاقہ اس طرح سے ہوتا تھا۔

اندازہ کیا آپ نے دولت تو اتنی بے شمار کہ گھر میں غلے کی طرح سے بھری ہوئی ہے اور قلب اتنا متوجہ الی اللہ کہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش، مسلم کو ایسا بنایا گیا ہے۔ مسلمان کو نہ تو یہ کہا گیا کہ تو شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر بیٹھ، پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ فرمایا یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے رہبانیت ختم کر دی۔ کمانا فرض بتلایا ہے۔ لیکن کمانے کے بعد لکھ پتی بن جائے۔ تو کیفیت یہ پیدا کر دی جائے کہ ہاتھ پیر میں تو سونا چاندی رکھا ہوا ہو، دل اللہ میں اٹکا ہوا ہو۔ مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے۔

اور مذاہب میں ترک دنیا اس طرح سکھلائی گئی کہ دولت کو ختم کر دو۔ اسلام میں اس طرح سے سکھلائی گئی کہ کماؤ مگر دل سے ترک کر دو۔ محبت کا تعلق نہ رہے۔ یہ زیادہ حوصلہ کا کام ہے۔ دنیا کو بالکل چھوڑ کر پہاڑ میں جا بیٹھے، یہ آسان ہے۔ لیکن سامنے موجود ہو، پھر دل میں گنجائش نہ ہو، یہ ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ یہ مجاہدہ مسلمان کو بتلایا گیا کہ سب کچھ لے کر پھر قلب سے بے تعلق رہے اور ہاتھ پیر سے اس طرح لگا رہے جیسے چوبیس گھنٹے اسی کام کے ہوں۔

حاصل یہ نکلا کہ دولت کتنی بڑھ جائے، اس کو وفادار نہیں بتلایا گیا۔ وہ دنیوی زندگی میں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور مرنے کے وقت تو چھوڑتی ہی ہے۔ جو ایسی بے وفا چیز ہو، اس سے محبت کر کے آدمی کیا کرے؟ اسے غلام اور خادم بنائے رکھے، یہی اس کا حق ہے۔ پھر بھی اگر اس کو قبلہ بنا لے، تو حشر یہ ہوگا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال میں بیان فرمایا کہ عین مرتے وقت مال سے مدد طلب کی کہ میں نے ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح تیری عزت کی، کیا تو میرے کام آئے گا؟ اس نے کہا میں تیرے کام آنے والا نہیں۔ اس وقت آدمی پچھتائے گا کہ میں نے سارا دل و دماغ کا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا اور اس نے وفا نہ کی، افسوس رہا۔ تو فرمایا کہ یہ تو بڑا بھائی ہے۔

1 **منجھلے بھائی کا سلوک**...... اور فرمایا سمجھے منجھلا بھائی کون ہے؟ فرمایا وہ انسان کے بیوی اور بچے ہیں کہ انسان مرتے وقت امید کی نگاہیں ڈالتا ہے کہ شاید میری بیوی یا اولاد کام آ جائے۔ میرا آخری وقت ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں کام آ سکتے۔ تو جانے تیری قبر جانے زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ تو مر جائے گا تو تجھے زیر زمین دفن کر دیں گے۔ لیکن آگے تو جانے، تیرا کام جانے۔ ہم تیرے مددگار نہیں حالانکہ بیوی بچے آدمی کے وہ ہیں کہ آدمی بعض اوقات ان کی محبت میں جان بھی کھو دیتا ہے، بعض دفعہ ایمان بھی کھو دیتا ہے۔ اولاد کی صحت اور بیماری سے بچانے کے لئے بعض مرتبہ ماں باپ شرکیہ چیزیں بھی کر گزرتے ہیں۔ ٹونے اور ٹوٹکے نیز سحر اور جادو بھی کرا لیتے ہیں۔ سحر حرام سے بھی باز نہیں رہتے کہ کسی طرح سے اولاد بچ جائے، کسی طرح سے جان بچ جائے۔ اولاد کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ مگر مرنے کے وقت وہ بھی ٹکا سا جواب دے دے گی کہ میں تمہارے کام کی نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔ یہ کہے گا، میں نے عمر بھر تیرے ساتھ سلوک کیا، وہ کہے گی، کیا ہوگا، تو نے جھک مارا، کس نے کہا تھا تجھے سلوک کرنے کو۔ اب بھگت اکیلے ہی۔ ہم تیرے کام آنے والے نہیں ہیں۔ تو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھائی کیسا ہے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بھائی شریف نہیں ہے۔ یہ بھی کمینہ خصلت نکلا۔

اس واسطے بیوی بچوں سے محبت ہو تو ان کی اصلاح کے لئے ہو، ان کی تعلیم و تربیت کے لئے تعلق ہو۔ بیوی کی محبت اس لئے ہو کہ اس کو بھی خدا پرستی میں لگایا جائے۔ محض نفس پرستی کی محبت ہوگی تو سب سے پہلے وہ الگ ہو کر یہ کہے گی، میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں وہ کہے گا میں تیرا خاوند ہوں، وہ کہے گی میں نہیں جانتی۔ اب تو میں دوسرے کے گھر جانے والی ہوں یا بیٹھنے والی ہوں۔ میرا تیرا واسطہ کیا؟۔ لیکن اگر تربیت کی اور اسے سیدھے سچے راستے پر لگایا، وہ کہے گی کہ میں ایصال ثواب بھی کروں گی، میں قبر میں بھی تجھے نہیں بھلاؤں گی۔

آخرت میں بھی نہیں بھلاؤں گی، تو مطمئن رہ میں برابر ثواب پہنچاؤں گی۔ اولاد کہے گی، میں تیرے لئے صدقہ جاریہ ہوں۔ تو نے میری تربیت کی، مجھے علم پڑھایا، عمل کے راستہ پر لگایا، آج تو جا رہا ہے، تو میرا عمل تیرے ساتھ جا رہا ہے،۔ میرا صدقہ جاریہ ہونا تیرے ساتھ ہے، تو فکر مت کرنا۔ لیکن اگر محض اولاد ہی اولاد ہے، یا بیوی ہی بیوی ہے، کوئی تربیت نہیں، محض نفس پرستی اور تعیش ہی ہے اور کچھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا تیرا کیا

واسطہ؟ تو جانے تیرا کام جانے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ منجھلا بھائی کیسا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا بالکل بیکار اور کمینہ خصلت ثابت ہوا۔

چھوٹے بھائی کا حسن سلوک...... فرمایا: اور سمجھے وہ تیسرا بھائی کون ہے؟ جس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کی اور اس نے کہا میں ہی آج کام آؤں گا۔ فرمایا وہ انسان کا نیک عمل ہے جس سے انسان عمر بھر بدسلوکی کرتا ہے۔ نماز کا گلا گھونٹتا ہے، یہ روز کا معمول ہے۔ نہ وقت کی پابندی نہ مسجد کی حاضری۔ کتنے انسان ہیں کہ رمضان آ رہا ہے، لیکن انہیں ذرا احترام نہیں۔ برسر بازار وہ سگریٹ پیتے اور کھاتے پھر رہے ہیں۔ بہت سے اللہ کے بندے ہیں کہ انہیں بے شمار دولت دی گئی۔ انہیں زکوٰۃ وصدقات کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ وہ تعیش اور سینما تھیٹر پر خرچ کریں گے، یا شراب وکباب پر خرچ کریں گے۔ تو اس میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ نہ نماز کی فکر نہ روزے کی فکر، نہ حج کی فکر۔ اور اگر یہ چیزیں سرانجام دیں، تو دل میں غرور کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ اس لئے کہ باوجود دولت کے میں نے نماز پڑھ لی۔ معاذ اللہ اللہ پر کوئی احسان کیا۔ نماز پڑھنا چاہئے تو نہیں تھا، اس لئے کہ دولت مجھے فرصت کب دیتی ہے۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی اور حج کر لیا۔ حج کرنے کے بعد تو گویا ساتوں جنتیں میرے قبضے کی ہوگئیں۔ اب میرے نیچے سے نکل ہی نہیں سکتیں تو یا تو عمل ندارد اور اگر کرے تو غرور موجود ہے، اس سے تو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بہر حال نیکی کے ساتھ انسان بدسلوکی کرتا ہے۔ سوائے اس کے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو نیکی تقویٰ اور طہارت کو اصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی نیکی کو قائم رکھنے کے لئے جان ومال کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر وہ سو میں دو چار ہوتے ہیں۔ زیادہ وہی ہوتے ہیں جنہیں نیکی وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ آخرت پیش نظر ہے ہی نہیں بس یہیں کا سارا جھگڑا سامنے ہے۔

تو مرنے کے وقت جب آدمی نیک عمل کی طرف رجوع کرے گا، تو یہ نیک عمل کہے گا۔ میں ہی ہوں تیرے کام آنے والا۔ اگر چہ تو نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ میں قبر میں، حشر میں، پل صراط پر تیرے ساتھ ہوں اور جنت میں بھی جو تجھے منافع ملیں گے، وہ میری وجہ سے ملیں گے۔ اس لئے وہاں بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو ابدالاباد تک جو چیز انسان کا ساتھ دینے والی ہے، وہ انسان کی نیکی اور عمل صالح ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور سوال وجواب میں پورا اترتا ہے، اس کی قبر جہاں تک نگاہ جاتی ہے، وسیع کر دی جاتی ہے۔ اسے ایک عظیم عالم نظر پڑتا ہے، جس میں روشنی بھی ہے، چاندنا بھی ہے، تو دور سے اسے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے سے خیر وبرکت ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس کا چہرہ دیکھ کر دل میں فرحت اور خوشی بھر جاتی ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہا ہے۔ جب قریب آتا ہے تو یہ میت پوچھتی ہے، اے شخص تو کون ہے؟ اس تنہائی کے گھرانے میں تو میرے پاس آیا۔ تیرے چہرے کو دیکھ کر مجھے

یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل خوشیوں سے لبریز ہے۔ تو کون ہے جو اس بے کسی کے عالم میں میرے پاس آ رہا ہے۔ وہ کہے گا تو مجھے بھول گیا، اتنی جلدی فراموش کر دیا۔ اَنَا عَمَلُکَ الصَّالِحُ ① میں تیرا نیک عمل ہوں۔ میں تجھے تسلی دینے کے لئے آیا ہوں کہ اسی تنہائی میں قطعاً مت گھبرانا، میں تیرے ساتھ ہوں۔ کوئی آنچ تجھ پر نہیں آ سکتی آئے گی تو میں اسے جھیلوں گا۔

تو عمل صالح وہ ہے جو نزع میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ۔ حدیث میں ہے کہ نزع کے وقت خود ملک الموت علیہ السلام تلقین کرتے ہیں کہ دیکھ جان کنی کا وقت قریب ہے۔ اب بھی اللہ اللہ کر لے، اب بھی کلمہ پڑھ تو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس وقت آدمی عمل تو نہیں کر سکتا، بے بس ہے، بعض دفعہ تو زبان بھی بے بس ہوتی ہے۔ آدمی وہ بھی نہیں کر سکتا، مگر دل میں تصور کر سکتا ہے۔ اس وقت کا وہ عمل بھی کار آمد ہو جاتا ہے کہ وہ دل کے اندر توحید و رسالت اور ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ کا ورد کر رہا ہے۔ تو ملک الموت بھی کہتے ہیں کہ ہاں جلدی کر۔ اس کو تلقین کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی نیکی کار آمد ہوگی۔ اس وقت کی یہ نیکی بھی کار آمد ہوگی۔ تو اس وقت دولت، بیوی، بچوں کا کام نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہے تو صرف نیکی کا کام کر سکتا ہے۔ تو نزع میں بھی نیکی کار آمد ہوئی۔

قبر میں بھی نیکی کار آمد ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے۔ تو چاروں طرف سے عذاب اس کی طرف دوڑتا اور بڑھتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے دماغ میں قرآن کی آیتیں محفوظ ہیں، وہ کھڑی ہو جاتی ہیں، خبردار! ادھر سے مت آنا۔ عذاب کا راستہ روک دیتی ہے۔ دائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں ہے کہ نمازیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو زکوٰۃ و صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں چہار طرف سے ناکہ بندی کر دیتے ہیں۔ عذاب رک جاتا ہے۔ اس طرح سے عذاب سے حفاظت کرنے والے وہاں اعمال صالحہ بنتے ہیں۔ وہاں بیوی، بچے اور رشتہ دار مدد کو نہیں پہنچتے۔ البتہ نیکی وہاں سنتری بن کے حفاظت کرتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی پر پھانسی کا مقدمہ چل جائے اور تمام ثبوت بیکار ہو جائیں اور یقین ہو کہ اب پھانسی چڑھے گا۔ اس وقت دنیا کا دستور ہے کہ مجرم براہ راست بادشاہ کے سامنے مراحم خسروانہ کی درخواست کرتا ہے کہ قانون میں تو گنجائش نہیں ہے۔ بادشاہ اگر خصوصی رحم و کرم سے مجھے چھوڑ دے، تو میری رہائی ہو سکتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی بادشاہ اور حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کو پیش کرتا ہے۔

قدیم زمانے میں دستور تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شاہی فرمان ہوتا تھا، تو لوگ مراحم خسروانہ کی درخواست

① المصنف لابن ابی شیبة، باب فی نفس المومن کیف تخرج، ج:۳، ص:۲۵۶، رقم:۱۲۰۵۹. امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں امام احمد نے اس کو مطول ذکر کیا ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب السوال فی القبر ج:۱ ص:۴۷۱.

پیش کرتے وقت وہ لے جا کر پیش کرتے تھے کہ ہم تو پشتینی حکومت کے وفادار ہیں، ہمارے گھر میں تو بادشاہ کا فرمان موجود ہے، ہمیں بادشاہ اور حکومت نے اپنا سمجھا تھا۔ ہم اس فرمان کو پیش کر کے نجات چاہتے ہیں۔ ہم وفادار، خدام، فدیہ اور حکومتی ٹیکس ادا کرنیوالا فدوی اور غلام ہیں۔ تو دستور یہ تھا کہ شاہی فرمان ادب کے ساتھ سر پر رکھ کر پیش کیا کرتے تھے کہ یہ فرمان ہے۔ ہم حکومت کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہم کو چھوڑ دیا جائے تو ادب کی وجہ سے سر پر رکھ پیش کرتے تھے ہاتھ سے پیش نہیں کرتے تھے۔ تو علماء لکھتے ہیں کہ جب عذاب خداوندی سر کی طرف سے آئے گا تو یہ شخص جس کے دماغ میں قرآن کریم محفوظ ہے۔ یہ قرآن کریم کو پیش کرے گا کہ میں تو اللہ کی حکومت کا فرمانبردار ہوں، میں غلام رہ چکا ہوں میرے گھر میں تو یہ شاہی فرمان ''قرآن کریم'' آیا ہوا ہے۔ میں سر پر رکھ کر پیش کرتا ہوں کہ اس کی بدولت مجھے نجات دی جائے اور ابدالآباد کی پھانسی سے مجھے بچایا جائے۔ تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو قرآن روکتا ہے۔ اسی حدیث میں ہے ''اَلصَّلٰوۃُ بُرْھَانٌ'' ① نماز انسان کی دستاویز ہے اور عدالت میں جب اپنی رہائی کے ثبوت کے لئے دستاویز پیش کرتے ہیں، تو دایاں دائیں ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ گویا نماز دائیں طرف سے عذاب کو روکے گی۔ گویا یہ انسان کی دستاویز ہے۔

اسی حدیث میں فرمایا گیا: اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے تو جب وار روکا کرتے ہیں تو ڈھال بائیں ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزہ مثل ڈھال کے آگے آجاتا ہے۔ تو ادھر سے بھی عذاب نہیں آسکتا۔ اور زکوۃ وصدقات یہ انسان کے پامزد ہیں۔ ہاتھ پیر کی کمائی ہے۔ تو پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو یہ صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض قبر میں چہار طرف سے ناکہ بندی عمل صالح ہی کرتا ہے۔

نیکی ہر عالم میں کار آمد ہوگی ...... حدیث میں ہے کہ آدمی جب قبر سے اٹھ کر میدان محشر میں جائے گا، تو اس کے آگے آگے ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' سر کے اوپر ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ''، دائیں طرف ''سُبْحَانَ اللّٰہِ''، بائیں طرف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' اور پشت پر ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' ہوگا اور یہ پانچوں کلمے اس طرح سے حفاظت کرتے ہوئے لے جائیں گے، جس طرح سپاہی حفاظت سے لے جاتے ہیں اور میدان محشر کے ہولناک مناظر سے بچادیں گے۔ بلکہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ ③ اللہ کی طرف سے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں کچھ چیزیں ہوں گی۔ جو اللہ کے امر سے حفاظت کریں گی۔ وہ معقبات یہ تسبیحات ہوں گی۔ اللہ

---

① السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ، ج:۲ ص:۵۱۲ رقم:۶۱۴: حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج:۲ ص:۱۱۴ رقم:۶۱۴. ② السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ، ج:۲ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج:۲ ص:۲۶۴ رقم:۷۶۴. ③ پارہ:۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ:۱۱.

کے نام اور کلمات ہیں جن کے ذریعے سے آدمی بچے گا، تو محشر میں بھی عمل صالح ہی کام آیا قبر و نزع میں بھی عمل صالح کام آیا۔ زندگی میں بھی اگر کام آتا ہے تو یہی عمل آتا ہے۔ اگر کوئی شخص متقی ہے اور وہ اتفاق سے کسی مصیبت میں پھنس جائے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس کیساتھ ہو جاتی ہیں کہا کرتے ہیں کہ بھائی غریب آدمی ہے، بے چارہ پھنس گیا مصیبت میں، یہ کوئی چور ڈاکو نہیں، کبھی برائی نہیں کرتا تھا، آج اس پر مقدمہ قائم ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے شرارت کی ہے۔ یہ اپنی ذات سے برا نہیں۔ تو نیک آدمی کو دنیا بھی اچھا کہتی ہے اور بدآدمی کو دنیا بھی برا کہتی ہے تو نیکی اور تقویٰ دنیا میں کام آتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ① جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ میں تو ہر طرف سے پھنس چکا تھا۔ یہ کہاں سے راستہ پیدا ہو گیا۔ اللہ کی طرف سے اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مدد ہوتی ہے۔

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② جب رزق کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جاتے ہیں، اگر آدمی نیک اور متقی ہے، تو ایسے راستے سے رزق بھیجتے ہیں کہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس راستہ سے رزق آئے گا۔

تو دنیا میں، مرنے کے وقت اور قبر میں بھی حتیٰ کہ حشر میں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اس کے سوا کوئی چیز کہیں کام نہیں آتی۔ بلکہ بیوی اور بچے بھی جبھی کام آتے ہیں، جب ان کے اندر نیکی پیدا کر دی جائے۔ وہ بد مزاج ہوں تو بیوی وبال بن جاتی ہے۔ اولاد اگر بری پیدا ہوئی تو وہ ایک مستقل مصیبت بن جاتی ہے نبی کریم داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَّلَدٍ يَّكُوْنُ عَلَيَّ وَبَالًا. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ امْرَاَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ" ③ اے اللہ! ایسی عورت سے پناہ مانگتا ہوں، جو بڑھاپے سے پہلے مجھے بوڑھا کر دے۔ یعنی رات دن اتنا ستائے کہ میں غم میں گھل گھل کر وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاؤں۔ اور ایسی اولاد سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے عذاب اور وبال بن جائے کہ نہ چھوڑ کے بن پڑتی ہے، نہ پکڑ کے بن پڑتی ہے۔ چھوڑ کے دھکا بھی نہیں دے سکتے کہ اولاد ہے۔ رکھے تو رات دن اس کی بدمزاجی کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار، اولاد و بیوی وبال جان بنتی ہیں۔ راحت کا ذریعہ کب بنتی ہیں؟ جب ان کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے۔ تو یہاں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اولاد اور بیوی کام نہیں آئی۔ حدیث میں ہے کہ: چند چیزیں ہیں جن کے صدقہ جاریہ کا ثواب آدمی کو پہنچتا رہتا ہے۔ جیسے کنواں، سرائے یا مسافر خانہ بنوا دیا تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، آرام حاصل کریں گے۔ اسے ثواب ملتا رہے گا۔ ④ یہ ابدی صدقہ ہے۔ کسی نے مسجد و مدرسہ بنوا دیا۔ جب تک لوگ اس میں

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔ ③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمہ : محمد ج: ۱۳ ص: ۳۳۷ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ من لم اعرفھم۔

④ الصحیح لمسلم، کتاب الوصیۃ، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ، ج: ۳ ص: ۲۵۵، رقم: ۱۶۳۱۔

پڑھیں گے، عبادت کریں گے اجر و ثواب بنانے والے کو ملتا رہے گا یہ صدقات جاریہ ہیں۔ فرمایا گیا سب سے بڑا صدقہ جاریہ انسان کی نیک اولاد ہے۔ جس کو آدمی سچے راستے پر ڈال دے۔ جب تک وہ نیکی کرے گی، اس کی نیکی کو دیکھ کر کوئی اور نیکی پہ چلے گا، تو جو سب کو اجر ملے گا، وہ تنہا اس شخص کو ملتا رہے گا۔ جس نے اولاد کو صالح بنایا، دین سکھلایا، علم دین پڑھایا، ان کی نیکیاں دیکھ کر محلہ والے، شہر والے نیک بن گئے۔ تو سب کو مل کر جتنا ثواب ملے گا، اس تنہا کو ملے گا، جس نے یہ راستہ پیدا کیا۔ تو اولاد صدقہ جاریہ کب بنتی ہے جب نیکی کے راستے پر ڈال دو۔ تو فی الحقیقت نیکی ہی کام آئی۔ اولاد کام نہیں آئی۔ بیوی کب راحت بنتی ہے، جب اس کے ماں باپ نے اس کے اخلاق درست کر دیئے ہوں۔ اس کو صحیح تربیت دی ہو کہ وہ اپنے خاوند اور سسرال کے لئے راحت کا ذریعہ بنے۔ تو راحت عورت نے نہیں پہنچائی، اس کی نیکی نے پہنچائی۔

حاصل یہ نکلا کہ عمل صالح دنیا میں، قبر میں اور آخرت میں بھی کام دے گا۔ نہ بیوی نہ اولاد نہ رشتہ دار اور نہ دولت کام آئیں گے۔ وہ تو بڑے اور منجھلے بھائی ہیں جو وقت کے اوپر جواب دیں گے۔ یہ بے چارہ عمل صالح ہی چھوٹا بھائی ہے جو ہر جگہ کام دیتا ہے۔

تو اس مثال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا باریک مسئلہ حل فرما دیا۔ اولاد اور دولت کی پوزیشن بھی بتلادی اور عمل صالح کی بھی۔ اگر ویسے حجت و برہان سے سمجھایا جاتا تو شاید میری اور آپ کی سمجھ میں نہ آتا مثال دے کر سمجھایا تو بات بالکل عیاں ہوگئی اور کھل گئی۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص علمی قوت ہے کہ باریک مسائل کو مثالوں کے ذریعے واضح فرما دیتے ہیں۔ تو عمل صالح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمدہ طریق پر واضح فرما دیا۔ اس کی حیثیت کھل گئی اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا:

عمل صالح کی ضرورت...... ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے لوگو! عمل کرو۔ محض باتیں نہ بناؤ، محض معلومات میں اضافہ مت کرو۔ یہ ایک قسم کا تعیش ہے، یہ ذہن کی عیاشی ہے، یہ کار آمد نہیں ہوگی۔ علم کو اپنے اندر سمو کر عمل صالح کا راستہ بناؤ۔ یہ کار آمد ہوگا۔ تو اے پیغمبر! فرما دیجئے اے لوگو! عمل کرو۔ ﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① یہ جو تم عمل کر رہے ہو۔ یہ رائیگاں جانے والا نہیں ہے اسے عنقریب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین بھی دیکھنے والے ہیں۔ قیامت کے دن مسلمانوں کے سامنے بھی تمہاری زندگی آئے گی۔ اللہ کے سامنے اعمال پیش ہوں گے۔

انبیاء علیہم السلام اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اعمال پیش ہوں گے کہ یہ ہی آپ کی امت کے اعمال اور اولین و آخرین جتنے ایمان والے ہیں، سب کے سامنے ہر ہر شخص کی زندگی آئے گی۔ تو فرمایا گیا، ایسے موقع سے غافل مت رہو، جس میں ساری چیزیں کھلنے والی ہیں۔ اگر ہماری کوئی برائی ہو اور ہمارے گھر والوں کے

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵۔

سامنے آ جائے۔ تو ہم منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ گھر والوں کی نگاہ میں بھی ہماری ذلت ہوگی اور گھر والوں سے گزر کر محلے والے بھی جان لیں، تو اور زیادہ شرمندگی ہوتی ہے اور اگر محلے سے گزر کر پورے شہر میں پھیل جائے کہ فلاں صاحب نے یہ کرتوت کی، تو گھر سے نکلنے کا منہ نہیں ہوتا۔ تو دوسروں میں ذرا ہماری بدی پھیل جائے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور جب خدانخواستہ اولین و آخرین کے سامنے ہماری برائی آ گئی، آدمؑ کی ساری اولاد دیکھے گی۔ اس میں مسلم و کافر اپنے اور پرائے سب ہی ہیں۔ ہر ہر شخص علی رؤس الاشہاد دیکھے گا کہ فلاں نے یہ حرکت کی تھی۔ اس وقت شرمندگی کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت انسان کی خفت وندامت کا کیا عالم ہوگا؟

تو اسوقت سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① اس دن سے ڈرو جب سب رب العالمین کے سامنے کھڑے حساب دیتے ہوئے ہوں گے ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ ② جب قیامت کے دن اللہ، رسولوں کو جمع کریں گے اور فرمائیں گے جب تم نے ہدایت کی، تو امتوں نے تمہارے سامنے کیا کیا جواب دیئے۔ اور وہ کہتے ہوئے ہوں گے کہ فلاں نے میری بات مانی اور فلاں نے نہیں مانی۔ فلاں طبقے نے سنا اور فلاں طبقے نے میرے کہنے کو بالکل اکارت کر دیا۔ اس وقت کی رسوائی، شرمندگی اور فضیحت کتنی بڑی ہوگی، اس کا کوئی اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔

روز کے روز نامۂ اعمال کرتے رہنا چاہیئے...... اس واسطے حدیث میں حضرت عمر بن خطاب کا ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ”حَاسِبُوْا انفسکم قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا“ ③ اس سے پہلے اپنی زندگی کا حساب لے لو، کہ وہاں حساب لیا جائے۔ اس سے پہلے اپنے کچے چٹھے کو درست کر لو۔ جو وہاں پر خدا کے اکاؤنٹنٹ ہیں، وہ تمہارے حساب کو جانچیں۔

اگر یہ معمول بنا لیا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں عمر بھر کی باتیں آدمی کو یاد نہیں رہتیں۔ لیکن روز کی بات تو روز یاد رہتی ہے۔ اگر چارپائی پر لیٹ کر آدمی عشاء کے بعد ایک وقت مقرر کر لے کہ لیٹ کر دس منٹ کیلئے سوچے، دن میں میں نے کتنی بدیاں کیں اور کتنی نیکیاں کیں اگر نیکیاں سمجھ میں آئیں تو اللہ کا شکر کرے، کہ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو مجھے نیکی کی توفیق دے دی۔ تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جس نعمت پر شکر کرو گے، اس نعمت کو بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکی پر شکر کرو گے، نیکی بڑھتی جائے گی اور دن بھر میں جتنی بدیاں کی ہیں، وہ بھی آدمی سوچ لے جو بدی سامنے آئے، گڑ گڑا کے اللہ کے سامنے توبہ کرے کہ اے اللہ! میرے سے غلطی ہوئی۔ اگر اللہ کا حق تھا، توبہ کر لے، امید ہے کہ معاف ہو جائے گا۔ اگر مخلوق کا حق تھا، اگلے دن حق کو ادا کر دے کسی کا روپیہ مار لیا تھا، اسے دے دے۔ کسی کو گالی دی تھی یا غیبت کی تھی، اس سے معافی مانگ لے حقوق اللہ ضائع کئے ہیں تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۰۹. ③ السنن للترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقاق والورع، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، ج: ۴ ص: ۶۳۸ رقم: ۲۴۵۹.

حقوق العباد ضائع کئے ہیں، تو بہ کرے اور صاحب حق سے معافی مانگ لے۔ اگر روز کے روز کچھا چٹھا صاف ہوتا رہا، آدمی کو مرنے کا غم نہیں ہوگا۔ مرنے کے وقت حساب صاف ہوگا، کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اور اگر روز کے روز نہ کیا، آج پچاس بدیاں کیں، وہ جمع ہوگئیں، کل اور کیں، ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ تیسرے دن اور بیس پچاس کیں، تو ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ مرنے کے وقت ظلمتوں کے سیاہ پردے سامنے پڑے ہوئے ہوں گے۔

کس طرح سے آدمی انہیں دھوئے گا، اگر ایک کپڑے پر دھبہ پڑ جائے، جبھی کپڑا صابن سے دھودے کپڑا صاف اور اگر دھبے پڑتے پڑتے مہینے بھر میں سارا کپڑا سیاہ ہوگیا، تو سارے بازار کا صابن خرچ کر کے بھی دھبے نہیں جائیں گے۔ وہ تو کپڑا ہی کالا ہوگیا۔ اس واسطے آدمی روز کے دھبے دھولے۔ تو صاف ہو جائیں گے ان کو جمع نہ کرے۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اگر کوئی بدی کرے تو بدی کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے تاکہ وہ مٹ جائے 'نامہ اعمال درست ہو جائے۔ جمع واصرار اس کے اوپر نہ کرے، تو یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا کرے۔ سونے کے وقت دس منٹ مقرر کرے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں۔ کتنی بدیاں کیں۔ نیکیاں یاد آئیں تو شکر کرے اور بدیاں یاد آئیں تو توبہ کرے۔ جب روز توبہ ہوتی رہے گی، بدیاں مٹتی رہیں گی۔ تو آدمی ہلکا پھلکا رہے گا۔ بڑی آسانی سے موت کے لئے منتظر ہو جائے گا اور موت کے تصور سے کوئی گرانی نہیں ہوگی۔

نیکی سے امید اور بدی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے...... اس لئے کہ نیکی کرنے سے امید پیدا ہوتی ہے، بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے جو ملازم ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا، بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے، اسے تمنا رہتی ہے کاش میرے سے کوئی پوچھے، تو نے کیا کام کیا تاکہ میں بتا سکوں کہ میں نے یہ کیا یہ کیا مجھے انعام ملے گا، تنخواہ بڑھے گی، مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔ تو نیکی کرنے سے امیدیں بندھتی ہیں۔ حق تعالیٰ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور بدیاں کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے، گھٹن پیدا ہوتی ہے اللہ کے سامنے جانے کو جی نہیں چاہتا نیک آدمی تمنا میں رہتا ہے کہ کب موت آئے اور مجھے بدلے ملیں اور بد آدمی مایوس ہوتا ہے کہ کسی طرح موت نہ آئے، اسے مرنا بھی موت ہو جاتا ہے۔

اسی واسطے کفار کے بارے میں فرمایا گیا، چونکہ انہیں مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ آخرت کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لئے انہیں مرنا بھی بھاری ہے ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ ① تم ان کو اس زندگی کے اوپر انتہائی حریص پاؤ گے۔ اگر ان کی عمر پچاس برس کی ہو تو وہ چاہیں گے، ساٹھ برس کی ہو جائے، دنیا سے ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ ② اور جو شرک میں مبتلا ہیں، وہ اس تمنا میں ہیں کہ کاش ایک ہزار برس کی عمر مل جائے۔ وہ مل جائے تو چاہیں گے کہ ایک ہزار کی اور مل جائے۔ وہ دنیا سے ٹلنا چاہتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ آئندہ انہیں کوئی توقع نہیں۔ مایوسیاں اور

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶.

ظلمتیں ان کے سامنے ہیں۔ مستقبل ان کا تاریک ہے۔

اور نیک آدمی مومن تو اس کے بارے میں ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا، یہود نے کہا تھا ہم اولیاء اللہ ہیں، تو فرمایا گیا ﴿قُلْ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْآ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تم اولیاء اللہ ہو، اور تم اللہ کے دوست ہو، تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ ولی کو تو تمنا ہوتی ہے کہ کب میں اس دنیا کو چھوڑوں اور اپنے پروردگار کے پاس جاؤں تم اگر واقعی ولی ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ حالانکہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ موت کے نام سے تمہیں بخار چڑھتا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ بس دنیا سے کسی طرح ٹلیں ہی نہ اور ایک ولی کامل کہتا ہے کہ یا اللہ! کب وہ دن آئے کہ اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑ کر پاک وطن میں پہنچیں ؂

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم	راحت جاں طلبیم در پے جاناں بردیم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بردیم

وہ کہتے کہ وہ کیسا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑی ہوئی بستی کو چھوڑ کر ہم اس پاک وطن میں پہنچیں گے غزل خواں وفرحاں وشاداں اور اللہ کے گن گاتے ہوئے اللہ کے ہاں آخرت میں پہنچیں گے۔ تو ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ مرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور بدی کا خاصہ یہ ہے کہ مایوسی بڑھتی ہے۔ خدا سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس واسطے فرمایا مشرکین کو حیات دنیوی پر زیادہ حریص پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی نیکی بڑھتی جائے گی، انسان کے لئے مرنا خوشگوار ہوتا جائے گا۔

یہ جو بعض اوقات ہماری کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا سا بیمار ہوئے اور گمان ہوا کہ موت آئی تو بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں کہ کچھ کرو، کوئی تعویذ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ٹل جائیں مرنا جینا یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر انسان اتنا گھبرا جائے، خدا جانے کیا ہو جائے گا۔ ایک صالح اور نیک بندے کے لئے تو خوشی کا مقام ہے کہ زندہ رہوں تو روزہ، نماز، طاعت وعبادت وغیرہ کا عمل نصیب ہوگا اور اگر مر گیا، تو اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، اس سے بہتر کیا چیز ہوگی۔ تو زندگی بھی خوشگوار، مرنا بھی خوشگوار! حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات کا جب وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے، خوشی اور مسرت میں ڈوبے ہوئے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! نزع کی تکلیف ہو رہی ہے اور خوشی ایسی جیسے معلوم ہو کہ شادی ہونے والی ہے فرمایا ''غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ'' ② پس عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ملاقات ہونے والی ہے۔ اسی خوشی میں جان دے رہے ہیں کہ اب وقت قریب ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت خوش ہیں، روزے سے ہیں، فرمایا بس عنقریب افطار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا کر کرنا ہے۔ چند منٹ رہ گئے ہیں یہ کیفیت نیکی اور تقویٰ وطہارت سے پیدا ہوتی ہے کہ

① پارہ: ۲۸ سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶ . ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الزکوۃ، باب الانفاق و کراھیۃ الامساک، ج: ۶ ص: ۱۷۷ .

موت خوشگوار بن جاتی ہے بلکہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال روز کے روز اگر محاسبہ کرلیا جائے اور اپنی نیکیوں کو شکر کے راستے سے بڑھایا جائے اور بدیوں کو توبہ کے راستے سے ختم کر دیا جائے۔ تو موت خوشگوار ہو جائے گی۔ اگر تصور بندھے گا کہ موت آنے والی ہے تو گھبراہٹ نہیں پیدا ہوگی۔ یہ کہے گا یا اللہ! اگر میں زندہ رہوں، تب بھی تیرا ہوں، مروں تب بھی تیرا ہوں۔ یہاں تو نے زمین کی سطح پہ رکھا ہے، وہاں زمین کی تہہ میں۔ عالم دونوں تیرے ہی ہیں۔ اس لئے تیرے ہی پاس رہوں گا، مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں قبر کے ہولناک حالات ارشاد فرمائے کہ منکر نکیر اس ڈراؤنی شکل میں آئیں گے۔ قبر میں یوں تاریکی اور اندھیرا ہوگا۔ مصیبت ناک صورتیں سامنے آئیں گی۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول! اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی؟ فرمایا عقل تو رہے گی۔ کہا: اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہوتا رہے گا جو کچھ ہوگا۔ منکر نکیر سے نمٹ لیں گے تو عقل سے مراد مادی عقل نہیں تھی جس سے ہوائی جہاز اور موٹر تیار کئے جاتے ہیں۔ عقل سے مراد عقل ایمانی تھی۔ یعنی ہمارا علم، معرفت، بصیرت، توکل علی اللہ اور ایمانی قوت قائم رہے گی؟ فرمایا، رہے گی۔ عرض کیا اب کوئی فکر نہیں منکر نکیر کسی صورت میں آ جائیں۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق، ہم بھی اللہ کی مخلوق ڈرنے کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں سامنے ہے جس سے ہم ڈر رہے ہیں۔ جو اللہ سے ڈر گیا۔ وہ پھر کسی سے بھی نہیں ڈرے گا۔ یہ توکل تام اور عمل صالح کی برکت ہے کہ نہ موت کی فکر نہ اس کے ہولناک مناظر کی فکر بس اللہ پر بھروسہ ہے۔ جب وہ چاہیں گے لے جائیں گے ہم تو ان کے زیر سایہ ہیں، ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت؟

جو بادشاہ کا ملازم ہے، صاحب خاص ہو اور ہر وقت پاس رہتا ہو اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ جب بادشاہ سفر کریں گے۔ تو میں ان کے ساتھ اور جب اپنے محل سرائے میں ہوں گے تو میں ان کے ساتھ ہوں گا۔ میرا حلوہ مانڈہ ہر وقت صحیح ہے اور ہر وقت کی عیش ہے۔ میں سفر میں بھی ساتھ، حضر میں بھی ساتھ، مجھے فکر کی کیا ضرورت؟۔ یہی شان مومن کی بھی ہے کہ سفر میں دنیا کے مسافر خانے میں ہو۔ تب بھی تکلیف نہیں کہ مالک کی نگاہ کے نیچے ہے اور منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ تب تو راحت ہی راحت ہے وہاں پہنچ گئے جس کے لئے سب محنتیں کیں۔ یہ سب چیزیں عمل سے بنتی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا:

﴿قُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے نبی کریم صلی علیہ وسلم! اپنی امت سے فرما دیجئے کہ اے لوگو! عمل کرو۔ اس لئے کہ عمل اکارت نہیں جائے گا، سامنے آئے گا۔ ﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① عنقریب اس عمل کو اللہ، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین بھی دیکھیں گے۔ ﴿وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵۔

وَالشَّهَادَةِ﴾ ① اور قریب وقت آ رہا ہے کہ تم سب کے سب اللہ کے پاس پہنچائے جاؤ گے جو غیب و شہادت کا جاننے والا ہے۔ کوئی ادنیٰ چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اور یہی نہیں کہ محض جانتا ہی ہے، بلکہ ﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ② وہ جتلائے گا کہ تم نے یہ یہ کرتوتیں کی تھیں۔ اگر نیکی کی ہے، تو جتلائیں گے کہ تم بڑے اعلیٰ لوگ ہو۔ بڑی اعلیٰ کارگزاری دکھلائی۔ برائیاں کی ہیں تو یہ جتلایا جائے گا کہ یہ تمہارے کرتوت ہیں۔ تو وہ خبر دے دیں گے ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ چیزیں کی تھیں۔

نیکی اور بدی دنیا میں بھی نمایاں ہو کر رہتی ہے...... آدمی کی نیکی اور بدی چھپی نہیں رہتی دنیا میں بھی سامنے آ جاتی ہے۔ آخرت میں تو آئے ہی گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ایک کوٹھڑی فرض کی جائے اس کے اندر ایک اور کوٹھڑی، اس کے اندر ایک اور کمرہ اور اس میں ایک اور کمرہ سات کمرے اندر باہر ہوں اور کسی کمرے میں نہ دروازہ ہو نہ روشن دان ہو نہ سوراخ ہو اور ساتویں کوٹھڑی کے اندر بیٹھ کر آدمی کوئی نیک یا بد عمل کرتا ہے، اللہ اس کے عمل کو کھول کے رہتا ہے کہ مخلوق کے دل میں پڑ جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ نیک آدمی کو ساری دنیا نیک کہتی ہے۔ کسی نے جا کے تو اس کو نہیں دیکھا کہ اس نے کیا کیا نیکیاں کیں خواہ مخواہ دنیا کی زبان پر ہوتا ہے کہ فلاں بڑا نیک ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے اور بد ہمیشہ ساری بدیاں چھپا کے کرتا ہے کوئی کسی کے سامنے آ کر بدی نہیں کرتا چور چوری چھپ کر کرے گا، زناکار چھپ کر زنا کرے گا۔ مگر دنیا کی زبان پر ہے کہ فلاں بڑا بدکار، سیاہ کار اور بے ہودہ آدمی ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم نے خود اس کو یہ عمل بد کرتے ہوئے دیکھا؟ کہیں گے نہیں، دیکھا تو نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ تو آدمی نیکی یا بدی کرے، چھپی نہیں رہتی۔

تو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اس کے عمل کو دیکھیں گے۔ صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ اللہ کے حضور میں دیکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ جتلائیں گے کہ تم نے یہ یہ کیا تھا اور جتلانے کے بعد پھر ثمرہ مرتب ہو گا تو نیکی کا بدلہ نیکی سے اور بدی کا بدلہ بدی سے دیا جائے۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ③ ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ سامنے آ جائے گی۔ اس کا بدلہ بھی دیا جائے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ ④ اور ذرہ برابر بدی کی ہے، وہ بھی سامنے آ جائے گی۔ اس کا بھی صلہ ملے گا۔

عملی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت...... میں نے یہ آیت اسی واسطے اختیار کی تھی کہ عمل کی زندگی اختیار کی جائے۔ جتنے مسائل اب تک عمل میں آ چکے ہیں۔ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر ان کو عمل میں لایا جائے اور جو نہیں آئے، ان کو معلوم کیا جائے، تا کہ بقیہ زندگی درست کی جائے۔ یہ جب ہی ہو گا جب دل میں عملی زندگی کی فکر ہو۔

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۷۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۸۔

قول ہی قول یا محض باتیں کرلینا یا بنالینا یا امیدیں اور تمنائیں باندھ لینا کہ ہم تو مسلمان ہیں یوں ہوگا۔اس سے کام نہیں چلتا۔جدوجہد سے کام چلتا ہے۔ ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ ① انسان کے لئے اس کی سعی ہی کارآمد ہوگی۔اس کی جدوجہد ہی کام دے گی۔جیسے دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں اگر کوئی محنت نہ کرے، تجارت و زراعت نہ کرے، تو دوسروں کی محنت کام نہیں آتی اپنا ہی کیا کام آتا ہے۔دوسرا اگر خدمت بھی کرے گا، ایک دن خدمت کردی، دو دن کردی۔ناداروں کی طرح کفالت تو نہیں کرسکتے کہ انہیں بیٹھے بٹھائے کھلائے جاؤ۔مثل مشہور ہے کہ ''آنسوؤں سے گھڑے تو نہیں بھرے جاسکتے'' گھڑے تو دریا سے ہی بھر سکتے ہیں تو لوگوں کی امداد سے زندگیاں نہیں گزرتیں کچھ آدمی خود کرے، کچھ کمی رہ جائے دوسرا کردے۔یہ تو ہوتا ہے۔لیکن دنیا ان کی کفالت کردے جو ہاتھ پیر ہلانا نہیں جانتے ایسا کوئی نہیں کیا کرتا۔اپنی ہی سعی کام آتی ہے تو جب دنیا جیسی مردار چیز بھی بلا سعی کے نہیں حاصل کی جاسکتی۔

تو آخرت جیسی پاک چیز بلا سعی کیسے مل سکتی ہے؟ کہ وہ گھر بیٹھے خود ہی آجائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ﴾ ② کیا ہم رحمت تمہاری کمر سے چپکا دیں۔تم بھاگے چلے جارہے ہو، اور ہم پیچھے آرہے ہیں کہ بھئی رحمت لیتے جاؤ۔دس دفعہ محنت کرو، خوشامد کرو، تب رحمت ملے گی۔مستغنی بنتے ہو؟ ہم تو غنی ہیں، تم محتاج ہو کے غنی بنتے ہو۔ہم غنی ہی غنی ہیں۔ہم میں محتاجگی کا نام نہیں، غنا تو ہمارا کام ہے نہ کہ بندے کا۔

اس واسطے یہ آیت میں نے تلاوت کی عمل کے بارے میں چند باتیں گذارش کیں اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مثال دی کہ عمل کی یہ پوزیشن ہے۔اسی کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔علم چاہے تھوڑا ہو مگر اس پر عمل پورا ہو۔وہی انشاءاللہ دنیا و آخرت میں کام آئے گا۔اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔(آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

① پارہ:۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ:۳۹. ② پارہ:۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ:۲۸.

انسانی زندگی کا نصب العین

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

عظیم ترین نعمت ...... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ کے انعامات انسانوں کے اوپر بے شمار ہیں۔ جن کی کوئی گنتی نہیں کی جاسکتی۔ قدم قدم پر نعمتوں کی بارشیں ہیں اور لحہ بہ لحہ انسانوں کو عجیب عجیب انعامات دیئے جارہے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (1) اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے بیٹھ جاؤ تو تم شمار نہیں کر سکتے۔ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

غرض انسان کے اوپر بے شمار نعمتیں ہیں۔ لیکن ساری نعمتوں کی اصل اصول زندگی کی نعمت ہے جو ہمیں عطا کی گئی۔ اگر زندگی نہ ہو تو کوئی بھی نعمت نہ ہمارے لئے نافع بن سکتی ہے نہ مفید ہوسکتی ہے۔ تو اصل میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ ایک زندہ انسان ہی نعمت سے مستفید ہوسکتا ہے۔ تو نعمتیں ساری ایک طرف اور زندگی ایک طرف۔ عظیم ترین یہ نعمت یا عمر جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اللہ نے بے قیمت عطا کر دی ہے۔

ما نبودیم و تقاضائے ما نبود! لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے کوئی پکار تھی۔ نہ ہماری طرف سے کوئی تقاضا تھا۔ مگر تیرا لطف و کرم ہماری خاموش آواز کو سن رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں زندگی ملے۔ اس خاموش پکار پر اتنی بڑی نعمت دیدی کہ سارے جہاں مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتے۔ ایک انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاں اولاد ہو، اگر نہیں ہوتی تو دنیا کے خزانے خرچ کر دے، نہیں ہوتی اور دینے پہ آتے ہیں تو غریب انسان کو اتنی دے دیتے ہیں کہ بظاہر وہ تنگ آجاتا ہے۔ تو نہ مانگے سے ملتی ہے نہ قیمت سے ملتی ہے۔ محض فضل سے ملتی ہے۔

سب سے بڑی نعمت یہ عمر ہے پھر یہ عمر بھی کوئی چھوٹی موٹی عمر نہیں ہے۔ آپ اسے عمر سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کسی کی زندگی پچاس برس ہوگی؟ کسی کی ساٹھ ہوگی؟ بہت لمبی عمر ہوئی تو اسّی نوے برس کی ہوگی؟ یہ زندگی ہے؟ یہ زندگی

(1) پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۱۸.

کا ایک معمولی حصہ اور زندگی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔

ابدی زندگی...... انسان کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے'' ہمیشہ سے نہیں تھا لیکن پیدا ہونے کے بعد اب ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اب انسان کے لئے مٹنا نہیں ہے۔ وطن کا انتقال ایک وطن سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف ہوتا رہتا ہے۔ نقل مکانی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی انسان سے چھنتی نہیں ہے۔

یہ پہلے ''عالم الست'' میں تھا جبکہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے سب بنی آدم کو نکالا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر داہنا ہاتھ مارا تو ساری نیک اولاد نکل پڑی اور بایاں ہاتھ مارا تو ساری بد اولاد نکل پڑی۔ یہ بنی آدم کا پہلا ظہور ہے تو ''عہد الست'' میں ابتدائی ظہور ہے۔ وہاں سے انسان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد منتقل ہو کر ماں کے پیٹ میں آ گیا پھر ماں کے پیٹ کی عمر نو مہینے کی ہے۔ پہلے بھی فنا نہیں ہوا تھا، ماں کے پیٹ میں بھی آ کر فنا نہیں ہوا۔ ''عہد الست'' سے انتقال ہوا تو رحم مادر میں آیا۔ رحم مادر سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گیا۔ ہر ایک عالم سے گزرتے ہوئے انتقال ہوتا ہے اور دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ دنیا میں انتقال ہوگا تو برزخ کے اندر پہنچ جائے گا۔ برزخ سے انتقال ہوگا تو عالم حشر کے اندر پہنچ جائے گا۔ وہاں پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ عالم حشر سے انتقال ہوگا تو عالم جنت میں پہنچ جائے گا۔ پھر جنت میں ابدالآباد تک روزانہ انتقالات ہیں۔ بڑے بڑے جہاں اور روز نئی نئی نعمتوں کی تجدید ہوگی۔ وہاں بھی درجہ بدرجہ عروج حاصل کرتا رہے گا۔ تو جب سے انسان کا ظہور ہوا اب تک برابر سفر میں ہے اور سفر کرتا رہے گا۔ اس لئے انسان ازلی نہیں ہے مگر ابدی ہے کہ مٹنے والا نہیں ہے تو آپ کی عمر تھوڑی نہیں ہے جس کو بیس پچاس اور سو برس سمجھ لیں۔ یہ انسان کی عمر کا ایک معمولی حصہ ہے، انسان ابدی طور پر زندہ ہے اس ابدی اور لامحدود عمر کا ایک معمولی حصہ ہے جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی زندگی بڑی طویل اور لمبی ہے۔

اختیاری نصب العین کی ضرورت...... اس دنیوی زندگی کو گزارنا، اس کے لئے اللہ نے ایک تو غیر اختیاری حصہ رکھا ہے۔ وہ آپ چاہیں نہ چاہیں گزر جائے گا اور جب انسان پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اختیار میں دی ہیں کہ اپنے ارادے اور اختیار سے زندگی کا نصب العین بناؤ۔ اس کے تحت زندگی گزارو۔ اس لئے کہ جو وقت یا جو زندگی بلا نصب العین کے گزرتی ہے۔ وہی مجنونانہ حرکت کہلاتی ہے۔ ایک دیوانے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ زندگی اس کی بھی گزر رہی ہے۔ تو دیوانگی کے ساتھ عمر کو گزارنا، یہ دانش مند کا کام نہیں ہے۔ یہ دیوانوں کا کام ہے۔ زندگی کا کوئی نصب العین بنانا پڑے گا جس کے تحت زندگی گزاری جائے کہ ہم کیوں زندہ ہیں؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ اور یہ جو روز میرے انتقال ہوتے رہتے ہیں اس جہاں سے اس جہاں کی طرف اور وہاں سے وہاں کی طرف۔ آخر یہ کیا کوئی افسانہ ہے؟ یا کوئی قصہ ہے کہ خواہ مخواہ انسان چل رہا ہے۔

ہم کراچی سے حیدر آباد دکن کا سفر کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مقصد دینی یا دنیوی سوچ لیتے ہیں کہ اس لئے جارہے ہیں۔ بلا مقصد ریل میں بیٹھ جائیں اور کوئی پوچھے کہ کیوں جارہے ہیں؟ کہ یوں ہی۔ کہا جائے گا کہ تم دیوانے ہو؟۔ تو دیوانہ اسے کہتے ہیں جو بلا نصب العین اور بلا مقصد کے زندگی گزارے، دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت کا کوئی نصب العین ضرور ہو۔ تو اتنی بڑی حرکت جو ہزاروں برس سے چل رہی ہے، اور ابدالآباد تک چلتی رہے گی اور بلا مقصد ہو؟ یعنی دیوانگی بھی اور اتنی لمبی دیوانگی کہ اس کی کوئی حد و نہایت نہ ہو۔ کم سے کم انسان کے لئے زیبا نہیں جو مدعی ہے کہ میں سب سے بڑا دانشمند ہوں مجھے عقل کامل دی گئی ہے۔ یہ مدعی ہے کہ میں ساری کائنات پر فوقیت رکھتا ہوں اور افضل ہوں حتیٰ کہ ملائکہ کی جنس سے بھی افضل ہونے کا دعوے دار ہے۔ تو یہ انسان جو اتنا بڑا دعویٰ رکھتا ہے، اس کی اتنی بڑی زندگی بلا کسی مقصد کے؟ تو ایک طرف یہ عقل کا دعویٰ کہ سب سے بالاتر اور ایک طرف یہ مجنونانہ حرکت کہ کوئی نصب العین زندگی کا نہیں۔ یہ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔ اس لئے انسان وہی کہلائے گا جو اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کرے۔

ابدی مقصد...... اور نصب العین بھی معمولی نہیں ہونا چاہئے۔ اس واسطے کہ جب عمر لمبی اور ابدالآباد تک کی ہے تو مقصد ایسا ہو جو ابدالآباد تک چلے، چند دن میں ختم ہو جائے وہ بھی دیوانگی ہوگی کہ عمر تو لاکھوں برس کی لے کر آیا اور مقصد وہ سوچ لیا جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پھر بلا مقصد کے عمر گزرے، پھر اس کے اوپر دیوانگی آجائے تو مقصد اور نصب العین زندگی کا ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے جیسی خدا نے عمر دی ہے کہ عمر لمبی ہے تو مقصد بھی لمبا ہو۔ اگر وہ دس جہان طے کرے تو وہ مقصد بھی دس جہان طے کرے، اس لئے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ زندگی جیسی نعمت اور دولت جو انمول موتی کی طرح سے ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتی، اس کے لئے کوئی ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ مقصد ہونا چاہئے کہ ہماری دانش کے بھی سب قائل ہو جائیں اور خود انسان بھی ایک دوسرے کا قائل ہو کہ واقعی صحیح مقصد ہے۔

وقتی دولت اور روٹی مقصد نہیں...... مقاصد دنیا میں بہت ہیں، مثلاً عمر کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی لمبی چوڑی عمر، کا مقصد روٹی فرض کرلیں کہ ہمیں کھانے کو ملے، یہ مقصد اور نصب العین تو ہے لیکن یہ کیا نصب العین ہے جس کے لئے نہ فضیلت کی ضرورت نہ کمال کی ضرورت نہ علم کی ضرورت یہ مقصد بے پڑھے لکھے کو بھی حاصل ہے۔ روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کی انتہائی توہین ہے اگر اس کا مقصد روٹی بنایا جائے، اس لئے کہ روٹی جانور کا بھی مقصد ہے۔ ہر جاندار اپنے اپنے مناسب روٹی کھاتا ہے، شیر اور بھیڑیا جو کھاتے ہیں، کیا انہیں کوئی ڈگریاں حاصل ہوتی ہیں، جن سے یہ کماتے ہیں؟ تو روٹی اور کھانا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں، عالم کو بھی ملتا ہے، جاہل کو بھی۔ غرض ایسی چیز کو مقصد زندگی قرار دینا جس کے لئے قطعاً علم و شعور کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی کی توہین ہوگی۔

پھر یہ کہ زندگی ابدالآ باد کی مل رہی ہے اور مقصد وہ ٹھہرایا ہے جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ جب آدمی کا سانس ختم ہوا تو روٹی بھی ختم، روٹی اسے چھوڑ گئی یہ روٹی کو چھوڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پھر بلا نصب العین کے زندگی رہ گئی، اس لئے لمبی زندگی کا نصب العین لمبا ہونا چاہئے اس لئے روٹی مقصد نہیں بن سکتی۔

دولت بھی اسی میں شامل ہے۔ آپ دولت کمانے کو نصب العین رکھیں گے تو یہ کوئی اونچا مقصد نہیں، یہ ایک وسیلہ ہے اور ضرورت کی چیز ہے، انسان جب تک دنیا میں زندہ رہے گا۔ کمائے گا بھی اور اسے حکم بھی ہے کہ کمائے، یہ بھی نہیں کہ معطل ہو کے بیٹھ جائے، لیکن مقصد زندگی نہیں، کمانا خود کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، کمانا خود مقصد نہیں اگر وہ مقصد جو کمانے سے پورا ہوتا ہے کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو اس کمانے کو یقیناً چھوڑ دیا جائے گا مثلاً پیٹ بھرنا ہے، کپڑے پہننا یا رہنا سہنا یعنی مکان بنانا، یہ بڑا مقصد ہے۔ اگر اللہ میاں کسی ایسے جہان میں بھیج دیں جہاں ہمیں اس طرح کے مکان کی ضرورت پڑے نہ پیٹ بھرنے کی ضرورت پڑے، تو کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، غرض یہ زندگی کا نصب العین نہیں بن سکتا ایک وقتی چیز ہے۔

پھر یہ کہ اس جہاں کی کوئی کتنی بھی بڑی چیز ہے، یہ بھی اس میں داخل ہے کہ جب آدمی اس جہان کو چھوڑے گا وہ چیز اسے چھوڑ دے گی، یہ اس کو چھوڑ دے گا، پھر وہ نصب العین ہی کیا ہوا۔؟ ہمیں ایسا نصب العین چاہئے جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ چلے، کروڑوں برس کی عمر ہو جب بھی وہ چلتا رہے، جبھی عمر کی توقیر ہوگی اور اللہ کے انعام کی قدر ہوگی۔ ورنہ انتہائی بے قدری ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت اور اس کے لئے کوئی مقصد ہی نہ ہو اور اگر ہو تو پانچ برس کا ہو۔

عزت و جاہ بھی مقصد نہیں...... یا مثلاً ایک مقصد یہ ہے کہ روٹی بھی نہیں، دولت بھی نہیں، کرسی مقصد ہے یعنی عزت اور جاہ ہمارا مقصد ہے کہ آدمی عزت کے ساتھ زندگی گزارے۔

یہ مقصد برا نہیں ہے۔ مگر انتہائی بے بنیاد مقصد ہے اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، اس واسطے کہ جس کو ہم عزت سمجھتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ہمیں بڑا سمجھیں اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگوں کا خیال ہماری طرف سے صحیح ہو تو عزت ہماری ہے اور ہاتھ میں لوگوں کے ہے؟ اور وہ بھی خیالی۔ ذرا وہ خیال بدل دیں، بس ہماری عزت ختم ہوگئی۔ آج اگر لوگوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیا، ہم عزت والے اور کل کو پبلک خفا ہو کر جوتیوں کا ہار ڈال دے، بس ذلیل ہوگئے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ اول تو خیالی اور خیال بھی دوسرے کا؟

اگر ہمارے ہی خیال سے عزت قائم ہوتی، تو ہم تخیل باندھے بیٹھے رہتے کہ ہم بڑے باعزت ہیں اور عمر بھر اس تخیل کو نہ چھوڑتے، تو عمر بھر عزت والے تو رہتے، عزت ہماری، قبضے میں دوسرے کے وہ بھی خیالی۔ اور وہ خیال اس کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ آج خیال بدل گیا تو کل ہماری بے عزتی ہوگئی تو لمبی چوڑی عمر اتنی بڑی نعمت کا نصب العین ایک بے بنیاد اور خیالی چیز؟

حقیقی عزت...... حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں کوئی مقبول ہو، اسے عزت کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی کو مقبولیت

دے اور اپنی مخلوق کے دلوں میں اس کی عزت ڈالدے، وہ عزت ہے وہ خیال کی نہیں واقعی عزت ہوتی ہے۔حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبریل کوفرماتے ہیں، میں نے فلاں بندے سے محبت کی، تو بھی اس سے محبت کر۔حضرت جبریلؑ کے دل میں محبت آجاتی ہے، جبریل علیہ السلام آسمان اول کے ملائکہ میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب نے محبت کی تم بھی محبت کرو، آسمان دوم میں اس کی محبت ہوتی ہے، وہ تیسرے کو، وہ چوتھے کو، یہاں تک کہ اس آسمان دنیا تک محبت آجاتی ہے۔تمام ملائکہ میں وہ محبوب بن جاتا ہے۔اس کے بعد یہ ملائکہ علوی ملائکہ سفلیٰ کوالہام کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں سے محبت کی، تم بھی محبت کرو، ان کے دلوں میں محبت آجاتی ہے وہ ملائکہ سُفلیٰ اولیائے کرام جو دنیا میں محبوبانِ الٰہی ہیں، کے قلوب میں الہام کرتے ہیں کہ ہم سب محبت کرتے ہیں تم بھی محبت کرو، تو خواص اہل اللہ کے قلب میں محبت آجاتی ہے۔پھران کے آس پاس کے حلقوں کے اندر محبت پہنچتی ہے، ''فَیُوْضَعُ لَـهٗ قُبُوْلُـهٗ فِی الْاَرْضِ'' ① اس کی مقبولیت پوری زمین میں پھیل جاتی ہے اسے کچھ کرنا دھرنا نہیں پڑا اور محبت آسمانوں دنیا کے اندر پھیل جاتی ہے۔تو حقیقی عزت وعظمت یہ ہے کہ من جانب اللہ اس کی مقبولیت دنیا میں پھیل جائے، یہ اصل عزت ہے، اسی لئے نہ اپنے تخیل سے اپنے کو عزت دار سمجھے نہ چند افراد کے دماغ پر روغن قاز مل کر کوشش کرے کہ تم تخیل میں مجھے بڑا سمجھو، یہ خیالی چیز ہوگی، جب خیال بدل جائے گا، عزت ختم ہوجائے گی لیکن جس کی عزت ملاءِ اعلیٰ میں قائم ہوگی، ملائکہ علوی وسُفلیٰ کے دلوں میں جس کی محبت قائم ہوگی، وہ محبت بنیادوں پر قائم ہے تخیلات پر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے باطن میں اگر کسی محبت کی قائم ہے وہ اٹل ہے اور اتنی قوی بنیاد پر ہے کہ اسے کوئی مٹانیوالا نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی محبت یہی ہوتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کی محبت ہوتی ہے پھر عالم میں ان کی محبوبیت پھیلادی جاتی ہے۔اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور ائمہ مجتہدین کی محبت اٹل بنیادوں پر ہوتی ہے۔وہ دنیا سے گزر جائیں مگر ان کی محبت نہیں گزرتی۔انبیاء علیہم السلام میں سے آج اگر کسی پیغمبر کا نام نامی آئے گا گردنیں عظمت سے جھک جائیں گی ہم دورد شریف پڑھنا شروع کردیں گے۔

یہ کیا چیز ہے؟ آج یہ ہستیاں اس عالم میں نہیں ہیں مگر دلوں کے اندر محبت موجود ہے، نسلاً بعد نسلٍ چلی جارہی ہے۔صدیاں گزر گئیں مگر محبت اٹل ہے۔اس لئے کہ اس محبت کی بنیادوں میں حق تعالیٰ کے باطن سے چلنے والی محبت ہے جو مٹنے والی نہیں ہے۔آج دنیا میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں ہیں۔آج حضرت صابر کلیریؒ موجود نہیں ہیں۔شیخ شہاب الدین سہروردیؒ موجود نہیں ہیں۔لیکن قلوب میں محبت قائم ہے، ان لوگوں کے نام آتے ہیں تو ہماری زبانوں سے رحمہ اللہ علیہم اجمعین نکلتا ہے۔عظمت سے ہم گردنیں جھکا دیتے ہیں۔وہ ہستیاں موجود نہیں، مگر محبوبیت موجود ہے، اس لئے کہ یہ محبوبیت اللہ سے چلی اور بندوں تک پہنچی، خواص سے

① الصحیح لمسلم کتاب البر والصلة والآداب، باب اذا احب الله عبدا حببه الی عباده، ج:۱۳ ص:۸۶ رقم: ۴۷۷۲.

شروع ہوئی عوام تک پہنچی۔

عزت کے بارے میں سنہری اصول......اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ جو مقبولیت عوام سے اوپر کی طرف چلتی ہے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ عوام میں پھیل گئی آگے خواص میں اس کا کوئی وجود نہیں، وہ عزت فرضی ہوتی ہے، چند دن کے بعد زائل ہو جاتی ہے اور جو خواص سے چلے، عوام کی طرف آئے وہ حقیقی عزت ہوتی ہے، تو میں نے عرض کیا انبیاء علیہم السلام، اولیائے کرام، علمائے ربانی اور صالح بندوں کی محبت، کوئی کارنامہ کر جانے والوں کی محبت جو رہتی دنیا تک قلوب میں باقی رہتی ہے وہ حقیقی عزت ہے۔ اس کی بنیاد فرضی نہیں ہوتی۔ آدمی کا خیال نہیں ہوتا قلب کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر آدمی یہ بھی چاہے کہ میں اپنے خیال سے یہ محبت نکال دوں، اسے قدرت نہیں ہوتی۔ اس کا دل ملامت کرے گا کہ نہیں تجھے محبت رکھنی پڑے گی، اس لئے کہ وہ بنیادوں پر قائم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عزت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے چلے۔ مقبولیت عند اللہ ہو۔ وہ عزت نہیں ہے کہ لوگوں کے تخیلات کے اوپر اس کی بنا ہو۔ کیونکہ خیال رات دن بدلنے والی چیز ہے۔ تو ایسی محبت وعزت جو کہ خیالی ہو، اس کو ہم اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ یہ زندگی کی توہین ہے، زندگی امر واقعی اور نصب العین فرضی اور خیالی بنا رہے ہیں زندگی کی بنیاد یں اٹل کہ انسان ابدی ہے اور عزت جو نصب العین ٹھہرا، اس کی کوئی بنیاد نہیں کہ کل کو ہے، پرسوں کو نہیں، یہ زندگی کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے یہ بھی نصب العین نہیں بن سکتی۔ تو نہ دولت اور رسمی عزت مقصد زندگی بن سکتی ہے نہ روٹی بن سکتی ہے۔ اگر دنیا ہی تک زندگی محدود ہوتی تو چلو ہم یہی نصب العین قرار دے لیتے مگر مشکل یہ ہے کہ زندگی آگے جانیوالی ہے۔ یہ زندگی کا کروڑواں معمولی حصہ ہے دائمی اور ابدی زندگی تو آگے ہے اس واسطے کوئی اور نصب العین ہونا چاہئے۔

انسان کا علم......وہ نصب العین کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ انسان تجویز نہیں کر سکتا، انسان بے چارہ محدود ہے وہ اپنے حال کی بات دیکھے گا۔ اس کا ماحول ایک محدود ماحول ہے۔ اس کے اندر وہ گھرا ہوا ہے، وہیں کی سوچے گا۔ تو انسان بے چارے کا تخیل ہی کیا؟ اس کی عقل ہی کیا؟ کہ وہ ایک لامحدود نصب العین سوچ لے۔ اپنے تخیل کے دائرے میں سوچے گا وہ محدود چیز ہوگی، کارآمد نہیں ہوگی۔ اس لئے انسانی زندگی کا نصب العین وہ بتلا سکتا ہے جو خود بھی لامحدود ہو، اس کا علم بھی ازلی ابدی ہو ازل سے ہے اور ابد تک جانے والا ہے۔ وہ خود انسان کا خالق ہے، اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو جانتا ہے۔ اس کے داؤ بھات سے واقف ہے فرمایا گیا ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾ ①

جس نے پیدا کیا۔ کیا وہ نہیں جانے گا مخلوق کو؟ وہی ہے اصل میں جاننے والا۔ ہم تم اپنے سے اتنے واقف نہیں ہیں جتنا ہمارا خالق ہم سے واقف ہے، ہمیں آج یہ پتہ ہے ہی نہیں کہ ہمارے پیٹ میں کیا ہو رہا ہے، یعنی

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۴۔

پیٹ ہمارا، نفس ہمارا، خود ہمیں ہی پتہ نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عظیم الشان مشین ہے جو چل رہی ہے۔ غذا پہنچ رہی ہے۔ معدہ اپنا کام کر رہا ہے، جگر، دل اور دماغ اپنا کام کر رہا ہے۔ جب آپ لقمہ کھاتے ہیں وہ معدے میں پہنچتا ہے معدہ اسے لے کر سفید حریرہ بنا دیتا ہے اور کچھ فضلات ہیں جن کو انتڑیوں کی طرف پھینک دیتا ہے اور اس کا جوہر جگر کی طرف پھینک دیتا ہے جگر کو کہتے ہیں کہ یہ طباخ بدن ہے (بدن کا باورچی) جگر اس حریرے کو پکاتا ہے۔ جب ہنڈیا پکتی ہے تو ایک حصہ اوپر جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک حصہ تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے، ایک حصہ بیچ بیچ میں ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو جوہر بنتا ہے، وہ جو اوپر کا جھاگ کا حصہ ہے وہ بلغم ہے جو نیچے تلچھٹ کا حصہ ہے وہ سودا ہے، جو بین بین ہے وہ صفرا ہے اور ان تینوں چیزوں سے مل کر جو جوہر بنتا ہے۔ اسے خون کہتے ہیں۔ یہ چار خلطیں تیار ہوئیں جگر باریک رگوں کے ذریعہ خون کو قلب کے اندر بھیجتا ہے، قلب کے بارے میں اطباء لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہے جیسے چوگڑی ہوتی ہے کہ بیچ میں سے دبا ہوا دونوں کنارے پھیلے ہوئے، جیسے اگالدان ہوتا ہے تو بیچ میں سے پتلا اور دونوں کنارے چوڑے، یہ قلب کی صورت ہے۔ اس کا ایک حصہ بطن عالی اور ایک بطن سافل کہلاتا ہے۔ یہ خون بطن سافل کے اندر پہنچتا ہے قلب اس کو پھر اپنی حرارت سے پکاتا ہے۔ اس کے پکانے سے ایک لطیف بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ وہ روح حیوانی کہلاتی ہے، اس روح کے اوپر پھر اوپر سے روح آتی ہے جس کو روح ربانی کہتے ہیں، اس سے انسانی کے علم اور ادراک کا تعلق ہے۔ تو بدن کا حصہ نیچے ایک سواری ہے اس پر روح حیوانی سوار ہے پھر روح حیوانی ایک سواری ہے اس پر روح ربانی سوار ہے اس طرح سے یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر سفر طے کر رہی ہیں۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ کس طرح غذائیں پہنچ رہی ہیں اور ہضم ہو رہی ہیں اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بن رہی ہیں لیکن انسان کو خود کو اس وقت پتہ نہیں کہ معدہ کیا کر رہا ہے، جگر کیا کر رہا ہے اور قلب کیا کر رہا ہے؟ جب ہمارے اندر سب کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تو اس کا محدود علم ہے۔ تو لامحدود زندگی کا نصب العین کیسے تجویز کرے گا؟ یہ اگر تجویز کرے گا تو چند روزہ ہوگا جیسے خود اس بیچارے کا علم چند روزہ ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ زندگی کا نصب العین تجویز کرنے والا وہ ہو جو زندگی کا خالق ہے۔ وہی اس کے اول و آخر سے واقف ہے۔ وہی نصب العین متعین بھی فرما سکتا ہے۔

خالق انسان کا تجویز کردہ نصب العین ...... اس خالق نے ایک نصب العین تجویز فرمایا اور اپنے فرمان کے ذریعے ہم تک بھیج دیا جس کو قرآن کریم کہتے ہیں، فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (1) میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری اطاعت کریں، تو مقصد زندگی درحقیقت اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت نکلی، عبادت کا لفظ سن کر ممکن ہے کہ آپ کو یہ تخیل پیدا ہوا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ جا کے مسجد میں بیٹھو، کوٹھی بھی چھوڑ دو اور بنگلہ بھی اور مسجد کا رستہ لو، عبادت تو وہاں ہوگی۔ اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ

(1) پارہ: ۲۷، سورة الذاريات، الآية: ۵۶.

بھائی! یہ دولت جو ہے اسے خیر باد کہو، یہ سب کچھ صدقہ کر کے جاؤ اللہ کے راستہ میں، اور اپنا گھر بار چھوڑ و۔

دولت سے بھی خدا ملتا ہے...... تو میں عرض کئے دیتا ہوں کہ یہ غلط تخیل ہے اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان جس دائرے میں رہے اسے مایوس نہیں کرتا، خدا تک پہنچنے کا لازمی راستہ بتلاتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انسان آج جس دائرے میں ہے، اس دائرے کو چھوڑ کر فلاں دائرے میں جائے جب تو مجھ تک آئے گا اور اگر نہیں چھوڑے گا تو مجھ تک نہیں آئے گا، ایسا نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی دولت مند ہے۔ اسے اسلام یہ کبھی نہیں کہے گا کہ تو اپنی ساری دولت کو ختم کر دے بلکہ اسی دولت کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اس کے صرف اور آمد کا طریقہ بتلائے گا، اس کے قوانین بتلائے گا کہ میری اطاعت کے تحت اس کو خرچ کر۔ اور میری اطاعت کے تحت اس کو حاصل کر یہ سب تیرے لئے عبادت ہے، تو اس طرح کرنے سے مجھ تک پہنچ جائیگا، تو دولت مند کو کہے گا کہ تو دولت کے راستے سے مجھ تک پہنچ۔

اس واسطے کہ ہزاروں عبادتیں ہیں جن کا تعلق ہی مال سے ہے۔ اگر دولت نہیں ہوگی تو آدمی زکوٰۃ کیسے دے گا؟ صدقۂ فطر کیسے دے گا؟ خیرات کیسے کرے گا؟ صلہ رحمی کیسے کرے گا؟ حج کیسے کرے گا؟ اجتماعی امور کیسے انجام دے گا؟ غرض خیرات وصدقات اور چندے، یہ سارے اعمال انجام نہیں دے سکتا جب تک دولت نہ ہو اور یہ سارے کام اسلام کے ہیں۔ اسلام کیسے کہہ دے گا۔ کہ دولت کو ضائع کر دو یا حاصل نہ کر دیا آ گئی ہے تو اسے کھودو، بلکہ اسی کو رکھ کر اسی دائرے میں سے راستہ نکال دے گا کہ اس کے اوپر چلو۔

غربت سے بھی خدا ملتا ہے...... لیکن اگر دولت مندوں کو اسلام نے راستہ بتلایا کہ تم اپنی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ۔ تو ممکن تھا کہ ایک غریب آدمی کا دل ٹوٹتا کہ بس دولت مند دنیا اور آخرت دونوں کما لے گیا۔ میں یہاں بھی محروم وہاں بھی محروم، نہ صدقہ دے سکتا ہوں نہ خیرات نہ صلہ رحمی کے قابل ہوں تو میں دنیا میں بھی ایسے ہی بے چارہ و بے کس رہا اور آخرت میں پہنچا تو بھی عبادتیں کم ہوئیں اس کا دل ٹوٹا۔ اسلام نے فوراً ڈھارس دی کہ تو بھی مایوس مت ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ: ”اے غریب! تو اپنی غربت پر پریشان مت ہو، اس وقت کو یاد کر کہ قیامت کے دن امراء اپنے اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہوں گے اور غرباء پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل بھی ہو چکے ہوں گے“۔

تو غریب نے کہا کہ مجھے میری غربت مبارک، مجھے تموّل کی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ سو برس کی مدت خدا جانے کیسے گزرے گی؟۔ حساب دے سکیں نہ دے سکیں؟۔ کوئی عتاب نہ ہو، مصیبت نہ کہیں بھگتنی پڑے۔ دنیا کی ساٹھ ستر برس کی عمر تو گزر ہی جائے گی۔ میں سچے دل سے اپنی غربت پر خوش ہوں، تو اسے دولت کی نعمت دی اور اسے استغناء کی نعمت دی، دولت نہیں ہے مگر اس کا دل غنی ہے۔ ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بعض دفعہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرماتے تھے۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا نے غم دزد نے غم کالا!

ایک لنگی اوپر سے اوڑھ لی، ایک باندھ لی، نہ چور کا ڈر نہ چکار کا ڈر، بس غنی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت مند کو دولت کی وجہ سے ہزار مصیبتیں ہیں، اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، کہیں چور، ڈاکو نہ آ جائے، حاکم حسد کرے تو اس سے بھی کسی طرح بچوں اور دولت کو بچاؤں کہیں ٹیکسوں کا اور محصول کا قصہ' غرض صبح سے شام تک ایک مصیبت ہے مگر غریب کہتا ہے کہ میں مصیبت زدہ نہیں ہوں۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا نے غم دزد نے غم کالا!

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

ما پیچ ندارایم ، غم پیچ ندارایم دستار ندارایم غم پیچ ندارایم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے، ہم دستار ہی نہیں رکھتے' اس لئے پیچ وخم کا بھی ہمیں غم نہیں پیچ وخم کے غم میں تو وہ پڑے جو دستار رکھتا ہو۔

غرض ایک دولت مند کو اگر مادی دولت دی گئی، تو غریب آدمی کو جو صابر اور محتسب ہے اس کو استغناء کی دولت دی گئی یہ کمال غناء سے بادشاہوں سے زیادہ مزے میں اور مطمئن ہے۔ فرمایا گیا کہ دنیا میں تجھے یہ نعمت ملی کہ تجھے غنی بنا دیا گیا سینکڑوں مصیبتوں سے چھوٹ گیا اور آخرت کی یہ نعمت ہے کہ پانچ سو برس پہلے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور امراء ابھی حساب وکتاب میں ہوں گے، تو دولت مند یوں خوش ہے کہ میں اپنی دولت سے جنت کما رہا ہوں، غریب آدمی یوں خوش ہے کہ میں اپنے غناء سے جنت کما رہا ہوں، تو اسلام نے کسی حالت میں مایوس نہ کیا، نہ دولت مند کو یہ کہا کہ تو فقیر بن۔ نہ فقیر کو یہ کہا کہ تو دولت مند بن ہر ایک حالت وکیفیت میں اس کو تسلی دی اور اسے راستہ بتلا دیا، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ کسی حالت کے بدلے بغیر اسی حالت میں اسلام راستہ نکالتا ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔

صحت ومرض میں بھی خدا ملتا ہے...... حدیث میں فرمایا گیا سب سے بڑی نعمت جس پر رشک کیا جائے، وہ صحت وتندرستی ہے صحت نہ ہو تو عبادت کیسے کرے؟ حج کو کیسے جائے؟ نماز کیسے پڑھے؟ روزہ کیسے رکھے؟ گویا ساری عبادتیں صحت سے وابستہ ہیں، اس لئے اس کی فضیلتیں بیان کی گئیں۔ صحت مند اور تندرست آدمی خوش ہے کہ مجھے اللہ نے صحت دی ہے، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جانی عبادت بھی کر رہا ہوں، محنت بھی اٹھا رہا ہوں، حج کو بھی جا رہا ہوں لیکن بیمار کا دل ٹوٹا کہ افسوس میں کچھ عمل نہ کر سکا، نہ میں مسجد تک جا سکتا ہوں نہ میں حج کرنے جا سکتا ہوں نہ میں جہاد کے لئے جا سکتا ہوں، کوئی کام بھی میں نہیں کر سکتا، افسوس میں محروم رہا۔ اسلام نے آ کر فوراً تسلی دی کہ پریشان مت ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ بعضے بندوں سے پوچھیں گے کہ۔ اے بندے! میں بیمار ہوا تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔؟ میں مریض ہوا تو میری مزاج پرسی کو نہ حاضر ہوا؟

بندہ کہے گا، اے اللہ! آپ تو رب ہیں آپ کو بیماری سے کیا تعلق؟ بیماری تو عیب اور نقص کی چیز ہے۔ آپ ہر نقص اور برائی سے بری ہیں۔ ①

فرمائیں گے فلاں بندہ بیمار ہوا تھا۔ اگر تو بیمار پرسی کے لئے جاتا، مجھے اس کی چارپائی کی پٹی پر موجود پاتا۔ بیمار کا دل بڑھ گیا کہ میری وہ خصوصیت ہے کہ بیماری میں حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے، کسی تندرست کی چارپائی پر حق تعالیٰ نہیں ہیں اور بیمار کی چارپائی پر موجود ہیں۔ یعنی خاص تجلی، لطف وکرم اور عنایت موجود ہے۔ کسی تندرست کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تندرستی اپنے اوپر لے کر کہا ہو کہ میں تندرست تھا۔ تو میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ بیمار کے بارے میں اپنے اوپر لیکر فرمایا کہ میں بیمار ہوا، تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔ گویا بیمار اتنا عزیز ہے کہ اس کی بیماری کو اپنی بیماری فرمایا کہ میں بیمار ہوا۔ تو بیمار کا دل بڑھ گیا کہ ایسی تندرستی کو سلام ہے جسے اتنا قرب نہ ہو، مجھے یہ بیماری عزیز اور مبارک ہے میں اس بیماری کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ بن رہی ہے اور درجات ومراتب طے ہو رہے ہیں۔

صبر کا پھل...... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، ایک ناسور پھوڑے کے اندر بتیس برس مبتلا رہے ہیں، جو پہلو پر تھا اور چت لیٹے رہتے تھے، کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی بتیس برس تک چت ہی لیٹے لیٹے کھانا بھی، پینا بھی، عبادت کرنا بھی، قضائے حاجت کرنا بھی۔ آپ اندازہ کیجئے بتیس برس ایک شخص ایک پہلو پر پڑا رہے، اس پر کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی بڑی بیماری ہے؟

یہ تو بیماری کی کیفیت تھی۔ لیکن چہرہ اتنا ہشاش بشاش کہ کسی تندرست کو وہ چہرہ میسر نہیں، لوگوں کو حیرت تھی کہ بیماری اتنی شدید کہ برس گزر گئے کروٹ نہیں بدل سکتے اور چہرہ دیکھو تو ایسا کھلا ہوا کہ تندرستوں کو بھی نصیب نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت!۔ یہ کیا بات ہے کہ بیماری تو اتنی شدید اور اتنی ممتد اور لمبی چوڑی اور آپ کے چہرے پر اتنی بشاشت اور تازگی کہ کسی تندرست کو بھی نصیب نہیں؟ فرمایا:

جب بیماری میرے اوپر آئی، میں نے صبر کیا، میں نے یہ کہا کہ: اللہ کی طرف سے میرے لئے عطیہ ہے۔ اللہ نے میرے لئے یہی مصلحت سمجھی۔ میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس صبر کا اللہ نے مجھے یہ پھل دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ ملائکہ علیہم السلام سے مصافحے کرتا ہوں۔ مجھے عالم غیب کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔

تو جس بیمار کے اوپر عالم غیب کا انکشاف ہو جائے۔ ملائکہ کی آمد ورفت محسوس ہونے لگے اسے کیا مصیبت ہے کہ وہ تندرستی چاہے؟ اس کے لئے تو بیماری ہزار درجے کی نعمت ہے۔ حاصل یہ کہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی، بیمار کو کہا کہ تیری بیماری اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے تو اگر اس میں صبر اور

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عیادة المریض، ج: ۴ ص: ۹۹۰ رقم: ۲۵۶۹.

احتساب کرے گا حسبۃً للہ اس حالت پر صابر اور راضی رہے گا تیرے لئے درجات ہی درجات ہیں۔

پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ تو علاج مت کر علاج بھی کر، دوا دارو بھی کر مگر نتیجہ جو بھی نکلے، اس پر راضی رہ، اپنی جدو جہد کئے جا باقی افعال خداوندی میں مداخلت مت کر تیرا کام دوا کرنا ہے۔ تیرا یہ کام نہیں ہے کہ دوا کے اوپر نتیجہ بھی مرتب کردے کہ صحت ہونی چاہئے۔ یہ اللہ کا کام ہے، تو اپنا کام کر، اللہ کے کام میں دخل مت دے، دوا دارو کر، مگر اللہ کی طرف سے جو کچھ ہو جائے اس پر راضی رہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے، اس پر صبر کرو گے، وہی بیماری ترقی درجات اور اخلاق کی بلندی کا ذریعہ بنتی جائے گی۔ اس سے آدمی کے روحانی مقامات طے ہوں گے، تندرست کو روحانیت کے وہ مقامات نہیں ملتے جو بیمار کو ملتے ہیں۔ تو بیماریوں کہے گا مجھے میری بیماری مبارک، مجھے تندرستی کی ضرورت نہیں۔ تندرستی میں مجھے یہ مقامات مل نہیں سکتے تھے، جو بیماری میں ملے۔

تو اسلام نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی کہ تو اس کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، بیمار کو بیماری میں تسلی دی کہ تو بیماری کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، تو بیماری کی وجہ سے محروم نہیں رہ سکتا، یہ خیال مت کر کہ جو کچھ ملنا تھا، تندرست کو مل گیا، میرے واسطے کچھ نہیں رہا۔ تیری بیماری میں تیرے لئے سب کچھ ہے۔ بہر حال ہر ایک کو اپنے دائرے اور اپنے مقام پر تسلی دینا یہ اسلام کا کام ہے۔

زندگی اور موت میں بھی خدا ملتا ہے...... زندگی ہے، یہ بڑی نعمت ہے، زندگی نہ ہو تو آدمی طاعت وعبادت کیسے کرے؟ ترقی کے مدارج کیسے طے ہوں؟ سارے کام زندگی سے متعلق ہیں موت جب آئے، مرنے والے کا دل ٹوٹا کہ یہ تو اپنی زندگی میں سب کچھ کما رہا ہے، میں تو ختم ہو چکا، میرے لئے اب کچھ نہ رہا، فوراً اسلام نے تسلی دی کہ بے صبر مت بن پریشان مت ہو۔ "تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ" ① مومن کا سب سے بڑا تحفہ موت ہے جو اس کو اللہ کی طرف سے عطاء کیا جاتا ہے فرمایا "اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ يُّوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ." ② موت ایک پل ہے جس سے گزر کر حبیب اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، اگر موت بیچ میں نہ ہو تو اللہ سے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر یہ زندگی ختم ہو کر اگلی زندگی نہ آئے تو جمال خداوندی کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو اس سے مرنے والے کو تسلی ہوگئی کہ میں تو بڑے درجات کی طرف جا رہا ہوں مجھے زندگی نہیں چاہئے۔ بلکہ ایسے میں موت کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ" ③ اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول ہونے کا

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱ ص: ۶۶ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجلہ ثقات دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۲ ص: ۳۲۰. ② یہ حضرت حبان الاسود کا قول ہے۔ دیکھئے: فیض القدیر، ج: ۳ ص: ۳۰۷.

③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳ ص: ۴۷۸ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹.

قائل ہو۔ جو مجھے رسول مانتا ہے، اس کے دل میں موت کی محبت ڈال دے اس لئے کہ اگر اسے اللہ سے محبت ہے۔ اللہ تک پہنچانے والی چیز موت ہے تو اس سے بھی محبت ہوگی، کیونکہ منزل اگر محبوب ہے تو راستہ بھی عزیز اور محبوب ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ اولیاء اللہ تو ہم ہیں۔ فوراً قرآن کریم نے مطالبہ کیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تمہیں یہ دعویٰ ہے کہ تم اولیاء اللہ ہو تو ذرا موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ۔ ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اس زندگی سے زیادہ موت کی محبت ہوتی ہے ان کی زبانوں پر یہ شعر رہتا ہے کہ:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس شہرِ مطلوب تک پہنچیں گے اور غزلخواں، شاداں اور فرحان جائیں گے، وہ کون سا دن ہوگا کہ اس گندے جہان کو چھوڑ کر پاک جہان میں جائیں گے۔

ابن الفارض رحمہ اللہ، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کھول دی گئیں اور منکشف ہوئیں، تو ابن الفارضؒ نے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں اور یہ شعر پڑھا ۔

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ ۔۔۔ مَاقَدْ رَاَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

اگر میری عمر بھر کی محنت کا ثمرہ یہ آٹھ کھلونے ہیں جو آپ نے رکھ دیئے تو افسوس میری عمر ضائع ہوگئی، مجھے کچھ نہ ملا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں، تجلیات خداوندی سامنے آئیں اور ان کی روح غرغرا کر پرواز کر گئی، تو ایک مرنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ تجلیات خداوندی میرے استقبال کو آ رہی ہیں، اسے کیسے زندگی کی تمنا باقی رہ سکتی ہے؟

حدیث میں ہے کہ جب مومن کے مرنے کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دائیں ہاتھ پر ہیں۔ لاکھوں کروڑوں فرشتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بائیں ہاتھ پر ہیں۔ دائیں ہاتھ والے مومنوں کی ارواح قبض کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے کفار کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ دائیں ہاتھ والے روشن چہرے کے ملائکہ ہیں، سورج اور چاند کی طرح ان کے چہرے چمکتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے ملائکہ سود الوجوہ ہیں، سیاہ اور بھیانک چہرے ہیبت ناک ان کی شکلیں ہیں۔

مومن پر جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ دور سے کچھ ستارے اور روشنی دیکھتا ہے وہ تحیر (حیران) میں مبتلا ہوتا ہے کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ چاند سورج کیسے ہیں؟

یہ جو وقت ہوتا ہے ادھر سے غفلت کا اور ادھر متوجہ ہونے کا ہوتا ہے۔ ابھی نزع نہیں شروع ہوا ابھی غفلت

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶.

طاری ہوئی، نزع تب شروع ہوگا جب سانس چلنے لگے لیکن ابتداءً یہ خوشی طاری ہے ہے اور یہ غفلت ہے کہ ادھر کا جہان چھپ جاتا ہے اور ادھر کا جہان روشن ہوجاتا ہے اور یہ نظر پڑتا ہے کہ لاکھوں چاند اور سورج ہیں جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ تو یہ تحیر میں دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ یہ کیسا کارخانہ ہے؟۔ اور ملائکہ علیہم السلام یہ آہستہ آہستہ اس لئے بڑھتے ہیں کہ مقصد شفقت ہے، اگر ایک دم آپڑیں تو یہ گھبرانہ جائے کہ یہ کیا بات ہوگئی، اس لئے آہستہ آہستہ اس کے دل میں گنجائش کرتے ہوئے آتے ہیں کہ وہ سہتا جائے اور یہ سمجھتا جائے پھر اخیر میں قریب آجاتے ہیں پھر اسے کوئی اوپری بات معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ نہیں کہ آتے ہی روح قبض کرنی شروع کردی۔ حدیث میں ہے کہ اس میت کو عالم آخرت کی ترغیب دلاتے ہیں اور دنیا سے نفرت دلاتے ہیں کہتے ہیں کہ ”اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّرَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَانَ“ ① اے پاک روح! اے پاک نفس! تو نے اپنے بدن کو نیک اعمال سے پاک کیا۔ اپنی روح کو بھی ذکر سے نیک کیا یا نیک کلمات سے پاک رکھا، تو اے پاک روح! اپنے پاک بدن سے چلی آ۔ اور کہاں جا؟ ”اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّرَیْحَانٍ“ بہاروں کی طرف اور نعمتوں کی طرف چل اور اس پروردگار کی طرف چل جو تجھ پر نامہربان نہیں، بلکہ شفیق، مہربان اور رحمت والا ہے، تیرا منتظر ہے۔ یہ گویا ترغیب دیتے ہیں تاکہ بندہ راضی ہو اور اس کی رضا کے بعد روح قبض کرنا شروع کریں۔

انبیاء علیہم اسلام کی ارواح قبض کرنے کے لئے ملک الموت آتے ہیں تو باقاعدہ اجازت مانگتے ہیں جب انبیاء علیہم اسلام اجازت دے دیتے ہیں تب قبض روح شروع ہوتا ہے۔ مومن سے اجازت نہیں لی جاتی مگر ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ موت کے اوپر مطمئن ہوجائے۔ اس کی رضا حاصل ہوجائے تب قبض روح شروع ہو، تو یوں ترغیب دیتے ہیں کہ اس گندے جہاں کو چھوڑ اور اس پاک جہاں کی طرف چل، ادھر نفس کی حکومت تھی، ادھر اس رب کی حکومت ہے جو تجھ پر کبھی نامہربان نہیں ہے، ہمیشہ تجھ پر مہربان رہے گا، روح و ریحان اور نعمتوں کی طرف چل۔

سب جانتے ہیں کہ موت سے انسان کو طبعاً کراہت ہے، کتنی نعمتیں ہوں مگر موت قبول کرنے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا، تو جب وہ اس ترغیب سے راضی نہیں ہوتا، حدیث میں ہے کہ پھر ملائکہ اس کو جنت کے تحفے دکھلاتے ہیں، کچھ پھل، کچھ لباس، اس کو دیکھ کر ایک دم روح پرواز کرنی شروع کردیتی ہے اور تشبیہ دی گئی کہ اس طرح سے نکل جاتی ہے جیسے مشک میں پانی بھر کر پانی الٹ دو، اس کا منہ کھول کر نیچے کردو اور سارا پانی غرغرا کر نکل جائے گا، ایک قطرہ باقی نہیں رہے گا، اس طرح روح شوق و ذوق میں پرواز کر جاتی ہے، تو ملائکہ علیہم السلام آتے ہیں، ترغیب دیتے ہیں، بندے کی رضا حاصل کرتے ہیں جب وہ راضی ہوتا ہے تب اس کی روح قبض کرتے ہیں، یہ ملائکہ علیہم السلام کی شفقت ہے، ملک الموت اس سے بات بھی کرتے ہیں۔

① المصنف لعبدالرزاق، کتاب الجنائز، باب الصبر والبكاء والنياحة، ج: ۳ ص: ۵٦٦ رقم: ٦٧٠٢.

جب نزع شروع ہوا۔ یہ ملک الموت کے اعوان و انصار کا کام ہے، نزع ہونے کے بعد روح کا قبض کرنا اور قبضے میں لینا، یہ ملک الموت کا کام ہے، گویا ابتدائی مبادی یہ ملائکہ طے کرتے ہیں اور آخری نتیجہ ملک الموت علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی جیسے نعمت ہے موت بھی ایک نعمت ہے۔ اسلام نے اگر زندگی کی تعریف کی اور ترغیب دی اور کہا کہ تم دعائیں مانگو کہ ہماری عمر صالحات وحسنات کے ساتھ دراز ہو، اب ایک شخص زندہ ہے تو ممکن ہے مرنے والے کے دل میں مایوسی پیدا ہو کہ اسے تو سب کچھ مل گیا، میری عمر ختم ہوگئی، تو اسے اس حالت میں تسلی دی کہ تیری موت تیرے لئے تحفہ اور روح و ریحان کا پیغام ہے حق تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا پیغام ہے، غرض یہ اس پر راضی کہ مجھے موت آ رہی ہے، وہ اس پر راضی کہ مجھے زندگی مل رہی ہے، نہ یہ مایوس نہ وہ مایوس۔ اسلام نے ہر ایک کو تسلی دی ہے کسی حالت میں اپنے پیروؤں کو مایوس نہیں کرتا، ہزار مصیبتیں آ جائیں اسلام مایوس نہیں ہونے دے گا۔ ہزار نعمتیں آ جائیں اس میں راستے دکھلائے گا، مصائب کے بارے فرمایا ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ، اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ① کتنی مصیبت آ جائے، کبھی مایوس مت ہونا، مومن کا کام نہیں ہے اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔

تو مصائب میں اسلام تسلی دیتا ہے کہ مصیبت سے مت گھبراؤ، مصیبت بھیجنے والے پر نظر رکھو، نعمت میں آدمی راضی کہ نعمت مل گئی، مصیبت آ گئی تو صابر اس کے اندر بھی راضی کہ مجھے بھی نعمت مل گئی، میرے اخلاق میں وہ بلندی پیدا ہوئی کہ نعمتوں میں وہ بلندی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ تو اس مصیبت نے میرے اخلاق اونچے کر دیئے۔ غرض کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ انسان کو مایوس بنا دیا گیا ہو۔

یہ میں نے اس پر عرض کیا کہ جب میں نے عبادت کا نام لیا تو ممکن ہے اس طرف تصور گیا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ کوٹھی بنگلے چھوڑو اور جاؤ مسجد کی طرف۔ یہ نہیں کہا جا رہا، بلکہ کوئی حالت ایسی نہیں جس میں خدا نہ ملتا ہو، اگر آپ کوٹھی بنگلوں میں رہ کر چاہیں، وہاں بھی اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔ آپ کی نیت صحیح ہونی چاہئے۔ آپ کا نصب العین درست ہونا چاہئے، مال کماؤ تو جائز طریق پر خرچ کرو جائز طریق پر، تو کمانا بھی عبادت، خرچ کرنا بھی عبادت ہے، دونوں پر سچی نیت سے اس طرح اجر ملے گا جس طرح نماز پڑھنے پر ملتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس بنے جب خدا کو پائے گا۔

دولت اپنی ذات سے بری نہیں...... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب مقبول ہیں، لیکن ان میں مالدار بھی ہیں اور نادار بھی، لکھ پتی بھی ہیں اور کروڑ پتی بھی اور ابوذر غفاری جیسے بھی جن کا مذہب یہ تھا کہ اگر ایک وقت کا کھانا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے وقت کے لئے آدمی جمع کرے تو جہاں ابوذر غفاری جیسے صحابہ ہیں وہاں عبدالرحمن ابن عوف جیسے بھی ہیں جو لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں میں ہیں جن کی تجارت تھی۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷۔

ان کی تجارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تھی اور حال یہ تھا کہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں روم، مصر اور شام میں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں اور نفع کا مال جب آتا تھا، تو یہ نہیں تھا کہ دس پانچ آدمی لے کر آجائیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور فرماتے تھے کہ گھر میں ڈالدو، وہ اس قدر ہوتا تھا کہ غلے کی طرح ڈھیر لگ جاتا تھا۔ دولت کی یہ کیفیت تھی۔

مگر اس کے ساتھ قلب کی کیا کیفیت تھی؟ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مہمانداری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان، دسترخوان پر جمع ہوتے تھے، جب نعمتیں چنی جاتیں، دسترخوان سج جاتا اور کھانے کیلئے بیٹھتے تو عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونا شروع کرتے بے اختیار دل بھر آتا اور فرماتے ”اے اللہ! تیرے نبی کے دسترخوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا جمع نہ ہوا اور میرے دسترخوان پر اتنی نعمتیں۔؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جا رہیں“۔ یہ کہہ کر روتے اتنا روتے کہ بے خود ہو جاتے، سارے حاضرین اور مہمان بھی روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا۔

رات کو پھر دسترخوان بچھایا جاتا۔ پھر اللہ کی نعمتیں چنی جاتیں، پھر عبدالرحمن ابن عوفؓ پر گریہ طاری ہوتا اور کہتے کہ ”اے اللہ مہاجرین اولین اتنی غربت اور بے کسی سے دنیا سے گئے کہ فاقے پر فاقے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس غربت میں وفات پائی کہ کفن بھی پورا میسر نہیں تھا۔ اگر سر ڈھانپا جاتا تو پیر کھل جاتے تھے۔ پیر ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر میں سر ڈھانپ دیا گیا اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال کر دفن کر دیا گیا۔ تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو یہ حالت اور عبدالرحمن ابن عوفؓ کا گھر پیسوں اور اشرفیوں سے بھرا پڑا ہے کہیں دنیا ہی میں میری جنت کی نعمتیں تو ختم نہیں کی جا رہی ہیں؟“

پھر روتے، سارے حاضرین روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا، تین تین وقت کے فاقے اس طرح سے آتے تھے۔ تو دولت کا یہ حال اور قلب کا یہ حال؟ غرض اسلام دولت کا مخالف نہیں ہے، تمول کو برا نہیں کہتا لیکن تمول سے اگر دل بگڑ جائے اس دل کو اسلام برا کہتا ہے، دولت اس لئے نہیں ہے کہ دل کو بگاڑا جائے، بلکہ اس لئے ہے کہ صحیح دل رکھ کر اس کو صحیح مصرف میں لگایا جائے تو آدمی کی دولت بری نہیں ہے آدمی برا ہوتا ہے، آدمی برا ہے تو دولت بری ہو جائے گی، آدمی اچھا ہے تو دولت اچھی ہو جائے گی سامان اپنی ذات سے اچھا یا برا نہیں، سامان والے کو دیکھو کہ وہ اچھا ہے یا برا۔؟ وہ اچھا ہے تو سارا سامان اچھا۔ وہ برا ہے تو سارا سامان برا۔ لوگ خواہ مخواہ دولت کو برا کہتے ہیں۔ دولت بیچاری نے کیا قصور کیا ہے؟ آدمی اپنے کو دیکھے۔

دولت کی مثال ...... عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے فرمایا: دولت کی مثال ایک سمندر کی ہے اور انسان کا دل کشتی جیسا ہے۔ پانی اگر کشتی سے باہر رہے تو منزلیں طے کرے گی اور اگر کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی گئی اور کشتی والا بھی گیا، تو فرمایا:

دولت ایک سمندر کی مانند ہے اور ہمارے دل کشتیوں کی مانند ہیں۔ اگر دولت دل سے باہر باہر ہے تو پار لگا کے آخرت کے کنارے پر پہنچا دے گی۔ لیکن اگر دل کے اندر آ گئی تو دل بھی ڈوبا اور دل والا بھی ڈوبا، غرض دولت کی برائی نہیں، دولت کا محل بتایا کہ دل سے باہر ہاتھ پاؤں میں رکھو کماؤ، کھاؤ پیو اور خرچ کرو، لیکن رہنی چاہئے ہاتھ پیر کے اندر۔ دل کے اندر فقط محبت خداوندی ہونی چاہئے۔ دولت کی محبت نہیں ہونی چاہئے۔

طبعی محبت کی رعایت...... اور اگر تھوڑی بہت طبعی طور پر محبت ہو بھی، آخر بالکل محبت کو کیسے دل سے نکال دے، کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے۔ تو اسلام نے بھی یہ نہیں کہا کہ بالکل محبت نکال دو تمہیں طبعی طور پر محبت وتعلق ہے، لہذا رکھو، مگر وہ محبت اتنی نہ ہو کہ جب محبت خداوندی کا مقابلہ پڑے تو یہ محبت غالب آ جائے۔ مقابلہ پڑے تو وہ محبت غالب رہنی چاہئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ تمہارے اموال اور تمہاری تجارتیں جن میں کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار کھوٹا نہ ہونا چاہئے اور تمہاری بلڈنگیں اعلیٰ اعلیٰ مکانات ومحلات جن سے تم راضی ہو اور تمہارے قلوب میں کشش موجود ہے، ﴿اَحَبَّ اِلَيْكُمْ﴾ اگر یہ اللہ کی محبت کے مقابلہ میں زیادہ محبوب بن گئے تو مصائب اور فتنوں کا انتظار کرو۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ "اَحَبَّ" کی ممانعت ہے کہ بمقابلۂ خدا زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم ہوا تھوڑی بہت محبت ہو تو اجازت دی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے مال اور اپنی چیزوں سے محبت ہوتی ہے، ہر انسان ولی کامل نہیں ہوتا۔ یہ پیغمبروں کے مقامات ہیں کہ ذرہ برابر قلب میں لگاؤ نہیں ہے، اولیاء کے مقامات ہیں کہ دولت یا مال سے ذرہ برابر لگاؤ نہیں، اب ہم اور آپ اس مقام تک کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محبت رکھو ہم نکالنا نہیں چاہتے، مگر مقابلہ پڑ جائے تو یہ دیکھو کہ محبت خداوندی کے مقابلے میں یہ مغلوب ہے یا غالب ہے؟ اگر غالب ہو تو پھر مصیبتوں کا انتظار کرو۔ اگر مغلوب ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، بہر حال اس کی گنجائش دی ہے۔ معلوم ہوا دولت کے اندر رہ کر بلکہ دولت کی کچھ نہ کچھ محبت رکھ کر پھر بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دولت اس سے چھنی جائے تب اللہ تک پہنچے یہ اسی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کا لفظ سن کر یہ دھیان نہ جانا چاہئے کہ گھر بار چھوڑ کر مسجد میں جاؤ، مسجد میں بھی خدا ملتا ہے گھر میں بھی ملتا ہے۔

انسان ہر حال میں خدا تک پہنچ سکتا ہے...... کھانا کھاتے ہوئے دستر خوان پر بھی ملتا ہے حتیٰ کہ استنجاء تک

① پارہ: ۱۰ ، سورة التوبة، الآية: ۲۴.

جاتے ہوئے بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ایک آدمی کھانا کھا رہا ہے اور اس نیت سے کھا رہا ہے کہ اگر میرے پیٹ میں کچھ قوت پڑ جائے تو اللہ کے راستہ میں عبادت و طاعت میں صرف کروں گا۔ وہ پورا کھانا عبادت میں داخل ہے اور اس شان سے داخل ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ جس نے بسم اللہ سے کھانا شروع کیا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا پر ختم کیا یعنی کھا کر یہ کہا فرماتے ہیں: غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبٖ پچھلے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں کھائی روٹی اور معاصی کی بخشش ہو رہی ہے، جو نماز پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے، وہ دستر خوان پر مرتب ہوا۔ معلوم ہوا آدمی دستر خوان پر بیٹھ کر بھی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔

روزہ سے بھی پہنچتا ہے، افطار سے بھی پہنچتا ہے۔ روزہ رکھے گا اس کے لئے فرماتے ہیں ''اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ.'' ① ''روزہ میرا ہے میں اس کا بدلہ دوں گا'' اور افطار کرنے بیٹھا تو فرمایا افطار کرنے والے کے لئے دو فرحتیں ہیں، ایک فرحت یہ ہے کہ پانی پی کر پورے بدن میں سیرابی آ گئی اور دوسری فرحت یہ ہے کہ اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، رضائے خداوندی نصیب ہوگی۔ غرض روزے میں آدمی فاقہ کر کے اللہ تک پہنچا اور کھا کر بھی اللہ تک پہنچا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب فاقہ کرے جبھی پہنچے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس ہو جبھی اللہ تک پہنچے، سرمایہ دار ہو تب بھی پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ سرمایہ کا اول و آخر درست ہو، حرام اور ناجائز کمائی نہ ہو، خرچ میں بھی ناجائز طریقہ نہ ہو۔

آج کا جنید و شبلی...... اور آج تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک انسان حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے تو وہ ولی کامل ہے۔ یہ اس زمانے میں جنید بغدادی جیسا ہے کہ اس زمانے میں جنید بننے کے لئے بے شک یہ ضروری تھا کہ کسی مکروہ کا بھی ارتکاب نہ کرے اور کوئی مستحب بھی نہ چھوٹنے پائے۔ لیکن آج کا جنید اگر فرائض سرانجام دے اور حرام سے بچ جائے تو انشاء اللہ اسے جنید و شبلی جیسا اجر ملے گا۔

اس لئے کہ آج کا زمانہ انتہائی فتنوں اور رکاوٹوں کا زمانہ ہے۔ ان رکاوٹوں میں رہ کر آدمی اپنے دین پر قائم رہ جائے تو وہ مجاہد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ ''آج تم ایسے دور میں ہو کہ اگر دین کے دس حصوں سے نو حصے انجام دو۔ ایک حصہ چھوٹ جائے، تم سے قیامت کے دن مواخذہ ہوگا کہ تم نے ایک حصہ کیوں چھوڑا؟ اور فرمایا تمہارے بعد ضعفاء آنے والے ہیں کہ اگر دین کے دس حصوں میں ایک حصے پر عمل کریں اور نو حصے چھوٹ جائیں تو انہیں اجر وہ دیا جائے گا جو تمہیں دیا جا رہا ہے''۔

یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے رکاوٹیں نہیں خدا کا رسول موجود ہے، معجزے موجود خیر القرون کے اندر تم موجود ہو، سارے دواعی اور اسباب دین موجود ہیں۔ اس لئے دین پر عمل کرنا تمہارے لئے دشوار نہیں۔ بعد والے وہ ہوں گے کہ نہ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ کا رسول موجود نہ معجزے ہوں گے نہ ان کے سامنے خیر القرون ہوگا نہ وہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الصوم، باب فضل الصيام، ج: ٢، ص: ٨٠٧ رقم: ١١٥١.

حالات و کیفیات ہوں گی، بلکہ شک ڈالنے والے اور شبہات پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے۔ فتنوں کا ایک ہجوم ہوگا۔ جوان سب کے اندر رہ کر دین پر قائم ہوگا۔ وہ تھوڑا بھی کرے گا تو اجر وہ ملے گا جو آج تمہیں دیا جا رہا ہے۔

غرض رکاوٹوں اور موانع کی کثرت میں جو چیز آتی ہے وہ قابل قدر رہوتی ہے، اس واسطے دولت دنیا ہو، تمول ہو، بلڈنگیں ہوں، باغات ہوں اگر حلال طریق پر کمائی جائیں حق تعالیٰ نے عطا کیا، تو اس کا عطیہ ہے، ضائع نہ کیا جائے لیکن اسی سے پوچھ کر خرچ کیا جائے۔

ہماری ملکیت کی حیثیت ...... اس واسطے کہ اپنی جان کے بھی ہم مالک نہیں ہیں تو اپنے مالوں کے مالک بھی ہم نہیں ہیں۔ جان کا مالک وہ ہے جس نے جان بنائی، ہمارے مالوں کا مالک وہ ہے جس نے مال بنا کر ہمارے سپرد کیا ہے۔ درحقیقت مالک حق تعالیٰ شانہٗ ہیں ہم امین و خزانچی ہیں، خزانچی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جسے چاہے دیدے، مالک سے پوچھنا پڑے گا کہ کتنا کس کو دوں؟ وہاں سے آرڈر ہوگا جتنا حکم ہوگا، اتنا خرچ کرنا پڑے گا، فرمایا گیا ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ ① ”زمین کا مالک اللہ ہے جسے چاہے بخش دے“۔ ہم مالک نہیں ہیں، اور جب بخش دیتے ہیں تو بخشنے کے بعد بھی مالک وہی رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ﴿وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ② سارے انسان دولتوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ”اصل وارث ہم ہیں“۔ پھر وراثت ہمارے ہی پاس آجائے گی، ہم ہی اول میں مالک تھے، ہم ہی اخیر میں ہیں اور درمیان کے حصہ میں بھی مالک ہم ہی ہیں، ہمارا ہی آرڈر چلے گا، ہمارے ہی کہنے کے مطابق وہ خرچ کی جائے گی۔

اسی لئے فرماتے ہیں ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ③ اس دولت میں سے خرچ کرو جو ہماری بخشی ہوئی ہے۔ یہ لفظ اس لئے کہہ دیا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مالک ہو یا تم اس دولت کے بنانے والے ہو، پیدا کرنے والے بھی ہم ہیں مالک بھی ہم ہیں تو فرمادیا کہ ﴿مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ وہ جو ہم نے تمہیں دولت دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔

ترغیب انفاق ...... اس عنوان سے خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اپنی چیز دوسرے کو دینے میں طبعاً رکاوٹ ہوتی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ بھائی یہ چیز تمہاری کب ہے تو دینا آسان ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ۔

مال مفت دل بے رحم

جب مال مفت کا ملے گا، آدمی بے تکلف خرچ کرے گا۔ ایک چیز دوسرے کی ہے، میں کیوں بخل کروں؟ اس لئے فرمایا کہ: تم اسے اپنی چیز سمجھتے کیوں ہو؟ یہ تو ہماری چیز ہے۔ جب ہم اجازت دے رہے ہیں تو ہماری چیز سمجھ کر خرچ کرو تا کہ سخاوت کر سکو۔ اطمینان سے دے سکو۔ یہ تمول اور دولت خود دین کے کمانے کے ذریعہ ہے جیسے میں نے عرض کیا صحابہؓ میں ابوذر غفاریؓ جیسے بھی ہیں اور صدیق اکبرؓ و (عبدالرحمن ابن عوفؓ) جیسے بھی ہیں۔

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸. ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۸. ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰.

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ ابوبکرؓ کا احسان ہے کہ چالیس ہزار روپیہ میری ذات کے اوپر خرچ کیا ہے۔ اس زمانے کا چالیس ہزار روپیہ ایسا ہے جیسا آج کا چالیس لاکھ روپیہ۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ضرورت پیش آئی اور خدام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا۔ یہ خرچ کرنا عین طاعت وعبادت بنا وہی ترقی کا باعث بنا کہ صدیقیت کا مقام ملا۔

بادشاہت کے ساتھ عبادت...... حاصل یہ نکلا کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو عبادت سے محروم نہیں رہ سکتا، ہر مقام کی عبادت ہے۔ دولت مند کی عبادت دولت کے ساتھ، غریب کی عبادت غربت کے ساتھ ہوتی ہے۔ بادشاہ کی عبادت بادشاہت کے ساتھ ہوتی ہے اور فقیر بے نوا کی عبادت فقر وفاقہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

امیر کے بارے میں فرمایا کہ: ''سَبۡعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظِلِّهٖ يَوۡمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ'' ① ''سات قسم کے لوگ ہوں گے جن کو قیامت میں عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جس دن بجز اللہ کے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہوگا''۔ اس میں پہلی نوع فرمایا:

''اِمَامٌ عَادِلٌ.'' ''وہ بادشاہ جو عدل وانصاف والا ہو''۔ اسے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ ایک فقیر یہ سمجھتا تھا کہ اسے اتنے اونچے مراتب مل رہے ہیں۔ یہ تخت پہ بیٹھا ہوا بادشاہ ہے۔ اس کے سامنے وسائل زندگی کھلے ہوئے ہیں عیش کے سارے سامان اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ کیا دیندار ہوتا؟ لیکن اسلام نے آ کر اسے تسلی دی کہ تو تخت پر بیٹھ کر بھی اللہ کو پا سکے گا۔ اگر تو عدل وانصاف کرے تو تجھے وہ مقام ملے گا کہ تجھے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ غرض ایک فقیر بے نوا کو بھی یہ مقام دیا گیا اور ایک بادشاہ وقت کو جو تخت وتاج کا مالک تھا، اسے بھی یہ مقام دیا گیا۔ تو اسلام کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتا۔ نہ یہ کہتا ہے کہ تو اپنا مقام بدل جب جا کے تجھے خدا ملے گا۔ بلکہ اپنے مقام پر رہ۔ مگر ضرورت کس چیز کی ہے؟ فکر کی ضرورت ہے۔ بے فکرا انسان کوئی انسان نہیں ہے۔ جس انسان کا نصب العین نہیں ہے، وہ انسان نہیں ہے، عقلمند انسان وہ ہے کہ اپنا نصب العین ٹھہرا دے۔ تو نصب العین طاعت وعبادت خداوندی نکلا۔ دولت مند ہوگا تب بھی اطاعت کر سکتا ہے۔ مفلسی میں ہوگا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے۔ بادشاہی تخت پر ہے تب بھی یہ نصب العین قائم ہے۔ غربت میں ہے تب بھی، تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی۔ زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم، موت آ جائے تو بھی، یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

قبر میں عبادت...... قبر میں بھی جا کر عبادت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے صاف حدیث موجود ہے کہ ''اَلۡاَنۡبِيَاءُ اَحۡيَاءٌ فِیۡ قُبُوۡرِهِمۡ يُصَلُّوۡنَ'' (اَوۡ كَمَا قَالَ عَلَيۡهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ② ''انبیاء علیہم السلام اپنی

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب فضل الصدقة، ج: ۲ ص: ۷۱۵ رقم: ۱۰۳۱. ② المسند للامام ابی یعلیٰ الموصلی، احاديث انس بن مالک رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ، ج: ۶ ص: ۱۴۷ رقم: ۳۴۲۵. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۲۱۱.

قبروں میں زندہ ہیں اور عبادتوں میں مشغول ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں'' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''کَانِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ'' ① گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں موسیٰ علیہ السلام تلبیہ پڑھتے ہوئے لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں جا رہے ہیں گویا حج بھی کرتے ہیں تلبیہ بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مطاف میں ایک شخص چوڑے سینے والا، چہرہ اتنا حسین اور تروتازہ کہ ایسا معلوم ہوا ابھی حمام سے غسل کر کے نکلا ہے۔ بال اتنے خوبصورت اور اتنے شاداب جیسے معلوم ہو کہ ان سے پانی ابھی ٹپک پڑے گا۔ تو میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ: مطاف میں یہ کون شخص ہے؟ کہا مسیح ابن مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام طواف میں بھی ہیں، غرض انبیاء علیہم السلام کی عبادت ثابت ہوئی۔

اولیائے کرام، کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اولیائے کرام کو بھی ذکر کا الہام فرماتے ہوں وہ بھی تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہوں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ صلحائے مومنین بھی ذکر اللہ میں لگے رہتے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ: ''تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے''۔ اگر ذکر اللہ پر زندگی گزاری ہے، موت بھی ذکر اللہ پر آئے گی، قبر سے جب اٹھے گا وہی ذکر کرتا ہوا اٹھے گا اگر حج میں لبیک کہتا ہوا انتقال کر گیا تو حدیث میں ہے کہ جب قبر سے اٹھے گا تو لبیک لبیک زبان پر جاری ہوگا۔ اور یہ سمجھتا ہوا ہوگا گویا میں حج کر رہا ہوں۔ بعد میں یہ پتہ چلے گا کہ یہ میدان عرفات نہیں ہے بلکہ میدان محشر ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب انسان قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور ملائکہ علیہم السلام سوال و جواب کے لئے آتے ہیں جن میں سے ایک کا نام منکر اور ایک کا نام نکیر ہے، اور منکر نکیر اس لئے کہا کہ ان کی صورتیں اوپری ہوتی ہیں جو کبھی نہیں دیکھی ہوتیں۔ وحشت ناک، ہیبت ناک اور ڈراؤنی شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں اور تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون؟ وَمَادِیْنُکَ؟ اور تیرا طریق کار کیا تھا؟ وَمَنْ ھٰذَا الرَّجُلُ؟ ② اور یہ ذات بابرکات جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے کون ہیں؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب یہ دونوں سوال کرنے کے لئے آتے ہیں تو ہر مومن کو جو وہاں قبر میں وقت دکھلایا جاتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ سورج ڈوبنے والا ہے اور عنقریب دن ختم ہونیوالا ہے۔ یَتَمَثَّلُ لَہُ الشَّمْسُ سورج کی صورت مثالی سامنے آتی ہے کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ اس وقت فرشتہ پوچھتا ہے کہ مَنْ رَّبُّکَ کون

① الحدیث اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ ولفظہ: کانی انظر الی موسیٰ علیہ السلام ھا بطاً من الثنیۃ ولہ جؤار الی اللہ بالتلبیۃ، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السماوات ج: ۱ ص: ۳۹۲.

② المصنف لابن ابی شیبۃ، کتاب الجنائز، باب فی نفس المومن کیف تخرج ونفس الکافر، ج: ۳ ص: ۵۵ رقم: ۱۲۰۸۹۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۶ ص: ۱۳۰.

ہے تیرا پروردگار؟ یہ میت جواب دیتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے کہیں وقت نہ نکل جائے، میری نماز مکروہ نہ ہو جائے۔

دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اس سے کیا جواب مانگتے ہو کہ تیرا رب کون ہے؟ یہ تو رب میں اتنا منہمک ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کو اور اس کی عبادت کرنے کو تیار ہے؟ اس سے رب کا کیا پوچھنا؟ اس نے عملاً جواب دیدیا کہ یہ اس کا بندہ ہے جس کی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جواب سچا دے گا، مگر ہمارا فرض ہے ہمیں ڈیوٹی انجام دینی ہے یہ ہمیں یقین ہے کہ تینوں سوالات کا جواب حق ملے گا۔ تو قبر میں اس مومن کا یہ کہنا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ (مجھے چھوڑ دو نماز کا وقت جا رہا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں نماز کا جذبہ رہے گا۔

اب یہ کہ پڑھوائی جائے نہ پڑھوائی جائے یہ اللہ جانتا ہے لیکن جذبہ ہے۔ ''نِیَّةُ الْمَرْءِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ'' ''اگر انسان نیت کرے تو نیت عمل سے بہتر ہے''۔ اس پر ہی اجر مرتب ہوتا ہے جو عمل پر ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ میدان محشر میں حاضر ہوں گے حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ ان کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ ساری عمر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے یا اللہ! انہوں نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔

حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے ان میں سے ایک جب رات کو سوتا تھا تو یہ جذبہ لے کر سوتا تھا کہ آج رات کو ضرور اٹھ کے تہجد پڑھوں گا۔ مگر غریب کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں، جب اس نے ساری عمر یہ نیت رکھی تو لکھ دو کہ اس نے ساری عمر تہجد پڑھا۔ غرض مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، وہاں جو یہ کہے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑ دو، میں نماز پڑھتا ہوں، معلوم ہوتا ہے ہر مومن کے اندر یہ جذبہ ہے۔

مگر یہ جذبہ کس مومن کے لئے ہوگا؟ جو دنیا میں بھی وقت مکروہ سے بچنے کے لئے چاہتا تھا کہ وقت پہ نماز ادا کرلوں، وہی وہاں بھی کہے گا۔ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اور جو یہاں پڑا ہوا دندناتا سوتا تھا، اس کی زبان سے نہیں نکلے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑ دو۔ میں نماز پڑھتا ہوں۔

اور شاید عصر کی نماز اس لئے رکھی کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عصر کی نماز کے وقت کے دو حصے ہیں۔ ایک وقت کامل ہے، ایک وقت مکروہ۔ دھوپ میں جب تک زردی نہ آئے وہ وقت کامل ہے اور جب زردی آ جائے وہ وقت مکروہ ہے اور عین جب سورج غروب ہونے لگے وہ وقت وقت مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ جب عصر کی نماز اس کے اوپر کامل فرض ہوئی تھی تو کامل ہی ادا کرنی چاہئے ناقص واجب ہوگی تو ناقص ادا کرے گا۔ اس واسطے اگر غروب کے وقت بھی ادا کر دی تو ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جیسی واجب ہوئی تھی ویسی ادا کر دی، اس لئے کہ عصر کے دو وقت ہیں، ایک وقت کامل ایک وقت مکروہ۔ قبر میں مومن کے واسطے ڈرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ کہیں وقت مکروہ نہ آ جائے، میں پہلے ہی کیوں نہ ادا کرلوں؟ صبح کی نماز

میں دو قسم کے وقت نہیں ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے پڑھ لے، جتنا وقت ہے سارا کامل ہے، جب سورج نکل آیا، وقت ختم ہو گیا۔ بخلاف عصر کے اس کے دو وقت ہیں۔ تو شاید اس لئے عصر کی نماز کا وقت دکھایا جاتا ہے کہ اس میں ناقص اور کامل دو حصے ہیں۔ تو مومن سوچتا ہے کہ کامل نماز ادا کیا کرتا تھا۔ اب یہ وقت ناقص آ رہا ہے میری نماز کہیں ناقص نہ ہو جائے۔ اس لئے ملائکہ سے کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔

بہر حال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن قبر میں ایک جذبہ لے کر جائے گا اور جذبہ یہ ہوگا کہ میں نماز پڑھوں۔ تو انبیاء علیہم السلام عملاً نماز میں مشغول ہیں۔ مومن اس جذبے میں مشغول ہے اگر چہ عمل کی اجازت نہ دی جائے یا اس میں سکت نہ ہو۔ تو دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اس کا جذبہ ہی عمل کے قائم مقام ہوگا۔ گویا وہ بھی نماز پڑھ رہا ہے۔

میدان حشر میں جذبۂ عبادت...... تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کا نصب العین وہ ہونا چاہئے کہ انسان اسے اس دنیا میں بھی نصب العین بنا سکے اور جب قبر میں پہنچے تب اس کا نصب العین اس کے ساتھ ہو اور وہ عبادت ہے۔ عبادت کا جذبہ جیسے یہاں ہے ویسے وہاں ہوگا۔ میدان حشر میں جب آدمی اٹھے گا اسی حالت پر اٹھے گا جس حالت پر موت آئی ہے اگر نماز پڑھتے ہوئے، ذکر کرتے ہوئے، حج کرتے ہوئے موت آئے، اسی حالت میں قبر سے اللہ اللہ یا لبیک لبیک کہتے ہوئے اٹھے گا اور دل میں تمنا ہوگی کہ میدان محشر میں نماز پڑھوں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ جو دار العلوم کے شیخ، مربی اور اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے ان کا مقولہ سنا، فرمایا: ''قیامت کے دن اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کروں گا، نہ مجھے جنت چاہئے نہ حوریں اور نہ محلات چاہئیں، مجھے تو اپنے عرش کے نیچے دو گز جگہ دے دیجئے۔ میں وہاں پر نماز پڑھتا رہوں''۔ گویا اس درجہ نماز کی تڑپ کہ اگر وہاں بھی طلب ہوگی تو نماز کی ہوگی۔ تو یہ ایک ایسا عمدہ نصب العین ہے کہ دنیا' قبر اور میدان محشر میں بھی ساتھ ہے۔

جنت میں عبادت...... اور جنت میں بھی ساتھ ہوگا۔ جنت کے بارے میں فرمایا گیا ''یُلْهَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ'' ① ''جتنے جنتی ہوں گے، ان کی زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہوگا''۔ یہ ارادۃً نہیں ہوگا، ارادے کی محنت دنیا میں انہوں نے اللہ اللہ کر کے اٹھائی تھی۔ اب اللہ کا ذکر نفس میں رچ گیا ہوگا اسلئے بلا ارادہ ذکر جاری ہوگا۔ سانس کے ساتھ اللہ کا نام نکلے گا، جیسے پاس انفاس ہوتا ہے کہ آنے والے سانس کے ساتھ اللہ اور جانے والے کے ساتھ ھُوْ، اَللّٰہُ ھُوْ، اَللّٰہُ ھُوْ۔ غرض اہل جنت کی زبانوں پر بلا ارادہ تسبیح و تہلیل اور اللہ کا نام جاری ہوگا۔ یہ اس کا اثر ہوگا کہ دنیا میں انہوں نے محنت کر کے ذکر اللہ کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ ''رَتِّلْ وَارْتَقِ'' ② ''تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا'' جتنی تیری ہمت ہے درجات کماتا جا، معلوم ہوتا

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی صفات الجنة...... ج:۴ ص:۲۱۸۰ رقم:۳۵۲۸.

② السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی من قرأ حرفاً...... ج:۵ ص:۱۷۷ رقم:۲۹۱۴.

ہے جنت میں روزانہ ترقی ہوگی۔ تلاوت کے ذریعے سے روزانہ عروج ہوگا۔ نیا سے نیا مقام، نئی سے نئی حالت، نئی سے نئی کیفیت اور نئی سے نئی نعمت ملتی رہے گی۔ تو عبادت کا نصب العین وہ ہے کہ دنیا سے چلا قبر تک پہنچا حشر تک پھر جنت تک پہنچا اور جنت میں پھر نئے سے نئے جہان، نئے سے نئے مقامات ابدالآباد تک آتے رہیں گے اور عبادت کا یہ نصب العین ساتھ رہے گا۔

ایمان کی وجہ سے ہر چیز پاکیزہ بن جائے گی...... اس لئے میں نے عرض کیا کہ: اس لمبی زندگی کے لئے نصب العین بھی لمبا ہونا چاہئے معمولی نصب العین جو چند دن کے بعد ختم ہو جائے۔ وہ زندگی کے حسب حال اور لائق نہیں ہے۔ یہ زندگی کی توہین ہے، آپ زندگی کا نصب العین روٹی کو بنائیں۔ یہ اس کی توہین ہے اس لئے کہ روٹی انسانوں کو بھی ملتی ہے جانوروں کو بھی ملتی ہے، یا دولت کمانے کو نصب العین بنائیں تو دولت خود ایک ذریعہ اور واسطہ ہے خود مقصد نہیں ہے، آدمی کی جب جان پر آنے لگتی ہے تو دولت کو خرچ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا دولت خود مقصود نہیں، جان مقصود ہے اور جب ایمان پر آنے لگتی ہے تو جان گنوا دیتا ہے کہ ایمان محفوظ رہنا چاہئے، معلوم ہوتا ہے ایمان مقصود ہے، تو سب سے بڑا نصب العین ایمان ہوا کہ نہ جان کی پرواہ کی نہ مال کی، تو ان چیزوں کو نصب العین بنانا عارضی چیزوں کو نصب العین بنانا ہے۔ اس واسطے لمبی زندگی نصب العین وہ ہونا چاہئے جو زندگی کے آخری گوشے تک پہنچ جائے، وہ طاعت وعبادت خداوندی ہے، وہ دولت ایمان ہے، وہ دولت عرفان ہے، وہ اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔

اس کو سامنے رکھ کر آدمی مال کو بھی گھماتا رہے، جان اور آبرو کو بھی گھماتا رہے، اس وقت اس کی جان بھی قیمتی جان بن جائے گی کیونکہ ایمان کے لئے ذریعہ بنی، مال بھی اس کا پاک مال بن جائے گا کیونکہ ایمان کے لئے وسیلہ بنا۔ اس کی اولاد بھی پاک بنادی جائے گی کیونکہ ایمان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ذریعہ بنے گی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ.'' ① ''نیک آدمی کا مال بھی نیک ہوتا ہے'' نیک مال نیکی کا ذریعہ بنتا ہے، تو انسان پاک رہے گا تو مال بھی پاک بنے گا۔ اگر انسان نے اپنے قلب اور روح کو معصیتوں سے ناپاک بنا دیا، اس کا مال بھی ناپاک بنے گا۔ اس لئے مال کی مذمت نہ کی جائے، مذمت اپنی کی جائے، غلطی ہماری ہوتی ہے، ڈال دیتے ہیں مال کے اوپر، آدمی پاک بن جائے ساری چیز پاک بن جائیں گی۔ بلڈنگ بھی پاک، مکان بھی پاک، ہر چیز اچھی ہو جائے گی، یہ جبھی ہوگا جب اپنی پوری زندگی کی نقل وحرکت کا اصل نصب العین اطاعت خداوندی بنایا جائے۔ اکبرالٰہ آبادی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ اس قطعے میں اس زمانے کی ایک حالت ظاہر کی ہے، مگر مقصد رہ گیا تھا تو ایک شعر میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ اس میں مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ اکبرالٰہ آبادی کہتا ہے کہ ۔

① المسند للامام احمد، احادیث عمرو بن العاص، ج: ۴ ص: ۱۹۷.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

نہ راحت ابدی نہ مصیبت ابدی، اگر مصیبت میں آدمی وقت ٹلادے مصیبت ختم ہو جاتی ہے۔ نعمت میں وقت ٹلادے، نعمت ختم ہوگئی، پائیداری اور قرار کسی چیز کو نہیں ہے، نہ یہاں کی عیش کے لئے پائیداری ہے نہ مصیبت کے لئے عیش والا بھی سب کچھ چھوڑ کر چل دے گا، مصیبت والا بھی چل دے گا۔ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

مگر ابھی شعر تشنہ ادھورا رہ جاتا ہے، وقت تو گزر جائے گا مگر آخر انسان کرے کیا؟ مصیبت و راحت ایک حالت ہی آئی اور گئی کہنا آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس کا میں نے جوڑ لگا دیا۔ گو یہ جوڑ ا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دے اس لئے کہ اکبر تو لسان العصر ہے، بڑے اونچے درجے کا شاعر ہے ہماری کیا شاعری اس کے مقابلے میں بس تک بندی ہے، مگر بہر حال خواہ وہ تک بندی ہی ہو، مگر پیوند تو لگا ہی دیا۔ چاہے وہ مخمل میں ٹاٹ ہی کا ہو، اس لئے کہ اگر مخمل پھٹی رہ جائے تو بدن کھلا رہ جائے گا۔ تو ٹاٹ سے بدن تو چھپ جائے گا لباس کا مقصد پورا ہو جائے گا، اس واسطے ہم نے بھی پیوند لگا دیا۔ وہ پیوند کیا ہے؟ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں کہ ۔

مقصد زندگی ہے طاعت حق — نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے
رہ گیا عزو جاہ کا جھگڑا — نہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اور قابل ذکر بھی نہیں خورد و نوش — نہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے ①

اصل مقصد یہ ہے کہ طاعت حق ہو، یہ ہوگی تو ہر چیز پائیدار اور کار آمد بن گئی اور اگر اطاعت حق باقی نہ رہی تو مال بھی وبال، جان بھی وبال، صحت بھی وبال، ساری ہیئتیں حقیقتیں، حرکتیں سب وبال جان بن جائیں گی، اندر ایمان نہیں رہے گا اور اگر ایمان آ گیا پھر اس کے لئے ہر چیز نعمت و راحت کا ذریعہ بنے گا۔

زندگی کی قدر کی صورت...... اس ساری تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ ہمیں اس زندگی کی قدر کرنی چاہئے، یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اور قدر کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی نصب العین کے تحت خرچ کیا جائے، بلا موضوع اور بلا مقصد نہ خرچ کیا جائے، اور یہ مقاصد نہیں ہیں کہ مجھے عیش مل جائے یا میری زندگی آرام سے گزر جائے یا میرے پاس دولت

① از مجالس حکیم الاسلام ص ۳۹۔

زیادہ ہو جائے یا میرے پاس کوٹھی ہو یہ کوئی مقصد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دے آدمی بنالے مگر اس کو بھی کسی مقصد کے تابع کیا گیا ہے، کوٹھی میں نیت کرے کہ میں اس لئے بناتا ہوں کہ دوست احباب جمع ہوں گے خدا کا نام لیں گے، موقع ہوگا تو جماعت ہوگی۔ اب کوٹھی نہ ہوئی عبادت گاہ بن گئی۔ اس کوٹھی میں آپ کو وہ اجر مل گیا جو مسجد میں ملتا۔

حسن نیت...... کسی بزرگ کے ایک خادم نے مکان بنوایا، جب مکان مکمل ہو گیا تو اس نے اس میں اپنے شیخ کو دعوت دی کہ آپ تبرکاً مکان کا افتتاح کر دیں۔ شیخ آئے تو بڑے خوش ہوئے کہ بڑا عمدہ مکان ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ بھئی! یہ اتنے بڑے بڑے روشندان، دروازے اور کھڑکیاں کیوں رکھیں؟

اس نے کہا حضرت اس لئے رکھیں کہ ہوا آئے، فضا صاف رہے۔ دھوپ بھی آئے، فرمایا: جابندۂ خدا! اس میں اس کی نیت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دھوپ تو ویسے بھی آ جاتی۔ نیت نہ کرتا، ہوا بھی آتی، ان روشندانوں میں تو نے کوئی ایسی نیت کیوں نہ کر لی کہ تجھے اجر مل جاتا۔ یہ چیزیں تو خود بخود آنی تھیں فرمایا، تو نے یہ نیت کیوں نہ کر لی کہ میں اس لئے لمبے لمبے روشندان رکھ رہا ہوں کہ ان سے موذن کی اذان کی آواز جلدی سے آ جایا کرے گی، میں در اس لئے رکھ رہا ہوں کہ ذکر اللہ کرنے والوں کی صدا جلدی میرے کانوں تک پہنچ جایا کرے اگر یہ نیت کرتا، تو اجر بھی ملتا، ثواب بھی ملتا۔ اور دھوپ ہوا بلا نیت کے بھی آ جاتی تو مکان کی خوشنمائی میں آدمی اگر یہ نیت کر لے کہ یہ میں گویا اپنا گھر نہیں بنوا رہا یہ اللہ کا گھر ہے اس میں ذکر بھی ہوگا، نمازیں بھی پڑھی جائیں گی، وعظ بھی ہوں گے، بس یہ مکان باعث اجر بن گیا اس نے وہ کام دیا جو مسجد اور خانقاہ کام دیتی۔ تو ذرا سی نیت کے پھیر سے انسان عادت کو عبادت بنا لیتا ہے اور ذرا سی نیت کی خرابی سے عبادت بھی عادت بن کے رہ جاتی، سارا اجر ختم ہو جاتا ہے۔ نماز کو اس نیت سے پڑھ لو کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں، یہ ریا کاری ہو گئی۔ نماز ختم ہو گئی۔ یہ منہ پر مار دینے کے قابل ہے اور روٹی کھانے میں اس کی نیت کر لو کہ اس لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو عبادت کروں گا تو آپ کی روٹی عبادت بن گئی۔ نیت اللہ نے ایسی پاکیزہ چیز بنائی ہے کہ عادت کو چاہو تو عبادت بنا لو اور بری نیت ہو تو عبادت عادت بن کر رہ جاتی ہے، وہ بالکل قابل اجر ہی نہیں باقی رہتی۔

اس واسطے نصب العین اور نیت صحیح ہو تو انسان کی پوری زندگی کارآمد بن جاتی ہے۔ یہ چند باتیں میں نے اس لئے گزارش کیں کہ مجمع میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اور حق تعالیٰ نے دولتیں دی ہیں اور یہ شکر کی بات ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نعمت عطاء کرے، فقط اسی کے خوش ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے ہر بھائی کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے بھائی کو حق تعالیٰ نے نعمت دی اور سرفراز کیا۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ دولت تو نہیں ملی مگر علم اور ایمان کامل کی دولت ملی ہوئی ہے تو اس درجے کی دولت ان کے پاس نہیں ہے اور بہت سے بیچارے ایسے بھی ہیں کہ نہ یہ دولت ہے نہ وہ دولت، مگر ساتھ میں حسرت اور صبر کی دولت ہے کہ ہائے ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور ہم محروم رہ گئے۔ طاعت و عبادت مالی نہ کر سکے۔ ان کی حسرت اس دولت کے قائم مقام ہے، اس

حسرت سے ان کو اجر و ترقی دی جائے گی۔ ایسے مختلف لوگ موجود ہیں، اس واسطے نصب العین مشترک ہونا چاہئے جو سب کے لئے کارآمد ہو، وہ اطاعت حق اور عبادت خداوندی ہے کہ وہ دولت میں بھی قائم رہ سکتا ہے اور ناداری میں بھی، حسرت میں بھی قائم رہ سکتا ہے فرحت میں بھی اور ایسی چیز کے لئے زیبا ہے کہ اس کو ہم اس لمبی عمر کا نصب العین اور مقصد بنا سکیں تو اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ①

عبادت کے معنی...... اور عبادت کے معنی حقیقت میں نہ نماز پڑھنے کے ہیں، نہ روزہ رکھنے کے ہیں، نہ زکوٰۃ دینے کے ہیں، عبادت کے معنی تعمیل حکم کے ہیں کہ جو ہم کہیں اس کی اطاعت کی جائے، اگر ہم کہیں نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت ہے۔ اگر ہم کہیں ہرگز نماز مت پڑھو، تو چھوڑنا عبادت بن جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں روزہ رکھو تو روزہ رکھنا عبادت ہے، پانچ وقت میں نماز پڑھو تو نماز عبادت اور تین وقتوں میں حکم ہے کہ ہرگز مت پڑھو سورج ڈوبنے اور نکلنے کے وقت اور زوال کے وقت ان اوقات میں آدمی نماز پڑھے گا تو گنہگار ہوگا۔ معلوم ہوا نہ نماز پڑھنا عبادت نہ چھوڑنا عبادت کہنا ماننا عبادت ہے، رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے، عید کا چاند دکھائی دیا، تو عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کوئی رکھے گا تو گنہگار ہوگا، معلوم ہوا نہ روزہ عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم کہیں رکھو تو رکھنا عبادت، جب ہم کہیں چھوڑ دو، تو چھوڑنا عبادت ہے۔

فرمایا گیا: خودکشی حرام ہے، اپنے آپ کو قتل مت کرو، لیکن اگر نفیر عام ہو اور یوں فرما دیا جائے کہ میدان جہاد میں ذبح ہو جاؤ گھوڑوں کو بھی ختم کر دو، یہ عبادت ہو جائے گی۔ معلوم ہوا نہ جان کی حفاظت عبادت، نہ جان گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں جان کی حفاظت کرو، حفاظت کرنا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں کہ اس جان کی پرواہ مت کرو، جان دیدو، پھر جان دیدینا عبادت ہے۔

غرض عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی کو قانون خداوندی کے تحت میں گزارنا، ہر حالت میں اسی کی رضا کو سامنے رکھنا اور اپنی منشاء کو ختم کرنا، یہ عبادت ہے۔

بہر حال اسلام کسی حالت میں کسی کو مایوس نہیں کرتا جس حالت میں بھی انسان ہو، اسی حال میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچنے کے لئے اسے راہ بتلاتا ہے اور انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی راہ درست فرمائے اور اس نصب العین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا آسان فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

پرسکون زندگی

مشاہیر عالم کے نام لکھے گئے خط کا جواب

از حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

(کراچی کے ایک صاحب اے. جی یودوجکی نے مشاہیر عالم کے نام ایک مطبوعہ خط میں درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ انسان اس ابتراور پراگندہ دنیا میں پرسکون زندگی کیسے بسر کرسکتا ہے۔ ''حضرت مہتمم صاحب قدس اللہ سرہٗ کے نام بھی خط آیا اور اتفاق سے حضرت موصوف کے سامنے اس وقت آیا جب وہ پچھلے دنوں بمبئی سے کلکتے کا سفر ہوائی جہاز میں کرر ہے تھے۔ اس فرصت میں موصوف نے اس سوال کا جواب ایک خط کی شکل میں کراچی کے ان صاحب کو تحریر فرمایا جسے ہم درج ذیل حوالہ قرطاس کرتے ہیں)۔

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی

محترم المقام! زید مجدکم السامی ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ آپ کا گرامی نامہ دفتر دارالعلوم دیوبند میں موصول ہوا۔ میں اس دوران سفر میں تھا، سفر طویل ہوگیا اور آپ کا والا نامہ دیوبند سے ہوتا ہوا مجھے بمبئی میں ملا۔ وہاں بھی مصروفیات کے سبب جواب لکھنے کا موقعہ نہ ملا اور کلکتہ روانگی ہوگئی۔ اس لئے آج کلکتے سے جواب عرض کرر ہا ہوں۔ اور اس تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں۔

آپ نے والا نامہ میں سوال فرمایا کہ ''اس پریشان اور ابتر دنیا میں انسان کس طرح ایک خوش وخرم اور پرسکون زندگی بسر کرسکتا ہے؟''

جواباً عرض ہے کہ سوال اہم اور عموماً آج کے دکھی دلوں کی ایک عمومی پکار ہے اس لئے حقیقتاً توجہ طلب ہے، لیکن یہ سوال جس قدر اہم اور پیچیدہ دکھائی دیتا ہے اسی قدر اپنے جواب کے لحاظ سے واضح اور صاف بھی ہے۔ جواب سامنے لانے کے لئے پہلے پریشانی اور ابتری کے معنی متعین کر لینے چاہئیں تو اس سے بچنے کی صورت اور زندگی کے سکون کی راہ خود ہی متعین ہو جائے گی۔ لوگوں نے عموماً مصیبت پریشانی، دکھ درد، بیماری افلاس، تنگ دستی، جیل قید وبند، مار دھاڑ، قتل وغارت، قحط، وباء، بلا وغیرہ کو سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک چیز بھی مصیبت نہیں، یہ صرف واقعات اور حوادث ہیں، پریشانی اور مصیبت درحقیقت ان سے دل کا اثر لینا تشویش میں پڑنا، دل

تنگ ہونا اور کرب وغم میں ڈوب جانا ہے۔

پس یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ اسباب مصیبت کہلائی جاسکتی ہیں، مصیبت نہیں کہی جاسکتیں، مصیبت قلب کی کیفیت احساس اور تاثر کا نام ہوگا، جیل کی قید وبند کا نام مصیبت نہیں بلکہ اس سے دل میں پراگندگی اور گھٹن کا اثر آنا مصیبت ہے۔ افلاس وتہی دستی خود کوئی پریشانی نہیں، بلکہ دل کا اس سے گھبرانا اور مضطرب ہونا پریشانی ہے، تپ ولرزہ یا ہیضہ وطاعون اور قحط ووباء مصیبت نہیں بلکہ دل کا ان سے کرب وبے چینی کا اثر لینا مصیبت ہے۔ پس مصیبت خود ہمارے دل کی کیفیت ہے۔ دنیا کے واقعات نہیں، اس لئے مصیبت کے خاتمہ کی یہ تدبیر کبھی معقول اور کارگر نہیں ہوسکتی کہ دنیا کے حوادث کو مٹانے کی کوشش کی جائے، جب کہ حوادث زمانہ نہ خود مصیبت ہیں اور نہ ہی ہمارے قبضے میں ہیں، بلکہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان حوادث کے پیش آنے پر قلبی تشویش وپراگندگی کا راستہ روک دیا جائے اور ان سے، بجائے خلاف طبع ضیق وتشویش کا اثر لینے کے، انہیں طبعیت کے موافق بنالیا جائے جس سے دل ان سے گھٹنے کے بجائے لذت لینے لگے تو ان میں سے نہ صرف مصیبت ہونے کی شان ہی نکل جائے گی بلکہ یہ امور قلبی راحتوں کا ذریعہ بن جائیں گے اور زندگی میں پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

آج کی دنیا زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے ان حوادث زمانہ کو ختم کردینے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ چونکہ ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش ہے جو کبھی شرمندہ وقوع نہیں ہوسکتی اس لئے جتنا جتنا یہ اوندھی تدبیر بڑھتی جائے گی، اتنا ہی دنیا کی زندگی میں ابتری اور بے چینی کا اضافہ ہوتا رہے گا اور کبھی بھی پریشانیوں اور بے چینیوں کا خاتمہ نہ ہوگا، جیسا کہ مشاہدے میں آرہا ہے۔ پس عالم کو بدل ڈالنے کی کوشش کا نام چین نہیں بلکہ خود اپنے کو بدل دینے کا نام سکھ اور چین ہے۔

اس کی سہل صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظر کو ان حوادث سے ہٹا کر اس سرچشمہ کی طرف پھیر دیا جائے جہاں سے بن بن کر یہ اسباب، مصائب وآفات عالم پر اتر رہے ہیں اور وہ اللہ رب العزت کی ذات بابرکات ہے جس نے اس عالم کو اپنی لامحدود حکمتوں سے عالم اضداد بنایا ہے اور اس میں راحت وکلفت، نعمت ومصیبت، حظ وکرب اور چین اور بے چینی دونوں کو سمو کر اس عالم کی تعمیر کی ہے۔ اگر اس سے رشتہ محبت وعبودیت اور رابطہ رضا وتسلیم قائم کرلیا جائے جس کا نام ایمان ہے اور ریاضت ومشق سے اسے اپنا حال اور جو ہر نفس بنالیا جائے کہ اس کے ہر تصرف اور تقدیر پر اطمینان واعتماد کلی میسر آجائے تو یہ محبت ہی ہر تلخ کو شیریں اور ہر ناگوار کو خوش گوار بنادے گی جس سے قلب ان حوادث سے تشویش کا اثر نہیں لے سکے گا جو مصیبت کی روح ہے کہ ؎

از محبت تلخہا شیریں بود

کیوں کہ عاشق کے لئے محبوب کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز محبوب اور لذیذ ہوتی ہے، وہ محبوب کی بھیجی ہوئی تکلیف کو بھی اپنے حق میں یہ سمجھ کر راحت جانتا ہے کہ محبوب نے مجھے یاد تو کیا، وہ میری طرف متوجہ تو ہے اور

مجھے قابل معاملہ تو سمجھا، یہ تصور ہی اس مصیبت کو اس کے لئے لذت وراحت بنادے گا اور مصیبت، مصیبت نہ رہے گی۔ خلاصہ یہ نکلا کہ مصیبت نام ہے خلاف طبع کا اور خلاف طبع کو موافق طبع بنانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ عالم کی طبیعت کو بدلنے کے بجائے، (جو بس کی بات نہیں) اپنی طبیعت کو بدل دیا جائے اور اس کا رخ مصیبت سے پھیر کر مصیبت بھیجنے والے کی طرف کر دیا جائے کہ نظر مصیبت پر نہ رہے بلکہ خالق مصیبت کی توجہ وعنایت اور بے پایاں حکمت وتربیت پر ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین بجز خدا کی ذات کو مانتے ہوئے اور اس کے ہر ہر تصرف پر کلی اعتماد واطمینان کئے بغیر میسر نہیں آ سکتا، اس لئے مصائب کا خاتمہ خدا کے نام سے بھاگنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی طرف لوٹنے میں ہے یعنی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ پیچھے ہٹنے میں ہے۔

اندریں صورت انسان جتنا بھی استیصال حوادث کی مہم میں لگا رہے گا، مصائب سے کبھی نجات نہ پاسکے گا جس کا راز یہ ہے کہ وہ دفعیہ حوادث وآفات کی تدبیر کسی نہ کسی سبب ہی کے ذریعے کرے گا اور یہ سبب بھی جب کہ خود ایک حادثہ ہوگا جس میں منفعت کے ساتھ مضرت کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوگا تو یہ دفع مصیبت بھی مصیبت سے خالی نہ ہوگا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ استیصال مصائب کی بجائے کچھ نہ کچھ اضافہ مصائب ہی ہو جائے گا اور ایک مصیبت اگر کسی حد تک ٹل بھی جائیگی تو دوسری مصیبت اسی آن اس کی جگہ لے لے گی۔

گر گریزی برامید راحتے ہم ازاں جا پیشیت آید آفتے

لیکن اگر ان حوادث سے بالاتر ہو کر خالق حوادث سے قلب کا تعلق قائم کر لیا جائے تو ادھر سے علمی طور پر تو ان آفات ومصائب کی حکمتیں دل پر کھلیں گی جس سے یہ مصائب معقول اور برمحل محسوس ہونے لگیں گے اور ان سے اکتانے کی کوئی وجہ معقول نہ ہوگی کہ قلب عقلاً غمگین ہو اور پھر عشق الٰہی کی سرشاری میں جب کہ ان حوادث کا ورود منشاء محبوب محسوس ہوگا تو اسے توجہ محبوب سمجھ کر یہ عاشق قلب میں عملاً ان آفات سے لذت وسرشاری کا اثر بھی لینے لگے گا اور آخر کار اس روحانی لذت وسرشاری میں محو ہو کر اسے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان آفات ومصائب کی طرف دھیان بھی کر سکے۔ اس لئے اس کے حق میں نعمت تو نعمت ہوئی مصیبت اس سے بھی بڑھ کر نعمت ولذت بن جائے گی اور زندگی سے مصائب اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پس راحت حقیقۃً اسباب راحت میں نہیں بلکہ مسبب الاسباب سے سچے تعلق میں پنہاں ہے۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلاصہ یہ ہے کہ راستے دو ہی ہیں، ایک مصائب سے دل تنگ ہو کر اسباب کے راستے سے ان کا مقابلہ اور استیصال کی فکر وسعی اور ایک مسبب الاسباب سے عشق کے ذریعہ مصائب کو توجہ محبوب سمجھ کر ان پر دل سے راضی ہو جانا اور شیوۂ تسلیم ورضا اختیار کرنا، پہلا راستہ بندگان عقل (فلاسفہ) نے اختیار کیا تو ایک لمحہ کے لئے بھی مصائب سے نجات نہ پاسکے، نہ خود مطمئن ہوئے نہ کسی کو اطمینان دلا سکے، بلکہ خود مبتلا ہو کر پوری دنیا کو مبتلائے مصائب

وآفات کر دیا جس سے دنیا سے سکھ اور چین رخصت ہو گیا، اسباب راحت بڑھ گئے اور راحت رخصت ہو گئی۔

دوسرا راستہ بندگانِ خدا (انبیاء واولیاء) نے اختیار کیا کہ حوادث عالم سے تنگ دل ہونے کے بجائے انہیں توجہ حق اور منشاء الٰہی سمجھ کر ذریعہ راحت قلب بنایا تو تشویش و پریشانی ان کے قلب کے آس پاس بھی نہ پھٹک سکی، خود بھی مطمئن اور منشرح ہوئے اور عالم میں بھی سکون واطمینان کی لہریں دوڑا دیں اس لئے ان کی اور ان کے متبعین کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے مصیبتوں کا خاتمہ ہوا اور خوشی وخرمی ان کی زندگیوں کا عنوان بن گئی۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَـآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ، لَاتَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ، ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ ① "بلاشبہ اولیاء الٰہی پر نہ خوف ہے نہ غم جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، ان کے لئے دنیا (زندگی) میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں خوشی وخرمی کا یہی اٹل قانون ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افلاطون حکیم نے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کو کمان فرض کیا جائے اور مصائب وآفات کو اس کمان سے چلنے والے تیر شمار کیا جائے اور خدا کو تیر انداز مانا جائے تو ان مصائب سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

عقل کا جواب تو مایوسی ہوتا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں کیوں کہ آدمی نہ آسمان کے دائرے کے باہر جا سکتا ہے نہ خدا کے احاطے سے باہر نکل سکتا ہے، اس لئے لامحالہ اسے مصائب کے تیر کھانے ہی پڑیں گے، بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، لیکن انبیاء فلاسفہ نہیں ہوتے کہ محسوسات میں گھری ہوئی محدود عقل کا سہارا پکڑ کر اپنے علم وعمل کے راستے محدود کر لیں، ان کا تعلق خالق عقل سے ہوتا ہے جو اپنے کمالات وتصرفات میں لامحدود ہے اور تعلق بھی محبت وعشق کا ہوتا ہے جو شش جہت سے بھی اوپر کی بات لاتا ہے ؎

عقل گوید، شش جہت راہیست حدے بیش نیست عشق گوید، ہست راہے، بارہا من رفتہ ام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مصائب کے تیروں سے بچاؤ کی بہت آسان صورت ہے اور وہ یہ کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آ کھڑا ہو، نہ تیر لگے گا نہ اثر کرے گا اور پہلوئے خداوندی ذکر اللہ اور یادِ حق ہے جس میں محو ہو کر آدمی اپنے کو کلیتہً خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ محبت وتفویض ہی عاشق کا وہ کام ہے جس سے ہر تلخ اس کے لئے شیریں بن جاتا ہے اور اس کی صدا یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

اور پھر اس کی تفویض اور جان سپاری کا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو، ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو، ہر چہ کنی رضائے تو

ظاہر ہے کہ اس لذت جان سپاری کے ہوتے ہوئے مصائب وآفات کی مجال ہی کیا رہ جاتی ہے کہ وہ قلب

① پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۶۲، ۶۴.

عاشق کو بے چین کرسکیں یا اس میں ذرہ برابر پراگندگی اور تشویش پیدا کرسکیں اس حالت میں قلب عاشق کی ہر تشویش و پراگندگی مبدل بہ سکون وطمانینت ہو جاتی ہے جو لذت وراحت کی جڑ اور [illegible] اب اگر اس میں کوئی تشویش و خلش ہو سکتی ہے تو اندیشہ فراق محبوب کی تو ہو سکتی ہے ورنہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشویش و پریشانی سے آلودہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ بندۂ عقل کو کبھی قلبی راحت نہیں مل سکتی اور بندۂ خدا کو کبھی قلبی پریشانی نہیں ہو سکتی۔

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (1) ''آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں''۔ مغروران عقل تجویز کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیشہ نامراد رہتے ہیں اور خاکساران حق تفویض کی راہ چلتے ہیں تو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس دنیا والوں کی انتہائی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسباب راحت کو راحت اور اسباب مصیبت کو مصیبت سمجھ رکھا ہے اس لئے دنیا کو اسباب ووسائل سے بھرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ یہی راستہ زندگی کی تشویشات اور بے چینیوں کا ہے جس میں ایک لمحہ کے لئے راحت میسر نہیں آسکتی، وہ اس راہ سے جتنا بھی حصول راحت اور دفعیہ مصائب کی جدوجہد کرتے رہیں گے اتنا ہی راحت سے دور اور قلبی سکون سے بعید تر ہوتے چلے جائیں گے۔

حصول راحت کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹ کر خدا سے معاملہ صاف اور رابطہ قوی کیا جائے اور اسی سچے خدا کا سہارا پکڑا جائے جسے چھوڑ کر ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، ورنہ زندگی کے پرسکون ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا، اس لئے آج کی پریشان حال اور ابتر دنیا اگر فی الحقیقت ایک خوش خرم اور پرسکون زندگی چاہتی ہے تو اپنا رخ بدلے اور بم چلانے، ایٹم بم بنانے، چاند پر جانے اور سیارات چھوڑنے میں راحت وسکون تلاش کرنے کی بجائے خداوند کریم کی بارگاہ کی طرف توجہ کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مستند قانون کو اپنا کر راہ عبودیت اختیار کرے کہ اس بارگاہ سے نہ کبھی کوئی مایوس لوٹا ہے نہ لوٹے گا اور اس سے کٹ کر نہ کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے نہ ہوگا۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر وبت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

سیرت اور صورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

احوال واقعی...... بزرگان محترم! اس جلسہ کا اصل مقصد جامعہ اشرفیہ کے فارغ التحصل طلباء کی دستار بندی اور ان کو مجمع عام میں سند وغیرہ دینا ہے تا کہ جامعہ کی سال بھر کی کارگزاری معاونوں کے سامنے آ جائے۔ تو اصل مقصد دستار بندی اور ان کی تکمیل کا اعلان ہے۔ یہ مقصد عنقریب آپ حضرات کے سامنے آ جائے گا۔ میں اسی ذیل میں چند کلمات، بہت مختصر وقت میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

اور مختصر وقت میں نے اس لئے عرض کیا کہ کچھ تو میں علیل اور ضعیف بھی ہوں اور زیادہ بیان ہوتا بھی نہیں ہے کچھ اس وجہ سے کہ علماء کے اتنے بڑے مجمع میں ایک طالب علم کو یوں بھی جرات نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہمارے استاذ اکبر حضرت علامہ مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون جاتے تو حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کے آنے سے میرے قلب کے اوپر ان کی علمی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے۔ میں کچھ مرعوبیت سی محسوس کرتا ہوں"۔

حالانکہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل، عارف باللہ، وہ حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت محسوس کریں حالانکہ حضرت شاہ صاحب ان کے ہم درس ہیں۔ حق تعالیٰ علم جسے چاہیں عطاء فرمائیں۔ تو حضرت علمی عظمت اور بوجھ محسوس کرتے تھے اور جہاں اتنے علماء بیٹھے ہوئے ہوں، آپ اندازہ کیجئے میرے دل پر اس کا کتنا بوجھ پڑ رہا ہوگا۔ اور بوجھ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اول تو قلت استعداد کی وجہ سے کوئی مضمون ہی نہیں (ذہن میں) ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ اور خبط ہو جاتا ہے۔ مگر بہر حال جب آپ حضرات نے اس جگہ بٹھلا دیا، اس کا قدرتی تقاضاء یہ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۷.

ہے کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس واسطے میں نے عرض کیا کہ اختصار ہوگا، کچھ علالت، کچھ ضعف اور کچھ علماء کی موجودگی یہ چند در چند چیزیں ہیں جن کی وجہ سے شاید میں زیادہ تفصیل نہ عرض کر سکوں اور مقصد اصلی دستار بندی ہے، اس کے لئے وقت بھی دینا ہے۔

اس دنیا میں ہر مخفی حقیقت کے لئے کسی پیکر کا ہونا ضروری ہے...... بات صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ اس دنیا کے حالات اور اس کی اشیاء پر جہاں تک ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز یہاں مرکب ہے۔ ایک حصہ اس میں نمایاں ہے، جس کو آپ جسم یا صورت کہہ دیں اور ایک حصہ مخفی ہے جس کو آپ روح یا جان کہہ دیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز روح اور جسم سے مرکب ہے۔ اس جہان میں نہ جسم محض ہے نہ روح محض ہے جسم محض ہو تو اس کا انجام گلنا پھولنا، پھٹنا سڑنا ہے۔ وہ بغیر روح کے باقی نہیں رہ سکتا اور روح محض بلا جسم کے نمایاں نہیں ہو سکتی، وہ مخفی کی مخفی رہ جائے گی۔ اس لئے دنیا میں جب بھی کوئی چیز آئے گی تو وہ اپنا کوئی پیکر یا ہیئت لے کر آئے گی۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب بھی کوئی غیبی حقیقت ظاہر ہوگی۔ وہ کوئی نہ کوئی پیکر یا پیراہن ضرور اختیار کرے گی اور وہ پیراہن اسی کے مناسب حال ہوگا جو اللہ نے اس لئے کے تجویز کیا ہے۔ مثلاً گلاب کی خوشبو ایک غیبی حقیقت ہے وہ جب نمایاں ہوگی، یہ نہیں ہے کہ وہ کیکر کے پتوں میں نمایاں ہو جائے، اپنے ہی مناسب صورت اختیار کرے گی۔ خربوزہ ہے اس کا ایک ذائقہ ہے۔ جب بھی اسے آپ تلاش کریں گے تو خربوزے کی ہیئت میں تلاش کریں گے یہ نہیں کہ آپ آم کی ہیئت میں خربوزے کا مزہ ڈھونڈنے لگیں۔ اس لئے کہ اس ذائقہ کو اللہ نے اسی کے مناسب شکل دی ہے۔ وہ غیر شکل میں نمایاں نہیں ہو سکتا۔

حقیقت کے مناسب صورت...... انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت جامعہ بنایا ہے جس میں سارے ظاہری اور باطنی کمالات رکھے ہیں۔ اس کے مناسب حال یہی صورت ہے جو آپ کی صورت نوعیہ ہے۔ یہ حقیقت کسی جانور کی شکل میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اسی انسانی پیکر میں ظاہر ہوگی تو ہر حقیقت قدرۃً چاہتی ہے کہ میرے مناسب صورت ہو۔ ہر صورت چاہتی ہے کہ میرے مناسب اس میں حقیقت ڈالی جائے۔ اللہ کے ہاں کوئی بے جوڑ قصہ نہیں ہے کہ حقیقت کوئی سی ہو اور شکل کوئی سی ہو۔ ہر صورت کے مناسب حقیقت اور ہر حقیقت کے مناسب صورت ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ "اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِيْ حِسَانِ الْوُجُوْهِ" [1] "خوبصورت چہروں میں خیر تلاش کرو" یعنی اگر چہرہ مہرہ اچھا ہے تو اندر بھی خیر ہی ہوگی۔ چہرہ مہرہ خراب ہے تو اس درجے کی نہیں ہوگی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ قادر مطلق ہیں۔ وہ پابند نہیں ہیں، وہ چاہیں تو بہتر سے بہتر صورت میں بری حقیقت ڈال دیں اور بری سی بری صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔ یہ درحقیقت ان کے قبضہ قدرت کی

[1] مسند ابی یعلی الموصلی، ولفظه: اطلبوا، سعید بن سنان عن انس بن مالکؓ ج: ۱۰ ص: ۲۱. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه ابو یعلی وفیه من لم اعرفهم دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۱۹۵.

بات ہے۔ لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ جیسا پیکر ہوگا ویسی حقیقت ظاہر ہوگی۔

دیدہ زیب صورت میں بری حقیقت...... غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دور ہے، اس میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ عام سڑک پر ایک عورت پڑی رہتی تھی اور جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ ساری اس میں جمع تھیں رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، دانت بھی زرد اور آنکھیں کرنڈی، رال بھی بہہ رہی ہے اور آنکھوں پہ چیپڑ بھی لگے ہوئے۔ غرض اس کی صورت کو دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ سڑک پر پڑی رہتی تھی۔ لوگ اسے بھیک دے دیتے تھے۔ رخ کوئی نہیں کرتا تھا۔ سب نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ وہ حاملہ پائی گئی۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس غلیظ کی طرف کس نے توجہ کی ہوگی؟ یہاں تک کہ حکومت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر اس گندی عورت کی طرف کون متوجہ ہوا ہوگا؟ تو سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) سے کہا گیا کہ اس کا پتہ چلاؤ، کون ایسی بھدی عورت کی طرف متوجہ ہوا؟

پولیس نے ایک ایسے آدمی کو لا کر پیش کیا جو نہایت حسین وجمیل اور نہایت ہی دیدہ زیب اس کی صورت۔ لوگ حیران تھے کہ ایسے پاکیزہ صورت انسان سے ایسا گندہ فعل کیسے سرزد ہوا؟ اور یہ فرشتہ صورت آدمی اس غلیظ عورت کی طرف کیسے متوجہ ہوا؟ تو پولیس سے سوال کیا گیا کہ تم نے کیسے پہچانا؟ پولیس نے کہا کہ اصل میں یہ شخص عرائض نویس ہے۔ جیسے لوگ عرضیاں لکھتے رہتے ہیں تو ان کو اجرت ملتی ہے۔ یہ بھی عرائض نویس ہے۔ فٹ پاتھ پر نالی بہہ رہی تھی اس کے قریب اس کی جگہ تھی۔ اس کی دوات خشک ہوگئی، تو اس نے بے تکلف نالی میں ہاتھ ڈال کر وہ جو گندہ پانی بہہ رہا تھا۔ اپنی دوات میں ڈالا۔ ہم نے جا کے پکڑ لیا کہ ایسی عورت کے ساتھ ایسی گندی حرکت یہی شخص کر سکتا ہے۔ اس کی طبیعت میں گندگی ہے اور پکڑنے کے بعد تحقیقات ہوئیں تو بات سچی ثابت ہوئی کہ یہی مبتلا تھے۔ تو صورت اتنی حسین وجمیل کہ بقول شخصے "دیکھ کر دھوپ بھاگ جائے" اور حرکت ایسی گندی سرزد ہوگئی کہ اس گندی عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔ بہتر سے بہتر صورت میں گندی حقیقت ڈال دیں، اور گندی سے گندی صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔

بدنما صورت میں پاکیزہ حقیقت...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "مَا رَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ أَبِي رَبَاحٍ" ① "میں نے اپنے دور میں عطاء ابن ابن رباح سے بہتر عالم نہیں پایا، علم، زہد، تقویٰ، اور کمالات ظاہر و باطن کے لحاظ سے میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں پایا۔ آپ اندازہ کیجئے کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس شخص کے علم وکمال کی تعریف کریں اس کا کس درجہ کا کمال اور علم وفضل ہوگا؟۔ تو علم وفضل کا یہ حال کہ ابوحنیفہ، مداح اور صورت انتہائی بدنما، کالی کلوٹی، دیکھ کر لوگ بھاگیں۔ مگر اس کالی صورت میں حقیقت اتنی

① السنن للترمذی، کتاب العلل، ج: ۱۲، ص: ۴۹۲.

پاکیزہ بھری ہوئی کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے سامنے گردن جھکا رہے ہیں۔

صورت ترجمانِ حقیقت ہے......تو یہ حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اچھی صورت میں بری حقیقت اور بری صورت میں اچھی حقیقت ڈال دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ اچھی صورتیں ہوں گی تو اچھی حقیقتیں ہوں گی اور بری صورت ہوگی تو حقیقت بھی اسی درجے کی ہوگی۔اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ''اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِيْ حِسَانِ الْوُجُوْهِ'' ① ''اچھی حقیقتوں کو پاکیزہ چہروں میں تلاش کرو''۔اس قسم کی تکوینی چیزیں اکثری ہوتی ہیں کلیہ نہیں ہوتیں کوئی نہ کوئی جز ان سے نکلتا رہتا ہے۔عام سنت اللہ یہی ہے کہ جیسی صورت ویسی حقیقت۔غرض ہر حقیقت کے مناسب صورت اور ہر صورت کے مناسب حقیقت دی جاتی ہے۔

صورت کا کام درحقیقت تعارف کرانا ہے یعنی حقیقت چھپی ہوئی ہے اسے پہچان نہیں سکتے جب تک کوئی صورت سامنے نہ ہو۔کیونکہ صورت حقیقت کی ترجمان ہوتی ہے صورت دیکھتے ہی آدمی کہتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔گلاب کی پتی دیکھ کر آپ فوراً پہچان لیں گے کہ اس میں گلاب کی خوشبو ہے۔آم کی شکل دیکھتے ہی پہچان لیں گے کہ یہ اس ذائقے کا پھل ہے۔اس میں آپ خربوزے کا ذائقہ محسوس نہیں کریں گے۔تو اس دنیا میں کوئی حقیقت بغیر شکل کے نہیں پہچانی جاتی۔اس لئے حق تعالیٰ نے ہر حقیقت کو ایک صورت عطاء فرمائی ہے۔اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ آپ بغیر صورت کے حقیقت کو پہچان لیں۔تو شکل وصورت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔یہ محض اس لئے رکھی گئی ہے کہ تعارف حاصل ہو جائے۔

حقیقت بیت اللہ الکریم......آپ حج کرنے کے لئے جاتے ہیں یا یہاں بیٹھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔یہ بیت اللہ کچھ نہیں ہے۔بیت اللہ معبود نہیں ہے وہ جو ایک چہار دیواری کا کوٹھا سیاہ لباس پہنے ایک محبوب کی مانند کھڑا ہے وہ مسجود نہیں ہے کہ آپ اسے سجدہ کریں بلکہ کعبہ درحقیقت وہ محل مبارک ہے جس کے اوپر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے اور وہ محل بھی فی الحقیقت کعبہ نہیں اس محل پر تجلی خداوندی اتری ہوئی ہے۔اس تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں، وہ مسجود ہے۔تو اس تجلی کے لئے محل کی ضرورت تھی۔تو اللہ نے ایک بقعہ مبارک معین فرما دیا۔اس محل کی پہچان کروانے کی ضرورت تھی تو کعبے کی چہار دیواری پر محنت کی گئی اور اسے بنایا گیا۔غرض کعبہ ایک علامتی نشان ہے۔حقیقت کعبہ وہ تجلی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں وہی فی الحقیقت مسجود ہے۔

ذات بالاتر ہے۔وہ کسی چیز میں نہیں سما سکتی کیونکہ لامحدود ہے۔محدود چیزوں کے اندر ذات نہیں سما سکتی۔البتہ تجلی ایسی چیز ہے کہ بڑی سے بڑی چیز یا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آ سکتی ہے۔اس لئے کہ تجلی کے معنی عکس کے ہیں۔جیسے مثلاً آفتاب بڑی چیز ہے اور سائنس دان کہتے ہیں کہ آفتاب زمین سے ساڑھے تین سو گنا بڑا ہے۔لیکن

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج:١٦ ص:٢٥٠. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبراني من طريق يحى بن يزيد بن عبدالملک النوفلي عن ابيه وكلاهما ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد ج:٨ ص:١٩٥.

زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جسے آئینہ کہتے ہیں۔اس میں آفتاب کی پوری تصویر اتر آتی ہے۔وہ آفتاب کا عکس ہے، عین آفتاب نہیں ہے۔ممکن نہیں کہ عین آفتاب آئینہ میں سما جائے۔لیکن اس عکس کو دیکھ کر آپ یہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آئینے میں سورج کو دیکھا اس میں سورج کے سارے خدوخال موجود ہیں۔وہی رنگ، وہی نقشہ، بلکہ آئینے کا آفتاب کام بھی وہی کرتا ہے جو اصل کا کام ہے۔اصل کا کام گرمی اور روشنی پہنچانا ہے۔اس آئینے کے ذریعے سے بھی آپ گرمی پہنچالیں گے اور آئینے کے مقابلے میں آئینے رکھتے چلے جائیں۔ہر آئینے میں ایک سورج آتا چلا جائے گا اور ان کے واسطے سے اندھیرے کنوئیں میں بھی روشنی ہو جائے گی۔تو جو اصل کا کام ہے تنویر اور حرارت۔یعنی روشنی پہنچانا اور گرمی پہنچانا وہی کام عکس بھی کرتا ہے۔اس لئے عکس کو دیکھتے ہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو دیکھا۔آپ کسی کی فوٹو لے لیں گو نا جائز ہی سہی لیکن فوٹو دیکھتے ہی آپ کہتے ہیں کہ یہ فلاں صاحب ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر اور اصل میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، غیریت نہیں ہوتی اگر غیریت ہوتی تو عکس کو دیکھ کر اصل کو آپ کبھی نہ پہچان سکتے۔تو عکس کا دیکھنا بعینہ اصل کا دیکھنا ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات لامحدود ہے۔وہ کسی غیر میں (مخلوق میں) نہیں سما سکتی۔وہ بالاتر ہے لیکن مخلوق کو پہچان کروانے کیلئے بیچ میں اللہ نے تجلی کا راستہ رکھا تو اس فضا میں یا آئینۂ بیت اللہ کے اندر اپنا عکس ڈال دیا۔اور عکس بڑی سے بڑی چیز کا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی آسکتا ہے۔تو درحقیقت مسجود وہ تجلی اور عکس خداوندی ہے جو بیت اللہ کے اندر اترا ہوا ہے۔یہ بیت اللہ کی عمارت اس کا ایک علامتی نشان ہے۔اگر یہ نہ ہو تب بھی سجدہ ادھر ہی کو ہوگا۔کیونکہ مقیم موجود ہے جس کو سجدہ کیا جاتا ہے۔

عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جب انہوں نے کعبے کی عمارت نئی بنائی تو پرانی عمارت نہیں تھی۔وہ منہدم کر دی گئی تھی لیکن طواف بھی جاری رہا اور نمازیں بھی جاری رہیں۔حالانکہ عمارت موجود نہیں تھی تو کعبہ اس تجلی مبارک کا نام ہے۔جس کا علامتی نشان کعبہ ہے۔

صورتِ کعبہ کا احترام......مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ علامتی نشان ہونے کی وجہ سے یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ کوئی ناقابل التفات چیز ہے۔اس کی عظمت، اس کا احترام، اس کا ادب اتنا ہی واجب ہوگا جیسے عین تجلی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔اس لئے کہ اسے تجلی سے ایک نسبت ہے اور وہ اس سے ملحق ہے۔نسبت کا اثر آئے گا تو اس کی اینٹ اینٹ معظم اور محترم بن جائے گی۔اس کا بھی ادب واجب ہوگا۔

اور نہ صرف بیت اللہ کا بلکہ اگر آپ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیں تو وہ غلاف بنایا تو آپ ہی نے ہے، مگر جب اس پر چڑھ گیا۔اس کے ساتھ نسبت قائم ہوگئی۔اس نسبت کی وجہ سے بنانے والے کو بھی اس کے سامنے جھکنا پڑے گا تو تجلی کی وجہ سے عظمت بقعہ مبارک کی قائم ہوئی۔اس بقعہ کی وجہ سے بیت اللہ کی چہار دیواری کی عظمت قائم ہوئی اور پھر ان سبھی وجوہ سے مسجد حرام کی عظمت قائم ہوئی اور مسجد حرام کی وجہ سے پورے مکہ کی قائم ہوئی۔حتیٰ کہ حجاز

بھی مقدس بن گیا۔ درجہ بدرجہ وہ تعظیم وتقدیس اور تکریم سب میں آتی رہی۔ تو اصل تعظیم اس تجلی مبارک کی ہے پھر درجہ بدرجہ نسبتیں پا کر سب اشیاء مقدس اور باعظمت بنتی گئیں حتیٰ کہ اگر کوئی حج کر کے آئے۔ آپ اس کے بھی ہاتھ چومتے ہیں۔ اس میں کیا نئی بات پیدا ہوئی؟ عبادت تھی تو وہ یہاں بھی کرتا تھا۔ نماز بھی پڑھتا تھا۔ ایک محض اسے بیت اللہ سے نسبت پیدا ہوگئی کہ اس کی آنکھوں نے بیت اللہ کا جلوہ دیکھا ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے وہ حاجی واجب الاحترام بن جاتا ہے تو دنیا میں ساری عظمتیں نسبت سے قائم ہوتی ہیں اور نسبت صورت اور حقیقت کی مطابقت کی وجہ سے قائم ہوتی ہے کہ یہ حقیقت اس صورت میں پائی جائے۔ لہٰذا یہ صورت بھی قابل احترام ہے۔

قرآن کریم اللہ کسی کے سینے میں اتار دے۔ اس حافظ کی بھی آپ قدر کرتے ہیں۔ حالانکہ حافظ گوشت پوست کا مجموعہ ہے۔ وہی گوشت پوست آپ کے اندر بھی موجود ہے۔ اس کی ذات میں کوئی عظمت نہیں مگر اللہ نے چونکہ اسکے قلب میں اپنا کلام اتار دیا ہے۔ کلام کی عظمت کی وجہ سے اس کی روح باعظمت ہوئی اور روح باعظمت ہونے کی وجہ سے اس کا بدن بھی باعظمت بن گیا۔ آپ لوگ اس کے ہاتھوں کو بھی چومتے ہیں۔

ظہورِ حقیقت کی علامت...... تو در حقیقت واجب التعظیم وہ حقیقت ہوتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کی پہچان کروانے کے لئے حق تعالیٰ ایک شکل بنا دیتے ہیں جو ذریعۂ تعارف بھی ہوتی ہے اور واجب الاحترام بھی ہوتی ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ جب کوئی حقیقت نمایاں ہونے کے قابل ہوتی ہے اسے کوئی شکل دے دی جاتی ہے۔

ایک بچہ ہے وہ بلوغ کے قریب پہنچ جائے تو وہ اعلان کرتا تھوڑا ہی پھرتا ہے کہ میں بالغ ہوگیا ہوں۔ مجھے بالغ سمجھو اور بلوغ کے احکام جاری کرو۔ البتہ اس کی شکل ایسی بنتی ہے کہ دیکھتے ہی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ بالغ ہوگیا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا ہو جاتا ہے۔ جان آنے لگتی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ اب یہ نکاح کے قابل ہے اس کا اب کہیں رشتہ ڈھونڈو۔ اب یہ بچہ نہیں رہا۔ یہ در حقیقت جوانی ہے جو روپ اختیار کرتی ہے۔ اس روپ کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے کہ اس میں بلوغ کی حقیقت آگئی ہے اور بلوغ کی حد کو پہنچ گیا۔ اب یہ اس درجے پر آگیا ہے کہ اگر اس کا نکاح کر دیا جائے تو اس کی نسل آگے چل سکتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے ایک طالب علم جو آپ کے ہاں آٹھ برس سے تعلیم پا رہا تھا وہ اب تک نابالغ تھا۔ اس نے میزان پڑھی، بلوغ کو نہیں پہنچا۔ شرح وقایہ تک پہنچا جب بھی بالغ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جب اس نے بخاری پڑھی۔ اب کہیں گے کہ یہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اب ایسا ہے کہ اگر اس کا کتاب سے رشتہ کر دیا جائے، تو اس کی علمی نسل شروع ہو جائے گی۔ اس کے شاگرد پیدا ہونے لگیں گے۔ روحانی ذریت پیدا ہونے لگے گی۔ اس لئے کہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اس کے لئے اللہ نے علامتیں رکھی ہیں۔

اسی طرح سے معنوی طور پر جب ایک طالب علم حد بلوغ وکمال کو پہنچے اس کی بزرگوں نے کچھ علامتیں رکھ دی ہیں۔ جس سے پہچانا جائے۔ مثلاً ایک علامت پگڑی باندھنا ہے۔ دستار بندی۔ یہ در حقیقت ایک اعلان ہے اور اس کی

علامت ہے کہ یہ اب علمی طور پر بالغ ہوگیا ہے ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اب اس کی روحانی طور پر ذریت واولاد پیدا ہوسکتی ہے۔بھئی! نکاح کرنے میں بھی آپ دو آدمی گواہ مقرر کرتے ہیں کہ نکاح ہوگیا۔اولاد جائز ہوگی۔اسی طرح اس بالغ طالب علم کے بارے میں سارے استاذ شہود بنتے ہیں کہ یہ بالغ ہے اب جسے یہ پڑھائے گا وہ اس سے علم حاصل کرے گا۔غلط راستہ پر نہیں جائے گا تو پگڑی دے دینا یا سند اس کے ہاتھ میں دے دینا یہ علامت ہے۔

حصولِ حقیقت کے ذرائع کا احترام..... مگر وہ طلباء جن کی دستار بندی ہوگی حد کمال پر پہنچنے کا یہ مطلب نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہوگئے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صلاحیت واستعداد پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کامل بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔اب استاذ اور کتاب کے محتاج نہیں رہے۔اس درجے کی قوت آ گئی ہے کہ اگر وہ مطالعہ شروع کریں، تبحر پیدا کریں، تفقہ سے کام لیں، تو ان کا علم آگے چلے گا تو دستار بند ہو کے طلباء یہ تصور نہ باندھیں کہ ہم اب کامل ہوگئے بلکہ یہ تصور باندھیں کہ استاذوں کی برکت سے صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، کہ اگر ہم کمال کے راستے طے کریں تو اب طے کرسکتے ہیں، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوگا کہ ہم استاذوں سے بالکل مستغنی ہوگئے بلکہ مرتے دم تک استاذوں کے محتاج رہیں گے، اس لئے کہ جتنا علم ان کا بڑھ گیا، ان کے استاذوں کا علم بھی بڑھ رہا ہے تو وہ اور زیادہ آگے بڑھ جائیں گے۔

مجھے اس پر ہمارے بھائی ادریس کا واقعہ یاد آیا۔آپ کے ہاں کے شیخ الحدیث مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، واقعی ایک مثالی عالم تھے۔متقی صاحب تقویٰ وطہارت، متبحر اور متفقہ، غرض جو عالم میں خصوصیات ہونی چاہئیں۔اللہ نے وہ سب عطاء کی تھیں اور وہ میرے بھائیوں میں بھی اور دوستوں میں سے بھی تھے اور ہم چونکہ ساتھ ہی پڑھے تھے۔ایک ہی جماعت میں تھے۔اس لئے ہماری آپس میں بے تکلفی بھی تھی۔ بہرحال ایک مثالی عالم تھے۔انہوں نے مسئلہ تقدیر پر ایک مضمون لکھا، جو منظوم ہے غالباً وہ چھپ بھی گیا ہے اور اس کے شروع میں میں نے کچھ مقدمہ بھی لکھا تھا، مولانا نے مسئلہ تقدیر کی شرح لکھی ہے۔اور اس کے شروع میں بطور مقدمے کے میں نے کچھ لکھا ہے۔یہ رسالہ لکھ کر وہ تھانہ بھون پہنچے اور ان کے ذہن میں یہ تخیل تھا کہ ایسی بدیہی چیزیں میں نے لکھی ہیں کہ ان میں کسی قیاس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔کھلی کھلی باتیں ہیں اور نصوص شرعیہ پیش کی ہیں۔اس پر کون نکتہ چینی کرسکتا ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر عرض کیا' حضرت! میں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔آپ اس پر ایک نگاہ ڈال دیں، کوئی تقریظ کا کلمہ لکھ دیں تا کہ یہ مستند بن جائے۔

حضرت نے فرمایا کہ بھئی! دوپہر کو قیلولہ کرنے کی عادت ہے تو لیٹ کر میں اسے دیکھ لوں گا کوئی بات ذہن میں آئی تو کچھ لکھ دوں گا۔یہ حضرت کے پاس وہ رسالہ چھوڑ کر چلے آئے۔حضرت نے دوپہر کو وہ سارا رسالہ دیکھا، ظہر کی نماز کے بعد جب جمع ہوئے تو حضرت مولانا ادریس صاحب بھی آئے۔حضرت نے فرمایا: مولوی

ادریس یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ انہوں نے کہا ''جی حضرت'' فرمایا: اول سے لے کر آخیر تک سارا غلط ہے۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ فرمایا کہ مواد سارا صحیح ہے اس لئے کہ آیات و روایات پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے جو لطائف نکالے گئے اور جو اس کا اسلوب بیان ہے اس میں غلطی کی ہے اور پھر اس پر اعتراضات کئے اور واقعی نا قابل حل اعتراضات تھے۔

ہمارے بھائی ادریس صاحب کو یہ بات نظر نہیں پڑی۔ اس پر حضرت نے ایک جملہ فرمایا۔'' بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے۔ علم تمہارا بہت وسیع ہے۔ ہمارا اتنا نہیں۔ مگر تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے تمہیں رجوع کرنا پڑے گا''۔ اس لئے کہ دس برس کتابیں دیکھ کر جس نتیجے پر پہنچو گے۔ بوڑھوں کے پاس آ کر منٹ بھر میں تمہیں چیز مل جائے گی۔ تو فرمایا: ''تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے''۔

غرض جن حضرات کی دستار بندی ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ اب انہیں کسی سے سروکار نہیں۔ وہ اب بھی اپنے اساتذہ کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ علم میں بڑھتے جائیں گے تو استاذ تو ان سے دس برس بڑا ہے۔ وہ بھی تو آگے بڑھتا جائے گا۔ یہ یہاں تک پہنچیں گے وہ اور دس گز آگے پہنچ جائے گا۔ اور علم کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ کسی مقام پر پہنچ جائے، پھر بھی آدمی علم کا محتاج رہتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، فرماتے ہیں کہ۔

كُلَّمَآ اَدَّبَنِیْ دَهْرٌ اَرَانِیْ نَقْصَ عَقْلِیْ   كُلَّمَآ اَزْدَادُ عِلْمًا اِزْدَدْتُّ عِلْمًا بِجَهْلِیْ

''جوں جوں زمانے نے مجھے علم سکھایا اور میرا شعور بڑھتا گیا اور مجھ پر میری جہالت واضح ہوتی گئی جس مقام پر میں پہنچا اور اس مقام کا علم ہوتا تو ہزاروں مقام نظر پڑتے جس سے معلوم ہوتا کہ ان سے ابھی تک جہالت تھی''۔ جب اس سے اگلے مقام پر پہنچے، تو اس سے آگے لامحدود مقامات ہیں جن کا علم نہیں تو اور جہالت کھلی کہ ابھی تو جاہل ہی جاہل ہیں۔ اس لئے کہ علم حق تعالیٰ کی صفت اور اس کا کمال ہے۔ اس کی ہر صفت لامحدود ہے۔ آدمی کتنا ہی بڑھ جائے جہالت پھر بھی رہے گی۔ اخلاق ربانی بلحاظ کمال کے لامحدود ہیں۔ آدمی کتنا ہی بااخلاق بن جائے پھر بھی وہ نیچا ہی رہے گا۔ اس لئے کہ مراتب اخلاق لامحدود ہیں۔

قرآنی حقائق کی اخروی شکلیں...... اسی واسطے حضرات صوفیاء کے ہاں صوفی کا لقب نامراد ہے۔ یہ ایسا وحشت ناک لقب رکھتے ہیں کہ وہ مبنی بر حقیقت تو ہوتا ہے مگر لفظ ڈراؤنا ہوتا ہے یعنی جسے ہم بامراد سمجھتے ہیں کہ یہ کامل و مکمل ہے یہ اس کا نام نامراد رکھتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب طریقت کبھی مراد کو پہنچتا ہی نہیں حق تعالیٰ کے مراتب کمال لامحدود ہیں، جس حد تک پہنچے گا محدود پہنچے گا۔ معلوم ہوگا آگے ابھی باقی ہیں۔ وہ کبھی مراد کی انتہا کو پہنچے گا ہی نہیں۔ جب رہے گا بیچ میں ہی رہے گا اس لئے انہوں نے لقب ہی نامراد رکھ دیا۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست   ہر چہ بردے مے رسی بروے مائیست

بے انتہا درگاہیں چلتے جاؤ، کوئی حد و نہایت نہیں حتی کہ جنت میں بھی آپ پہنچ جائیں گے۔ اور انشاء اللہ ضرور پہنچیں گے۔ وہاں بھی آپ بڑھتے ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی حد پر رک جائیں گے۔ اس لئے کہ جنت ظاہری و باطنی کمالات ربانی کے مقامات کھلنے کا نام ہے جیسا کہ ظاہری نعمتیں وہاں بے شمار ملیں گی۔ باطنی نعمتوں کی بھی وہاں کوئی حد و نہایت نہیں ہوگی۔ آدمی کا علم بڑھتا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو فرمایا جائے گا۔

''رَتِّلْ وَارْتَقِ'' تلاوت کرتا جا، ترقی کرتا جا۔ یعنی جتنی آیتیں ہیں۔ اتنے ہی قرآن کے مقامات ہیں اور ان مقامات کی اتنی لامحدود کیفیات ہیں۔ جس مقام پر پہنچو گے لامحدود نعمتیں اور کیفیات محسوس ہوں گی اور معلوم ہوگا اب تک کچھ ملا ہی نہیں تھا تو آگے لے لو۔ کبھی بھی حد کو نہیں پہنچو گے۔ حافظ کو فرمادیا جائے گا۔ جہاں تک تیری قوت ہے تلاوت کر اور ترقی کرتا جا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی جتنی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت کے درجات ہیں۔ جیسے دنیا میں ایک آیت لاکھوں علوم پر مشتمل ہے کہ جتنا اس کے سمندر میں غوطہ لگاؤ تہہ نہیں ملتی۔ علوم در علوم نکلتے چلے آتے ہیں ۔

حرف حرفش را اندر معنی معنی در معنی در معنی

جتنا کریدو گے علم کے نیچے علم ہے تہہ بہ تہہ علوم ہیں۔ آخر اللہ کا کلام ہے، معجزہ ہے۔ اسی طرح جب ایک آیت کے حقائق کھل کر وہاں کیفیات کی صورت میں نمایاں ہوں گے وہ بھی تہ بہ تہہ ہوں گے۔ ان کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔ گویا ایک ہی آیت کے علوم و کیفیات پاتے پاتے ہزاروں برس گزر جائیں گے۔ اسی کی لذت سے فارغ نہیں ہوگا۔ آگے کا مرتبہ جب آئے گا جب اس سے بھی فراغت نہ ہوگی۔ غرض بے انتہاء درجات و مراتب ہیں۔

اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ جنت میں جا کے مقامات انتہا کو نہیں پہنچیں گے۔ روز ترقی رہے گی اور یہی چیزیں جو آپ نے اللہ کی آیتیں پڑھی ہیں، انہی کے حقائق متمثل ہوں گے۔ شکل بدل بدل کر باغ و بہار کی صورت میں نعمت بن بن کر آپ کے سامنے آئے گی۔

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ ① ''دنیا میں جو عمل کرتے تھے، اس کو بعینہ یہی آپ کا عمل نعمت کے مختلف روپ اختیار کرے گا''۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' ② ''یہ سخاوت جنت میں ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی''۔

ظاہر میں آپ نے فقیر کے ہاتھ پر کچھ رکھا، داد و دہش کی۔ اس کی شکل درخت کی ہوگی اس لئے کہ جزا مطابق عمل ہوتی ہے۔ عملاً آپ نے فقیر کے سر پر سایہ کیا۔ اس کی بھوک کو دفع کیا، اس کی پریشانی کو دور کیا، اس کی سرپرستی کی۔ گویا فقیر کو آپ نے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ وہ بیچارہ مطمئن ہوگیا۔ اس عمل نے جنت میں جا کر ایک

---

① پارہ: ۱۵، سورة الكهف، الآية: ۴۹. ② الحديث اخرجه البيهقي في شعب الايمان، الرابع والسبعون من شعب الايمان وضعفه، ج: ۷ ص: ۴۳۴ رقم: ۱۰۸۷۵.

درخت کی شکل اختیار کی، تو درخت کے سایہ میں آپ آ گئے جیسے ایک فقیر کو آپ نے سایہ دیا تھا۔ اسے آپ نے پھل کھلایا تھا۔ جس سے وہ بیچارہ بچ گیا۔ وہ درخت آپ کو پھل دے گا۔ جس سے آپ کی زندگی بھی ترقی کرے گی۔ اس لئے آپ کا عمل درخت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ تو جیسے درخت سایہ بھی دیتا ہے، پھل بھی دیتا ہے، فرحت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی منافع سخی کو حاصل ہوں گے۔

کمال علمی کی علامات...... حاصل ساری بات کا یہ نکلا کہ جس طرح جوانی کچھ علامتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے روحانی مقامات اور اس کا حد کمال کو پہنچنا بھی کچھ علامات سے پہچانا جاتا ہے۔ جب علمی طور پر وہ بالغ ہوگا، اساتذہ شہادت دیں گے کہ یہ بالغ ہو گیا۔

اس کی علامت یہ ہے کہ سند اس کے ہاتھ میں دے دیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھ دیں کوئی نشان اس کے سامنے پیش کر دیں وہ ایک علامت ہوگی، جیسے جوان آدمی کے لئے داڑھی کا نکلنا، چہرے کا چوڑا چکا ہو جانا جوانی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر جیسے میں نے عرض کیا جو بھی کسی حقیقت کی علامت ہوگی اگر وہ حقیقت اچھی ہے تو وہ علامت بھی قابل تعظیم ہوگی۔ جیسا کہ آپ کو گلاب کی خوشبو محبوب ہے تو اس کی پنکھڑیاں بھی اتنی ہی محبوب ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ انہیں جوتوں سے روندیں۔ اگر خوشبو عزیز ہے تو اس کے پتے بھی عزیز ہوں گے۔ وہی تو خوشبو کا ظرف ہے۔ وہ اگر پامال ہو گیا تو خوشبو باقی کہاں رہے گی؟۔ تو علم کی خوشبو کی جس قسم کی علامات ہیں، جس پیکر میں چھپی ہوئی ہوں گی۔ اگر علم واجب التعظیم ہے تو وہ شخصیت بھی واجب التعظیم ہوگی۔ جو اس کو سند ملے گی وہ بھی واجب الاحترام ہوگی۔ اس کو پگڑی ملے گی وہ بھی واجب القدر ہوگی۔ وہ اس اندرونی حقیقت کی علامت ہوگی جس سے آپ کو نظر آ جائے گا کہ اندر علم و کمال ہے۔

اس واسطے کہ متکلم کی حقیقت اس کے کلام سے کھلتی ہے جیسا کلام سامنے آئے گا آپ سمجھ جائیں گے ایسا ہی متکلم بھی ہوگا۔ تو جیسی علامتیں سامنے آئیں گی آپ سمجھ لیں گے کہ ایسی ہی حقیقت اس کے اندر ہے، مثلاً علامت یہ سامنے آئی کہ سر پر دستار باندھی گئی، سند ہاتھ میں دی گئی۔ اساتذہ نے شہادت دی۔ یہ علامت ہوگی کہ واقعی اس میں کوئی اچھی حقیقت ہے، وہ حقیقت واجب الاحترام تو یہ علامتیں بھی واجب الاحترام۔

انتقال حقیقت کا اثر...... مجھے اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمایا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ: جس سال ہم نے دارالعلوم سے تعلیم پائی تو دورے میں کل چودہ لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب یہ دورے سے فارغ ہوئے تو اہل مدرسہ نے فیصلہ کیا کہ کوئی جلسہ دستار بندی کیا جائے۔ ان کو پگڑی باندھی جائے اور اعلان کیا جائے کہ یہ فارغ التحصیل ہیں۔ فرماتے تھے کہ ہم طلباء کو بڑی فکر پیدا ہوئی کہ بھئی! ہمارے اندر نہ کوئی لیاقت ہے نہ قابلیت ہے اور برسر مجمع ہمیں دستار دی جائے تو کہیں ہم، اپنے استاذوں کے بدنام کنندہ ثابت نہ ہوں؟ اس لئے کسی طرح سے اس جلسے کو رکوانا چاہئے۔ ہم اس

قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔

خیر کا زمانہ تھا، تواضع اور کسرِ نفسی طلباء میں بھری ہوئی تھی۔ فرماتے تھے کہ سب نے مجھے وکیل بنایا کہ تو جا کے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عرض کر جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ: میں چھتے کی مسجد میں حاضر ہوا اور حضرتؒ کے حجرے میں گیا تو کتاب دیکھ رہے تھے اور ہئیت یہ بتائی کہ اونچا تکیہ تھا اور اس پر کہنیاں ٹیک رکھی تھی اور ہاتھ پیشانی کے قریب تھے۔ کتاب میں محو تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ کے بعد حضرت مولاناؒ نے دیکھا تو میں نے سلام عرض کیا۔ جواب دے کر فرمایا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟

میں نے عرض کیا حضرت! یہ سننے میں آ رہا ہے کہ دستار بندی کا جلسہ ہوگا اور ہمیں پگڑی باندھی جائے گی۔ اگر یہ امر ہے تب تو ہم تعمیل کریں۔ آپ جو چاہیں ہمارے سر کے اوپر باندھ دیں لیکن اگر اس میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے تو اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ (کہ ہم سب کی یہ رائے ہے کہ) ہم نالائق اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔ ہم کہیں اپنے استادوں کے بدنام کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔ اس لئے اس جلسے کو روک دیا جائے۔

فرماتے تھے کہ: مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں جوشِ رحمت پیدا ہوا۔ پہلا جملہ تو یہ فرمایا کہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم ایسا سمجھو اور جب تک آدمی اپنے بڑوں کے سامنے ہوتا ہے یہی سمجھتا ہے کہ میں نالائق ہوں کسی قابل نہیں ہوں اور اسے سمجھنا بھی چاہئے۔ فرمایا یہ تمہاری سعادت ہے۔

اس کے بعد فرمایا باقی ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ "فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللّٰهِ" مطمئن ہو کے کر رہے ہیں۔ ہمیں تمہاری استعدادوں کے اوپر اعتماد ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ہمیں شرحِ صدر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہم نہ صرف پگڑی باندھیں گے بلکہ یہ بھی اعلان کریں گے کہ "جس فن میں جس کا جی چاہے، ان سے مناظرہ کرلے"۔ تو حضرتؒ فرماتے تھے کہ: حضرتؒ نے یہ جملے فرمائے کہ ہم فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللّٰهِ مطمئن ہو کر تمہیں دستار باندھ رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں انشراح ہے تمہاری استعدادیں ہیں اور ہم بھرے مجمع میں اعلان کریں گے کہ جس کا جی چاہے جس فن میں ان سے بحث کرلے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تو کانپ گیا کہ بھئی! آئے تھے نماز بخشوانے، یہاں روزے بھی گلے پڑ گئے، ہم تو آئے تھے کہ سند بھی نہ ملے، یہاں اعلان ہوگا کہ بحث بھی کرو، تو میں بہت سہم گیا، اس کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور جملہ فرمایا جو شفقت کا تھا، فرمایا: "تمہاری سعادت مندی ہے جو تم اپنے کو نااہل اور نالائق سمجھتے ہو باقی عام طور پر دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں جاؤ گے تم ہی تم ہو گے۔" فرماتے تھے کہ ہم نے یہی دیکھا کہ جہاں گئے ہم ہی ہم نظر آئے اور کسی کی دال گلتی ہم نے نہیں دیکھی یہ ان بزرگوں کے قول کا اثر تھا اور اس حقیقت کا جو ان کے ذریعے سے ان کے قلوب میں پہنچی۔

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ: جس کو دستار دی جائے، اس کا جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ بزرگوں کی طرف سے ایک عطیہ ہے، ہمارے لئے تبرک ہے مگر ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اس عطیہ کو ہم رکھ سکیں۔ شاید اس کی برکت سے

حق تعالیٰ ہمارے اندر کوئی پاکیزگی پیدا فرما دے۔

نقل پر حصول حقیقت......اس لئے کہ بعض دفعہ جب صورت اچھی ہوتی ہے۔ تو اچھی صورت میں بھی اچھی حقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے آجاتی ہے۔ جب اچھی ہیئت بنے گی اور امید ہے کہ اللہ کی طرف سے اچھی حقیقت بھی آجائے گی۔

آپ نے واقعہ سنا ہی ہوگا' حدیث شریف میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا مشہور واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک یا کسی اور غزوے سے جب واپس ہوئے تو مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) چند میل باقی رہ گیا۔ عادت شریف یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نہیں داخل ہوا کرتے تھے۔ سعی فرماتے تھے کہ دن میں داخل ہوں۔ اس لئے وہاں پڑاؤ ڈال دیا گیا تاکہ کل صبح کو مدینہ منورہ میں پہنچ جائیں چونکہ لشکر تھا۔ خیمے وغیرہ لگ گئے۔ تو نماز کے لئے اذان ہوئی۔ جب کوئی فوج یا لشکر جاتا ہے تو لشکر اور فوجیں دیکھنے کیلئے عموماً بچے جمع ہو جاتے ہیں۔ اب یہ صحابہ کا لشکر تھا اور اس زمانے میں عام شہرہ تھا کہ ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہے۔ یہ ان کا لشکر ہے تو دیکھنے کے لئے سینکڑوں بچے جمع ہو گئے جب اذان ہوئی تو بچوں نے اذان کی نقل اتارنی شروع کی اور ایک شور کی شکل بن گئی کیونکہ ہر بچہ جب اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے گا تو خود ہی شور ہو گیا اَللّٰهُ اَكْبَرُ کا بڑا شور مچا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر تشریف لائے۔ فرمایا یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! موذن اذان دے رہا ہے، بچے نقلیں اتار رہے ہیں۔ فرمایا: ان بچوں کو پکڑ کے لاؤ۔

حضرات صحابہؓ پکڑنے کے لئے دوڑے تو بچے بھاگ گئے۔ یہ ابو محذورہؓ نہ جوان تھے نہ بالکل بچے تھے، انہیں غیرت آئی کہ میں بھاگ جاؤں۔ یہ کھڑے ہو گئے۔ صحابہؓ نے انہیں پکڑ لیا اور لا کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے ذرا جرات سے کہا کہ اذان دے رہے تھے۔ فرمایا۔ اچھا دو اور نقل اتارو۔

انہوں نے ذرا دبے لفظوں میں کہا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، فرمایا' زور سے کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے زور سے کہا جیسے موذن اَللّٰهُ اَكْبَرُ پکارتا ہے۔ اس کے بعد حقیقت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید کا مسئلہ آیا۔ فرمایا آگے چلو۔ اب یہ ذرا جھجکے۔ اس لئے کہ توحید میں بھی ان لوگوں کو بہت سا کلام تھا۔ وہ شرک کے اندر مبتلا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نقل کیوں نہیں اتارتے؟ انہوں نے ذرا دبے اور گھٹے لفظوں میں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فرمایا آگے چلو۔ آگے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو ساری جھگڑے کی چیز تھی۔

اس لئے کہ توحید کے کسی نہ درجے کے مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ بالکل منکر نہیں تھے اور کہتے تھے کہ اللہ اور خالق تو ایک ہی ہے۔ اس نے اپنے نیچے بہت سے خدا بنا رکھے ہیں۔ انہیں اختیارات دے دیئے ہیں، کوئی روزی

دینے والا ہے، کوئی اولاد دینے والا ہے۔ اصل ایک ہی ہے اور اسی واسطے جب وہ حج میں جاتے تھے تو انکا تلبیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس میں ایسی ہی توحید کا اقرار تھا اور کہتے تھے "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ. لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ اِلَّاشَرِیْکًاھُوَلَکَ" "اے اللہ میں تیرے پاس حاضر ہوا تیرا کوئی شریک نہیں، ہاں شریک وہ ہے جو تو نے خود ہی اپنا شریک بنا رکھا ہے"۔ یعنی تو نے ہی معاذ اللہ جو شرک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ وہ شریک تو موجود ہے باقی از خود کوئی تیرا شریک نہیں ہوسکتا۔

تو کسی نہ کسی درجے میں توحید کو مانتے تھے۔ سارا جھگڑا رسالت کے اندر تھا اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تک تو بات بیت گئی۔ اب جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی باری آئی تو یہ بہت شپٹائے کہ کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نقل اتارو۔ جب نقل اتار رہے تھے، انہوں نے بہت دبے گھٹے لفظوں میں کہا "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا۔ یہاں تک کہ اذان پوری ہوگئی۔ فرمایا' جاؤ!۔ عرض کیا، حضور! اب جاؤں کہاں؟ میں تو اب غلام بن چکا!

وہ توحید و رسالت جو زبان سے ادا کی۔ وہی صورت وہی آواز دل میں اثر کر گئی۔ توحید بھی دل میں اتر گئی۔ نبوت کی عظمت بھی دل میں اتر گئی۔ تو عرض کیا اب میں کہاں جاؤں۔ میں تو غلام ہو چکا ہوں۔ میرا تو دل مسلمان ہو چکا۔ زبان سے میں نے توحید و رسالت کا اعلان کر دیا۔ زبان نے جس چیز کا اعلان کیا تھا، وہی دل میں اثر کر گئی۔ اچھی صورت بنی تھی تو اس میں حقیقت بھی اچھی پیدا ہوگئی۔ تو آدمی اچھی صورت بنالے تو حق تعالیٰ اس میں حقیقت حسنہ ڈال دیتے ہیں۔

ظاہری وضع کا باطن پر اثر...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے ظاہری روپ، ظاہری وضع قطع، اس کی تہذیب پر توجہ دلائی ہے کہ جیسی تم ظاہری وضع اختیار کرو گے، باطن بھی تمہارا ویسا بن جائے گا۔ فرض کر لیجئے کوئی شخص پہلوانوں کا سا لباس پہننے لگے، لنگوٹ باندھ کر میدان میں آجائے۔ طبعاً اس کا دل چاہے گا کہ پنجہ کشی کرے، ڈنڈ پیلے، مقابلے ہوں اور کشتی ہو۔ طبعاً ادھر جذبات مائل ہو جائیں گے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص زنانہ لباس پہن لے۔ چوڑیاں بھی پہن لے، رنگین کپڑے پہن لے، چند دن کے بعد جذبات میں نسوانیت آجائے گی، اس کا جی چاہے گا کہ بولے بھی عورتوں کی طرح اور لب و لہجہ بھی وہی اختیار کرے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اگر ایک شخص علماء کی وضع اختیار کرے طبعی طور پر ورع و تقویٰ کی طرف توجہ ہوگی چاہے ظاہرداری میں ہو کہ میاں مولویانہ لباس پہن رکھا ہے۔ اس میں اگر کوئی بری حرکت کی۔ لوگ کیا کہیں گے۔؟ اس لباس میں رہ کر یہ حرکت؟ تو خواہ مخواہ طبیعت مائل ہوتی ہے کہ کوئی متقیانہ افعال سرزد ہوں۔ یا اہل اللہ اور درویشوں جیسا لباس پہن لے۔ تو قدرۃً اس میں زہد و قناعت کے جذبات پیدا ہوں گے غرض ہر وضع قطع باطن پر موثر ہوتی ہے۔ جیسی ہیئت بنالو گے ویسی

حقیقت بن جاتی ہے۔اس لئے شریعت نے زور دیا ہے کہ ہیئت بناؤ تو اہل اللہ جیسی بناؤ۔انبیاء علیہم السلام کی ہیئت بناؤ۔صحابہ کرامؓ اور علماء ربانی کی ہیئت بناؤ۔اس ہیئت میں اچھی حقیقت ڈال دیتے ہیں۔چاہے ظاہر داری کے لئے ہی بناؤ مگر بیکار نہیں ثابت ہوتی۔غرض ظاہری قول،ظاہری ہیئت ایسی مت اختیار کرو کہ تمہارا باطن بگڑ جائے۔

قول وفعل کا اثر......مثلاً زمانہ جاہلیت میں یہ رسم پڑی ہوئی تھی کہ اس طرح سے اگر کسی نے انگلی دکھلا دی تو تلواریں نکل جاتی تھیں جیسے ہمارے آپ کے ملک میں کہتے ہیں کہ کسی کو ٹھینگا دکھا دینا، کسی کو انگوٹھا دکھا دیا وہ لڑ پڑے گا۔یہ چڑانے کی علامت ہے۔زمانہ جاہلیت میں چڑانے کی یہ علامت تھی۔اس طرح انگلی دکھائی اور تلواریں نکلیں۔اس لئے اس انگلی کا نام سَبَّابَہ یعنی گالم گلوچ کی انگلی تھا۔جہاں اٹھی اور لڑائی شروع ہوتی۔

شریعت اسلام نے اس کی ہیئت کو بدلا۔اس کے محل کو بدلا کہ انگلی اٹھائی جائے مگر کہاں؟ شہادت اور توحید کے واسطے التحیات کے اندر اٹھائی جائے اور اس کا نام رکھا سَبَّاحَہ، یعنی اللہ کی پاکی بیان کرنے والی انگلی۔فرمایا سَبَّابَہ مت کہو، ورنہ وہی لغوی معنی یاد آئیں گے جو زمانہ جاہلیت کے تھے۔سَبَّاحَہ کہو۔جب لفظ اچھا بولو گے، حقیقت بھی اندر اچھی آ جائے گی۔

تجارت کرنے والے کو قرآن کریم نے تاجر کہا ہے۔اور زمانہ جاہلیت میں خنسار کہتے تھے۔تو ارشاد فرمایا گیا کہ۔خنسار مت کہو۔تاجر کہو، یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ: "لَا تَقُوْلُوْا خِنْسَارًا وَقُوْلُوْا تَاجِرًا." خنسار مت کہو، جاہلیت کی لغت ہے۔جب وہ بولو گے تو تمہاری طبیعت خواہ مخواہ جاہلیت کی طرف جائے گی، اس لئے وہی لفظ بولو، جو اللہ نے اختیار کیا ہے تا کہ ذہن جائے تو قرآن کی طرف اور حقائق الٰہیہ کی طرف جائے۔غرض ہر چیز میں ہیئت ہو۔لفظ یا قول ہو اچھی صورت اختیار کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تاثیر نہ ہو۔ہر چیز میں اللہ نے اثر دیا ہے۔کھانے پینے کی چیزوں میں اثر ہے، جیسا دانہ کھائیں گے ویسا اثر ظاہر ہوگا۔جیسا پھل کھائیں ویسا اثر ظاہر ہوگا۔ہر چیز میں تاثیر ہے۔اور فقط اشیاء ہی میں تاثیر نہیں۔آپ کے بدن میں بھی تاثیر ہے، آپ کی ہر ہیئت میں تاثیر ہے۔آپ اگر کسی کو منہ اچھا کر کے دکھلائیں، ممنون ہوگا اور اگر کسی بری ہیئت سے دکھلائیں۔جبھی لڑائی ہو جائے گی، معلوم ہوتا ہے ہیئت میں ممنون کرنے کا اثر بھی ہے اور غیض وغضب میں لانے کا بھی۔اسی طرح آپ کی آنکھ بھی موثر ہے۔اگر آپ نیچی نگاہ کر کے بات کریں، محبت پیدا ہوگی اور اگر آنکھ اٹھا کے گھور کے گفتگو کریں تو غیض وغضب پیدا ہوگا۔معلوم ہوتا ہے آنکھ خاموش ہے۔مگر خاموشی کے ساتھ بولتی ہے۔بعض دفعہ غیض اور بعض دفعہ محبت پیدا کر دیتی ہے۔

لباس کی وضع قطع میں اثر ہے جیسی وضع ہوگی ویسی تاثیرات قلب کے اوپر پڑیں گی۔چہرے مہرے کی جیسی ہیئت بنائیں گے، ویسے قلب کے اوپر اثرات پڑیں گے۔جب ہر چیز میں اثر ہے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اوضاع کے اندر اور ہیئت کے اندر اثر نہ ہو۔شریعت نے تہذیب سکھلائی کہ قول بھی ایسا مت کہو جو بھدا ہو جس سے دو معنی

کی طرف دھیان جائے۔ ہیئت بھی ایسی مت بناؤ جس سے کوئی برائی پیدا ہو۔ ہیئت، قول اور نظر بھی اچھی رکھو۔

اس لئے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ ① "چال میں میانہ روی اختیار کرو"، ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے چلو گے، تکبرانہ چال ہو جائے گی، بہت جھک کے چلو گے بیماروں کی چال بن جائے گی۔ درمیانی چال رکھو اس میں تواضع اور انکساری بھی ہو اور ساتھ میں قوت بھی ہو، نہ تمہیں بیمار سمجھا جائے نہ متکبر سمجھا جائے اس لئے کہ چال کا بھی اثر پڑتا ہے۔ اور فرمایا ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ ② "آواز میں ذرا پستی اختیار کرو"۔ بہت زیادہ چلا کے بولنا جس سے دوسرا سمجھے کہ اس نے مجھے بہرہ سمجھا، جب ایک اچھے بھلے آدمی کو آپ خواہ مخواہ بہرہ بنا دیں گے، اسے غصہ ہی آئے گا، پھر زیادہ تلخ آواز کانوں کو بھی ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ بقدر ضرورت آواز بلند کرے، اعتدال کے ساتھ گفتگو کرے۔ تو پوری طرح مہذب بنو۔ ہاتھ پاؤں زبان اور ہیئت میں اعتدال رکھو۔ کہیں ارشاد فرمایا:

ایمان کا اثر....... "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ③ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔ وہ کیا مسلمان ہے کہ گالم گلوچ کرتا آ رہا ہے۔ دوسرے کا دل دکھاتا ہوا آ رہا ہے، چاہے آپ اسے اسلام سے خارج نہ کریں۔ مگر حقیقی معنیٰ میں کوئی کمال تھوڑا ہی ہے؟ بڑا مسلم حقیقت میں وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں اور کہیں فرمایا: "اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَدِمَآئِهِمْ" ④ "مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جانوں، اموال اور آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں"۔ لاکھوں روپے چھوڑ کر چلے جائیں کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کر سکتا۔ بہو بیٹی کو چھوڑ کر اطمینان ہو کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کرے گا۔ اور یہاں لفظ جو فرمایا وہ یہ نہیں کہ: "مَنْ اَمِنَهُ الْمُؤْمِنُوْنَ" اس سے مسلمان مطمئن ہوں، بلکہ فرمایا مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ لوگ اس سے مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے خائن نہیں۔ غیر مسلم بھی اطمینان کا اظہار کریں کہ واقعی یہ ایماندار آدمی ہے۔ تو مومن تو وہ ہے۔

اگر مومن اور مسلم ایسا ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہوں کہ بھئی! ذرا بچ کے چلو۔ کہیں جیب نہ کترے، کہیں گالی نہ دیدے، کہیں دل نہ دکھا دے، مومن کیا، یہ تو اچھا خاصا بیل ہو گیا۔ اس لئے کہ بیل جب چلتا ہے تو لوگ بچ کے چلتے ہیں کہ بھئی! جانور ہے کہیں لات نہ مار دے، دم نہ مار دے، پیشاب نہ کر دے، چھینٹ نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی اسی طرح بچ کے چلیں کہ کہیں گالی نہ دے دے، جیب نہ کتر لے، چھری نہ مار دے، یہ مومن کیا یہ تو اچھا خاصا بیل ہے مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے مطمئن ہوں کہ جان بھی محفوظ ہے، آبرو بھی اس سے محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ مومن ہے جب تک لوگوں کو اتنا اطمینان نہ ہو وہ آدمی سچا مومن ہے؟

---

① ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱۔ ④ الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰۔

کردار واخلاق کے اثرات ...... یہ ایمان لے کر اگر آپ غیر مسلموں کے سامنے جائیں گے۔ان کی گردنیں جھکیں گی۔اسلام اسی طرح پھیلا ہے،دباؤ سے نہیں پھیلا۔کردار واخلاق اور معاملات کی سچائی،اور خیر خواہی خلق اللہ سے اسلام پھیلا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جہاں ان اوصاف کو لے کے پہنچے لوگوں کی گردنیں جھک گئیں،سندھ میں جب حضرات صحابہؓ داخل ہوئے تو مورخین لکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کے مسلمان ہوئے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔یہ سچوں کے چہرے ہیں۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ بھی مبلغ ہے۔اس کی وضع قطع بھی مبلغ ہے اور اس کی ہر حرکت مبلغ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم غور کریں تو ہم خود اسلام کی تبلیغ میں حائل ہیں۔غیر مسلم ہمیں اور آپ کو دیکھ کر، ہماری حرکات کو دیکھ کر اسلام سے رک گئے ہیں۔اگر سو میں سے دس پانچ آدمی پاکیزہ اخلاق کے نکل آئیں اسے قوم کی پاکیزگی نہیں کہتے کم سے کم اکثریت تو ہو۔حالات یہ ہیں کہ ہمارے افعال بھی منکر،ہیئتیں بھی منکر، بیسیوں خرافات بھری ہوئی ہیں۔تو غیر مسلموں تک اسلام کو پہنچانے میں اپنے افعال سے ہم خود حائل بنے ہوئے ہیں وہ ہمارے دین کو کتابوں سے نہیں،افعال سے دیکھتے ہیں۔ہماری حرکتیں بری دیکھیں گے،کہیں گے ان کا دین بھی ویسا ہی ہے، ہماری حرکتیں صحیح ہوں۔کہیں گے،واقعی ان کا دین اچھا ہے۔بہر حال ہمیں اور آپ کو سنبھلنے کی ضرورت ہے۔ہم ایسے ہوں کہ محض زبان سے تبلیغ نہ کریں بلکہ ہمارا چہرہ مہرہ دیکھ کر لوگ کہیں واقعی مسلمان آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں دیو بند کے قریب مظفر نگر میں آریوں سے مسلمانوں کا مناظرہ ہوا۔اس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے گئے۔یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی جوانی کا زمانہ تھا۔تھوڑی تھوڑی داڑھی آئی ہوئی تھی۔بالکل ابتدائی دور تھا۔حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وجیہ بھی تھے اور حسین وجمیل بھی تھے۔اکثر سبز پگڑی باندھا کرتے تھے۔غرض حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی دلکش صورت تھی۔حضرت شاہ صاحبؒ اس مناظرے میں گئے کیونکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے استاذ بھی پہنچے ہوئے تھے۔اس موقع پر آریہ مبلغ نے کہا کہ:"اگر کسی کی صورت کو دیکھ کر اسلام قبول کیا جا سکتا۔تو میں مولوی انور شاہ کی صورت کو دیکھ کر ابھی اسلام قبول کر لیتا۔اس کا چہرہ بتلاتا ہے کہ اسلام یہ ہے"۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ خود مبلغ ہوتا ہے۔غرض شریعت اسلام نے ہیئتوں کی تہذیب اور ان کو درست کرنے کی تاکید کی ہے۔کیونکہ ہیئت سے سارا کام چلتا ہے۔

لباس کا اثر ...... جب فوجیں آپس میں ملتی ہیں تو فوج کا سپاہی اپنی وردی سے پہچانا جاتا ہے جو اس کا یونیفارم ہوتا ہے اس سے شناخت ہوتی ہے۔اگر کوئی اپنا سپاہی دشمن کی وردی پہن کے آجائے یقیناً اسے گولی ماردیں گے بعد میں چاہے افسوس کریں کہ بھئی! یہ تو اپنی فوج کا تھا۔معلوم ہوا سارا دارومدار یونیفارم اور وردی ہوتا ہے۔آپ سب اللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔اگر دشمن کی ہیئت میں آئیں گے تو ڈر ہے کہیں گولی نہ ماردی جائے۔اپنی ہیئت میں آنا چاہئے

تا کہ اپنی فوج کا سپاہی سمجھا جائے تو ہیئتوں کی اصلاح، ظاہری تہذیب اس کی طرف شریعت نے بہت توجہ فرمائی۔

میں اس لئے یہ عرض کر رہا تھا کہ ان طالبعلموں کو جنہیں دستار دی جائے گی انکی ہیئت ایسی ہوگی کہ ہاتھ میں سند ہے۔ سر پر پگڑی ہے دل میں علم بھرا ہوا ہے۔ مجموعے سے سمجھا جائے گا یہ ماشاء اللہ فارغ التحصیل ہو گئے۔ مگر ان کا فرض ہے کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ ہم کامل مکمل ہو گئے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا ہے۔ اب تکمیل کا راستہ شروع ہوا ہے۔ اگر چاہیں تو مکمل ہو سکتے ہیں۔ فی الحال ہماری ابتداء تھی۔ اساتذہ کو انکی استعداد کی شہادت دینی ہے کہ ان کے دل میں طلب پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہ چاہیں تو مکمل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک خوشی کا وقت ہوگا کہ ہم اپنے طلباء کو دستار باندھیں گے کہ قوم میں الحمد للہ ایسے نوجوان پیدا ہوئے جو کل کو علم سکھلائیں گے، ان کی علمی ذریت قائم ہوگی۔

علم کے اثرات......اور ظاہر بات ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے کہ ساری دنیا اس کی قدر کرتی ہے۔ کوئی بڑا ہی کندہ ناتراش ہوگا جو علم کی قدر نہ کرے۔ اس لئے کہ علم نہ ہندی ہے نہ سندھی۔ نہ افریقی نہ امریکی۔ نہ ایشیائی نہ یورپین۔ بلکہ سارے انسانوں کی ایک متاع مشترک ہے۔ اس لئے ہر انسان علم کی طرف جھکتا ہے۔ علم میں زندگی و نسل اور وطن کا تعصب نہیں آتا وہ سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی لئے طلباء کے تبادلے ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہوتے ہیں۔ علم سیکھنے کے لئے یورپ والے آپ کے یہاں آ رہے ہیں۔ آپ کے طلباء یورپ جا رہے ہیں۔

علم کوئی سا بھی ہو، انسان کا ایک طبعی مرغوب ہے۔ اس میں یہ قید نہیں کہ بھئی! یہ ہندوستان والوں کا علم ہے۔ ہمیں اس سے بچنا چاہئے۔ علم میں پاکستانی ہندوستانی کی تقسیم ہے ہی نہیں۔ وہ تقسیم سے بالاتر ہے۔ لہٰذا سب جھکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہماری صفت نہیں ہے اگر ہماری صفت ہوتی اس میں تعصب ہوتا۔ یہ ہمارے خدا کی صفت ہے اور حق تعالیٰ ان ساری حدبندیوں سے بالا ہیں۔ ان کی صفت پر جب آپ آئیں گے تو اتحاد پیدا ہوگا۔

میرا افریقہ جانا ہوا تھا۔ افریقہ یونیورسٹی جوہانسبرگ میں ہے۔ اس میں ایک تعلیمی اجتماع ہو رہا تھا۔ اور سارے یورپین جمع تھے۔ کوئی چھ سات ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ وہاں کالے گورے کی بڑی تفریق ہے۔ کالوں کی گاڑیاں الگ، گوروں کی الگ دکانیں، اسٹیشن پر کالوں کا حصہ الگ، گوروں کا الگ غرض رنگ کے لحاظ سے بڑا تعصب وہاں پھیلا ہوا ہے۔ تو ہم یونیورسٹی دیکھنے کے لئے گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک بین الملکی تعلیمی اجتماع ہو رہا ہے۔ اس میں سارے ملک کے نمائندے جمع ہیں۔ ہم نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں پھر کسی وقت آ کے دیکھیں گے تو دو لڑکیاں کسی صوبے سے نمائندے کے طور پر آ رہی تھیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ یہ راستہ بھول گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اوپر جانا چاہتے ہیں تو آیئے ہمارے ساتھ چلئے، ہم بھی ساتھ ہو لئے۔ اوپر جا کے دیکھا تو بڑا عجیب اجتماع۔ اس میں چھ سات ہزار گورے مرد بھی عورتیں بھی جمع ہیں۔ اور اس طرح سے اسٹیج قائم جیسے پارلیمنٹوں میں ہوتا ہے کہ اوپر کی اسٹیج پہ تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ صدر نائب صدر اور سیکرٹری۔ اس کے بعد نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر پانچ افراد تھے۔ اس

سے نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر سات افراد تھے، جیسے پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس انداز کا تھا۔ ہم پیچھے کرسیوں پر دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ تو ایک نمائندے نے یہ سمجھ کر کہ یہ وضع قطع سے دوسرے ملک کے معلوم ہوتے ہیں، ہمارے میزبانوں سے پوچھا کہ یہ یہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں، ہندوستان سے آئے ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا دارالعلوم دیوبند کے۔ انہوں نے کہا۔ دارالعلوم دیوبند کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا ایک مذہبی یونیورسٹی ہے اور یہ اس کے چانسلر ہیں۔ تو اس لڑکی کو بھی قدر ہوئی کہ اچھا یہ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس نے کہا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر میں (ان کی آمد کی) صدر کو اطلاع دوں؟ انہوں نے کہا دے دیجئے۔ اب میں تو کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ انگریزی میں بات چیت ہو رہی تھی۔ خیر اس نے صدر کو اطلاع دی۔ اس نے کھڑے ہو کے کہا کہ ہمارا تعلیمی جلسہ ہے۔ اور حسن اتفاق دیکھئے کہ ہندوستان کا ایک شخص جو وہاں کے تعلیمی ادارے کا ذمہ دار ہے۔ وہ موجود ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں اسے اسٹیج پہ بلاؤں؟

ساری پبلک نے کہا کہ ضرور بلایئے، اب وہاں سے ایک آدمی پہنچا، اب یہ قوم کی شائستگی کی بات ہے کہ جوں ہی میں اٹھا، تو پورا جلسہ کھڑا ہو گیا۔ اور تالیاں بجانی شروع کیں، اپنی دانست میں گویا تبریک و تہنیت پیش کی جب تک میں اسٹیج پر نہیں پہنچ گیا برابر تالیاں بجتی رہیں۔ اسٹیج پر جب پہنچے تو اوپر تین کرسیاں تھیں۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری۔ سیکرٹری عورت تھی اور وہ بیچ میں تھی صدر نائب صدر اِدھر اُدھر تھے۔ میرے پہنچتے ہی اس (سیکرٹری) عورت نے کرسی چھوڑ دی۔ مجھے بٹھلا دیا۔ خود پشت پہ کھڑی ہوگئی۔ تو خیر میں نے کہا گورا ہٹا، کالے نے قبضہ کیا۔ میں اب تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ محض تکریماً اور اعزازاً ایسا کیا۔ لیکن صدر نے اعلان کیا کہ: یہ ہندوستان کی یونیورسٹی کے ذمہ دار ہیں۔ آپ اجازت دیں، تو میں انہیں تقریر کے لئے کہوں؟ پبلک نے کہا ضرور کہنا چاہئے۔

اب اس نے تقریر کی درخواست کی تب میں سمجھا کہ یہ مقصد تھا۔ میں محض اعزاز ہی سمجھ رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھے کہا کچھ بیان کیجئے۔ وہ جو وہاں میں نے جملے کہے کہ وہ مجھے سنانے تھے جس کے لئے یہ تمہید تھی جو میں نے یہ واقعہ سنایا، وہاں چونکہ کالے گورے کی تفریق ہے۔ تو پہلے میں نے کھڑے ہو کر حکومت کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں آنے کی اجازت دی اور پبلک کا کہ اس نے قبول کیا، پھر جلسے والوں کا کہ انہوں نے ہمیں یہاں آنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ "آپ نے اس پر غور کیا کہ کالے اور گورے مل کر اس وقت ایک جگہ جمع ہیں۔ تو کس چیز نے ہمیں جمع کیا؟ یہ سوال میں نے کھڑا کیا۔"

اگر آپ کہیں کہ رنگ نے جمع کیا تو میرا رنگ اور آپ کا رنگ اور ہے۔ رنگ کے معنی ہی حد بندی اور قطع و انقطاع کے ہیں۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا۔ جو گورا ہے وہ کالا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمیشہ الگ ہی الگ رہیں گے۔ تو رنگوں کے ملنے کا بھی کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح میں نے کہا: مجھے اور آپ کو وطن نے بھی جمع نہیں کیا۔ آپ کا وطن افریقہ ہے میرا وطن ہندوستان ہے اور وطن کے معنی ہی حد بندی کے ہیں کہ افریقہ ہندوستان، اور ہندوستان افریقہ

نہیں بن سکتا۔تو ہم الگ ہی رہیں گے۔

اور میں نے کہا نسل نے بھی ہمیں جمع نہیں کیا میری نسل اور ہے اور آپ کی نسل اور ہے، نسل کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو ایک خاندان کا ہے وہ دوسرے خاندان کا نہیں بن سکتا، ہمیشہ انقطاع رہے گا۔ پھر آخر ہمیں کس چیز نے جمع کیا؟ اور میں نے کہا کہ جمع بھی اس طرح کہ آپ اور ہم صرف کندھا ہی ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ دل بھی ہمارے ملے ہوئے ہیں، ہر ایک کے دل میں دوسرے کی جگہ، یہ کس چیز نے جمع کیا؟ میں نے کہا درحقیقت ہمیں علم نے جمع کیا ہے نہ کہ رنگ، نسل اور وطن نے جمع کیا، اور علم نے کیوں جمع کیا؟ اس لئے کہ وہ ہماری صفت نہیں ہے۔ اگر وہ ہماری صفت ہوتی تو میرا علم اور ہوتا، اس کا علم اور ہوتا، آپ کا علم اور ہوتا۔ وہ بھی تفریق کا ذریعہ بنتا علم اللہ کی صفت ہے میری اور آپ کی نہیں ہے میں نے کہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی صفات پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے جب تک انہیں چھوڑ کر کوئی خدا کی صفت اختیار نہ کریں جامعیت کی شان اسی کے اندر ہے اور میں نے کہا کہ:

جب اللہ کی صفت میں جمع کرنے کی شان ہے۔ تو اگر کوئی ذات تک پہنچے۔ اس کو سامنے رکھے۔ پھر انسان ہی نہیں حیوان غیر حیوان سب جمع ہو جائیں گے۔ سب کا خالق وہی ہے۔ سب کی اصل ایک ہے۔ اس لئے جمع کرنے کی شان اللہ کی ذات وصفات ہی میں ہے۔ انسان کی ذات وصفات میں جمع کرنے اور جمع ہونے کی شان نہیں ہے۔ جب تک ہم اپنی صفات کو چھوڑ کر خدائی صفات اختیار نہیں کریں گے۔ ہم میں اتحاد نہیں قائم ہوگا۔ تو ذریعۂ اتحاد اللہ کی ذات وصفات ہیں۔ اور ذات وصفات اسلام بتاتا ہے۔ تو اسلام جمع ہونے کا ذریعہ ہے اور کوئی چیز جمع کرنیوالی نہیں ہے۔ یہ ایک بات بیچ میں یاد آ گئی تھی۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان طلباء کو جنہیں دستار دی جائے گی کہ یہ ایک ظاہری ہیئت ہے اور اس ظاہری ہیئت کے ذریعے سے وہ پہچانے جائیں گے کہ اللہ نے اتنی قابلیت عطاء کی تو انہیں غرہ نہیں کرنا چاہئے اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اب یہ ہم سے مستغنی ہو گئے۔ کتنا بھی زمانہ گزر جائے۔ وہ آپ کے شاگرد ہی رہیں گے اور بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

بہر حال یہ مبارک ساعت ہے کہ جس میں جامعہ کے سات آٹھ سال کا نچوڑ آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے گا کہ اتنے افراد ہم نے تیار کئے اور اتنوں کو اس قابل بنایا کہ یہ آگے دوسروں کو ہدایت ونصیحت کر سکیں۔

نسبت کا اثر......اب یہ آپ حضرات کا فرض ہوگا کہ اپنی اعانت سے اپنے چندوں سے آپ نے جن کو تیار کیا، آپ خود ان کی قدر کریں۔ آپ کو بھی قدر کرنی پڑے گی۔ جیسے بیت اللہ کا غلاف آپ ہی اپنے ہاتھوں بناتے ہیں۔ لیکن بن کر جب وہ بیت اللہ پر لٹک جاتا ہے تو آپ ہی اسے چومتے ہیں اور پیشانی پر لگاتے ہیں کہ اسے نسبت پیدا ہو گئی۔ ان بچوں کو آپ ہی نے پڑھایا ہے اور پگڑی بھی آپ ہی نے دی۔ لیکن آپ کے لئے ان کی قدر کرنی واجب ہو گئی۔ چونکہ نسبت پیدا ہو گئی۔ اس لئے آپ کو بھی علم کے آگے جھکنا پڑے گا۔

آپ اگر کسی عالم کے آگے جھکتے ہیں تو اس کے گوشت پوست کی وجہ سے نہیں۔ جیسا گوشت پوست اس میں ہے آپ میں بھی ہے، اس علم کی وجہ سے جھکتے ہیں جو اس کے اندر ہے۔ تو یہی علم ان طلباء میں بھی ہے جس حد تک بھی اللہ نے ان کو علم دیا ہے اور قابلیت دی ہے، وہ ایسی ہے کہ آپ پر تعظیم کرنا واجب ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ ایک باپ بے پڑھا لکھا ہے۔ اس نے بچے کو پڑھا دیا۔ جب اسٹیج بنے گا، اسٹیج پر بچہ بیٹھے گا اور باپ نیچے۔ وہ علم ہی ہے جس نے اسے اونچا بنا دیا اور جس کے پاس علم نہیں وہ نیچا رہ گیا۔ کیونکہ علم خود ذاتی طور پر رفعت کی چیز ہے وہ اللہ کی صفت ہے۔ علم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہتا۔ اس لئے عالم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہے گا اگر واقع میں عالم ہے۔ علم میں طبعی طور پر ترفع اور بلندی کی شان ہے۔

طریق منزل مقصود..... مگر اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی میں کہیں تکبر نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس کا بدرقہ عبدیت ہے کہ علم کے ساتھ جب تک عبدیت جمع نہیں ہوگی تو تکبر اور نخوت اس سے الگ نہیں ہو سکتا اور عبدیت یہ ہے کہ کسی مرد کامل کے سامنے آدمی پامال بنے ؎

قال را بگذار مرد حال شو ــــــ پیش مرد کاملے پامال شو

تو عالم اگر کسی کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرائے تو علم اس کے لئے اور زیادہ تباہی اور وبال کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے وہ تکبر و نخوت پیدا کرے گا۔ لڑائی جھگڑے پیدا کرے گا۔ جو عالم تربیت یافتہ نہیں ہوگا، اخلاق صحیح نہیں ہوں گے۔ عموماً فسادات اور جھگڑے کا باعث بنے گا۔ جب تک اپنے اخلاق کو پامال کر کے ان کو بلند نہ کرلے، حرص کی بجائے قناعت نہ ہو، کبر کی بجائے تواضع نہ ہو، بخل کے بجائے سخاوت نہ ہو۔ غرض جب تک اخلاق فاضلہ نہ جمع ہوں علم کی قدر نہیں کھل سکتی نہ علم کام دے سکتا ہے جب تک اخلاق صحیح نہ ہوں۔ تو محض علم سے آدمی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا۔

اس لئے مدارس میں دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے ایک تعلیم کی جس سے علم پہنچے اور ایک تربیت کی جس سے اخلاق درست ہوں۔ اگر تعلیم محض رہ گئی۔ علم آ جائے گا، اخلاق نہیں آئیں گے وہ وبال جان بن جائے گا۔ اگر اخلاق درست ہو گئے علم نہ آیا تو جاہلانہ افعال سرزد ہوں گے۔ اس سے منکرات و بدعات سرزد ہوں گی، دونوں صورتیں تباہی کی ہیں۔ تو علم اور اخلاق جب تک جمع نہ ہوں کام چلنے والا نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ نے اپنے مقدمہ میں کچھ اشعار لکھے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ ؎

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ ــــــ وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ ــــــ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكٌ

’’وہ عالم دنیا میں فساد کبیر ہے جو دوسروں کی ہتک چاہے۔ کبر و نخوت میں بھرا ہوا ہو دوسروں کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو۔ وہ عالم میں عظیم فساد ہے اور اس سے بھی زیادہ فساد ہے اس عابد میں جو جہالت کے ساتھ عبادت

کررہا ہے۔ وہ رات دن بدعات و منکرات میں مبتلا ہوگا۔"

گویا امت کے فساد کے دو دھڑے ہیں۔ ایک جاہل مولوی ایک جاہل صوفی ایک وہ عالم ہے کہ علم ہے مگر اخلاق نہیں۔ ایک وہ عابد کہ عبادت ہے مگر علم نہیں۔ دونوں چیزیں جمع ہوں جب جاکے وہ مصلح ثابت ہوگا۔

تو کہتے ہیں۔

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

"یہ دونوں قسم کے لوگ دنیا کے لئے فتنہ ہیں جو بھی دین کے بارے میں ان سے تمسک کرے گا۔ وہ فتنہ میں گرفتار ہوگا"۔ وہ عالم ربانی جس کا علم بھی صحیح، اخلاق بھی صحیح، سیرت بھی پاکیزہ ہو۔ وہ اصلاح کا ذریعہ بنے گا۔ وہ صحیح راستہ دکھلائے گا۔ اسی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

یہ جو ہمارے بچے تیار ہوں گے اس میں اس کی ضرورت ہے کہ ان میں دونوں وصف آجائیں علم بھی صحیح ہو اور اخلاق بھی ان کے درست ہوں۔ دورانِ تعلیم میں ہی اخلاق کی درستگی کی تمرین ہو۔ تواضع، انکسار، خدمت، ایثار اور جذبہ خدمت خلق اللہ، یہ جذبات ان کے اندر پیدا کئے جائیں، ابھارے جائیں۔ ان سے ان کی نشو ونما صحیح ہوگی۔ اور فرض کیجئے اس وقت اس میں کوئی کمی رہ گئی، تو بعد میں اسے پورا کر لیجئے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ سلف کی شان یہ تھی "كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْهُدٰى كَمَا كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْعِلْمَ." "سلف کی شان یہ تھی کہ جب آٹھ دس برس میں علم حاصل کر لیتے تھے اس کے بعد عمل سیکھنے کے لئے مستقلاً مشائخ کی خدمت میں رہتے تاکہ اعمال اور اخلاق درست ہوں"۔

ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں بھی میری طالب علمی کے زمانے تک تو یہ پابندی رہی کہ طالب علم فارغ التحصیل ہوجاتا تھا' لیکن سند نہیں دی جاتی تھی جب تک جماعت کے کسی بزرگ کے پاس رہ کر ان کا مرید ہو کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرالے، بعد میں ایسا نہ رہا۔ اس لئے خرابی پیدا ہوگئی۔ بہر حال جیسے علم ضروری ہے، اخلاق بھی ضروری ہیں۔

یہ ہمارے بھائی جو پگڑی باندھیں گے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ آج سے علم میں بھی کامل ہوگئے، اخلاق میں بھی کامل ہوگئے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے، اب آگے چڑھنا ان کا کام ہے۔ تو ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ ہم نے پہلی سیڑھی پر انہیں چڑھا دیا۔

بس یہ چند باتیں جلسہ دستار بندی کے سلسلہ میں ذہن میں آگئیں اپنے ضعف کی وجہ سے میں کوئی خاص ترتیب سے کچھ زیادہ بول نہیں سکا۔ بہر حال جیسے کھانے کے بارے میں اصول ہے کہ "خَيْرُ الطَّعَامِ مَاحَضَرَ." "بہترین کھانا وہ ہے جو حاضر ہو" آدمی مہمان کے سامنے رکھ دے۔ تو یہاں بھی خَيْرُ الْكَلَامِ مَاحَضَرَ جو دل میں آگیا، وہ پیش کر دیا۔ اسے قبول کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ کو بھی قائم و دائم رکھے۔ مدرسہ کے سارے اساتذہ

کرام کو معاونین، منتظمین کو سب کو حق تعالیٰ برکتیں عطا فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

شعب الایمان

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً اَعْلٰهَا قَوْلُ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ. وَالْحَيَآءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ. اَوْ كَمَاقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ.

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! جیسا کہ آپ کے علم میں آیا ہے کہ قریب ہی میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا اس کی وجہ سے کچھ ضعف بھی لاحق ہوا جس کا اثر اب تک موجود ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تو یہ تھی کہ میں کم سے کم تین چار ماہ، مئی، جون تک زور سے بھی نہ بولوں اور تقریر بھی نہ کروں۔ لیکن یہاں ایک ایک کر کے اس ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی۔ زور سے بھی بولنا پڑا اور تقریریں بھی کرنی پڑیں اور ایسی صورت بن جاتی ہے کہ بولنے کی مجبوری پیش آتی ہے تاہم جتنا اپنے بس میں ہوتا ہے میں احتیاط بھی کرتا ہوں۔ اس لئے یہ گذارش ہے کہ شاید میں زیادہ دیر تک نہ بول سکوں۔ جتنا بھی آسانی سے بن پڑے گا، اسی قدر چند لمحات آپ حضرات کے لوں گا اور اس حدیث کے بارے میں چند کلمات گذارش کروں گا۔

ترجمۂ حدیث...... یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ سن لیجئے۔ اس کے بعد اس کی تھوڑی تفسیر اور تشریح۔ ترجمہ یہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے اور شاخیں ہیں جن میں سے اعلیٰ ترین شعبہ لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا اور پڑھنا۔ اور ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذا دہ چیزوں کا ہٹا دینا، تکلیف دہ چیزوں کا دور کر دینا ہے تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا حیاء ایمان کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ یہ حدیث کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

اس میں ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے اس کی ضرورت ہے کہ خود ایمان کی حقیقت سامنے آئے تا کہ اس کے شعبوں کو اور اس کی شاخوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ایمان کی دو بنیادیں...... ایمان کی دو بنیادیں ہیں، ایک "اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ" اور ایک "اَلشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ" اللہ کے اوامر اور اس کے قانون کی عظمت و تعظیم کرنا اور دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت کرنا اور اس کی خدمت کرنا یہ ایمان کے اجزاء یا اس کے دو بنیادی شعبے ہیں۔ ایک کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف دوڑے، اسی کی طرف جانے کی کوشش کرے، اس کی عظمت و تعظیم کے حقوق بجالائے۔ دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کا حق بجالائے۔ اگر ایک شخص اللہ کی طرف دوڑتا ہے لیکن مخلوق کو ستاتا اور ایذا رسانی کرتا ہے۔ اس شخص کو ضعیف الایمان کہا جائے گا۔ اس کا ایمان کمزور، ناقص ہے۔ ایک طرف دوسرا شخص ہے جو دن رات قومی خدمات میں لگا ہوا ہے، ہر وقت کا اوڑھنا اور بچھونا قوم کی خدمت ہے۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع نہیں ہے۔ نہ عبادت ہے نہ اطاعت ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف الایمان اور ناقص الایمان ہے۔ کامل الایمان وہی شخص سمجھا جائے گا کہ ایک طرف اللہ کی طرف جھکا ہوا ہو اور دوسری جانب مخلوق کی طرف رجوع کئے ہوئے ہو جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے کہ ہمہ وقت رجوع الی اللہ بھی ہے اور ہمہ وقت خدمت مخلوق اللہ بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک فرمائی گئی کہ "کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ" ① "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یاد خداوندی سے فارغ نہیں تھا"۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے حتی کہ گھر میں رہتے ہوئے، بیویوں کے پاس جاتے ہوئے بھی کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ ذکر اللہ آپؐ سے صادر نہ ہوا ہو۔ زبان مبارک، قلب مبارک اور عمل مبارک سے۔ غرض یاد خداوندی ہر وقت ہر لمحے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کی تربیت و تعلیم، ان کی راہنمائی و ہدایت سے کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری عمر شریف رجوع الی اللہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع کرنا مخلوق کی خدمت سے غافل نہیں بناتا۔ اسی طرح ہر آن مخلوق کی خدمت میں منہمک ہیں اور یہ خدمت رجوع الی اللہ سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اللہ نے اپنے قانون کو حجت و برہان اور بصیرت سے منوایا ہے...... "اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ" "اللہ کے اوامر کی تعظیم کرنا"۔ یہ ایمان کا جز اول تھا مگر یہ قدرتی بات ہے کہ کسی قانون کی عظمت تب ہوتی ہے جب قانون ساز کی عظمت دل میں ہو۔ اگر قانون بنانے والا یا قانون چلانے والا، اس کی دل میں کوئی عظمت نہ ہو بلکہ اس کی حقارت دل میں بیٹھی ہوئی ہو، تو قانون کی عظمت بھی دل میں نہیں ہوسکتی۔ اگر قانون بنانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو تو پھر قانون دباؤ اور مجبوری کا رہ جاتا ہے۔ دلی شغف کے ساتھ آدمی قانون پر نہیں چل سکتا۔

شریعت اسلام کے قانون کو اللہ نے اس طرح نہیں بھیجا کہ دباؤ ڈال کر منوایا ہو۔ پہلے مالک سے محبت پیدا کی گئی ہے۔ اس محبت کے ذیل میں قانون سے خود بخود محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی قانون شریعت پر اپنے دل کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب ھل یتتبع المؤذن فاہ ھھنا وھھنا...... ج:۳ ص:۱۰۱۔

محبت، رضا اور شغف سے چلتا ہے دباؤ سے نہیں چلتا۔ یہ نہیں ہوا کہ تلوار کا دباؤ ڈالا اور مجبور و مقہور کر دیا ہو۔ بلکہ حجتیں پیش کیں کہ دلائل سے سمجھو، بصیرت سے سمجھو۔ جب شرح صدر ہو جائے قبول کرو، ورنہ چھوڑ دو۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی شان فرمائی گئی، ﴿اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ ① ''جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں، تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں گرتے تھے بلکہ بینا و شنوا ہو کر سوچ سمجھ کر بصیرت کے ساتھ قبول کرتے تھے''۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی ﴿عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ، وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ② ''میں اور میرا اتباع کرنے والے اس دین پر بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہیں''۔ کسی دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ دل کی لگن سے قائم ہیں تو شریعت اسلام نے بصیرت پیدا کرنی چاہی ہے۔ قران کریم نے جہاں جہاں اللہ کا وجود اس کی توحید اس کی صفات، منوائی ہیں۔ وہاں دلائل دیئے ہیں۔ انفسی دلائل بھی، آفاقی دلائل بھی۔ کہ اپنے نفسوں میں غور کرو تو تمہیں اللہ کے وجود کی حجتیں ملیں گی۔ کائنات میں غور کرو تو اس کے وجود اور اس کی یکتائی کے دلائل ملیں گے کہیں پہاڑوں کو، کہیں دریاؤں کو، کہیں ہواؤں کے لوٹ پھیر کو پیش کیا کہیں سورج کی حرکت کو پیش کیا کہ ان تمام تغیرات کو دیکھو۔ سورج کتنا بڑا عظیم کرہ ہے۔ آج کل کے فلاسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ زمین سے سورج گیارہ کروڑ گنا بڑا ہے۔ گویا سورج میں سے گیارہ کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں۔ اتنا بڑا سیارہ اور چوبیس گھنٹوں میں لاکھوں میل کی حرکت کرتا ہے تو اتنا بڑا کرہ اور غلاموں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بڑی طاقت ہے اس نے اسے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اس لئے سورج کو دیکھ کر اس کی ذات عالی کو پہچانو۔

اگر زمین حرکت کر رہی ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کا دعویٰ ہے۔ تو یہ عظیم کرہ جس میں اربوں کھربوں مخلوق آباد ہے اس کو کس نے چکر میں ڈال رکھا ہے؟ کس نے گھمار کھا ہے؟ ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ ③ ''سورج کی یہ مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے، رات کی یہ مجال نہیں ہے کہ دن کو نہ آنے دے، خود چھا جائے''۔ اپنے وقت پر دن، اپنے وقت پر رات بھی آ رہی ہے۔ یہ محکم نظام کسی نابینا کا قائم کیا ہوا نہیں بلکہ دانا اور بینا کا قائم کیا ہوا ہے۔ ایسے دانا اور حکمت والے کا قائم کیا ہوا ہے، جس کی حکمت لامحدود ہے، جس کے کمالات لامحدود ہیں۔ موسم اپنے اپنے وقت پر آ رہے ہیں۔ گرمی اپنے وقت پر آتی ہے۔ ایک سیکنڈ نہیں رک سکتی، سردی، برسات اپنے اپنے وقت پر آتی ہے۔

سبزیوں کا جو نظام بنا دیا ہے اسی وقت پر بیج زمین سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تناور درخت بنتا ہے۔ درخت کی جو بنیاد اور عمر ہے وہ مقرر اور لکھی ہوئی ہے اتنا پاکیزہ اور اتنا اعلیٰ ترین محکم نظام بغیر کسی حکمت والے کے ممکن نہیں ہے۔ غرض قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود اور یکتائی کو منوایا، وہاں یہ نہیں کہا کہ تم مجبور ہو، ماننا پڑے گا ورنہ

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۳ سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔ ③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۴۰۔

جہنم میں جاؤ گے بلکہ دلائل وحجتیں پیش کیں کہ ان کو سوچو اور سمجھو۔

عقل وبصیرت کے ساتھ کئے ہوئے عمل سے ہی درجات بلند ہوتے ہیں......عقل کی فضیلتیں الگ بیان کیں۔ حدیث میں ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یارسول اللہ! دو شخص یکساں قسم کا عمل کریں۔ اتنی ہی نمازیں وہ پڑھتا ہے، اتنی یہ اتنا ہی ذکر وہ کررہا ہے۔ اتنا ہی یہ لیکن روز قیامت ایک کے درجات زیادہ بلند ہوں گے، ایک نیچے رہ جائے گا حالانکہ عمل کی تعداد دونوں کی برابر ہے۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرق کی وجہ عقل ہے جو عقل اور بصیرت سے عمل کرتا ہے اس کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ جو بے بصیرتی سے عمل کرتا ہے وہ نجات پالے گا لیکن اس کے لئے درجات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوگا۔ تو عقل کو (بلندی درجات کے لئے) معیار قرار دیا۔ اسی کو فرمایا: ﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ① ”آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کے لوٹنے پھیرنے میں قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں مگر کن کے لئے؟ عقل والوں کیلئے جو تدبر کے ساتھ غور وفکر کرتے ہیں“۔ جو صرف پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں، ان کے لئے کوئی نشانی نہیں ہے۔ جو پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے بعد دل کی آنکھ سے بھی دیکھیں اور تدبر کریں، ان کے سامنے اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلیں گی۔

شریعت اسلامی کی نظر میں عقل مند کون ہیں؟......اور عقلمند کون ہیں؟ آگے ان کی تفصیل فرمائی: ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ② ”عقل مند وہ ہیں جو اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے اللہ کے ذکر میں منہمک ہیں اور ہر وقت تخلیق اور کمالات میں فکر کرتے رہتے ہیں“ تو دل میں ذکر اور فکر دونوں ہوں وہ عقلمند ہیں۔ فقط ذاکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا، فقط متفکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا۔ اگر محض فکر ہی فکر ہے ذکر اللہ نہیں تو وہ فلسفی ہے اور اگر محض ذکر ہی ہے فکر نہیں ہے تو وہ متکشف اور جامد ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہوں کہ ذاکر بھی اور متفکر بھی تو اس کو شریعت کی اصطلاح میں عقلمند کہا گیا ہے۔ اسی پر اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلتی ہیں۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے کوئی دباؤ ڈال کر نہیں منوایا چونکہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا مانو۔ حالانکہ یہ فرمانے کا حق تھا کہ اللہ کا حکم آگیا ہے تو ماننا پڑے گا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے وجود کو دلائل سے سمجھو، اس کے قانون کو بھی بصیرت سے سمجھو، سوچ سمجھ کر قبول کرو۔ اندھوں، بہروں کی طرح سے قبول نہ کرو۔ عقل کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ فکر کرے۔ شریعت اسلام نے جمود نہیں بتلایا حاصل اس کا یہ نکلا کہ کوئی دباؤ ڈالنا مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر اور فکر کرانا مقصود ہے۔

مدار نجات اللہ کا فضل ہے......اور زیادہ ذکر کون کرتا ہے؟ ”مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ“ ”جس شخص کو جس سے محبت ہوتی ہے اس چیز کو کثرت سے یاد کرتا ہے“ اللہ سے جب محبت ہوگی اس کی یاد بھی بڑھے گی۔ اس کی

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۰۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۱۔

فکر بھی بڑھے گی۔ رات دن غور بھی کرے گا۔ تو اصل چیز محبت نکل آتی ہے۔ یعنی دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت پیدا کرو پھر ان کے قانون کی محبت بھی ہوگی ان کے قوانین کی عظمت بھی ہوگی اور اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ جو ایمان کا ایک بڑا جز ہے وہ ثابت ہو جائے گا۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے اوامر کی تعظیم ہو اور اوامر کی عظمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک دل میں اللہ کی عظمت نہ بھری ہوئی ہو۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: میدان حشر میں بعض لوگ ایسے بھی آئیں گے جو بے شمار گناہوں کا بار اپنے سر پہ لئے ہوں گے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان لوگوں کے لئے فرماتے ہیں کہ ’’اے بندے! اگر تو میرے سامنے اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں۔ تو اتنی بڑی مغفرت لے کر میں تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو میری بڑائی کو مانتا ہو‘‘۔

بڑائی اور عظمت خداوندی وہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اگر اتفاقاً واحیاناً گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ فرماتے ہیں، پرواہ مت کرو سچی توبہ کرلو اور اگر خدانخواستہ توبہ بھی نہ ہوئی، اس کے لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ’’نیکیاں خود بدیوں کو مٹا دیں گی‘‘، عمل صالح اور نیکی کے اندر لگے رہو۔ تو عمل صالح میں لگا یا گیا تاکہ بدیاں بھی مٹ جائیں اور اگر اس کے باوجود بھی بدیاں سرزد ہوں تو دل کے اندر حق تعالیٰ کی عظمت ضرور رکھو۔

اس کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ آج سے آدمی بدیوں پر جری ہو جائے کہ جی! بس میں دل کے اندر عظمت ومحبت رکھتا ہوں۔ لہٰذا اب میں آزاد ہوں، میں جو چاہوں کروں۔ میں کہتا ہوں، جو بدی کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب کے اندر محبت کی کمی ہے۔ پوری محبت ہے ہی نہیں۔ جس کے قلب میں محبت رچی ہوئی ہوگی وہ بدی سے خود بخود بچے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ: جو بھی بندہ بخشا جائے گا وہ درحقیقت اپنے عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے بخشا جائے گا۔ جب تک فضل متوجہ نہ ہو، بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے خواہ کتنی بڑی نیکیاں ہوں۔

اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ’’وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!‘‘ یارسول اللہ کیا آپ کی نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوں؟ فرمایا کہ ’’میری نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوگی‘‘ اگر فضل متوجہ نہ ہو تو میری بھی نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ’’اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ‘‘ ① جب تک اللہ ہی اپنی رحمت اور فضل نہ کرے۔ اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔

عمل بھی ضروری ہے۔ یہ بھی آپ نہ سمجھئے کہ بس فضل کے اوپر آدمی بیٹھا رہے اور یوں کہے کہ فضل ہوگا، نجات ہو جائے گی۔ پھر عمل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں عمل کرنا، اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہو چکا۔

① الصحیح لمسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب لن یدخل الجنة احد بعمله...... ج: ۴ ص: ۱۲۷۱۔

اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے اوپر فضل نہیں ہو رہا۔ عمل فضل کی علامت ہے کوئی بیکار چیز نہیں ہے۔ بہر حال عمل کرا دینا اور عمل قبول کر لینا یہ بھی فضل کی دلیل ہے، اس عمل پر نجات کا ثمرہ مرتب کرنا یہ بھی فضل کی دلیل ہے۔ اول سے آخر تک فضل خداوندی سے کام چلے گا۔ محض ہمارے اعمال کہ ہم اس پر غرہ (فخر) کریں، یہ اس درجے کے نہیں ہیں جو ہمیں نجات دلا سکیں۔ جب تک کہ اللہ کا فضل متوجہ نہ ہو۔

اسلام میں اعتراف عجز روحِ عبادت ہے...... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عمل کتنا ہی کرے۔ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس واسطے کہ انعامات لامحدود ہیں۔ اور ہمارے عمل محدود ہوگا۔ ہم خود ہماری طاقت، ہمارا دماغ، عقل وقوت بھی محدود ہے، عمل جتنا کریں گے وہ ایک حد کے اندر ہوگا اور اللہ کی رحمتوں کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔ بارش کی طرح سے ہر ہر آن رحمتیں برس رہی ہیں۔ ان رحمتوں کا حق ادا کرنا حقیقت میں بس کی بات ہے بھی نہیں، ناممکن ہے۔ بس یہی صورت ہے کہ عمل کر کے آدمی یوں کہے، اے اللہ! مجھ سے کچھ نہیں بن پڑا۔ یہ اپنے عجز کا اعتراف کر لینا یہی حق کی ادائیگی ہے ورنہ حقیقی معنی میں اللہ کے حق کو کون ادا کر سکتا ہے؟ حضرات داؤد علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ①

اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب شکر کرنے کا آپ کا حکم ہے۔ تو میرا فرض ہے اور میں شکر ادا کروں گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ ادا کروں تو کس طرح سے کروں؟ اس لئے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس پر مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس پر شکر ادا کروں گا تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت اور آ گئی، تو پھر اس پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ گویا ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں شکر کی ابتداء کیسے کروں؟ شکر کو انجام کیسے دوں؟ سوائے اس کے کہ اپنے عجز کا اعتراف کروں کہ میں آپ کے شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا ''اے داؤد! تم نے اگر یہ سمجھ لیا کہ تم ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنی ہار مان لو اور اپنے عجز کو تسلیم کر لو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الشاکرین ہیں کہ آپ سے بڑھ کر اللہ کا کوئی بندۂ شکر گزار نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ ''اَللّٰهُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ'' اے اللہ! میرے بس میں نہیں ہے کہ تیری ثناء اور صفت بیان کر سکوں اور تیرا شکر ادا کر سکوں۔ ''اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ'' ② ''بس اس سے سوا کیا کہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے خود تعریف کی ہے''۔ میری تعریف سے تو بالاتر ہے۔ میرے قبضے میں نہیں ہے کہ تیری تعریف

---

① پارہ: ۲۲ سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳۔ ② المصنف لابن ابی شیبۃ، کتاب الصلوۃ، باب مایقول الرجل فی آخر الوتر...... ج: ۲ ص: ۹۹ رقم: ۲۹۴۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۳۹۵۔

کر سکوں۔اس عجز کے اعتراف کو بھی حق تعالیٰ نے شکر قرار دیا ہے کہ یہی میرا شکر ہے۔اس لئے کہ حق ادا کرنا بندے کے قبضے میں نہیں ہے تو اعمال بھی ہمارے ناقص اور نکمے شکر کی ادائیگی سے بھی ہم عاجز پھر سوائے اعتراف عجز کے اور کیا صورت ہے؟ اس کا نام اللہ نے شکر اور عبادت رکھ دیا کہ کرو اور کرنے کے بعد کہو کہ ہم سے کچھ نہ ہو سکا۔

ملائکہ علیہم السلام جو ہزار ہا ہزار برس سے عبادت میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں اربوں کھربوں ملائکہ ایسے ہیں کہ جب سے پیدا ہوئے وہ سجدے ہی میں ہیں۔ کچھ رکوع ہی میں ہیں اور بعض تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور فرمایا جو ستر ہزار آج طواف کریں گے، اب ابدالآباد تک انہیں پھر نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے دن پھر نئے ستر ہزار اور پھر نئے۔تو کروڑوں، کھربوں ملائکہ ہیں جو طواف میں مشغول ہیں۔اسی طرح اربوں کھربوں ہیں جو صف بندی کئے ہوئے تسبیح و تہلیل میں ہیں اتنی لاکھوں برس کی عبادت کے بعد ملائکہ قیامت کے دن عرض کریں گے: ''مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ'' ① ''اے اللہ! ہم نہ تیری عبادت کا حق ادا کر سکے نہ ہم تیری معرفت پوری کر سکے۔تو ہماری عبادتوں سے بالاتر ہے۔''

یہ ان کا اعتراف عجز یہی حقیقت میں ان کی عبادت ہے تو عبادت گزار کا کام یہ ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں بن سکا۔ یہ تواضع و انکسار اور یہ کسر نفس یہی اسلام میں عبادت کی روح ہے۔اسی سے انسان کی مقبولیت بڑھتی ہے۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کی عظمت نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی عظمت دل کے اندر نہ ہو اور اس عظمت کا تقاضا یہی ہوگا کہ ہمہ وقت زبان سے، قلب سے، دماغ سے اور اعضاء و جوارح سے بھی اطاعت و عبادت میں مشغول رہیں۔ ہر اعتبار سے ہم شکر گزار بنے رہیں۔

اور شکر گزاری یا عظمت کا اعتراف فقط زبان سے نہیں ہوتا، دل سے بھی ہوتا ہے۔روح سے بھی اور عمل سے بھی ہوتا ہے۔ جتنا اطاعت کا عمل بڑھے گا تو عملی شکر بڑھے گا، جتنا زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں گے۔ یہ اظہار عظمت کا شکر ہوگا، جتنا دماغ میں سوچیں گے کہ اللہ سب سے بڑی ذات ہے۔ یہ اس کی عظمت کا دماغ اعتراف کر رہا ہے۔ عقل سے جتنے دلائل اس کی عظمت کے قائم کریں گے یہ عقل کا اعتراف عظمت ہے کہ وہ بھی مانتی ہے۔ عظمت والی ذات وہ ہے۔ جتنی آپ کے وجدان اور ضمیر میں عظمت بیٹھے گی۔ یہ قلب کا اعتراف ہے کہ وہ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے تو رگ و پے سے عظمت کا اعتراف ہونا چاہئے۔ وجدان، ارکان، زبان ولسان الغرض ہر اعتبار سے اس کی عظمتوں کا اعتراف چاہئے، جتنا شکر ادا کیا جائے گا، اتنی عظمت نمایاں ہوگی اور پھر بھی یہ کہہ دینا چاہئے کہ ہم حق ادا نہیں کر سکے۔

بہرحال اس عظمت کے بعد اب فرماتے ہیں کہ: جب تم اس مقام عظمت پر آ جاؤ گے، اگر تم سے گناہ بھی

① المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم ومن مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب، ج:۳ ص:۹۳ رقم: ۴۵۰۲.

سرزد ہوں گے تو پرواہ مت کرو۔ میں اتنی بڑی بخشش لے کر تم سے ملاقات کروں گا اس لئے اگر عظمت ہے تو بندہ تو خطا ونسیان سے مرکب ہے یہ غلطی کرے گا آخر بشریت ہے۔ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام بنائے گئے ہیں اور محفوظ اولیاء اللہ ہی بنائے گئے ہیں۔

ہم اور آپ تو رات دن گناہوں میں غرقاب ہیں۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہو اور وہ بغیر عظمت کے متوجہ نہیں ہوتا اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے عظمت کا اعتراف دل میں ہوگا، تو قانون خداوندی کی عظمت بھی دل میں ہوگی اور جب اس کے قانون کی عظمت دل میں بیٹھے گی تو عمل درآمد دل کے لگاؤ سے ہوگا۔ خواہ وہ دیانات ہوں، خواہ وہ عبادات ہوں، خواہ وہ معاشرت ہو، انفرادی و جماعتی زندگی ہو، شہری زندگی ہو۔ جب قانون کی عظمت ہوگی تو آدمی بغیر قانون کس طرح نہیں چلے گا؟ ضرور چلے گا۔ ہر آن اس کی اس پر توجہ رہے گی کہ اس بارے میں میرے پروردگار کا کیا حکم ہے جو میں اس پر چلوں اور کس طریق پر عمل درآمد کروں۔

عظمت ومحبت خداوندی ہی ایمان کی بنیاد ہے...... بہرحال پہلی بنیاد ''اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ'' ہے۔ یہ ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اگر عظمت نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ پھر عظمت کے بھی درجات ہیں۔ ایک درجہ عظمت کا وہ ہے جو عوام مومنین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو اولیاء عظام اور علماء ربانیین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو ائمہ کرام کے دلوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے قلوب میں تھا۔ ایک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں تھا۔ اسی طرح ایمانوں میں بھی فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ایمان سب سے اعظم ترین ایمان ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس کے بعد تابعین کا' اس کے بعد ہم جیسے عوام کا ایمان سب سے آخر کا درجہ ہے۔ تو جیسے درجات عظمت کے ہیں۔ ویسے ہی درجات ایمان کے بھی ہیں۔ بہرحال جب نفس عظمت میں شرکت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ قانون کی عظمت بھی ہوگی۔ جب عظمت ہوگی، پھر محبت بھی ہوگی، محبت ہوگی تو آدمی کے دل میں قانون پر عمل درآمد کرنے کی لگن پیدا ہو جائے گی۔

یہی محبت تھی جس نے حضرات صحابہ کرامؓ کو مجبور کیا کہ گھر بار انہوں نے چھوڑا، جائیدادیں انہوں نے ترک کیں، وطن چھوڑ کر بے وطن ہوئے۔ اپنی لذتیں ترک کیں، اپنا آرام وآسائش تج دیا۔ کس لئے؟ محض محبت نبوی اور عظمت خداوندی کی وجہ سے جب محبت دل میں بیٹھ گئی تو ہر چیز ان کے سامنے ہیچ بن گئی۔ تو ہجرت کر کے وطن چھوڑ کر کے اللہ کے رسول کے ساتھ آ گئے۔ جانیں الگ قربان کیں، مال الگ چھوڑا اولاد کو، عزیزوں کو، رشتہ داروں کو الگ چھوڑا، اگر محبت وعظمت نہ ہوتی، یہ اتنے بڑے بڑے کام ان سے سرزد نہیں ہو سکتے تھے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایات میں فرمایا گیا ہے کہ: جب غزوہ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ کے چھوٹے صاحب زادے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' وہ کفار کے لشکر میں مسلمانوں کے مدمقابل تھے غزوہ بدر کے بعد ایمان کی توفیق ہوئی اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد ایک دفعہ اپنے

والد صدیق اکبرؓ سے کہنے لگے کہ: ''اے میرے والد! جنگ بدر کے اندر کئی دفعہ ایسا موقع آیا کہ آپ میری زد کے نیچے تھے' اگر میں تیر چلاتا یا تلوار سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرتا، میں آپ کو ختم کر سکتا تھا، مگر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ میرے باپ ہیں۔ میرے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے قتل ہوں۔ اس لئے میں باپ ہونے کی عظمت کی وجہ سے رک جاتا تھا''۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! اگر تو میری زد پر آجاتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا پھر میں دوسروں کی طرف بڑھتا اس لئے کہ جب دل میں اللہ کی محبت آ گئی تو پھر کسی دوسرے کی محبت کی سمائی کا دل میں کیا سوال' پھر کہاں کی اولاد اور کہاں کی بنیاد؟ جب میں اللہ کے لئے کھڑا ہوا تو میں پہلے اس کو دیکھتا جو دشمن خدا ہے اور میرا عزیز بھی ہے تاکہ میں اپنی عزیز داری کو حق تعالیٰ کی دشمنی سے پاک کر دوں۔ میں پہلے تجھے قتل کرتا''۔ اولاد کے حق میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا، ظاہر بات ہے کہ عظمت و محبت خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس درجہ کی محبت رچ بس گئی تھی کہ اصول و فروع کی محبت ہی نہ رہی تھی۔

اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ① '' کوئی بھی تم میں سے اس وقت تک کامل الایمان مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت اپنی اولاد ماں باپ سے نہ ہو جب تک اتنی محبت غالب نہیں آجائے گی اس وقت تک مت سمجھو کہ تم میں کمال ایمان پیدا ہو گیا''۔ ظاہر بات ہے کہ ایمان کی بنیاد محبت نکل آتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ایمان متحقق نہیں ہو سکتا۔

ایک محبت تو طبعی ہے جو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے اور اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک محبت عقلی ہے۔ ایمان عقلی محبت کا نام ہے طبعی محبت کا نام نہیں ہے۔ طبعی طور پر آدمی اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے لیکن عقلاً یہ سمجھتا ہے کہ زیادہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس واسطے جب اللہ کے حکم اور اولاد کا مقابلہ پڑتا ہے وہ اولاد کو دھکا دے دیتا ہے اور حکم خداوندی کو آگے رکھتا ہے۔ یہ عقلی محبت ہے، محض طبعی جذبہ نہیں ہے تو ایمان عقلی محبت و عظمت کا نام ہے۔ یہ پہلا رکن ہے۔

ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ...... دوسرا رکن یہ ہے کہ: اَلشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ جتنا آدمی اللہ کی طرف جھکے اتنا ہی اس کی مخلوق کی خدمت کی طرف متوجہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ یُّحْسِنُ اِلٰی عَیَالِہٖ. ② ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی قید نہیں ہے۔ جتنے بندگان خدا ہیں وہ سب خدا کا کنبہ ہیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی چہیتی مخلوق ہے اللہ کو سب سے زیادہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ...... ج: ۱ ص: ۱۷ رقم: ۴۴.
② مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ ج: ۷ ص: ۳۴۰.

محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ احسان وسلوک کے ساتھ پیش آئے''۔ وہی اللہ کا سب سے زیادہ چہیتا ہے۔ بہر حال جیسے اللہ کی محبت لازمی ہے، اسی طرح سے فرمایا گیا مخلوق پر شفقت کو لازمی سمجھو۔

اگر مخلوق ستم رسیدہ ہے، مظلوم و بے کس ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے۔ اگر کوئی غیر مسلم بھی مصائب میں پھنس جائے اور مسلم دیکھ رہا ہے کہ وہ مصیبت زدہ ہے تو مسلم کا کام یہ ہے کہ اس کو بھی مصیبت سے نجات دلائے۔ جتنا بھی اس کے بس میں ہے۔ اس کو بھی ظلم وستم اور پریشانی سے چھڑائے بہر حال مخلوق کی خدمت یہ شفقت کے لئے ضروری ہے۔ جب تک مخلوق کی خدمت نہ ہو شفقت نہیں پائی جا سکتی۔

خدمت کے پھر دو درجے ہیں۔ ایک درجہ نفع رسانی کا ہے، ایک درجہ ضرر رسانی سے بچ جانے کا۔ تکلیف نہ پہنچاؤ، نفع چاہے پہنچا سکو یا نہ پہنچا سکو۔ تو ایک درجہ کف الاذیٰ کا ہے یعنی اپنی ایذا رسانی کو روک دو۔ اذیت مت پہنچاؤ اور ایک یہ کہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی مخلوق کو نفع اور راحت پہنچاؤ۔ اولین درجہ یہ ہے کہ تم سے کسی مخلوق کو ضرر واذیت نہ پہنچے، اگر یہ بھی نہ ہو تو سمجھو ایمان نہیں۔ اگر آدمی کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا دیکھے یا اسے گمان ہو کہ یہ مبتلا ہو جائے گا۔ آدمی کا فرض ہے کہ اسے متنبہ کر دے، اگر متنبہ بھی نہ کرے آنکھ بند کر کے گزر جائے تو سمجھ لو کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ ورنہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے کو متنبہ کر دے کہ یہ تکلیف کا راستہ ہے اس پر مت جاؤ، اسی واسطے فرمایا گیا: اَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ. ①

''ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹائے'' جس سے کسی کو تکلیف پہنچے کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھا کر راستے کو صاف کر دے۔ اینٹیں پڑی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کو ٹھوکریں لگیں گی اٹھا دے تا کہ مخلوق کو اذیت نہ پہنچے۔ یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ: قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: تین قسم کے آدمی ہیں جن پر حق تعالیٰ لعنت کرتے ہیں۔ ایک وہ جو سڑک کے اوپر ایذا دہ چیزیں ڈال دے ایک وہ کہ موارد عامہ میں جہاں لوگ بیٹھتے ہوں، راحت اٹھاتے ہوں، وہاں بول و براز کر کے جگہ کو پراگندہ کرے۔ جیسے کوئی درخت کا سایہ ہے لوگوں کی بیٹھنے اٹھنے کی جگہ ہے وہاں پر آدمی نجاست ڈال دے یا بول براز کرے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پر ہماری طرف سے لعنت ہے۔ اسی طرح سے کسی ایسی تکلیف کا سامان کر دے کہ مخلوق کو ٹھوکر لگ رہی ہے یا مخلوق کو کانٹے چبھ رہے ہیں جو اس نے پھیلا دیئے ہیں۔ اب لوگ تکلیف میں پڑتے ہیں تو یہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اس کی تفریح ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سمجھو ایسے شخص میں ایمان نہیں ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہے۔ تو جہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کی عظمت کرو، وہاں یہ بھی بتلایا گیا کہ مخلوق کی خدمت کرو اور خدمت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کم سے کم اذیت دوسروں کو مت پہنچاؤ۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

خیر کی امید نہیں تو کم از کم آدمی بدی نہ پہنچائے۔ دوسرے کے واسطے ایذا زدہ نہ بنے۔ یہ گویا لازمی سمجھا گیا ہے کہ نہ قول سے ایذا پہنچاؤ نہ عمل سے ایذا پہنچاؤ، نہ کسی ہیئت سے ایذا پہنچاؤ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ① لمز بھی مت کرو۔ کسی کو کن آنکھیوں سے آنکھ مار دینا، پھبتی اڑانے کے وقت آدمی آنکھوں سے اشارہ کیا کرتا ہے جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اس کی مخالفت فرمائی گئی کہ تمہاری آنکھ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا سبب بنے ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ برے لقب سے بھی یاد نہ کرو۔ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ: کوئی کسی کو کہے یا کافر، یا فاسق. فرمایا ایمان کے بعد ایسے برے القاب؟ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ② ”ایمان کے بعد فسق و فجور مت اختیار کرو“ کہ لوگوں کو برے القاب سے یاد کرو یا خطاب کرو۔ بعض لوگ دوسرے کو برے برے القاب سے مخاطب کرتے ہیں، وہ بیچارے شرمندہ ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت فرمائی گئی۔ فرمایا گیا ﴿لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ ③ ”ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر بھی مت کرو۔ پھبتی بھی مت کسو، ایسا مذاق بھی مت کرو کہ دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچ جائے تم جو دوسرے کو تمسخر اور اس کی تحقیر کر رہے ہو، تمہیں کیا خبر ہے کہ اللہ کے ہاں وہ زیادہ مقبول ہو اور تمہاری قبولیت اتنی نہ ہو“۔ اس لئے فرمایا تمسخر بھی مت کرو، لمز بھی مت کرو۔ تکلیف دہ ہیئت بھی مت بناؤ۔ جیسے زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ یہ انگلی اگر کسی نے ذرا سی اٹھا دی تو تلوار کھنچ جاتی تھی۔ چڑانے کی انگلی سمجھی جاتی تھی۔ گویا انگلی کا اٹھا دینا گالی دینا تھا۔ اسی واسطے اس انگلی کا نام ”مَسَبَّه“ تھا۔ یعنی گالم گلوچ کی انگلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدلا اور فرمایا اسے ”سَبَّاحَه“ کہو یعنی اللہ کی پاکی بلند کرنے کی انگلی اور نمازوں میں اس انگلی کو اٹھاؤ جب کلمہ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو۔ تو بجائے سبابہ کے سباحہ اس کا نام رکھا کہ یہ گالم گلوچ کی انگلی نہیں ہے بلکہ تسبیح و تہلیل ہے اور طاعت و عبادت کی انگلی ہے۔ اس نام کو بھی چھوڑ دو جو زمانہ جاہلیت کا نام ہے۔

کمال ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟...... بہر حال کسی ایسی ہیئت سے اشارہ کرنا یا جیسے کسی زمانے میں انگوٹھا دکھلا دینے کا دستور تھا جس سے دوسرا چڑ جائے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا زمانہ جاہلیت میں شہادت کی انگلی دکھا کر چڑا دینا سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے روکا گیا تاکہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے لئے ایذا رسانی کا باعث نہ بنے۔

فرمایا گیا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ④ ”مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نہ زبان سے ایذا پہنچائے نہ ہاتھ سے“۔ کہیں فرمایا گیا ”اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ② پارہ: ۲۶ سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱.

النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ." ① مومن کون ہے؟ جس سے لوگ اپنی جان، مال، آبرو کے بارے میں امن میں ہوں اور مطمئن ہو جائیں، لوگ یوں سمجھیں کہ ہماری جان بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے یہ جان کے اندر خیانت نہیں کرے گا۔ ہماری آبرو بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے خائن نہیں ہے۔

اور یہاں پر لفظ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ ہے یعنی لوگ مطمئن ہوں۔ اس میں یہ بھی قید نہیں کہ مسلمان ہی مطمئن ہوں بلکہ غیر مسلم بھی مطمئن ہو جائیں کہ یہ موذی نہیں ہے۔ یہ ایماندار ہے تو ایمان کی علامت یہ بتلائی گئی کہ ہر کس و ناکس اس کے معاملات کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ مومن ہے۔ اس سے مال، جان، آبرو میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ کسی میں بھی خیانت نہیں کرے گا۔ بہر حال مومن کی شان یہ ہوئی کہ اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھرا ہوا ہو اور بلا استثناء ہر مخلوق کی درجہ بدرجہ خدمت کرے جس کے دل میں محبت خداوندی ہوگی، اس کے دل میں اس کی مخلوق کی محبت ہوگی اور جب مخلوق کی بھی محبت ہوگی تو اسے چین نہیں آئے گا کہ کوئی شخص اذیت وتکلیف کے اندر رہے۔ وہ سعی کرے گا کہ اس کی تکلیف رفع کروں۔ کم سے کم اس کی اذیت وتکلیف کا ذریعہ نہ بنوں اور اس کی جان و مال محفوظ رہنا چاہئے۔

اگر خدانخواستہ مومن ایسا ہو جائے کہ لوگ اس سے دور ہٹنے لگیں کہ بھائی! کہیں یہ چھری نہ مار دے، کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں گالی نہ دیدے تو وہ مومن کیا؟ وہ تو اچھا خاصا بیل ہے۔ بیل جب چلتا ہے تو لوگ پہلو بچا کر چلتے ہیں کہ بیل ہے کہیں لات نہ مار دے، کہیں دم نہ مار دے، کہیں پیشاب نہ کر دے، چھینٹا نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی یہ کھٹک پیدا ہوگئی کہ کہیں چھری نہ مار دے، جیب نہ کتر لے وہ بھی پھر بیل ہوا۔

مومن وہ ہے جس سے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ یہ نہ ہماری جان کا لیوا ہے نہ آبرو گرانے والا ہے نہ مال میں خیانت کرنے والا۔ غائبانہ بھی خیانت نہ کرے بلکہ حفاظت کرے۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، اچھے بڑے صالح لوگوں میں سے تھے۔ وہ سہارنپور سے اپنے وطن کانپور جا رہے تھے۔ سہارنپور کے گنے مشہور ہیں۔ انہوں نے کافی مقدار میں گنے خرید کئے۔ اب وہ جا کے کانٹے پر ڈالے تاکہ تلواؤں، اس لئے کہ وہ اس مقدار سے زیادہ تھے جو ایک ٹکٹ میں لے جائی جا سکتی ہے۔ تولنے والے بابو نے دیکھا کہ ایک نیک صالح آدمی، صورت بھولی بھالی، اس کے چہرے پر ایمانداری برس رہی ہے اس نے کہا مولوی صاحب! تلوانے کی ضرورت نہیں، بس تم ویسے ہی لے جاؤ۔

انہوں نے کہا صاحب! آپ تو کہہ رہے ہیں کہ ویسے ہی لے جاؤ۔ اگر میں لے گیا اور ریل میں چیکر آ گیا اور اس نے مال چیک کیا۔ وہ کہے گا یہ مال زیادہ ہے۔ وہ میرے سے جرمانہ بھی وصول کرے گا۔ میں یہاں تھوڑا دے کر چھوٹتا ہوں، وہاں زیادہ دینا پڑے گا۔ آپ مجھے کیوں زیادہ میں پھنسا رہے ہیں؟

① الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰.

اس نے کہا: نہیں، ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا صاحب، غازی آباد سے گاڑی بدلے گی وہاں دوسرا چیکر آئے گا، اس نے چیک کیا تو جتنا لمبا راستہ ہوتا جائے گا محصول وجرمانہ بھی بڑھتا جائے گا۔ اس نے کہا ہم اس سے کہہ دیں گے کہ وہ اس چیکر سے کہہ دے گا کہ بھئی! انہیں مت ستانا اور یہ مال لے جانے دو۔

انہوں نے کہا صاحب! اس نے چھوڑ دیا لیکن جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور میرے پاس جو وزن زیادہ ہوگا تو وہ بابو کہے گا کہ یہ اپنا ٹکٹ دے رہے ہو، اس مال کا ٹکٹ کہاں ہے؟ تب میں کیا کہوں گا؟ اس نے کہا ہم اس دوسرے چیکر سے کہلا دیں گے۔ وہ اس بابو سے کہہ دے گا۔ آپ کو پاس کر دیا جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر لے جائیں۔ انہوں نے کہا پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا پھر کیا ہوگا۔ پھر آپ کا گھر آ جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ اللہ میاں جو میرے سے پوچھیں گے کہ ریلوے کے مال میں خیانت کیوں کر کے آیا تھا؟ قیامت کے دن جو باز پرس ہوگی، تو میں کیا جواب دوں گا؟ اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی مجنون اور دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا اللہ کا نام لینا اس کے نزدیک دیوانگی تھی۔ حقیقت یہی ہے ؂

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد   اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہ ہے جو اللہ کا دیوانہ نہیں بنتا، فرزانہ وہ ہے جو فرزانہ نہیں ہے۔ ہر وقت غرور میں مبتلا ہے۔

"اَکْثِرُوْا ذِکْرَ اللّٰہِ حَتّٰی یَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ" ① "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون کہنے لگیں"۔ ایک سودا اس کے دل کے اندر سما جائے۔ جب دیکھو اللہ اللہ، جب دیکھو اللہ اللہ۔ معلوم ہوتا ہے دیوانہ ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا اور اس میں فرمایا کہ: ہمارے حضرت استاذ یہ فرماتے تھے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے امام اوزاعی تیسرے قرن کے اکابر علماء میں سے ہیں۔ امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ امام اوزاعی نے اس وقت کے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا کہ "اگر صحابہ کرامؓ آج قبروں میں سے نکل آئیں تو ہم تو انہیں مجنون کہیں گے اور وہ ہمیں کافر کہیں گے کہ وہ اسلام جو دنیا کے اندر ہم چھوڑ گئے تھے وہ تو گیا۔ اب اس کا وجود کہاں ہے؟" یہ امام غزالی نے امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے۔

اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "میں یہ کہتا ہوں اس زمانے میں اگر قبر سے نکل کر امام غزالی آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے اور ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔

اور شیخ الہند نے فرمایا: "اگر میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے زمانے کے لوگ قبروں سے نکل کر آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے، ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔ حقیقت یہی ہے کہ دیوانہ تو وہی ہے جسے لوگ دیوانہ کہیں اور خدا

① مسند احمد، مسند ابی سعید الخدریؓ ج: ۲۳ ص: ۱۷۲.

کا دیوانہ اللہ کا مجنون کہ ہر وقت اللہ ہی کا نام ہے۔ اسی ہی کی رٹ ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب تک یہ جنون نہیں سمائے گا، ایمان کا کمال نہیں ہوسکتا۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ علیہ عنہ جلیل القدر صحابیؓ ہیں۔ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا لقب ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسرار اور فتن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں فرمائیں، ان کے اسرار ان کے قلب میں محفوظ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے بہت سے واقعات بیان کرتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے فتنے مجھے بتلا دیئے ہیں۔ فتنہ پردازوں کے نام اور ان کے نسب نامے بھی بتلا دیئے ہیں کہ فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں فتنہ پرداز کھڑا ہوگا۔ لیکن ان کو زبان سے ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ فتنوں کے بارے میں ان سے کچھ احادیث مروی ہیں، گویا اسرار نبوت کے امین ہیں۔ اسرار نبوت ان کے قلب میں ہیں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ایران فتح ہوا اور اس کا دار السلطنت بغداد تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو آپ کھانا کھا رہے تھے، ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی وغیرہ لئے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ تو حضرت حذیفہ ابن یمانؓ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے اتفاق سے ایک لقمہ گر پڑا۔ آپؓ نے فوراً لقمے کو اٹھایا۔ اس کی مٹی جھاڑ کر صاف کیا اور تناول فرمالیا۔ اس فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن لوگوں کا ملک ہے یہاں تہذیب اور شائستگی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ زمین پر سے لقمہ اٹھا کر کھالینا، لوگ اس کو عیب شمار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ حرص وہوس ہے، زمین پر پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کے کھالیا؟ یہ تمیز کے خلاف ہے۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ لوگ آپ کے اوپر ملامت کریں گے، مذاق اڑائیں گے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ." "کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟" اس سنت میں جو برکت ہے وہ دنیا وما فیہا میں نہیں ہے۔ سُبْحَانَ اللهِ.

جب تک اس درجے کا جنون دل میں نہ سما جائے کہ ایک ایک سنت پر آدمی جم جائے اور دانت سے مضبوط پکڑ لے کہ دنیا کی ملامت کا خوف ترک کردے، اس وقت تک کمال ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں ایمان نام ہی جنون کا ہے۔ مگر جنون عشق کا نام ہے اور عشق بھی اللہ کا کسی غیر اللہ کے عشق کا نام ایمان نہیں ہے۔ جب عشق دل میں گھر کر جاتا ہے تو عاشق تو واقعی مجنون سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ غیر محبوب اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ وہ تذکرہ کرے گا تو محبوب کا، نام لے گا تو محبوب کا، فکر ہوگی تو محبوب کی۔ غرض جنہیں عشق کی دولت میسر نہیں وہ انہیں مجنون نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قُلِ اللّٰهَ اللّٰهَ حَتّٰى تُقَالَ مَجْنُوْنٌ" اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔

اسی بنا پر امام اوزاعی نے کہا تھا کہ اگر آج صحابہ کرامؓ اپنی قبروں میں سے نکل کر آجائیں تو ہم انہیں مجنون

کہیں گے وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ ہم کہیں گے یہ دیوانے ہیں۔ سوتے اور جاگتے انہیں ایک ہی لگن ہے۔ وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ وہ ذکر اللہ کی لگن اور وہ اسلام کہاں گیا جو ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ بہر حال دل کی لگن اور تڑپ کا نام ایمان ہے کہ دل میں ایک نسبت پیدا ہو جائے اور آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، کھانے، پینے، سونے، جاگنے میں ایک ہی کا نام اور ایک ہی کا ذکر ہو۔

مومن کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے...... آخر احادیث میں جو مختلف اوقات کے اذکار بتلائے گئے ہیں کہ مومن کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ اللہ کی طرف وہ توجہ نہ کرے۔ گھر سے باہر نکلے تو دعا پڑھے "بِسْمِ اللّٰهِ، آمَنَّا بِاللّٰهِ تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" ①

گھر میں داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَ بِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا." ②

استنجا کے لئے داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ." ③

استنجا کر کے باہر آؤ تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ." ④

لباس پہنو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ." ⑤

دوستوں سے مصافحہ کرو تو کہو "نَحْمَدُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَنَسْتَغْفِرُهٗ." ⑥ "ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس سے استغفار کرتے ہیں"۔

دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھو تو کہو بسم اللہ اور فارغ ہو جاؤ تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا. پھر اس کے وعدے دیئے گئے کہ اگر کسی نے بسم اللہ سے کھانے کی ابتداء کی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا. پر ختم کیا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں تو گناہوں کی مغفرت کا وعدہ الگ دیا گیا، تو مومن کا کوئی لمحہ فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ سونے کے لئے لیٹو تو کہو "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى." "اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوں گا"۔

جب صبح کو اٹھو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ." "اس اللہ کے لئے حمد ہے

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا اخرج من بیتہ، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب ج: ۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۱۶۰۵.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا دخل بیتہ، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۶.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الطھارۃ، باب اذا ارادخول الخلاء، ج: ۱ ص: ۲۸۳ رقم: ۳۷۵.

④ السنن لابن ماجه، کتاب الطھارۃ، باب مایقول اذاخرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۱۱۰ رقم: ۳۰۱.

⑤ المستدرک للامام الحاکم، کتاب اللباس، ج: ۴ ص: ۲۱۳.

⑥ السنن لابن ماجه، کتاب الادب، باب الرجل یقال لہ کیف اصبحت، ج: ۲ ص: ۱۲۲۲ رقم: ۳۷۱۱.

جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی اور اس کی طرف سب کو جانا ہے یا جمع ہونا ہے اور پھیلنا ہے''۔

آفتاب نکلے تو دعا بتلائی ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَلَّلَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً وَّجَآءَ بِالشَّمْسِ مِنْ مَّطْلَعِهَا. اَللّٰهُمَّ اُشْهِدُکَ وَاُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِکَ وَ مَلٰٓئِکَتَکَ وَجَمِیْعَ خَلْقِکَ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ. '' ① ''اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے دن چمکا دیا۔ جس نے سورج کو نکالا۔ اے اللہ میں تجھے بھی گواہ کرتا ہوں تیرے حملۂ عرش کو بھی گواہ کرتا ہوں تیرے ملائکہ کو بھی گواہ کرتا ہوں اور تیری تمام مخلوق کو گواہ کرتا ہوں کہ میں شاہد ہوں۔ تو اللہ ہے، تو یکتا ہے اور تیرا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے''۔

اسی طرح فرمایا: بیوی کے پاس جاؤ تو یہ دعا پڑھو: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا. '' ② اولاد کی خبر سنو تو یہ دعا پڑھو۔ نیا پھل سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو۔ غرض تمام اوقات کی سینکڑوں دعائیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کی زندگی کو ہر آن ذاکر کی زندگی بنایا گیا ہے۔ وہ ہر آن اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ توحید کا سبق پڑھتا رہے۔ ایک ہی کی طرف جھکنا، ایک ہی کے لئے جینا، ایک ہی کے لئے مرنا اسی کا نام اسلام ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ③ ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ''۔ اس مسلم بننے کے یہ معنی نہیں تھے کہ کلمہ پڑھ کر آج مسلم بن جاؤ۔ آپ تو پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی اولوالعزم، ہزارہا پیغمبروں کے والد بزرگوار ہیں۔ خلیل اللہ لقب ہے۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ اب تک مسلمان نہیں۔ اب کلمہ پڑھ کر مسلمان بن جاؤ۔ مسلم بننے کے معنی گردن جھکا دینے کے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے اور سپرد کر دو کہ نہ تمہاری مرضی رہے اور نہ ارادہ رہے۔ جو کچھ ہو ہماری مرضی اور ہمارا ارادہ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ④ ''اے اللہ! میں مسلم بن گیا''۔ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا۔ آپ کے حوالے کر دیا۔ جو چاہیں آپ کریں جب یہ کر دیا تو اب یہ اعلان کر دو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ⑤ ابراہیم! کھلے بندوں کہہ دو، میری نماز، میرا حج، میرا مرنا اور میرا جینا، اور مرنے اور جینے کے درمیان جتنے افعال ہیں وہ خود سارے اس کے اندر آ گئے۔ تو سونا، جاگنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا۔ سب اللہ کیلئے ہے۔ میرے نفس کے لئے کچھ نہیں۔ جس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور آج میں ہی اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی گردن جھکا دینے کے نکل آئے۔ یعنی زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کو ہی یاد کرو۔ اس کی یہ تفسیر ہے

---

① الاذکار للنووی، ج: ۱ ص: ۸۶. عمل الیوم واللیلة لابن سنی ج: ۱ ص: ۲۷۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب النکاح، باب مایستحب ان یقول عندالجماع، ج: ۲ ص: ۱۰۵۸ رقم: ۱۴۳۴.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیة: ۱۳۱. ④ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیة: ۱۳۱. ⑤ پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیة: ۱۶۲، ۱۶۳.

جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں اذکار بتلاتے ہیں۔ فرائض وسنن اور واجبات اپنی جگہ وہ تو وقت خاص میں ادا کرو۔ لیکن تمام اوقات جو تمہاری زندگی کے ہیں۔ ہر موقع کی دعا ہر موقع پر ذکر اللہ کرو اور اسے یاد کرتے رہو تا کہ مسلم کی زندگی سو کر اٹھنے سے لے کر رات کے سونے تک ذکر اللہ سے معمور رہے۔ یہی حقیقت میں اسلام ہے ایسا اسلام جب آدمی کا ہوگا، تو لامحالہ لوگ اسے مجنون ہی کہیں گے کہ بھئی جب سو رہا ہے تو اللہ اللہ، جاگ رہا ہے تو اللہ اللہ، کپڑے پہنتا ہے جب بھی اللہ اللہ، روٹی کھاتا ہے جب بھی اللہ اللہ۔

مومن کا قلب بھی ذاکر ہونا چاہئے ......اور یہ واقعہ ہے جو اس کی مشق کرے، اذکار کا پابند بن جائے گا۔ پھر قلب ذاکر بن جاتا ہے۔ پھر وہ ارادہ بھی نہ کرے جب بھی ذکر اللہ بے ارادہ اس کی زبان اور قلب سے جاری ہوتا ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں ایک صاحب اسی شان کے تھے کہ ذکر اللہ ان کے رگ وپے میں رچ چکا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرتے تھے. ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پانی اتر آیا، تو آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔ جب ہسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ: دیکھئے بالکل خاموش رہئے گا۔ ہلنا جلنا بالکل نہیں ہوگا اور میں آپریشن کرتا ہوں پہلے میں آپ کو بے ہوش کروں گا۔ اس کے بعد پھر آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ بارہ گھنٹے کے لئے حس وحرکت نہ کریں انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔

اس نے کلوروفام سنگھایا بے ہوش ہونا تھا کہ ایک دم قلب میں سے الا اللہ، الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے کہا کیا کرتے ہو؟ اب انہیں تھوڑی ہی خبر تھی کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو بے ہوش تھے۔ آخر وہ پھر ہوش میں لے آیا اور کہا یہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا کیا؟ کہا آپ تو اللہ اللہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ اس نے کہا دیکھئے اللہ اللہ کرنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ کم سے کم اس وقت خاموش رہئے۔ اس نے پھر بے ہوش کیا۔ بے ہوش ہونا تھا' پھر قلب سے الا اللہ الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر ان کی آنکھ نہ بن سکی۔ ڈاکٹر نے کہا میں اس حالت میں آپریشن نہیں کر سکتا۔ تو آدمی جب بیداری میں اللہ کے نام کی مشق کرتا ہے، رات دن ذکر میں رہے پھر بلا ارادہ اس کی زبان پر ذکر جاری ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت ذاکر رہتا ہے۔ تو لامحالہ ایسے شخص کو مجنون ہی کہا جائے گا کہ عجیب جنونی آدمی ہے۔ ہر وقت الا اللہ سونے کے لئے لیٹے تب الا اللہ، اور جاگتا ہے تب الا اللہ گھر سے نکلتا ہے جب الا اللہ مسلم کی یہ زندگی ہے۔

معاشرے کے تمام گوشوں میں ذکر اللہ موجود ہے......اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے معاشرہ سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے نہ تجارت کرو نہ زراعت بس اللہ اللہ کرتے رہو۔ اس تجارت وزراعت کو بھی اسلام نے اللہ اللہ بنا دیا ہے کہ جب حسن نیت سے شریعت کے مطابق تجارت ہو، زراعت، مزارعت، معاشرت، تمدن ہو، وہ خود اللہ اللہ کے اندر داخل ہے۔ وہ بھی ذکر حق ہے۔ جب اتباع سنت پایا جائے گا وہ خود ذکر اللہ ہوگا۔ بہر حال معاشرت کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس میں ذکر کی شان موجود نہ ہو، ذرا سی فکر کی ضرورت ہے دل میں یہ لگن ہو کہ میں اللہ کے لئے

کرر ہا ہوں اور آدمی جو چیز کرے اس نمونے کو سامنے رکھ لے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا ہے۔ پھر اس کی ساری زندگی ذکر اللہ ہی میں شمار ہوگی، اسے ذاکر کہا جائے گا، غافل نہیں کہا جائیگا۔ عظمت ومحبت خداوندی جب قلب میں سما جاتی ہے تو ایسے ذاکر آدمی سے جب کوئی فعل سرزد ہوگا وہ خود ذکر کے حکم میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خدمت خلق اللہ کے اندر راسخ القدم ہوگا۔ وہ ایک طرف اللہ کا ذاکر ہوگا اور ایک طرف مخلوق کا خادم ہوگا۔ ایک طرف عبادت رب ادا کرے گا۔ ایک طرف خدمت خلق ادا کرے گا اور ایک چیز اس کو دوسری طرف سے غافل نہیں بنا سکے گی، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے اور انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چل کر آدمی ولایت کے اونچے اونچے مراتب پر پہنچتا ہے۔ اس مرتبہ کا حاصل یہی ہے کہ ذکر اللہ اس کے رگ وپے میں راسخ ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھے جب بھی ذکر اللہ اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہو اور فرش زمین پر بیٹھے جب بھی ذاکر ہو۔ وہ بہترین فاخرہ لباس پہن لے جب بھی وہ ذاکر ہو، پھٹے پرانے کپڑے پہن رہا ہے جب بھی اس کا قلب ذاکر ہو کوئی چیز اس کو ذکر اللہ سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ وہ لباس خود اس کے لئے یاددہانی کا ذریعہ اور مذکر بن جاتا ہے۔

اولیاء اللہ میں بزرگی کی دو شانیں...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے طبقے کے اور بہت سے بزرگ، رامپور ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں جمع ہوئے۔ کسی ایک جگہ دعوت میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت اور شان یہ تھی کہ زہد اور ترک دنیا انتہا درجے کا تھا۔ میرے تو جدامجد ہی تھے۔ گھر میں جو واقعات میں نے سنے وہ یہ ہیں کہ حضرت کی ملک میں ایک جوڑا کپڑے سے زیادہ نہیں تھا جو بدن پر ہوتا۔ گھر بار جائیداد سب دوسرے کے حوالے کر دی تھی۔ ان کی ملک میں ایک جوڑا کپڑا جو بدن پر تھا، ایک قرآن شریف، ایک صحیح بخاری کا نسخہ اور فتوحات مکیہ کی جلد جو شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ چار چیزیں کل ان کی ملک تھیں۔

کپڑے کا جوڑا جب پھٹ پھٹا کر پرانا ہو جاتا تھا اور اس درجے پر آ جاتا تھا کہ پہننے کے قابل نہ رہے تب دوسرا جوڑا بنتا تھا اور وہ جوڑا بھی گاڑھے کا کوئی اعلیٰ لباس نہیں ہوتا تھا۔ حضرت کا طریقہ یہ تھا کہ بند دار اچکن بلا کرتے کے پہنتے تھے اور ایک جوڑ پائچے کا چوڑا پاجامہ جو پرانے زمانے میں لوگ پہنتے تھے اور ایک پرانی لنگی کندھے پر رہتی تھی۔ کپڑوں کو دھولیا اور سکھا کر پہن لیا۔ وہی ایک جوڑا تھا جب تک وہ پھٹ کر بدن سے الگ نہ ہو جائے جب تک دوسرا جوڑا نہ بنتا تھا۔

تو رامپور کی جس دعوت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں حضرت تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے کپڑا بہت پرانا ہو گیا تھا، پگڑی میں کچھ ڈورے بھی لٹک رہے تھے، یہ شان تو حضرت کی تھی۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس دن اتفاق سے بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً

پانچ سو روپے قیمت کا لباس ہوگا۔ بہترین جبہ اور بہترین عمامہ۔ تو لوگوں کی جیسی عادت ہوتی ہے دعوت میں بیٹھ کر انہوں نے کچھ تبصرے شروع کر دیئے۔ ایک نے کہا کہ بھئی! مولانا رشید احمد صاحب عالم بہت بڑے ہیں باقی بزرگی سے کیا تعلق؟ بزرگ تو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جو بالکل تارک الدنیا ہیں۔ کپڑا لباس دیکھو تو انتہائی زہد وقناعت بزرگی کی شان تو ان میں ہے اور یہ تو پانچ سو روپے کا جوڑا پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

گویا عوام الناس ان بزرگوں کو لباس سے پہچانتے ہیں۔ لباس اچھا ہے تو بزرگی ندارد ہے۔ لباس پھٹا ہوا ہے تو بزرگی موجود ہے۔ یہ ایک سطحی سی چیز ہے۔ مگر بہرحال لوگوں نے یہ تبصرہ شروع کیا۔ یہ بھنک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پڑ گئی حضرت نانوتوی کا چہرہ یہ چیز سن کر غصے میں سرخ ہو گیا اور اس شخص سے فرمایا کہ: ''جاہل! تو کیا جانے کہ بزرگ کسے کہتے ہیں تو نے کپڑوں کو دیکھ کر بزرگی سمجھی ہے؟ کپڑوں کے معیار سے تو بزرگی کو پرکھتا ہے؟'' فرمایا ''میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ پھٹا پرانا لباس نہ پہنوں، میرا نفس اپنے آپ سے باہر ہو جائے۔ اس لباس نے اسے روک رکھا ہے''۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ شخص وہ ہے کہ اگر ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تو بھی اس شخص کے نفس میں تغیر نہیں ہوگا نہ اس کے دل میں کوئی پھول پیدا ہوگی، نہ نفس پھولے گا، نہ غرور پیدا ہوگا۔ غنا کے اس درجے و مرتبے پر ان کا نفس پہنچ چکا ہے کہ بادشاہی تخت پر بٹھلا دو تب بھی یہ زاہد اور قانع ہیں۔ لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تب بھی ان کے قلب میں زہد وقناعت ہے''۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں، تب بھی وہ ذاکر ہیں۔ ایک لاکھ کا لباس ہو تب بھی ذاکر ہیں۔ ذکر قلب کی شان ہے۔ قلب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کبار محدثین میں گذرے ہیں۔ امام کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لباس بہت فاخرہ اور ٹھاٹھ دار پہنتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! بظاہر یہ زہد وقناعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا لباس پہنتے ہیں جیسے نوابوں کا فرمایا ''میں اس لئے پہنتا ہوں' اگر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لوں تو۔ ''لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَآءِ الْمُلُوْکُ'' ''یہ امیر زادے اور بادشاہ زادے مجھے ناک پوچھنے کا رومال بنا لیں''۔ میں اس لئے فاخرہ لباس پہنتا ہوں تا کہ بتلا دوں کہ جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم تم سے مستغنی ہیں کسی درجے میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ میں اس نیت سے پہنتا ہوں، تو اس نیت سے فاخرہ لباس پہننا یہ خود اطاعت وعبادت ہے۔ اس لئے اہل اللہ کا کوئی قدم بھی اطاعت وعبادت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ والوں میں بہت سے ایسے گزرے ہیں۔ جو فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن بزرگی ایک قدر مشترک تھی۔ یہاں بھی تھی، وہاں بھی تھی۔ یہاں اور نیت سے تھی وہاں اور نیت سے تھی۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں لیکن بادشاہوں کی وہ شان نہیں ہوتی تھی جوان کی شان تھی۔ مسند الگ تھی، صفائی ستھرائی الگ خدام الگ کھڑے ہوئے ہیں، دروازوں کے اوپر دربان الگ موجود ہیں اور صفائی کا یہ عالم کہ اگر ایک تنکا بھی سامنے پڑا ہوا ہوتا تھا تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ فرماتے تھے ”کوڑا کباڑ گھر کے اندر بھر رکھا ہے۔“ بہت نزاکت تھی۔

بادشاہ وقت نے ملنے کی آرزو کی۔ اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے بہت چاہا کے مجھے اجازت مل جائے ۔مگر اجازت نہیں تھی۔ آخر حضرت مرزا صاحب کے خادم خاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا: توان کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ تیرا معاملہ بہت رسوخ کا ہے تو میرے لئے ایک پانچ منٹ کی مہلت لے لے۔

اس نے کچھ اتار چڑھاؤ کر کے حضرت سے عرض کیا۔ تو پانچ منٹ کی اجازت ہوگئی کہ بادشاہ آسکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت آئے۔ بہت ادب کے ساتھ دوزانو ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے کچھ نصائح فرمائیں اس دوران میں حضرت مرزا صاحب کو پیاس معلوم ہوئی تو خادم کو پانی لانے کے لئے اشارہ کیا بادشاہ نے سمجھ لیا کہ پانی چاہتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ اگر مجھے اجازت ہو؟ اجازت ہوگئی کہ اچھا تم پانی پلاؤ، تو بادشاہ پانی لینے گئے تو گھڑے کے اوپر جو بڑولی ڈھکی ہوئی تھی۔ پانی لے کر جواسے رکھا وہ کچھ ٹیڑھی رکھی گئی بس مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا۔ فرمایا ”تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں تم بادشاہت کیسے کرتے ہو گے؟ ہٹو یہاں سے“ اپنے خادم خاص کو حکم دیا کہ وہی پانی پلائے گا۔

اس شان کے بھی بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی ولایت میں کوئی کمی نہیں۔ ولی کامل ہیں۔ ان کی نسبت و تصرف اور تربیت سے ہزاروں اولیاء بن گئے۔ ایک شان یہ ہے۔

اور ایک شان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے یہ بھی انہی کے ہمعصر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور مرزا مظہر جاناں رحمہ اللہ علیہم یہ تینوں ایک قرن کے بزرگ ہیں۔ شاہ غلام علی صاحب کا یہ حال کہ نہ گھر، نہ در، نہ کپڑا نہ لتا، زہد و قناعت اور فقر و فاقے اور اس پر مہمانوں کی یہ کثرت کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان ہر وقت ان کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ لیکن ظاہر میں ذریعہ معاش کچھ نہیں ریاست ٹونک کے نواب۔ نواب امیر خاں، وہ حضرت کے مرید تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ کے ہاں تین تین سو، چار چار سو مہمان ہوتے ہیں۔ آخر یہ کہاں سے آتا ہوگا؟ بڑی تنگی اٹھاتے ہوں گے۔ بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ تو ریاست ٹونک کا ایک ضلع جس کی ایک سال کی کئی لاکھ روپے آمدنی تھی۔ وہ پورے کا پورا حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں پیتل کے پتر پر لکھ کر بھیجا کہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں تا کہ مہمانوں اور گھر والوں کا خرچ چلے۔ آپ اسے خدا کے لئے قبول فرمالیں۔ شاہ غلام علی صاحب نے اسی پتر پر جواب لکھا اور اس پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔ لکھا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے۔ میری طرف سے انہیں کہہ دو کہ روزی مقدر ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ زہد وقناعت اور ایک طرف یہ ٹھاٹھ باٹھ جو مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے۔ ہیں وہ بھی ولی کامل، یہ بھی ولی کامل، ولایت کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ ولایت کا تعلق کپڑوں سے نہیں وہ قلب سے ہے۔ قلب جب اللہ رسیدہ بن جائے۔ وہ ولی کامل ہے۔ اپنے حسن نیت سے کوئی لباس فاخرہ پہنتا ہے اس میں بھی نیکی کی نیت مضمر ہوتی ہے، اس میں بھی مصلحت ہے۔ کسی پر زہد وقناعت کا غلبہ ہوتا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بزرگی کی دو شانیں...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں۔ آپ نے انہیں دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب اللہ کا عالم بنادے اور اس کی حکمت سکھلادے''۔ تو بڑے زبردست مفسر ہیں بلکہ تفسیر قرآن کے اندر صحابہؓ میں یکتا ہیں۔ لیکن لباس کس شان کا پہنتے تھے؟ ان کے لباس کا کپڑا اس زمانے کا بہترین کپڑا اور قیمتی ہوتا تھا۔ بڑا فاخرہ لباس ہوتا اور جس مجلس میں بیٹھتے تھے تو عجیب عطر ہوتا مجلس اس سے مہک جاتی تھی۔

اور ایک طرف ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو بدن پر کپڑا ہے ان کا مذہب یہ تھا کہ اس کے سوا دوسرا کپڑا رکھنا جائز نہیں۔ ان کی یہ شان تھی۔ جب ملک شام فتح ہوا تو شام میں تمدن تھا۔ حضرت امیر معاویہ کی حکومت تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں پہنچے وہاں تمدن، کھانے پینے کی افراط اور سب کے بہترین مکانات تھے۔ ان پر زہد وقناعت کا غلبہ، جس گھر میں جاتے اور دیکھا کہ دستر خوان پر بہترین کھانے جمع ہیں۔ بس لاٹھی لے کے سر ہو جاتے کہ اللہ کے رسولؐ کے دستر خوان پر کب دو کھانے جمع ہوئے ہیں جو تم نے جمع کر رکھے ہیں۔ تو یہ نہیں کہ امر بالمعروف کر دیں۔ لاٹھی لے کے مارپٹائی کے لئے تیار ہو جاتے۔ لوگ عظمت کرتے تھے کہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ دستر خوان اٹھ جاتا۔ لیکن لوگ تنگ آ گئے۔ اس طرح کسی کا بہترین لباس دیکھا۔ بس لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لباس کب پہنا؟ کسی کے گھر میں صندوق میں دو چار جوڑے جمع ہیں۔ لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کب چار جوڑے رکھے تھے جو تم رکھ رہے ہو؟ اور مرنے مارنے کو تیار۔ آخر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھے کہ یہ تو لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ اب لوگ اس کامل زہد وقناعت پر کیسے آ جائیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد وقناعت تھا۔ امت میں تو ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں حکم دیا جائے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ ان کی کسی سے نہ نبھے گی۔ چنانچہ وہاں سے حکم پہنچ گیا کہ ربذہ میں جا کے قیام کرو تو جنگل میں جا کے قیام کیا۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللھم علمہ الکتاب، ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۵.

چونکہ امیر المومنین کا حکم تھا اور وہ واجب الاطاعت تھا، سر جھکا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کر جنگل میں قیام کیا۔ وفات کا جب وقت آیا تو گھر میں خود تھے اور ان کی بیوی تھی۔ تیسرا کوئی نہیں تھا، بیوی رونے لگی۔ اس لئے کہ ہاتھ پلے کچھ نہیں تھا، اس لئے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ صبح کا جو کھانا کھایا، تو رات کا کھانا رکھنا جائز ہی نہیں، توکل کے خلاف ہے۔ جو بدن پر کپڑا پہنے ہوئے تھے اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔

آپ نے فرمایا: رومت۔ دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں تمہیں ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑے گا۔ ان سے کہنا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کی وفات ہوگئی ہے۔ لوگو! (سواریوں سے) اتر جاؤ اور ان کے کفن دفن کا انتظام کردو۔ بیوی باہر جا کر بیٹھ گئی۔ تو واقعی تھوڑی دیر بعد گرد اڑی اور اونٹوں پر پانچ، چھ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا۔ جب وہ ان کے گھر کے قریب پہنچا بیوی نے کہا اے لوگو! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ابوذر غفاریؓ ہیں ان کی وفات کا وقت ہے۔ آپ لوگ اتر جائیں ان کے کفن دفن کا انتظام کردیں اور نماز جنازہ پڑھادیں۔ تو ان سواروں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جلیل القدر صحابیؓ ہیں یہ سن کر کہ ابوذر غفاریؓ ہیں تو اس زور سے چلا پڑے کہ: ”صَدَقَ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ: ”وَيْحَكَ اَبِيْ ذَرٍّ يَعِيْشُ فَرِيْدًا وَيَمُوْتُ فَرِيْدًا۔“ اے ابوذر! افسوس ہے کہ تنہائی میں زندگی گزاروگے اور تنہائی میں تمہاری موت بھی آئے گی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔ وہ واقعہ سامنے آ گیا۔

اس کے بعد اندر آئے ملاقات ہوئی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ خوش ہوئے۔ فرمایا یہ میرا آخری وقت ہے۔ میرے کفن دفن کا انتظام کردو اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کفن کا کوئی سامان نہیں۔ بس یہ کرتہ اور لنگی ہے جو باندھے ہوئے ہوں، اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے حضرات سے خطاب کرکے کہا کہ ”کوئی شخص مجھے ایک چادر دے دے تا کہ اس چادر میں میں لپیٹ کر دفن کردیا جاؤں“۔ گویا اگر کفن سنت میسر نہ ہو تو کفن کفایت ہی میسر آ جائے۔

کفن سنت تو تین کپڑے ہیں۔ ازار، لنگی اور ایک قمیض ہے اور کفن کفایت یہ ہے کہ ایک ہی کپڑے میں پوری لاش کو دفن کردیا جائے۔ تو فرمایا کم سے کم کفن کفایت میسر آجائے۔ ورنہ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں۔ اور زہد وقناعت کا یہ عالم کہ فرمایا: ”تم میں سے کوئی مجھے ایک چادر دے دو، مگر وہ شخص دے جو حکومت کا ملازم محصل اور زکوۃ وصول کرنے والا نہ ہو۔“ فرمایا ”جو لوگ مالیات کے وصول کرنے کے اوپر مقرر ہیں وہ بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں یا بہت اعلیٰ مال وصول کرلاتے ہیں تو رعایا تنگ ہوتی ہے یا رعایت ومروت کرتے ہیں تو ادنیٰ درجے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ اس سے حکومت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اعتدال سے کام نہیں لیتے۔ اس واسطے اس شخص کی چادر میں قبول نہیں کروں گا جو مالیاتی تحقیق کے اوپر ملازم ہے“۔

حالانکہ وہ خلافت راشدہ کا دور ہے۔ یہ صحابہؓ ہیں جن کا تقوی اور تقدس دنیا کے لئے نمونہ اور معیار ہے۔ مگر ابوذر غفاریؓ کا تقوی یہ ہے کہ وہ اسے بھی خلاف تقوی سمجھتے ہیں کہ ایسے ملازم کا ہدیہ بھی قبول کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس دو چادریں ہیں اور وہ میری ماں کے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت ہے اور گھر ہی بنا ہوا ہے۔ فرمایا ''ہاں! بس وہ کافی ہے، ایک چادر مجھے دے دو۔'' چنانچہ وفات ہوئی اور اسی چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیئے گئے۔ ان پانچ، چھ حضرات نے جنازہ کی نماز ادا کر دی۔

تو میں عرض کر رہا ہوں ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو پانچ سو روپے کا جبہ پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کوئی جوڑا بھی موجود نہیں۔ لیکن بزرگی میں کلام نہیں ہے۔ وہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ یہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور صحابہؓ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ (رَضِیَ اللہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ)'' سارے صحابہؓ متقی، پارسا اور پاکباز ہیں اولیائے کاملین ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب اور ولی گزرے لیکن صحابیت کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ صحابیت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ ان میں بھی دونوں شانیں موجود ہیں، تو بزرگی کا تعلق لباس کے فاخرہ ہونے اور لباس کے کمتر ہونے سے نہیں ہے۔ وہ قلوب سے متعلق ہے۔ فاخرہ لباس پہننے میں بھی ان کی نیتیں اچھی ہوتی ہیں اور پھٹا پرانا لباس پہننے میں بھی اچھی نیت ہوتی ہے۔ بزرگی دونوں کا ہی قدر مشترک ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں بزرگی کی دو شانیں......اور میں تو کہتا ہوں کہ: انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون بزرگ ہے ان کی جوتیوں کے صدقے سے تو دنیا میں بزرگ بنتے ہیں۔ انبیاء آتے ہی بزرگی بانٹنے کے لئے ہیں۔ ان کے گھر سے بزرگی تقسیم ہوتی ہے۔ انبیاء میں بھی دونوں شانیں ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ ہیں اور تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہی محلات کھڑے ہوئے انکے نیچے نہریں اور دریا بہہ رہے ہیں اور ایک طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جو چیز بدن کے اوپر ہے اس کے سوا کوئی چیز ان کی ملک ہی نہیں ہے اور اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ کل سامان ان کے پاس کیا تھا؟ ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ کھانے کا وقت آتا تو وہ کھانے کا برتن تھا۔ وضو کا وقت آتا تو وہ پانی کا ظرف تھا۔ اسی میں پانی لے لیتے اسی میں پی لیتے اور اسی میں کھا لیتے۔ زندگی کا سامان ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ چمڑے کا تکیہ تھا کہ جہاں نیند آئی سر کے نیچے رکھا اور سو گئے۔ چاہے زمین ہی پر ہو۔ یہ کل مال و دولت تھا۔

ایک دن تشریف لے جا رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص دریا کے کنارے پر کھڑا چلو سے پانی پی رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر اتنی دنیا ہم نے اپنے پاس رکھی ہے کہ جس کے بغیر بھی گذر ہو سکتا تھا۔ یہ بلا پیالے کے پانی پی رہا ہے۔ وہ پیالہ بھی پھینک کے چلے گئے کہ یہ بھی میرے پاس زائد تھا صرف تکیہ باقی رہ گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے

نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر۔ یہ تکیہ دنیا کا ایک مستقل سامان ہے جو میں نے رکھ رکھا ہے اس کے بغیر بھی گزر بسر ہو سکتا ہے، کہنی رکھ کے بھی سو سکتے ہیں۔ اس دن سے وہ تکیہ بھی چھوڑ دیا۔ اب اس کے بعد سوائے ستر ڈھانپنے کے کوئی چیز باقی نہ رہی، یہ بھی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ سلیمان علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں یہاں شاہی ٹھاٹھ ہے۔ وہاں انتہائی درویشی ہے اور ان دونوں میں بزرگی اور نبوت مشترک ہے۔

تو لباس سے کسی کو پرکھنا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک یہ کہ خلاف شرع لباس ہو، اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو ہر مسلمان کو تنقید کا حق ہے کہ یہ جائز نہیں۔ پاجامہ پہنے اور وہ ٹخنوں سے نیچے ہے آپ کو نصیحت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے دن تین شخص ہوں گے جن کی طرف حق تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک شخص ''اَلْمُسْبِلُ الْمَنَّانُ'' ہے جس کے کپڑے اتنے لمبے ہوں جو ٹخنوں سے اتنے نیچے ہوں کہ گھسٹتے جا رہے ہوں۔ ①

یہ تکبر کی علامت ہے اور متکبر پر رحمت کی نظر نہیں ڈالی جائے گی، اس پر آپ اعتراض کر سکتے ہیں۔ کوئی ریشم کا لباس پہنے ہوئے ہو یہ ناجائز ہے آپ کو حق ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کے لئے خالص ریشم پہنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ چار انگشت کے اندر اندر ریشم ہو کوئی پھول بوٹے یا دھاری بنی ہوئی ہو۔ یہ تو جائز ہے لیکن خالص ریشم کا لباس یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی خلاف شرع لباس پہنے ہوئے ہو آپ کو اعتراض کا حق ہے لیکن مطلقاً کوئی شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے ہو اور آپ اس سے دلیل پکڑیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے تو ھَلاَّ شَقَقْتَ قَلْبَهٗ آپ اس کے قلب میں گھس کر دیکھ آئے ہیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے۔ لباس سے بزرگی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ مکان کے اچھے ہونے سے بزرگی کی قلت یا بزرگی سے معدوم نہیں مانا جا سکتا۔ تو انبیاء میں دونوں شانیں موجود، اولیاءؒ میں بھی موجود، صحابہؓ میں بھی موجود۔ ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے، دیکھنا اصل یہ ہے کہ قلوب کس درجے کے ہیں۔

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے:..... بہر حال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو، لباس کیسا بھی ہو۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ جاہل تو کیا جانے کہ بزرگی کسے کہتے ہیں؟ ''میرے لئے اس پھٹے پرانے لباس میں بھی اپنے نفس کے لئے مشکل اور بھاری ہے اور یہ وہ شخص ہے کہ اسے ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو، اس کے نفس میں تغیر نہیں آ سکتا''۔

یہ تو یوں کہہ رہے ہیں اور مولانا گنگوہی سے جب پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کس مقام کے ہیں، یہ فرمایا کہ: ''بھائی! ہم نے ایک ہی ساتھ پڑھا، ایک ہی استاذ کے شاگرد ہوئے، ایک ہی شیخ کے مرید ہوئے، ایک ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن باوجود اس کے وہ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ ہم ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار..... ج: ۱ ص: ۱۰۲ رقم: ۱۰۶.

پائے کہ وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں''۔

ان سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ مقام پر ہیں۔ ان سے پوچھو تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اتنے اونچے ہیں کہ میں ان کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں سب سے زیادہ بڑا ہوں۔ یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ بزرگی میں نہ دعویٰ وادعاء ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ ترک دعویٰ اور ترک شیخی کا نام بزرگی ہے۔ جب یہ پیدا ہو، کہا جائے گا بزرگی ہے۔

آج ہم اپنی حالت کو دیکھیں، ہر شخص یوں کہتا ہے کہ: میں اچھا ہوں اور یہ برا ہے اور قدیم مسلمانوں کا یہ دستور تھا کہ ہر شخص یوں جانتا تھا کہ یہ اچھا ہے اور ساری برائیاں میرے اندر ہیں۔ اس واسطے عالم میں امن تھا۔ آج ہم دوسرے کو حقیر اور اپنے کو بڑا جانتے ہیں اور اپنے کو بڑا جان کو دوسرے پر ہم ہر قسم کی زیادتی جائز رکھتے ہیں۔ تو دنیا فساد کا گھرانہ بن گئی۔ ہم نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور قدیم بزرگوں نے امن سے بھر رکھا تھا۔ ان میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ وہاں بزرگی کے معنی یہ تھے کہ اپنے نفس کی تحقیر ہو اور دوسرے کی عظمت جہاں فرمایا گیا ''ظُنُّوا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا'' ''ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان اور حسن ظن رکھو''۔ اگر کوئی برائی بھی سننے میں آئے اس کی تاویل کرو کہ نہیں یہ نہیں یہ مطلب ہوگا۔

اچھے مطلب پر محمول کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی کی نیک عبادت بھی ہو تو توڑ مروڑ کر ایسے معنی بیان کریں کہ کسی طرح اس پر الزام آ جائے۔ یہ قلب کے کھوٹ کی دلیل ہوتی ہے۔ ورنہ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر کسی کا قول، فعل یا کسی کی عبارت کچھ مبہم بھی ہو تو اس کو ایسے معنی پہناؤ کہ اس کی بریت ثابت ہو نہ یہ کہ وہ مجرم بن جائے۔

اس واسطے علماء لکھتے ہیں کہ: کسی مسلمان سے حسن ظن قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن بدظنی قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک ہاتھ میں حجت نہ ہو کسی سے بدگمانی پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب اپنے نفس کی حقارت اور دوسرے کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہو۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں، دوسرا بڑا ہے۔ فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو حقیر ہے وہ کہے گا تو ذلیل ہے میں عزت دار ہوں، فساد شروع ہو جائے گا، جب آپ یوں کہیں کہ بڑے آپ ہی ہیں، وہ کہے نہیں بڑے آپ ہی ہیں۔ پھر نزاع کیسے ہوگا؟ لڑائی کہاں سے ہوگی تو تواضع کے اندر امن ہے اور تکبر کے اندر خلل امن اور بدامنی ہے۔ جہاں کہیں آپ فساد دیکھیں سر پھٹول دیکھیں سمجھ لیں کہ کسی متکبر کا وجود درمیان میں آ گیا ہے۔ متواضع جب ہوگا تو وہاں بدامنی کے کوئی معنی نہیں۔ وہاں تو امن ہی امن قائم ہوگا، فلاح ہی فلاح ہوگی۔ مومن کو تواضع سکھلائی گئی ہے، تکبر نہیں سکھلایا گیا۔

عظمت و کبریائی صرف اللہ کی شان ہے..... تکبر اللہ کی شان ہے۔ خدا کے سوا کسی کے لئے تکبر زیبا نہیں،

وہی فرما سکتے ہیں ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ① "زمین اور آسمان کے اندر سب بڑائیاں ان کے لئے ہیں"۔ انہی کا نام ﴿اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ ہے وہی تکبر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کسی کو طالب علمانہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو یہ حکم دیا گیا کہ "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ② "اللہ کے اخلاق اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرو"۔ وہ رحیم و کریم ہے تو تم بھی اپنے اندر رحم و کرم پیدا کرو۔ وہ علیم و خبیر ہے تو تم بھی اپنے اندر علم و خبر پیدا کرو۔ جہالت دور کرو۔ وہ لطیف ہے تو تم بھی اپنے اندر لطافت اور ستھرائی پیدا کرو۔ وہ حافظ و حسیب ہے۔ تو تم بھی اپنے بھائیوں کے محافظ بنو۔

جب یہ حکم ہے تو اللہ کی صفات میں سے متکبر ہونا بھی ایک صفت ہے۔ پھر چاہئے کہ ہر شخص متکبر بھی بنے۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ تکبر کرنا بہت بری بات ہے۔ تو ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ تکبر تو اللہ کی شان ہے۔ وہ بری تھوڑا ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو وہ سچے ہیں اور جب میں یوں کہوں گا کہ میں بڑا ہوں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ تو جھوٹ بولنا بری بات ہے تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ خدا کے سوا جو تکبر اور بڑائی کا دعویٰ کرے گا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ تو جھوٹ سے بچایا گیا ہے اس لئے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ③ اپنی جگہ صحیح ہے اور تکبر اور برائی کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ ہرگز بڑائی مت کرو، جھوٹے بن جاؤ گے۔ لیکن جب متواضع بنو گے تو اللہ خود بخود بڑائی دے دے گا۔ دنیا سمجھے گی کہ تم بڑے ہو۔ تمہارے اندر بڑائی آ گئی۔ تو ایک ہے بڑا بننے کا دعویٰ کرنا اور ایک عنداللہ بڑا بن جانا ہے تو عنداللہ بڑے بن جاؤ۔ اللہ تمہیں بڑائی دے دے، یہ بڑائی قابل قبول ہے لیکن تم خود ہی کہنے لگو کہ میں بڑا ہوں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا مقابلہ ہے۔ جس کو ایک حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: "اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظَمَةُ إِزَارِيْ وَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ" ④ "تکبر میری چادر ہے، عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے جو اس میں کھینچا تانی کرے گا۔ میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچا دکھاؤں گا"۔ تو جو بھی بڑا بول بولتا ہے ہاتھ کے ہاتھ اسی مجلس میں اسے سزا مل جاتی ہے۔ چار آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی تذلیل کے درپے ہو جاتے ہیں اور جو چھوٹا بول بولتا ہے کہ میں ہیچ ہوں، میں حقیر ہوں۔ دوسرے تعریفیں کرتے ہیں کہ نہیں آپ بڑے ہیں، آپ بزرگ ہیں۔ آپ ایسے اور ایسے ہیں۔ تو بڑائی کا بول بولنا، دعویٰ کرنا، تذلیل کی علامت ہے۔ دوسرے یقیناً ذلیل سمجھیں گے۔ چھوٹا بنے گا تو دوسرے بڑا سمجھیں گے بڑائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دعوے کرے بلکہ دعویٰ ترک کر دے خود بخود بڑائی آ جائے گی۔ تو "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" میں اگر بزرگی لینی ہے تو اس کا راستہ تواضع ہے۔ تکبر اور کبریائی نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۵ سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۳۷. ② ③ احیاء علوم الدین، باب بیان ان المستحق للمحبۃ ھو اللہ وحدہ ج: ۳ ص: ۴۰۰. ④ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر، ج: ۱ ص: ۵۹ رقم: ۲۵۹۵.

جیسے آپ کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ جب چڑھیں گے تو جھک کے چڑھنا پڑے گا اور جب اتریں، تو جب تک اکڑیں گے نہیں اتر نا مشکل ہوگا۔ یہ اس کی علامت ہے کہ اونچائی پر جب پہنچ سکتے ہو جب جھک کے چلو، جب اکڑو گے تو نیچے کی طرف جاؤ گے۔ اوپر نہیں جاسکتے۔ آدمی جتنا اکڑے گا زمین میں دھنسے گا۔ جتنا جھکے گا اتنا بلندی کے اوپر پہنچے گا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ۔

پستی سے سربلند ہوا اور اوسرکشی سے پست   اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جتنا کوئی بڑا بننا چاہتا ہے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور جو بے چارہ خود گر جاتا ہے اسے اوپر اٹھا دیتے ہیں اور بلند بنا دیتے ہیں۔

''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ① ''جو اللہ کے لئے نیچا بننا چاہے اللہ اسے اونچا کرتا ہے''۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی بندہ دعویٰ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی، میں نے حج کیا۔ میں نے اتنی نیکیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ نامعقول! تو نے کیا کیا؟ توفیق میں نے دی، عقل تیرے اندر میں نے پیدا کی، ارادہ میں نے پیدا کیا تو نے کیا کیا؟

اور اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اگر میں نے نماز پڑھی تو تو نے ہی توفیق دی تھی، تو نے ہی راستہ مہیا کیا تھا، تو نے ہی مجھے ہمت دی تھی۔ ساری بات خوبیوں کی تیری طرف ہے مجھ سے کچھ نہیں ہوسکا۔ اس کو فرماتے ہیں کہ نہیں چل کے تو ہی گیا تھا، مسجد تک تو ہی گیا تھا، حج کا ارادہ تو نے کیا تھا۔ اس کو سراہتے ہیں اور اونچا اٹھاتے ہیں۔ تو جو جھکتا ہے اسے اونچا کرتے ہیں۔ جو خود اونچا بننا چاہتا ہے اسے جھکا دیتے ہیں۔ اس لئے عزت پانے کا راستہ جھکاؤ ہے عزت یوں نہیں آیا کرتی کہ آپ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں کہ کرد میری عزت نہیں تو ماروں گا۔ یہ عزت کا طریقہ نہیں عزت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کی عزت کریں وہ تمہاری عزت کرے گا۔ تو معزز بن جاؤ گے تم ڈنڈے سے دوسرے کی تذلیل کرو اور کہو میری عزت کرو۔ یہ تو خود اپنی ذلت اور رسوائی مول لینا ہے۔

تواضع علامت آدمیت ہے...... بہر حال جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو، اس وقت تک صحیح معنی میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی۔ مخلوق کی تذلیل وتحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے، تو ایک طرف عظمت خداوندی دل میں ہو اور ایک طرف خدمت خلق اللہ ہو اور خادم خلق نہیں بن سکتا، جب تک کہ متواضع، منکسر المزاج نہ ہو جب تک یہ نہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں۔ اب راستے میں کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک متکبر کانٹے کو اٹھانے کے لئے کبھی نہیں جھکے گا سمجھے گا میری شان کے خلاف ہے۔ میری حیثیت عرفی بہت بلند ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، ج: ۶ ص: ۱۰۰۱ رقم: ۲۵۸۸۔

متواضع ہے تو وہ جھک کر کانچ کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے اٹھا پھینکے گا تا کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ یہ خدمت وہ سر انجام دے گا جس کے قلب کے اندر تواضع اور انکساری موجود ہوگی، کبر اور ریا کاری جس کے اندر ہوگی، وہ کبھی یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔ بہر خدمت خلق اللہ کا جذبہ تب موجود ہوگا، جب دل میں تواضع للہ کا جذبہ موجود ہو، منکسر المزاج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملالے گا، کبھی تواضع نہیں کرے گا۔ اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی۔ آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہوگئی۔ حکم دیا گیا تھا کہ درخت مت کھاؤ۔ بھول کر کھالیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی۔ نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ یہ نہیں ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے۔ مگر شکل کیا پیش آئی؟ ایک تو کمبخت شیطان نے آکے قسم کھائی ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① "قسم کھاکے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں"۔ آدم علیہ السلام کا سچا قلب، آپ کسی فریب سے واقف نہیں۔ مقام جنت میں ہیں، جو کریم مقام ہے۔ یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے۔ دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ خدا کا نام لے کر قسم کھارہا ہے۔ بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے؟ ان کے ذہن میں یہ آیا۔

ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ تھے۔ حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے ایک محدث تھے، انکے نانا تھے۔ بالکل مادرزاد ولی اور معصوم فطرت بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے ہی نہیں۔ ایک جگہ کھونٹی گاڑ رکھی تھی دھوپ وہاں تک پہنچ جاتی۔ کہتے کہ جاؤ بھئی! چھٹی کا وقت آ گیا لڑکے شرارت کر کے کھونٹی آگے گاڑ دیتے۔ دھوپ جلدی پہنچ جاتی اور کہتے میاں جی صاحب! چھٹی دے دو، وقت ہوگیا فرماتے اچھا جاؤ چھٹی۔

لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ بچے جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے کھونٹی آگے گاڑ دی ہے فرماتے: مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا، مسلمان بچے کا یہ کام نہیں۔ فرماتے، بس بھئی تم جاؤ۔ تو واقعی جس کے دل میں اسلام اور سچائی ہوتی ہے۔ حسن ظن کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہی نہیں۔ سمجھتا ہے کہ سچ ہی بول رہا ہوگا۔ جب خدا کی قسم کھا کر کہے تب تو وہم بھی نہیں جاتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو شیطان ملعون ہے سب کچھ ہے مگر جب اس نے اللہ کی قسم کھائی آدم علیہ السلام کا دل پگھل گیا۔ فرمایا: خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنا مشکل معلوم ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ مجھے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کی گئی تھی اور یہ فرمادیا گیا تھا کہ یہ درخت مت کھانا کہیں حکم کی خلاف ورزی نہ ہوجائے۔ تو اس نے تاویل سمجھائی، یہ کہا کہ یہ حکم موبد نہیں تھا کہ ہمیشہ

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

ہمیشہ کے لئے ہو۔ یہ حکم محدود وقت کے لئے تھا۔ اس لئے حکم دیا گیا تھا کہ اس درخت کو کھانے کی آپ میں صلاحیت نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے اس درخت کے کھانے کی استعداد پیدا ہوگئی ہے اور جب آپ کھا لیں گے تو ابدالآ باد تک جنت میں رہیں گے۔

تو جنت مقام کریم وسکون ہے۔ اس میں رہنے کی تمنا آدم علیہ السلام کی فطرت کا جذبہ تھا اور قسم کھا کے اس نے خیر خواہی جتلائی اور تاویل سمجھائی کہ یہ ممانعت وقتی تھی، دوامی نہیں تھی۔ ان چیزوں سے گھبرا کر درخت کھالیا تھا۔ اسے نافرمانی نہیں کہتے۔ صورۃً تو نافرمانی ہے مگر حقیقتاً نافرمانی نہیں۔ اسے لغزش، خطاء فکری یا خطاء اجتہادی کہیں گے۔ عصیان اور نافرمانی نہیں کہیں گے۔

اور حق تعالیٰ نے بھی تعبیر فرمادیا کہ ﴿وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ ① ”آدم نے نافرمانی کی“۔ حقیقت میں آدم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں۔ مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی، اور مقرب بندے۔ مقربین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدت تعلق کی بنا پر زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے آپ برا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام ہی یہ ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے، دھول مارنے کو تیار ہو جائیں گے کہ تو اپنا ہو کر یہ کام کرتا ہے تو شدت تعلق کی بنا پر تھوڑی سے بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں، پیغمبر ہیں۔ انہوں نے لغزش کر کے درخت کھالیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی کر رہے ہو۔ یعنی اتنے مقرب ہو کر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقتہً وہ عصیان نہیں تھا۔ خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔

تو ایک طرف ابلیس سے خطا سرزد ہوئی۔ فرمایا گیا تھا کہ تو آدم کو سجدہ کر، اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ السلام سے بھی خطا سرزد ہوئی۔ مگر فرق کیا تھا؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا کہ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ ② اے اللہ! میں نے کیا جب میں مجرم، نہیں کیا جب میں مجرم، جب تک آپ نہیں بخشیں گے میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔

﴿وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ③ ”اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے تو میں ٹوٹے اور گھاٹے والوں میں سے ہو جاؤں گا“۔ میرے پنپنے کی کوئی صورت نہیں بہر حال ہر حالت میں خطا کار ہوں تو اعتراف خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا ابدالآباد کے لئے مقبول بنائے گئے ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگان الٰہی مقبول بنے اور ان سے جنت آباد ہوگی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کیا کہ یہ کہا ہو مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی کہ آپ کہتے ہیں کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا۔ جھکنا خاک کا کام ہوتا ہے آگ کا کام نہیں۔ میں کیسے آدم کے سامنے جھک جاؤں؟ گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابدالآباد کے لئے ملعون بنادیا گیا۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۱. ② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳. ③ پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳.

تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع وانکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی۔ شیطان کبر وریاء سے پیش آیا ابدالآباد کے لئے ملعون بن گیا۔

اس نے کہا تھا ﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ ① میں بہتر ہوں۔ آدم بہتر نہیں ہے انانیت وہاں سے چلی۔ جو انانیت برتتا ہے وہ گویا اپنا نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ رہا ہے اور جو کہتا ہے کہ میں ہیچ اور خاکسار ہوں، وہ آدم کا بیٹا ہے کیونکہ انکسار کرنا اور تواضع للہ کرنا آدم علیہ السلام ہی کا کام تھا۔

حدیث میں فرمایا گیا: "انتم بَنُوْا اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ." ② "تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں" تو مٹی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اچھل اچھل کر اوپر جائے۔ وہ جتنی پامال ہوگی اتنی ہی کارآمد ہوگی۔ اگر وہ اڑ کر کپڑوں پر پڑی، آپ لعنت برسائیں گے، کپڑے جھٹک دیں گے اگر آنکھوں میں پڑی تو برا بھلا کہیں گے اور آنکھوں کو دھوئیں گے۔ جوتوں کے نیچے رہے گی تو باعزت رہے گی اور چڑھے گی تو بے عزت بن جائے گی۔

انسان بھی ایسا ہے کہ جتنا متواضع ہو کر مٹی بن جائے سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور اگر وہ سروں پر چڑھنے لگے تو اسے پٹخ کر پامال کر دیتے ہیں پیروں کے نیچے آجاتا ہے تو متکبر بننا درحقیقت نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔ متواضع بننا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت کرنا ہے۔ جتنا آدم کے ہم بیٹے بنیں گے۔ اتنا ہی عزت پائیں گے۔ جتنا اپنے کو کبر وانانیت سے نسبت دیں گے اتنا ہی پامال کئے جائیں گے۔

مخلوق خدا کی خدمت وہ کر سکتا ہے جس میں انانیت نہ ہو۔ جو یوں کہے کہ ﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ ③ اسے کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کو ایذا رسانی سے بچانے کے لئے مٹی، ڈھیلے، کانچ، کانٹے اٹھا کے پھینک دے۔ وہ کہے گا میں سب سے بہتر ہوں (سب کو چاہئے میری خدمت کریں، میں کسی کی خدمت کیوں کروں، اس لئے) میں کیوں کانٹوں کو اٹھاؤں۔ لیکن متواضع آدمی کہے گا کہ میں تو خدمت خلق کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں خدمت کروں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دو رکن ہیں ایک "اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اللہ کے اوامر کی عظمت اور وہ پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی بزرگی وعظمت سے دل لبریز نہ ہو جائے۔ دوسرا "اَلشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ" مخلوق خدا پر شفقت کرنا، ترس کھانا اور اس کی خدمت کرنا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تواضع للہ کا جذبہ نہ ہو۔ جب تک اپنی ہیچ دانی اپنے اندر نہ ہو، انانیت نہ ہو۔ جب یہ دو باتیں جمع ہو جائیں گی۔ کہا جائے گا کہ اس کے اندر ایمان ہے اور ایمان بھی کمال درجے کا ہے۔ کہ اِدھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق میں شامل اِدھر اللہ سے ملا ہوا

---

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶. ② السنن للامام الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۵، ص: ۳۸۹ رقم: ۳۲۷۰. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۷ ص: ۱۱۵ رقم: ۲۶۶۸. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶.

ہے اُدھر مخلوق میں ملا ہوا ہے۔ اللہ تک پہنچنے سے اس میں یہ کبر نہیں آتا کہ میں تو مقبولان الٰہی میں سے ہوں۔ یہ مخلوق میرے رتبے کی نہیں اسے پامال کردے اور مخلوق میں آ کر یہ بات نہیں کہتا کہ میں رات دن چین اڑا رہا ہوں مجھے اللہ کی بندگی سے کیا واسطہ؟ بندگی میں بھی کامل، خدمت میں بھی کامل ہو تو ایمان بھی اسی کا کامل ہوگا۔

حیاء دار آدمی ہی عبادت و خدمت کرسکتا ہے..... مگر یہ کون کرسکتا ہے؟ جس کے اندر اللہ سے حیا موجود ہو جو حیادار ہو۔ کوئی بے حیا و بے غیرت ہو جائے، وہ نہ عبادت کی طرف متوجہ ہوگا نہ خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ تو عظیم چیز حیا ہے اور حیا کی حقیقت وہی انکسار نفس کہ نفس میں انکسار ہو، نفس ٹوٹ رہا ہو اور اپنے کو دوسرے کی عظمت کے سامنے ہیچ سمجھ رہا ہو۔

تو ایمان اس زمین پر آتا ہے جس زمین میں حیاء موجود ہو، اس قلب میں گھر کرتا ہے جس قلب کے اندر حیاء موجود ہو۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً'' ① ''ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں'' اوپر کی شاخ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں ہے اور ایمان کا ادنیٰ درجہ ''اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ.'' ہے یعنی راستے سے ایذا دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تا کہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا جو مخلوق سے ملا ہوا ہے۔ اور دونوں کا منشاء بتلا دیا۔ ''وَالْحَيَآءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ'' ② یہ دونوں شعبے وہ برتے گا' جس میں حیاء اور انکسار نفس موجود ہو اور جس میں حیاء نہیں تو ''اِذَا فَاتَكَ الْحَيَآءُ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ'' ③ ''جب آدمی سے حیاء جاتی رہتی ہے تو پھر جو چاہے کرے''۔ پھر قلب کے اندر زندگی باقی نہیں رہتی۔ بس جو کرتا ہے کرتا رہتا ہے۔

تو اس حدیث میں مومن کامل بننے کی ہدایت دی گئی اور اس کے لئے ایک طرف عبادات خداوندی ہے اس کا اعلیٰ قول ہے کہ زبان سے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے اور جب زبان سے پڑھنے کا عادی ہوگا تو یقیناً قلب میں بھی توحید جمے گی اور جب قلب میں جم جائے گی تو ہر فعل سے توحید سرزد ہوگی۔ مترشح ہوگی اور نکلے گی۔ ہر فعل میں توحید رچ جائے گی۔ پھر ہر موقعہ پر ذکر اس کے اندر ہوگا۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے وہ ذاکر بن جائے گا۔

دوسری چیز فرمائی خدمت خلق اللہ ہے۔ اس کا بھی تعلق حیاء سے ہوگا۔ جتنا حیاء دار ہوگا اتنا مخلوق سے شفقت سے پیش آئے گا اور اس کی خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ حدیث میں نے اس وقت تلاوت کی تھی اور اس کے

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

③ الحدیث اخرجه البخاری فی صحیحه ولفظه: اذالم تستحی فاصنع ماشئت، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار ج: ۱۱ ص: ۳۰۳.

متعلق یہ چند جملے عرض کئے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ میں زیادہ نہیں بول سکوں گا اور اب بھی کچھ زیادہ ہی ہوگیا۔ مگر بہرحال اتنے پر قناعت ہے۔حق تعالیٰ ہمیں آپ سب کو کمال ایمان کی اور حیا کی توفیق دے۔(آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

تعلیم و تبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّـا بَعْـدُ: بزرگانِ محترم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی، مکی زندگی تیرہ برس کی ہے اور مدنی زندگی دس برس کی ہے۔

مکی زندگی...... مکی زندگی تکالیف ومشکلات، پریشانیوں اور کلفتوں کی ایک طویل صبر آزما زندگی ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی نبی کو اپنی قوم سے وہ ایذائیں اور تکلیفیں نہیں پہنچیں جو مجھ کو میری قوم سے پہنچی ہیں"۔ لیکن ان تمام تکالیف کے بعد بھی آپ دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی انہماک اور لگن سے کرتے رہے مشرکین کے ایمان نہ لانے سے آپکے دل میں جو ضیق وتنگی پیدا ہوئی تھی اس پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آپ اپنے دل کو ان پر نہ کڑائیے بلکہ اپنے کام میں لگے رہئے۔ آپ خدا کے حکم پر عمل کرتے رہے اور اس کی حمد وتعریف اور اس کے بھیجے ہوئے مذہب کی تبلیغ میں لگے رہے، آپؐ کو مجنون، کاہن، جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا، آپؐ پر پتھر پھینکے گئے، آپ کو زہر دیا گیا، کوئی نازیبا حرکت نہ تھی جو آپ کے ساتھ نہ کی گئی ہو، لیکن ان سب کے باوجود آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نہایت صبر وثبات کے ساتھ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سعی وکوشش کرتے رہے، خدا کی طرف سے بھی آپ کو یہی حکم ملا کہ ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ﴾ ① ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا﴾ ② "آپ صبر کیجئے جیسا کہ آپ سے قبل دوسرے اولوالعزم وصاحب ہمت لوگوں نے صبر کیا" صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے اور اگر اس پر بھی یہ جاہل اعتراض کریں تو آپ ان پر اپنے دل کو نہ کڑائیے ﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ ③ "آپ ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجے گئے"۔

جہادِ کبیر...... یہ بات اسلام کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ پٹتے رہنے اور مصائب وتکالیف برداشت کرنے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا، بات یہ نہیں بلکہ خدا کا یہ حکم تھا کہ ہر قسم کی تکالیف ومصائب کو برداشت کرو اور زبان سے

① پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵. ② پارہ: ۲۹ ،سورۃ المعارج، الآیۃ: ۵. ③ پارہ: ۳۰ ،سورۃ الغاشیۃ: ۲۲.

اُف بھی نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جواب نہ دیا جائے، جواب دیا جائے اور اس سے بھی سخت دیا جائے اگر تلوار سے جسم پر حملہ کیا جائے تو اس کا جواب زبان سے روح پر حملہ کر کے دیا جائے۔ اگر تکلیف پہنچائی جائے تو دین کی بات انہیں پہنچا کر تکلیف پہنچائی جائے، عربی شاعر نے کیا خوب کہا

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ وَلَا يَلْتَامُ مَاجَرَحَ اللِّسَانُ

''یعنی نیزوں کے لگے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے لگے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں''۔ انکا اندمال نہیں، یہ زبان کا جہاد بڑا جہاد ہے۔ اسے جہاد کبیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ جہاد جو تلوار لے کر کیا جاتا ہے اس میں منٹوں کا قصہ ہوتا ہے اور تکلیف بھی تھوڑی دیر کی، لیکن دین کی دعوت کا جو جہاد زبان سے کیا جاتا ہے وہ اذیت و تکلیف کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اس میں تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانا اور ہر لحہ قتل ہونا ہے۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا بہادر کون ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ جو حملہ کر کے قتل کر دے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں جو اپنے نفس کو قتل کر دے، یہ دعوت کا کام جہاد کبیر ہے، اس میں انسان طعنے سنتا، گالیاں کھاتا، تکلیفیں اٹھاتا، مصیبتیں جھیلتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے اور میدان کارزار میں آدمی جا کر جنگ کرتا ہے پھر یا تو قتل کرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے۔

انقلابِ عظیم...... اسلام نے اپنے متبعین کو صبر و تحمل کی تعلیم دے کر جبن و بزدلی کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ بہادری اور اولوالعزمی کی طرف بلایا ہے اور اپنے مشن کیلئے ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے اور بتلا دیا ہے کہ کامیابی و کامرانی شدائد و مصائب پر اسی طرح صبر و تحمل کرنے سے ملتی ہے، مکہ کی زندگی کو دیکھئے، تیرہ آدمی مسلمان ہوئے یہ سب حضرت ارقم کے گھر میں بند رہتے زنجیریں چڑھائے رکھتے، عدد کے اعتبار سے بھی کم، شوکت وسطوت بھی ندارد، لیکن دین کی تبلیغ میں لگے رہے، حق کی طرف بلاتے رہے، تکلیفیں اور مصائب جھیلتے رہے اور اپنی زبان سے کفار کے قلب وجگر پر نشتر زنی کرتے رہے، بالآخر ان کی پیہم سعی اور مسلسل کوشش سے ایک عظیم انقلاب آیا، اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ ذلت وخواری کی جگہ عظمت ورفعت نے لے لی، یہ تبدیلی تلوار کے جہاد سے رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ زبان کے اس جہاد سے ہوئی تھی جسے جہاد عظیم کہا گیا ہے اور کیسے ہوئی؟ اس طرح ہوئی کہ وہ لوگ مصائب کو جھیل گئے مگر حوصلہ نہیں چھوڑا۔

آج کی ہماری زندگی مشابہ ہے مکہ کی زندگی سے بالکل وہ حال تو نہیں جو وہاں تھا، یہاں ہماری جائدادیں ہیں، ہمیں قانونی حقوق حاصل ہیں۔ ہم جو پیشہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اسلام کی شوکت اور اسلام کا حکم نہیں ہے، تمدن تہذیب کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی ہے لیکن وہی بات خدا کے نام پر نہیں مانی جاتی خدا کا نام لے کر کچھ نہیں منوایا جا سکتا۔ تمدن وتہذیب کے نام پر ہر بات منوائی جا سکتی ہے ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ

الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ﴾ ① ''سارا غصہ، سارا شکوہ صرف اس وجہ سے ہے کہ خدا کا نام لیا جاتا ہے'' یہاں مادہ پرستی ہے، وطن پرستی ہے، لیکن خدا پرستی نہیں ہے اس زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ آج ہم اور آپ تلوار سے طاقت پیدا نہیں کر سکتے بلکہ صرف خدا کی طرف دعوت دے کر طاقت وقوت پیدا کر سکتے ہیں۔ آج ہماری کامیابی وکامرانی و فلاح اس دعوتی کام میں مضمر ہے، دعوت وتبلیغ کا یہ کام ہماری زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب لاسکتا ہے اور ہم میں وہ قوت پیدا کرسکتا ہے کہ جو ہم سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔

ہماری نجات کا ذریعہ...... حق بات کو دوسروں تک پہنچانا اور دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی امانت اور دیانت سے کرنا خدا کا حکم ہے اور خدا کا کام کرنے والا خدا کی نگرانی میں ہے۔ اگر دل میں یہ تصور جاگ اٹھے کہ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس بات کا ڈر اور کس کا خوف؟ گورنمنٹ کا ایک ادنیٰ ملازم جب سرکاری کام پر ہوتا ہے تو وہ کتنا جری ہوتا ہے اس کی تمام جرات صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم ہے، اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے سرکار پر حملہ کیا۔ یہی تصور دین کا کام کرتے وقت ہمارے دل میں ہونا چاہئے۔ ہم اس ملک میں اور ان حالات میں اگر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں تو صرف مذہب کے نام سے، اس کے علاوہ ہماری نجات کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ② قسم ہے زمانے کی زمانہ چلا آ رہا ہے اور چلا جائے گا، زمانہ مکانیات پر چھا گیا ہے، مکان اپنی جگہ قائم ہے اور زمانہ پیہم گردش میں ہے سب سے زیادہ وسیع محرف زمانہ ہے، ازل سے قبل کا ہے اور انتہاء کا علم نہیں زمانہ کا پھیلاؤ بہت زیادہ، خدا تعالیٰ زمانہ کی قسم کھاتا ہے اور قسم گواہ کے قائم مقام ہے یعنی خدا تعالیٰ زمانہ کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ انسان ٹوٹے اور گھاٹے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے نیک اعمال کئے، ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے علاوہ تمام لوگ خسارہ ونقصان میں ہیں۔

قوتِ ایمان...... تاریخ دیکھی جائے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک فتح ان ہی قوتوں کو ہوئی جو ایمان والے تھے اور جن لوگوں نے ایمان والوں کی مخالفت کی، ان کو تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں وہ ذلیل وخوار ہوئے، فرعون، ہامان، شداد، ابوجہل، ابولہب اور ان جیسے تمام مال ودولت والے جنہوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ایمان والوں کو ستایا، پریشان کیا اور ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی لیکن انجام کار خود ہی ذلت وخواری سے دوچار ہوئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب...... اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو ایمان والا بننا پڑے گا قرآن پاک نے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی﴾ ③ ''یعنی انسان کو اس کی سعی وکوشش ہی کام دے گی'' کسی دوسرے کی سعی کام نہ آئے گی۔ لیکن اس کے برخلاف حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ثواب دوسروں کو

① پارہ: ۳۰، سورۃ البروج، الآیۃ: ۸۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العصر۔ ③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

پہنچایا جائے تو ثواب دوسروں کو پہنچ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کی سعی دوسرے کے کام آتی ہے۔اس طرح حدیث وقرآن میں تعارض واقع ہوتا ہے۔

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب جوایک خدا ترس عالم تھے۔انہوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ: میں نے جلالین میں قرآن کی یہ آیت پڑھی اور حدیث کی ایک کتاب میں ایصالِ ثواب کی یہ حدیث دیکھی،دونوں میں تعارض نظر آیا۔ بہت سوچا،کتابیں دیکھی لیکن کسی طرح اس کا حل سمجھ نہ آسکا۔رات کوسونے کے لئے گھر گیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اگر رات کوموت آ گئی تو دوصورتوں میں سے ایک یقینی ہے یا تو حدیث کا انکار لازم آتا ہے یا پھر قرآن کا اوران دوصورتوں میں ایمان کی سلامتی نہیں، یہ خیال آتے ہی بستر چھوڑ دیا اور پیدل گنگوہ کا سفر کیا،۲۲ کوس کا سفر رات بھر میں کر کے صبح تڑکے گنگوہ پہنچا،مولانا گنگوہیؒ جو کہ ضعیف ہو چکے تھے بینائی جا چکی تھی اس وقت وضوفرمارہے تھے،فرمایا کہ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا کہ اس آیت اور حدیث میں تعارض واقع ہوگیا ہے اوراس کا حل سمجھ میں نہیں آرہا ہے، اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا قرآن کی اس آیت ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ ① سے نفسِ ایمان مراد ہے یعنی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لائے تو کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہیں آئے گا اور حدیث سے مراد عمل ہے،ایمان کسی کو نہیں بخشا جاسکتا،عمل بخشا جاسکتا ہے۔

عام تبلیغ ہر شخص پر ضروری ہے...... اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ: انسان خسارہ میں ہے مگر صرف اہل ایمان اور وہ لوگ اس سے مستثنٰی ہیں، جوایک دوسرے کوحق وصبر کی وصیت کریں اور دوسروں کو صالح ونیکوکار بنانے کی کوشش کریں، دین کی تبلیغ واشاعت کا کام اس لئے شروع کیا گیا، کیونکہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ کام صرف علماء سے متعلق ہے، وہ مسائل جن میں اختلاف ہوانہیں نہ بیان کیا جائے بلکہ علماء اس کو بوقت ضرورت بیان کریں اور عام تبلیغ ہر شخص پر لازمی ہے امت محمدیہ کے ہر فرد سے اس ذمہ داری کو لازم ٹھہرایا گیا ہے ارشاد ہے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② اس آیت میں اس امت کو مخاطب بنایا گیا ہے اور "لِلنَّاسِ" کہا گیا ہے "لِلْمُسْلِمِيْنَ" نہیں کہا گیا۔

تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ...... ہندوستان میں اس وقت دعوت وتبلیغ کے کام کو چند سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع کیا۔خدا تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر اس کا القاء کیا انہوں نے تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ اختیار کیا۔کیونکہ دستور ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر ایک بات کہتے ہیں یا کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر خاص طور پر پڑتا ہے،ایک ہی بات کو جب مختلف لوگ مختلف وقتوں میں کہتے ہیں تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہے حق تعالیٰ نے سورۂ یاسین میں ارشاد فرمایا ہے ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ

① پارہ:۲۷،سورۃالنجم،الآیۃ:۳۹. ② پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۱۱۰.

﴿فَقَالُوْآ اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ ① "جب ہم نے انکے پاس دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے تیسرا رسول بھیج کران کو سرفراز کیا، انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں"۔

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے دعوت کے کام میں جماعتی طریقہ اپنایا، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ آج کا دور اجتماعی دور ہے، کھیل کود، صنعت وتجارت وزراعت غرض ہر چیز میں اجتماعیت پائی جاتی ہے، ہر مسئلہ میں وفود جاتے ہیں میٹنگیں ہوتی ہیں ہر جگہ جماعتی رنگ دکھلائی دیتا ہے، اس جماعتی ماحول میں انفرادی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا، یہی کچھ سوچ سمجھ کر مولانا مرحومؒ نے اس جماعتی کام کو جماعتی ڈھنگ سے شروع کیا، جب جماعت بنا کر کچھ لوگ کسی آدمی کے پاس جاتے ہیں اور اس حال میں کہ کاندھوں پر بستر لدے ہوئے پیدل چل کر آ رہے ہیں، محنت ومشقت کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں، لامحالہ وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ انہیں مجھ سے کوئی غرض ومطلب نہیں، پھر کیا چیز ہے جو انہیں اس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ کر رہی ہے، ضرور جو یہ لوگ کہتے ہیں وہ صحیح ہوگا یہ چیز اسے بہت متاثر کرتی ہے۔

تبلیغی جماعت اور انقلابِ عظیم...... میں نے شاید کہیں لکھا ہے کہ تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر بطور فن کے القاء کیا، اس میں تعلیم وتربیت، سیر وسیاحت، روح کی دلچسپی، بدن کی ورزش ہر ایک چیز موجود ہے، آج کے دور میں یہ کام بڑا ہی مفید اور لازمی ہے، اسی وجہ سے یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس تبلیغ سے ایک عظیم انقلاب آ رہا ہے، ہندوستان کے ہر خطے میں اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی میں گیا وہاں میں نے تبلیغی جماعتیں اور تبلیغی مراکز دیکھے۔ رسمی انداز میں اس عالمگیر طریقہ پر کام نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نہ فتنہ وفساد ہے اور نہ واویلا اور شور، آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ ان جماعتی لوگوں نے کہیں غدر کیا، کہیں فساد برپا کیا۔ یہ ایک خاموش تبلیغ ہے، جو عالمگیر طریقہ سے ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

تبلیغ میں باہر نکلنے کا فائدہ...... تبلیغ کے کام میں آدمی کو اسکے گھر سے نکالا جاتا ہے، وہ گھر کے ماحول سے نکل کر خدا کے گھر میں پہنچتا ہے، وہاں اسے دوسرا ماحول ملتا ہے، گھر کے ماحول میں اور اس ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے، یہاں اسے داعی اور عامل دونوں بننا پڑتا ہے، وہ داعی بن کر آتا ہے اور عامل بن کر جاتا ہے۔

مقصدِ تبلیغ...... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: ہم نے علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے مگر جب علم آ گیا تو اس نے کہا کہ میں تو خدا کے لئے ہوں۔ اس تبلیغی کام کا ایک نظام ہے اور اوقات نکالنے کا ایک اصول ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ قلب کی صفائی ہو وہ تمام دنیوی آلودگیوں سے پاک ہو، تزکیۂ نفس ہو، انشراحِ قلبی اور روحانی قوتوں کو جلا ہو، شیطانی قوتیں دبیں اور مغلوب ہو جائیں۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ یس، الآیۃ: ۱۴۔

بے لوث خدمت...... آج کے دور میں بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن یہ تحریک اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں نہ عہدے ہیں نہ منصب ہیں نہ کرسیاں اور نہ سیٹیں ہیں، بلکہ اپنے ہی مال کا خرچ ہے، اپنی جیب پر بار ہے، یہ تحریک موجودہ دور میں دین کے تحفظ کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ ہے، کسی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے ''توہمات'' اور ''تنازع للبقاء'' پر لیکن یہاں اس کے برعکس ہے یہاں تنازع للبقاء کی جگہ فنا للبقاء ہے اور توہمات کی جگہ محبت و الفت ہے، ریاست کے لئے پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور یہاں خود بخود پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

دو پناہ گاہیں...... آج جس دور میں ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام تعلیم والے باہر سے لوگوں کو لا کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

دعوتِ شرکت...... تبلیغی کام ایک ٹھوس اور بنیادی کام ہے، اس پر قوموں کے عروج وزوال کی بنیاد ہے جو لوگ اس تبلیغی کام میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے وقتوں کو لگاتے ہیں وہ مزید اس کام میں لگیں، اگر پہلے کم وقت لگاتے تھے تو اب اور زیادہ وقت لگائیں اور اس کام کو محنت اور جانفشانی سے کریں جو کہیں اس پر خود عامل ہوں اور عمل کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ سب سے بڑی دلیل عمل ہے اور عمل کے بڑے اثرات پڑتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ: دنیا میں ہر شخص اپنی بات کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے لیکن اگر اس کا یہ قول عمل کے مطابق ہے تو ٹھیک ورنہ اس کے لئے ہلاکت وتباہی ہے اسی طرح ہر کام کے کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ حدیں ہوتی ہیں، کام کو اس طرح کریں کہ دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں ''اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا'' ① انسان پر اس کے نفس کا، اس کی جان کا، اس کی بیوی کا، آنکھوں کا، ہر ایک کا حق ہے اگر ایک انسان ایک حق ادا کرے اور اس حق کے ادا کرنے میں دوسرے بہت سے حقوق پامال ہوں تو یہ خیر کی بات نہیں۔ خیر کی بات تو یہ ہے کہ حق بھی ادا ہو جائے اور دوسرے حقوق کی پامالی بھی نہ ہو، کھاؤ بھی کہ یہ نفس کا حق ہے اور روزہ بھی رکھو کہ خدا کا حق بھی ادا ہو جائے۔

دعوتی کام کا نفع...... آج دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات اور فلاح وکامرانی کی راہ یہی دعوتی کام ہے۔ اس کام نے قوموں کو بنایا اور اور سنوارا ہے یہی کام کرنے والے چنے ہیں۔ اور یہی کام کرنے والے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ②

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیہ لیفطر... ج:۷ ص:۷۶.

② نشانِ منزل، بھوپال۔ مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء

تبلیغی جماعت اور اصلاح

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!①

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس وقت تبلیغی سلسلے کے چند مقاصد آپ حضرات سے گزارش کرنے ہیں، وہ مقاصد اور باتیں کوئی نئی نہیں ہوں گی، ہاں عنوان کا فرق ہوگا' میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد سے پہلے بطور تمہید ایک اصول عرض کر دوں۔ اصول سمجھ میں آ جانے کے بعد مقاصد خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے۔

اصول یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اضداد بنایا ہے، ہر اصل کے مقابلے میں اس کی ایک ضد رکھی ہے اور ہر اصل کا تصادم اپنی ضد سے برابر ہوتا رہتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں کفر ہے، توحید کے مقابلے میں شرک ہے، اخلاص کے مقابلے میں نفاق ہے، سچ کے مقابلہ میں جھوٹ ہے، ظلمت کے مقابلے میں نور ہے، دن کے مقابلے میں رات ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر خیر و شر، بھلائی اور برائی بھی ملی جلی چل رہی ہیں۔ اس دنیا کو نہ صرف خیر کا عالم کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف شر کا، خیر محض اور راحت محض یہ عالم جنت ہے۔ تکلیف محض اور برائی محض یہ جہنم کا عالم ہے۔ اس دنیا کو جنت و جہنم دونوں سے مرکب کر کے بنایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر و شر دونوں ہی کے آثار موجود ہیں۔

ایک غور طلب حقیقت...... غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شر و برائی اس عالم میں اصلی ہے اور یہ خود بخود چیزوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، مگر بھلائی محنت کر کے لانی پڑتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ آدمی محنت کرتا ہے بھلائی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر محنت نہیں کرتا تو برائی خود بخود ابھر کر سامنے آ جاتی ہے مثال کے طور پر کھانا ہے اس کو خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ باقی رکھنے کے لئے نعمت خانہ بنوانا پڑتا ہے اسے ہوادار کمرے میں رکھنا پڑتا ہے، تب کہیں کھانا اپنی خوبیوں کے ساتھ باقی رہتا ہے، لیکن اگر یہ محنت نہ کی جائے تو کھانا خود بخود سڑ جائے گا، خراب ہو جائے گا۔ اس کے اندر بدبو پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

① عالمی تبلیغی اجتماع سہارنپور، منعقدہ ۱۹۷۱ء بروز شنبہ بعد مغرب اسلامیہ انٹر کالج میں بیان ہوا۔

اسی طرح ایک باغ ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، چمن بندی ہوئی ہو، پھول کھلے ہوئے ہوں۔ اس کا منظر نگاہوں کو اچھا معلوم ہوتا ہو، دیکھنے سے آنکھوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہو، سونگھنے سے ناک میں خوشبو آتی ہو، مگر یہ ساری خوبیاں اس وقت پیدا ہوگی جب کہ آپ مالی رکھیں گے، مالی رکھیں گے اور وہ برابر باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں، درختوں کی جڑوں کو صاف کریں، اس کو پانی دیں، جہاں مناسب سمجھیں کتر بیونت کریں۔

لیکن اگر آپ باغ کو جھال جھنکال بنانا چاہیں سو اس کے لئے آپ کو نہ تو کسی مالی رکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی ہالی وموالی رکھنے کی ضرورت۔ بس بنانے کی محنت چھوڑ دیجئے تو خود بخود ہی چند دنوں میں باغ کی ساری سرسبزی وشادابی ختم ہو جائے گی۔

ایسے ہی مکان ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ صاف ہو، ستھرا ہو، خوش رنگ ہو، دیدہ زیب ہو، ڈیزائن اچھا ہو، ان سب کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑے گی، ماہر وتجربہ کار معمار لانے پڑیں گے، پھر مکان بن جانے کے بعد فراش رکھنا ہوگا جو برابر اس کو جھاڑتا پونچھتا رہے تب جا کر یہ خوبیاں برقرار رہیں گی، لیکن اگر آپ مکان کو ویران بنانا چاہیں، اسے اجاڑنا چاہیں تو کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کے صحیح رکھنے پر آپ جو محنت صرف کررہے تھے اسے چھوڑ دیجئے چند دن کے بعد گرد آئے گی پھر پلاستر اکھڑے گا، پھر اینٹیں جھڑیں گی، پھر چھت گرے گی، پھر دیواریں آپڑیں گی اور اس طرح مکان کھنڈر ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی اور شر کائنات کی ہر ہر چیز کی ذات کے اندر موجود ہے، انسان محنت کرتا ہے تو خیر آجاتی ہے، نہیں کرتا تو شر خود بخود ابھر آتا ہے۔ یہ اس عالم کا ایک طرز ہے اور سنت اللہ اسی طرح جاری ہے چونکہ اس عالم کا ایک بڑا فرد انسان بھی ہے لہٰذا اس کے لئے بھی اس اصول اور اس قاعدہ سے جدا ہونا ممکن نہیں، چنانچہ بلاتکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ برائی ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتی ہے اور بھلائی لانی پڑتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، آپ اس کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں تب جا کر وہ انسان بنتا ہے اور اگر آپ یہ محنت نہ کریں، تو اس کے اندر جو برائیاں ہیں ان کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، خوبیاں پیدا کرنے کے لئے عالم بنانے کے لئے سینکڑوں ادارے ہیں، مدرسے ہیں مگر کیا جاہل بنانے کے لئے بھی آپ نے کوئی مدرسہ دیکھا؟ جاہل تو انسان بنا بنایا پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ”اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور پھر تمہارے اندر سننے کی طاقت رکھ دی تاکہ سن سن کر علم حاصل کرو، دیکھنے کی طاقت رکھ دی تاکہ دیکھ دیکھ کر علم حاصل کرو، تدبر وتفکر کی قوت رکھ دی تاکہ اس کے ذریعہ معلومات میں اضافہ کرو“۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان میں علم کی استعداد اور صلاحیت تو رکھتے ہیں، مگر کوئی ماں کے پیٹ سے علم وہنر لے کر نہیں آتا۔ یہ تو انسان کے علم کا حال ہے اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں موجود ہے ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ ① "میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا اس وجہ سے کہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے" معلوم ہوا کہ نفس انسانی میں ذاتی طور پر شر موجود ہے اسلئے وہ انسان کے برے اعمال ہی کی طرف لے جائے گا۔ آپ اس کی تربیت کریں گے تو بن جائے گا اور بھلائی کی طرف آ جائے گا ورنہ برائی پیدا ہونے اور اس کی تربیت کے لئے کسی کالج اور مدرسہ کی ضرورت نہیں ہوگی، خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ ؎

قرنہا باید کہ تا یک سنگ خارازآفتاب ــــ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

یعنی ایک پتھر کا بے قیمت ٹکڑا جب سالہا سال اور قرن ہا قرن دھوپ میں پڑا رہتا ہے، آفتاب کی تپش اور اس کی گرمی کو برداشت کرتا ہے تب جا کے ایک باقیمت لعل بنتا ہے ؎

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ بعد کشت ــــ جامہ گردد شاہدے را یا شہیدے را کفن

ایک بنولے کا دانہ محبوب کے بدن کی زینت بنے اس کے لئے مہینوں کی مدت درکار ہوتی ہے' آدمی زمین پر محنت کرتا ہے اس میں ہل چلاتا ہے، اسے کھیتی کے قابل بناتا ہے پھر بیج کو زمین بوس کر دیتا ہے، اس کے بعد اس سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے، روئی بنتی ہے، اسے توڑ لیا جاتا ہے، پھر مل میں بھیجا جاتا ہے، اس کی دھنائی ہوتی ہے، صفائی ہوتی ہے، سوت بنتا ہے پھر کپڑا تیار ہوتا ہے اور پھر درزی اس کی قطع و برید کرتا ہے، ان تمام مراحل سے گزر کر پھر کسی محبوب کا جامہ بنتا ہے، ورنہ تو بنولے کی کوئی قیمت نہیں تھی، زیادہ سے زیادہ کسی بھینس کے منہ میں چلا جاتا۔ آگے کہا ہے کہ ؎

سالہا باید کہ تا یک کودکے از درس علم ــــ عالمے گردد نکو یا شاعر شیریں سخن

یعنی ایک نادان اور چھوٹا بچہ جب سالہا سال کسی مکتب اور مدرسے میں پڑھتا ہے، استاد کی مار اور سختیاں برداشت کرتا ہے اس کے بعد جا کر یا وہ عالم بنتا ہے یا شاعر۔

تو عالم بنانے اور خوش اخلاق بنانے کے لئے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی ہے، مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، معلمین و ملازمین رکھنے پڑتے ہیں، تب جا کے آدمی، آدمی بنتا ہے، لیکن جاہل و بداخلاق بنانے کے لئے نہ تو کہیں مدرسہ قائم کیا جاتا ہے اور نہ کوئی ادارہ۔ حاصل یہ کہ کسی چیز کو قیمتی بنانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے، محنت کی ضرورت پڑتی ہے مگر بے قیمت بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسان کی قدر و قیمت اوصاف سے ہے...... آپ جانتے ہیں کہ اللہ میں بالذات خوبیاں ہیں، کمالات

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳.

ہیں اور مخلوق میں ذاتی طور پر خوبی وکمال نام کی کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مسلمہ قاعدہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اوصاف سے ہوتی ہے، جس شئی کے اندر اوصاف زیادہ ہوں گے، اس کی اسی قدر توقیر ہوگی، عزت ہوگی اور اسی اعتبار سے اسے بلند مرتبہ اور مقام حاصل ہوگا، ایک شخص عالم ہے اس کی آپ عزت کرتے ہیں اس کے علم کی وجہ سے اور اگر وہی آپ کا استاد بھی ہو تو عزت کا ایک درجہ بڑھ جائے گا اور اگر اتفاق سے وہی آپ کا حاکم بھی ہو تو اس کی عزت کا ایک درجہ اور بڑھ جائے گا۔

حاصل یہ کہ انسان کے اندر جس قدر اوصاف بڑھتے جائیں گے، اس کی قدر و قیمت اور عزت و وقار میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ بالذات انسان میں کوئی کمال نہیں، کمال ایک عارضی شئی ہے، جو محنت کر کے لایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ بچے کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں اور اگر وہ تعلیم سے جی چراتا ہے تو لالچ دلاتے ہیں، اس لئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی ہنر اور کمال کا مالک بن جائے۔

بہر حال اتنا تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر قیمت اس کے اوصاف سے ہوتی ہے حضرات انبیاءؑ کی ذات بلاشبہ مقدس ہے اور ان میں بھی سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس بابرکات تو حد درجہ متبرک ومقدس ہے، لیکن یہ سارے کا سارا تقدس نبوت ورسالت ہی کی وجہ سے ہے اور اسی منصب رسالت کی وجہ سے آپ واجب الاطاعت ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! اگر میں حکم شرعی بیان کروں تو اس کا ماننا لازمی اور ضروری ہے لیکن اگر ذاتی مشورہ دوں تو اس کا ماننا ضروری نہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر مسلمان کے قلب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حد درجہ محبت ہے اس کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کو بھی حکم سمجھے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائے، مگر جہاں تک قانون کی بات تھی وہ آپ نے بیان فرما دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے کر دیا، حضرت بریرہؓ نہایت ہی خوبصورت اور حضرت مغیثؓ بالکل معمولی شکل کے آدمی تھے، جس کی وجہ سے ان دونوں میں بنتی نہیں تھی، آئے دن لڑائی جھگڑے کا بازار گرم رہتا، حتی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی جب آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا یا نہ رکھنا اس کے ہاتھ میں ہو جاتا ہے، حضرت بریرہؓ نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے فائدہ اٹھانا چاہئے چنانچہ انہوں نے نکاح کے فسخ کرنے ارادہ کر لیا۔ حضرت مغیثؓ حضرت بریرہؓ پر سوجان سے عاشق تھے۔ جب انہیں بریرہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو روایتوں میں آتا ہے کہ یہ مدینہ کی گلیوں میں بے چین و بیقرار پھر رہے تھے اسی بے چینی کی حالت میں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے بریرہؓ سے نکاح کرایا تھا اور اب آپ ہی اسے باقی رکھیے، چنانچہ حضرت بریرہؓ کو بلایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ کی جانب سے سفارش فرمائی اور بریرہؓ کو طرح طرح سے سمجھایا اور کہا کہ نکاح باقی رکھو فسخ مت کرو، بریرہؓ بھی تھیں بڑی ہوشیار، انہوں نے فوراً پوچھا، یا

رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ حضرت بریرہؓ کہتی ہیں۔ پھر تو میں نہیں قبول کرتی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ① اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر اگر حضرات انبیاء بھی کوئی بات کہیں تو اس کا ماننا بھی ضروری نہیں ہے، یوں محبت وعقیدت کی لائن سے آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں، تو جب حضرات انبیاء کے یہ درجات ہیں تو پھر ہماری آپ کی کیا حیثیت ہے اور ہم اور آپ کس شمار میں آئیں گے؟

حقیقتِ آدمیت......اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب انسان کے اندر اوصاف وکمال جمع ہو جائیں وہ علم وفضل کا مالک بن جائے تو اس کی توقیر ہوتی ہے، عزت ہوتی ہے بہرحال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ: اس دنیا میں برائی اصل ہے اس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بھلائی لائی جاتی ہے اس کے لئے محنت کرنی ہوتی ہے، مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے ورنہ نہ تعلیم گاہیں ہوتیں نہ خانقاہیں اور نہ اس طرح کے تبلیغی اجتماعات ہوتے، تعلیم کی حاجت ہونا یہ دلالت ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ نہیں بلکہ اس کو گھڑ گھڑ کر انسان بنایا جاتا ہے، آدمی پیدا ہوتا ہے مگر آدمیت بنائی جاتی ہے، آدمی کی صورت کا نام انسان نہیں بلکہ وہ تو سیرت اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انسان بودے ‌‌‌‌ ‌ احمد و بوجہل ہم یکساں بودے

اگر آدمی کی صورت ہی کا نام انسان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل میں کوئی فرق نہ ہوتا، صورت تو دونوں کی یکساں ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت دراصل آتی ہے سیرت سے، اخلاق سے، اگر صورت اچھی ہوئی لیکن باطن خراب ہے یا ظاہر درست ہے لیکن اندر ناقص اور نکما ہے تو اس سے کوئی بات پیدا نہ ہوگی، بلکہ یہ صورت حال عیب ہے ہنر نہیں اور اسی طرح باطن کے خراب رہتے ہوئے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بالکل ایسی ہے جیسا کہ نجاست کے اوپر چاندی کا ورق لگا دیا جائے اس طرح نجاست کا پاک ہونا تو درکنار ورق بھی ناپاک اور ناقابل استعمال ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی بہترین لباس پہن لے مگر دل میں گندگی بھری ہو تو لباس کی وجہ سے وہ نہ تو واجب الاحترام ہوگا اور نہ اس کے کمال میں کسی طرح کا اضافہ ہوگا۔

ارسطو مشہور حکیم اور فلسفی گزرا ہے، رات دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رہتا اور ان کا امتحان لیا کرتا تھا وہ اپنے کام میں اتنا مشغول رہتا کہ اسے نہ دن کی خبر ہوتی اور نہ رات کی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے دن کا تھکا ہارا راستہ پر سو گیا، اتفاق سے اسی دن بادشاہ کی سواری نکلی ہوئی تھی، آگے آگے نقیب وچوبدار ہٹو، بچو ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے آ رہے تھے مگر یہ نیند میں اس طرح مست کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں پڑا سوتا رہا، ان بیچاروں کو کسی قسم کی فکر نہیں ہوا کرتی ہے، بادشاہ کی سواری کا گزر اس کے پاس سے ہوا اسے اس طرح سوتے دیکھ کر چلتے چلتے بادشاہ نے غصہ

① الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب شفاعۃ النبی ﷺ فی زوج بریرۃ، ج: ۵ ص: ۲۰۲۳ رقم: ۴۹۷۹.

میں ایک ٹھوکر ماری اس پر اس نے کہا ''بے ادب'' بادشاہ نے کہا کہ گستاخ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں ارسطو نے جواب دیتے ہوئے کہا: غالباً آپ جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہی ٹھوکر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اس کے اس گستاخانہ کلام کو سن کر اور بھی غصہ آیا اس نے کہا بدتمیز! میرے پاس خزانہ ہے، فوجیں ہیں، قلعہ ہے، تخت وتاج ہے پھر بھی تو مجھ سے یہ گستاخانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے، ارسطو نے کہا کہ یہ ساری چیزیں تو باہر کی ہیں تیرے اندر میں کون سی چیز، کون سی خوبی اور کون سا کمال ہے، تو یقین رکھ کہ جس دن تیرے اوپر سے یہ قبا شاہی اتر جائے گی تو ذلیل ہو جائے گا، تیرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ آدمی کو فخر اپنے اندر کی چیز پر کرنا چاہئے جب تیرے اندر کوئی کمال نہیں ہے تو تو کپڑوں اور تخت وتاج سے باکمال نہیں بن جائے گا۔ یہ قبا شاہی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ۔ پھر ہم دونوں دریا میں کودیں جب معلوم ہوگا کہ تم کون ہو اور میں کون ہوں تیرے اندر کیا کمال ہے۔ اور میرے اندر کیا کمال ہے۔

حاصل یہ کہ آدمی صورت انسانی کا نام نہیں اور نہ اس کی وجہ سے آدمی باعزت اور باکمال بنتا ہے اسی طرح لباس، وہ انسان کے باہر کی چیز ہے اور دولت تو اس سے بھی باہر ہوتی ہے لہٰذا ان چیزوں کی وجہ سے باکمال ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، سرچشمۂ کمال تو خدا ہی کی ذات ہے اور ہمارے اندر جو کمال آئے گا وہ وہیں سے آئے گا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا قرب ہو بارگاہ خداوندی سے اور ظاہر ہے کہ قرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی، پھر جس قدر جدوجہد بڑھے گی قرب بڑھے گا اور جس قدر قرب بڑھتا جائے گا کمال آتا چلا جائے گا اور جتنا بعد ہوگا کمال کے اندر کمی پیدا ہوتی جائے گی۔

کمالاتِ انسانی......انسان کے دو کمال ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا علمی کمال اور دوسرا عملی کمال، علمی کمال پیدا کرنے کے لئے مکاتب ہیں، مدارس ہیں، یونیورسٹیاں ہیں اور عملی کمال پیدا کرنے کے بھی مختلف طریقے ہیں اور مختلف ذرائع ہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں عملی کمال پیدا کرنے کے چار طریقے لکھے ہیں۔

صحبتِ اہل اللہ......اول یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہا جائے، ان حضرات کی جتنی ہی زیادہ صحبت نصیب ہوگی، اتنا ہی ان کا رنگ قلب کے اندر اترتا چلا جائے گا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، صحبت نیک سے آدمی کے اندر خیر پیدا ہوتی ہے، خوبی پیدا ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِخِ الْكِيْرِ. فَحَامِلُ الْمِسْكِ: اِمَّآ اَنْ يُّحْذِيَكَ وَاِمَّآ اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّآ اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبًا. وَنَافِخُ الْكِيْرِ: اِمَّآ اَنْ يُّحْرِقَ ثِيَابَكَ وَاِمَّآ اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا خَبِيْثَةً.'' (1) ''اچھے ساتھی اور برے رفیق کی مثال، مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے جیسے مشک والا اگر تمہارے پاس سے بھی گزر گیا تو جب بھی نفع تم اس سے خرید لوگے تو بھی نفع، ہر حالت میں دماغ معطر

(1) الصحيح للبخاری، كتاب البيوع، باب فی العطار و بيع المسک، ج: ۲ ص: ۲۱۴ / ۷ رقم: ۱۹۹۵.

رہے گا۔اور بھٹی والے سے تعلق میں کپڑا جلے گا ورنہ اس کی بدبو بلاشبہ دماغ کو مکدر رکھے گی"۔

تو بھائی! ہر چیز کے اثرات ہوا کرتے ہیں، اگر آپ دریا کے کنارے آباد ہوں گے تو آپ کے مزاج میں بھی رطوبت پیدا ہوگی خشک علاقے میں رہیں گے تو یبوست پیدا ہوگی، گلاب کے پھول کو کپڑے میں رکھ دیجئے تھوڑ دیر کے بعد نکالیں گے تو کپڑے سے بھی گلاب کی خوشبو آئے گی، ریشمی کپڑوں میں عورتیں برسات کے موسم میں گولیاں رکھ دیتی ہیں، اگلے موسم میں جب نکالتی ہیں تو کپڑوں سے گولیوں کی بدبو آتی ہے، حالانکہ کپڑے کی ذات میں نہ تو خوشبو ہے، نہ بدبو، مگر مصاحبت کا اثر پڑتا ہے، اگر گلاب کو اس کا مصاحب بنادیا جائے تو کپڑے میں خوشبو آجاتی ہے اور اگر گولیوں کو مصاحب بنادیا جائے تو اس کے اثرات کپڑے کے اندر رچ بس جاتے ہیں اور کپڑے سے بدبو آنے لگتی ہے۔اسی طرح اہل اللہ کی صحبت کے اثرات ہوتے ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا، ایک عالم ربانی اور درویش حقانی کی شان یہ ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آئے گویا کہ ان کا ذکر، ذکر خدا کی تمہید ہے کسی نے کہا ہے کہ ۔

خاصان خدا خدا نہ باشند ولیکن از خدا جدا نہ باشند

جب آپ اہل اللہ کے قریب ہوں گے تو کمالات ربانی آپ کے اندر آئیں گے، صحبت صالح کے آثار خیر و برکت کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فیض صحبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)......یہی وجہ ہے کہ جو مرتبہ اور مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں، کوئی بڑے سے بڑا قطب ہو، غوث ہو، صحابیت کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، آپ کی مجلس میں شریک رہے ہیں جسے آپ کی صحبت نصیب ہوئی ہو اور آپ کی مجلس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو اس کے کمالات کا کیا کہنا، ایک آدمی آفتاب کے نیچے کھڑا ہو تو اس پر جو گرمی ہوگی وہ کمرے میں بیٹھنے والے کو نہیں ہوسکتی اور جو تہہ خانے میں بیٹھا ہوگا اس پر دھوپ اور گرمی کا اثر بھی کم ہوگا، جتنا آفتاب سے قریب ہوگا، حرارت اور نورانیت بڑھتی جائے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں آپ سے جو بلاواسطہ مستفید ہوئے ہیں انکے فضائل وکمالات درجہ اولیٰ میں ہیں اور جو بالواسطہ ہیں ان کا ثانوی درجہ ہے اور ان حضرات سے جن لوگوں نے استفادہ کیا وہ تیسرے نمبر پر ہیں اسی طرح درجہ بدرجہ کمی ہوتی چلی جائے گی۔ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ" (1) "سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس سے متصل ہو پھر جو اس سے متصل ہو"۔سلف میں شاگرد و استاد کی اصطلاح نہیں تھی بلکہ شاگردوں کو "صاحب" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کہا جاتا تھا کہ یہ اصحاب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ اصحاب مالک ہیں یہ اصحاب فلاں ہیں

(1) الصحیح لمسلم، کتاب المناقب، باب فضائل الصحابة ثم الذین یلونهم...... ج:٦ ص:١٩٦٣ رقم: ٢٥٣٥.

اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان حضرات نے اپنے استاذ اور شیخ سے محض کتاب کے الفاظ اور معنی ہی نہیں حاصل کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے استاذ کے رنگ کو بھی قبول کیا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رنگ قبول کیا تھا جو آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ حاصل یہ کہ سب سے بڑی چیز ہے صحبت اس کے ذریعہ ایک کے قلب کا رنگ اور اس کے جذبات دوسرے کے اندر آتے ہیں محمد حسین آزاد نے بالکل سادہ لفاظ میں ایک شعر کہا ہے ۔

ملنے والوں سے راہ پیدا کر　　　　اس کے ملنے کی اور صورت کیا

یعنی تم اگر محبوب سے ملنا چاہتے ہو تو پہلے ان کے پاس آنے جانیوالوں سے رسم وراہ پیدا کرو۔ وہ کسی دن تذکرہ کر دیں گے تمہاری بھی رسائی ہو جائے گی۔ ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پہلے اللہ والوں سے ملا جائے، ان کے رنگ کو قبول کیا جائے، قلوب کے بدلنے کی کوشش کی جائے، اخلاق کو درست کیا جائے، نفس کی اصلاح کی جائے، پھر بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قبول فرمالیں گے اور اپنا بنالیں گے۔

اگر کسی کے پاس علم ہے مگر اس نے شیخ کی صحبت نہیں اختیار کی ہے، اس کا رنگ نہیں قبول کیا ہے تو وہ علم صرف لفظی ہوگا حقیقی نہیں ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (1) "اللہ سے ڈرو اور معیت اختیار کرو سچے لوگوں کی" سچوں کی معیت اختیار کرنے سے ان کے اثرات تمہارے اندر پیدا ہوں گے اور سچائی کی خوبی تمہارے ذہن میں بیٹھتی چلی جائے گی۔ صحبت ہی کی بات ہے کہ محدثین کے یہاں ان راویوں کی روایت زیادہ قابل قبول ہوتی ہے، جنہوں نے محض سنا ہی نہیں بلکہ اپنے شیخ کی صحبت بھی زیادہ سے زیادہ اٹھائی ہو۔

علم حقیقی...... دیکھو بھائی! ایک علم تو ہوتا ہے رسمی اور لفظی جو رٹنے اور کتابوں سے آجاتا ہے اور ایک علم ہوتا ہے حقیقی جو علماء ربانی اور اہل اللہ کی صحبت سے آتا ہے، بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے کہ وہ عالم تو نہیں مگر جاہلوں کو کون کہے عالموں کی بھی رہنمائی فرماتے تھے۔ حاجی امیر خاں صاحب ہمارے اکابر دیوبند کے ایک متعارف خادم جن سے سنی ہوئی روایات کا مجموعہ خود میں نے مرتب کیا اور حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے اس پر فوائد اپنے قلم سے تحریر فرمائے جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ رسمی عالم تو نہیں تھے یعنی انہوں نے باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہ پڑھا تھا اور نہ کسی مدرسہ کی ان کے پاس سند تھی مگر حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہما کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس کی برکت سے انکے علم وفکر میں کچھ ایسی گہرائی پیدا ہوگئی تھی کہ علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی، بحر العلوم اور کتابوں کی حافظ شخصیت ان سے استفادہ کرتی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آتا ہے، وہ بد اخلاق بھی ہے، مشرک بھی، مگر جب آپ ؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ محبت سے فیض یاب ہوتا ہے تو عالم بھی بن جاتا ہے، خلیق بھی بن جاتا ہے اور کریم بھی۔

تو بھائی نیک صحبت سے اخلاق بدل جاتے ہیں، روحیں پلٹ جاتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ

---

(1) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹۔

علیہ وسلم کے ہزاروں معجزات ہیں اور معجزات کو تو چھوڑ دیجئے آپ کا یہی کم کارنامہ اور کیا کم معجزہ ہے کہ آپ نے عرب جیسی تہذیب واخلاق سے ناآشنا قوم کے قلوب کو بدل کر رکھ دیا، لوہے کا نرم کر دینا آسان ہے مگر قلوب اور روحوں کا بدلنا نہایت ہی مشکل، ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا ہر ہر صحابیؓ ایک معجزہ ہے۔

مؤاخاۃ فی اللہ...... لیکن اگر کسی شخص کو اتفاق سے شیخ میسر نہ آئے اور وہ کہے کہ میری بستی میں نہ تو کوئی شیخ ہے نہ کوئی عالم پھر میرے نفس کی اصلاح کی کیا صورت ہوگی، ایسے شخص کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بستی میں اس کا کوئی دوست تو ہوگا ہی اور اگر نہ ہو تو ایک دو آدمیوں سے دوستی کر کے آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ اگر میں کوئی برائی کروں تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر روک دو، تم کرو گے تو میں روک دوں گا، تم سے کوئی کوتاہی ہوگی، تو میں تنبیہ کروں گا، مجھ سے ہوگی تم کرنا، اگر دوستی اس طرح ہوگئی تو زیادہ نہیں چالیس دن کے اندر سینکڑوں برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

تو اگر کوئی شیخ نہیں ملتا، کوئی عالم نہیں ملتا۔ تو اس طرح اپنے نفس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ: قیامت کے دن سات آدمی ایسے ہوں گے جنہیں اس دن جس دن کہ کہیں سایہ نہ ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ عرش کے سائے تلے جگہ دیں گے ان میں سے ایک نوع یہ بھی ہے۔ ’’قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ: اِمَامٌ عَادِلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ اِلَيْهِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَاتَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَاتُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ‘‘ ①

’’آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لیں گے، جس دن کہ سوائے خدا کے سائے کے کسی کا سایہ نہ ہوگا، ایک انصاف پرور بادشاہ، دوسرے وہ نوجوان جس کی جوانی کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوا اور تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، جب مسجد سے نکلتا ہے تو بے چین رہتا ہے، تاوقتیکہ پھر مسجد میں نہ پہنچ جائے اور دو اشخاص جنہوں نے اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے ترک تعلق کیا اور ایک وہ شخص ہے کہ جس نے خدا کو یاد کیا ہو تنہائی میں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک وہ کہ جسے ایک ایسی عورت نے زنا کی دعوت دی جو خوبصورت بھی تھی اور بلند خاندان سے تعلق بھی رکھتی تھی اس پر اس نوجوان نے یہ کہہ دیا کہ مجھے تو خدا کا خوف اس کام کی اجازت نہیں دیتا اور ایک وہ شخص جس نے صدقہ دیا اور اتنا چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہیں معلوم کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا‘‘۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ، ج: ۲ ص: ۷۱۵ رقم: ۱۰۳۱۔

حدیث میں ہے کہ: ایسے دو آدمی جن میں مواخات فی اللہ تھی اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور وہ مقبول عند اللہ ہو جائے تو وہ دعاء کرے گا کہ اے اللہ میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر لے آ، اسی کی وجہ سے مجھے یہ مقام ملا ہے۔

انتخاب دوست...... اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ: اصلاح کے اس دوسرے طریقہ میں کسی دوست سے مدد لینی ہوگی، تو بھائی! دوست بھی دنیا میں ایک ہی نوعیت، فطرت اور مزاج کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں بڑا فرق اور تفاوت رہتا ہے اس لئے دوست کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا کسی نے کہا ہے نا کہ۔

دلا اندر جہاں یاراں سہ قسم اند زبانی اند و نانی اند و جانی
بنانی ناں بدہ از دربدر کن تلطف کن بیاران زبانی
ولیکن یار جانی را بدست آر مدارا تش بگیری تا توانی

یعنی دوست کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو دستر خوانی دوست اگر خدا نے آپ کا دستر خوان سلامت رکھا ہے تو پھر آپ کے لئے دوستوں کی کمی نہیں جتنے چاہئے جمع کر لیجئے اور بعض زبانی دوست ہوتے ہیں ان کی بھی دنیا میں کوئی کمی نہیں اور بعض جگری اور حقیقی دوست ہوا کرتے ہیں جو صرف آرام اور راحت ہی میں نہیں بلکہ تکلیف اور مصیبت میں بھی پورا پورا ساتھ دیتے ہیں، ایسے دوستوں کی تعداد یقیناً کم ہے۔

جو دستر خوانی دوست ہوں ان کی بات تو بالکل نہ مانو اس لئے کہ جس دن تمہارا دستر خوان لپٹ جائے گا ان کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی البتہ انہیں انکی طلب وخواہش کے مطابق کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑا لیجئے اور جو زبانی جمع خرچ کرنے کے عادی ہوں تم بھی ان کے ساتھ دوستی زبان ہی تک محدود رکھو۔

ایک شاعر تھے انہوں نے ایک امیر صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھا اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپکی کرسی کا پایۂ ہفت آسمان سے بلند ہے آپ کے تاج کے موتی، جیسے آسمان کے تارے وغیرہ وغیرہ۔ جب قصیدہ ختم ہو گیا تو امیر صاحب نے کہا کہ: پرسوں آنا تمہیں دو ہزار اشرفیاں دوں گا۔ اس سے جناب خوب خوش ہوئے اور گھر جا کر تیسرے دن کا انتظار کرنے لگے قبل اسکے کہ تیسرا دن آئے پہلے ہی انہوں نے اس امید پر کہ اب تو دو ہزار ملے گا ہی پانچ سو روپیہ قرض لے لیا، چنانچہ اب بہترین کھانے پک رہے ہیں، اعزاء و اقارب کی دعوتیں ہو رہی ہیں نئے نئے جوڑے تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ جب تیسرا دن آیا تو دربار پہنچ کر امیر صاحب کو سلامی دی۔ امیر صاحب نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، دوسری مرتبہ سلام کیا، اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے، تیسری بار کھانسے اس پر بھی امیر صاحب کی نگاہ نہ اٹھی، آخر زبان ہی سے کہا کہ بندہ حاضر ہے میں نے اس دن قصیدہ پڑھا تھا اور آج کے دن آپ نے دو ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ امیر صاحب نے سر اٹھایا اور کہا: بھائی تم نے قصیدہ پڑھا تھا جس کے اندر محض الفاظ ہی الفاظ تھے، حقیقت اور واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا تم نے مجھے لفظوں سے خوش کر دیا۔

میں نے بھی تمہیں لفظوں سے خوش کر دیا، جیسا تم نے دیا تھا ویسا میں نے واپس کر دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دوستوں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ محض زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں ان کی باتوں کا حقیقت اور واقعیت سے نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی واسطہ، ایسے دوستوں کی زبانوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے، لیکن ایسے دوست جو مصیبت میں کام آتے ہوں، خود پریشانیاں اٹھالیتے ہوں مگر دوست پر آنچ نہ آنے دیتے ہوں، ہزاروں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اور اسی تیسرے دوست کے متعلق شاعر نے یہ بات کی ہے کہ اسے مضبوط پکڑلو اور اس کے تعلق ومحبت کی قدر کرو۔ بہرحال اصلاح نفس کے لئے اگر کوئی شیخ نہیں ملتا تو اپنے دوستوں ہی سے اپنی صلاح کرنی چاہئے۔

دشمن کے ذریعے اصلاح...... لیکن اگر کوئی کہے کہ میرا کوئی دوست ہی نہیں تو پھر اس کے لئے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے ایسا تو شاید ہی کوئی ہوگا کہ آج کے دور میں جس کا کوئی دشمن نہ ہو، آپ کے دشمن چھانٹ چھانٹ کر آپ کے عیوب اور برائیاں نکالتے اور پھیلاتے رہیں گے اب آپ کا کام یہ ہوگا کہ آپ کے اندر جو برائیاں ہیں انہیں چھوڑتے چلے جایئے۔ اگر آپ اس طرح ایک چلے دو چلے بھی گزار لیں گے تو بڑی حد تک آپ کی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ صالح بن جائیں گے۔

محاسبۂ نفس...... اور اگر کوئی کہے کہ میں تو پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، مجھے نہ کسی شیخ کی صحبت میسر ہے اور نہ میرا کوئی دوست ہے نہ دشمن ہے پھر میرے لئے اصلاح کا کیا طریقہ ہوگا، امام غزالی لکھتے ہیں کہ اس کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے اس کے لئے چوتھا طریقہ محاسبہ نفس کا ہے، روزانہ سوتے وقت کم از کم پندرہ منٹ مراقبہ کرے اور سوچے کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کیں اور کتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، جو بھلائیاں کی ہوں ان پر شکر ادا کرے اسلئے کہ شکریہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ زیادتی کی توفیق دیں گے، ارشاد خداوندی ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① "یعنی اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم نعمتوں کو بڑھا دیں گے، تو جتنا شکر ادا کریں گے خدا تعالیٰ نعمتوں کو بڑھا دیں گے" اور جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان پر سچے دل سے توبہ کرے، جب صدق دل سے توبہ کرلے گا تو سارے گناہ جھڑ جائیں گے، حدیث میں ہے: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ." ② "گناہ سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے کہ جیسا کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوا"۔ اگر برابر اس عمل کو جاری رکھا جائے گا تو برائیاں ختم ہوتی جائیں گی اور نفس میں اصلاح وتقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حاصل یہ کہ اولاً تو شیخ کے ذریعہ نفس کی اصلاح کیجئے شیخ نہ ملے تو پھر دوست کے ذریعے خوبیاں پیدا کیجئے اور اگر دوست نہ ہو تو پھر دشمن کو آلہ کار بنایئے اور اگر دشمن بھی نہیں ہے تو اپنا شیخ اپنے ہی کو بنا لیجئے، عرفی طور پر

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراهيم، الآية: ۷.

② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۲ ص: ۴۱۹ رقم: ۴۲۵۰.

اصلاح کے یہ چار طریقے ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی میسر آ جائے تو نجات کے لئے کافی ہے اور اگر اتفاق سے یہ چاروں چیزیں میسر آ جاویں تب وہ شخص کیمیا بن جائے گا کہ (۱) شیخ بھی ہو (۲) مواخاۃ فی اللہ بھی ہو (۳) دشمن بھی ہو اور (۴) محاسبہ بھی ہو گویا اگر کسی کو یہ چاروں چیزیں میسر آ جائیں تو پھر زہے قسمت وزہے نصیب۔

تبلیغی جماعت اصلاحی طریقوں کی جامع ہے...... اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک ''معجون مرکب'' ہے گویا یہ نسخہ امرت کا بن گیا جس میں اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہوگا آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا، اس لئے کہ جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا۔ کیونکہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔

جماعت کی برکات...... بہت ممکن ہے کہ اس مجموعہ مرکب میں بعض کمزور ارادہ، بعض نحیف عمل، بعض خام علم والے جمع ہو جائیں اور شبہ یہ ہو کہ تبلیغ سے حاصل ہونیوالا فائدہ یقینی ہونے کی بجائے موہوم ہو کر رہ جائے گا۔ تو بھائی اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کمزوروں سے مرکب اجتماع، جمعیت اور اتحاد کی بنا پر یہ ایک قوت حاصل کر لے گا جیسا کہ اس کی نظیر خود ہی ہمارے فن حدیث میں بھی موجود ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ اگر کسی حدیث کے سلسلے میں چند ضعیف سندیں جمع ہو جائیں تو وہ حدیث بھی محدثین کے نزدیک قوی سمجھی جانے لگتی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اگر چند بھیک مانگنے والے دو، دو، چار، چار پیسے جمع کر لیتے ہیں تو سب کے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے اور اگر علیحدہ علیحدہ چاہیں تو کسی کا بھی پیٹ نہیں بھر سکتا، ایسے ہی اگر چند ضعیف العمل اور ضعیف روحانیت والے نیک نیتی سے جمع ہو جائیں گے تو ایک کا دوسرے پر اثر پڑے گا اور سبھی کے اندر قوت پیدا ہو جائے گا۔ اور بھائی ان حضرات کی نیک نیتی میں کیا شبہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرات نہ تو تجارت کے لئے جمع ہوتے ہیں نہ کھیتی باڑی اور نہ کسی دوسرے کاروبار کے لئے۔

پھر یہ بھی تو سوچئے کہ دس پندرہ آدمیوں کی جماعت میں کوئی نہ کوئی تو مقبول خداوندی ضرور ہی ہوگا اور ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی مقبولیت کا اثر دوسروں پر یقیناً پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ مومن کو نماز باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ ساری جماعت کے نمازی بھی کمزور کیوں نہ ہوں، پھر بھی مجموعہ میں خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے پوری جماعت کی نماز قبول ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ جماعت میں خواہ کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں، لیکن خدا کا کوئی مقبول بندہ ضرور ہوگا جس کی وجہ سے

اس کی مقبولیت ضرور ہوگی۔

نیک نیتی کا اثر......اور پھر وہ اپنی ذاتی غرض سے نہیں نکلے ہیں، بلکہ اللہ کے رضا کے لئے نکلے ہیں۔ اس نیک نیتی کا اثر بھی پڑتا ہے، کیونکہ یہ اللہ کا نام سیکھنے جا رہے ہیں۔ خدا کو یاد کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ تو جب اس نیت سے اللہ کے راستہ میں نکلیں گے تو اس کا اثر بھی ضرور آئے گا۔ گویا اس طرح فی الجملہ صحبت شیخ وصحبت صلحاء میسر آ جائے گا۔ بہر حال یہ سب سے پہلی چیز صحبت اہل اللہ ہے۔

تبلیغی بھائی...... پھر جب ایک جذبہ سے جائیں گے تو مواخاۃ (بھائی چارگی) بھی قائم ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ان میں باہم دوستی بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اس لئے واپس آنے کے بعد ایک دوسرے کو تبلیغی بھائی کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی بھائی آ رہے ہیں گویا ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی بن جاتا ہے اور آپس میں ایک قسم کی اخوت ہو جاتی ہے۔

جماعت کی نماز کی بھی یہی خصوصیت ہے، جب لوگ مسجد میں آتے ہیں تو ایک کی دوسرے سے آنکھیں چار ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں باہمی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی غائب ہوتا ہے تو دوسرے سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں تو روزانہ آیا کرتا تھا آج کیوں نہیں آیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے، پھر لوگ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اور اس طرح لوگوں کو عیادت مریض کا ثواب حاصل ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ مرض کی حالت میں آدمی کو اللہ تعالیٰ سے بے حد قرب ہوتا ہے۔ حدیث ہی میں ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے نعمتوں میں اتنا قرب نہیں ہوتا جتنا کہ مصیبتوں میں ہوتا ہے۔ نیز حدیث ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تھا تو میری مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا، بندہ کہے گا کہ اے باری تعالیٰ آپ کی ذات تو ان چیزوں سے پاک ہے، آپکے بیمار ہونے کا کیا سوال؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا تو مجھے اس کی پٹی پر موجود پاتا، تو پھر تجھے بھی وہ قرب نصیب ہوتا جو میرے اس بندے کو مجھ سے حاصل تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ایک مریض کی عیادت کے لئے جانے سے عیادت کے ثواب کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب بھی نصیب ہوگا، اگر خدانخواستہ اس کا انتقال ہوگیا تو سب کے سب اس کے کفن دفن میں لگیں گے اس کا بھی ثواب ملے گا گویا کہ از اول تا آخر ثواب ہی ثواب ہے، یہ ہیں برکات مسجد میں حاضری اور بروقت مسلمانوں کے آپس میں ملنے جلنے کے نتائج، اب آپ دیکھئے کہ تبلیغ والے مرکز ہمیشہ مسجد کو ہی بناتے ہیں تو مسجدوں کی وہ برکات جو مسجد میں آنیوالوں کے لئے مخصوص ہیں۔ خود تبلیغ والوں کو ضرور بلکہ کچھ زائد ہی نصیب ہوں گی اور پھر ایک مشرب ایک مسکن ایک مطعم کی بناء پر جو مواخات بھائی بندی کے جذبات باہم رونما ہوتے ہیں یہ تبلیغ والے اس سے بھی محروم نہیں رہ سکتے تو تبلیغی جماعت میں نکل کر شیخ بھی ملے، دوست بھی ملے، نیت بھی اچھی ہوئی اور پھر اچھی بات

کہنے کا موقعہ بھی ملا۔

جماعت میں دشمنوں سے عبرت کا موقع......اب جب اچھی بات کہو گے تو ہر ایک ٹھنڈے دل سے نہیں سنے گا بلکہ اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت میں رہ کر دشمنوں سے بھی نصیحت حاصل کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ دس لوگوں کے پاس جائیں گے، دس منہ ہوں گے، دس قسم کی باتیں ہوں گی، کوئی بدعتی کہے گا، کوئی وہابی کہے گا اور بھی طرح طرح کی سخت وست باتیں آپ کو لوگ کہیں گے، آپ کے عیوب اور خرابیاں نکالنے کی کوشش کریں گے، جب آپ بار بار اس قسم کے لوگوں کو سنیں گے تو غور کریں گے کہ آخر میرے اندر کیا کمزوریاں ہیں کیا کوتاہیاں ہیں پھر ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کر کے آپ ان کو دور کرنے کی فکر کریں گے۔ حاصل یہ کہ اس میں نیک لوگوں کی صحبت بھی میسر دوستی بھی میسر، دشمنوں سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا بھی موقعہ۔

تبلیغ میں محاسبہ......اور ان تمام باتوں کے ساتھ جب آپ رات کو پڑ کر سوئیں گے تو یقیناً سوچیں گے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں اور کتنی برائیاں کیں اور پھر آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ رات کا وقت ہے حق تعالیٰ سے قرب ہے لاؤ نیکیوں پر اس کا شکریہ ادا کروں اور برائیوں سے توبہ کرلوں، تو اس طرح نیکیوں کا سلسلہ بڑھ جائے گا اور برائیاں گھٹتی چلی جائیں گی۔ تو بھائی! اس جماعت میں یہ چاروں دوائیں موجود ہیں، جو ہدایت کے لئے ایک ایسا معجون مرکب ہے کہ اس کے بعد پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

تبلیغ اور اصلاح......اور مقصود اصلی یہ ہے کہ پہلے خود ہمارا ہی دین درست ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ابتداء خود اپنے ہی سے کرنی پڑتی ہے، ضروری ہے کہ آدمی پہلے خود صالح بنے، پھر دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کو صالح بنائے، ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرے گا تو صالح بنے گا۔ دوسروں کو عمل کی دعوت دے گا تو مصلح بنے گا۔

اعتراضات اور ان کا اصولی جواب......رہ گئے تبلیغی جماعت پر اعتراضات تو لوگ کرتے رہتے ہیں، کون سا ایسا کام اور کون سی ایسی جماعت ہے جس پر اعتراضات نہیں ہوتے، آپ اعتراضات کو چھوڑ دیجئے اور کام کرتے جایئے۔ مثال کے طور پر لوگ ایک اعتراض یہ کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے صرف فضائل بیان کرتے ہیں۔ مسائل نہیں بیان کرتے اور دین درست ہوتا ہے مسائل سے، فضائل سننے کے بعد دل میں امنگ تو پیدا ہو جاتی ہے مگر جب آگے مسئلہ نہیں معلوم ہوگا تو ممکن ہے کہ لوگ امنگ اور جذبات کی رو میں بہہ کر من گھڑت عمل شروع کر دیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ بدعت میں مبتلا ہوں گے۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ اس طرز عمل سے لوگ بدعت کے اندر مبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔ اولاً تو محض احتمال اور امکان کی بات ہے دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ کیا ہے چالیس برس کے اندر کتنے لوگ بدعت میں مبتلا ہوئے؟

رہا مسائل کا نہ چھیڑنا، اس کا اگر یہ جواب دیا جائے کہ ہم پہلے فضائل بیان کر کے جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بعد میں مسائل چلائیں گے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے تبلیغ چل رہی ہے کیا آج تک جذبہ ہی پیدا نہیں ہوا؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تبلیغ والے فضائل ہی تو بیان کرتے ہیں مسائل سے انکار تو نہیں کرتے، کیا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ کسی سے نہ پوچھو، ہرگز وہ ایسا نہیں کہتے۔

دوسرے یہ کہ کام کرنے کے مختلف میدان اور مختلف لائنیں ہوتی ہیں، کوئی درس و تدریس کی لائن اختیار کرتا ہے، کوئی وعظ و تبلیغ کی، تو کوئی سیاست و حکمت کی، ان حضرات نے بھی ایک لائن اختیار کرلی ہے، فضائل بیان کرتے ہیں، لوگوں کے اندر دینی جذبہ اور امنگ پیدا کرتے ہیں، اب ساری لائن وہی اختیار کرلیں، یہ نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن۔

جب آپ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو آپ کام کرنے سے پہلے کچھ مقاصد اور اصول مقرر کرتے ہیں اور اپنی لائن متعین کرتے ہیں، اس میں آپ سب چیزوں کو داخل نہیں کرتے، تو پھر آپ اس میں سب چیزوں کو کیوں شامل کرنا چاہتے ہیں؟ بہرحال جب کوئی اعتراض کرے تو اسے سن لینا چاہئے اور اپنا کام کرتے رہنا چاہئے عمل ہی سب اعتراضات کا جواب ہے۔

مقصد تبلیغ...... بس تبلیغ والوں کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور دینی امنگ پیدا کردی جائے، اب اس امنگ سے آدمی دین کی جس لائن میں بھی کام لینا چاہے لے سکتا ہے، نیز دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب کسی چیز کی امنگ پیدا ہوجاتی ہے تو آدمی خود ہی اس امنگ کو صحیح طریقے سے پورا کرنے کی جدوجہد اور سعی کرتا ہے۔ اگر آپ کے اندر صحیح امنگ پیدا ہوگئی ہے اور آپ کو مسائل کی طلب ہے تو علماء سے ملئے، مدرسے میں جائیے اور مسائل معلوم کیجئے باقی کام میں نہ لگنا اور اعتراضات کا کرنا یہ حیلہ کرنیوالوں کا کام ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہر جماعت کا ایک نصب العین اور طریقہ کار ہوتا ہے، آپ کا اس پر دوسری چیزوں کو لادنا کہ فلاں چیز کو بھی اس میں شامل کرلیجئے کسی طرح مناسب نہ ہوگا، جب اس جماعت نے اپنا ایک موضوع متعین کرلیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ اسے اس پر کاربند رہنے دیں۔

بہرحال تبلیغ سے نفع اظہر من الشمس ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں دین کی امنگ اور طلب پیدا ہوئی اور اسی امنگ اور طلب کی وجہ سے کتنی بدعات ختم ہوئیں ورنہ لاکھوں آدمیوں کا محض اللہ اور اللہ کے دین کی خاطر اپنا پیسہ خرچ کرکے سفر کرنا، اپنا کھانا، اپنا پینا، پہلے یہ جذبہ کہاں تھا تو اس سے جو نفع پہنچا اس کو تو آپ بیان نہ کریں اور جو ان کا منصوبہ نہیں اس کو آپ اعتراض کی بنیاد بنائیں، یہ تو کوئی مناسب بات نہ ہوگی۔

خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے...... بہرحال! اصلاح نفس کے چار جز و اور چار طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہوگئے ہیں، صحبت صالح بھی ہے۔ ذکر و فکر بھی ہے۔ مواخاۃ فی اللہ بھی ہے۔ دشمن سے عبرت و موعظت بھی ہے اور محاسبہ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا، اس طریقہ کار سے دین عام ہوتا جارہا

ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی چلی جارہی ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے عقائد درست ہو رہے ہیں، لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرر ہے ہیں کم از کم ان تجربات کو سامنے رکھ کر اعتراض کرنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔

اس لئے اس میں خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے، آپ خود داخل ہو کر اس بات کا فائدہ محسوس کریں گے کہ اس کام سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟ آپ اسے تجربات کی روشنی میں معلوم کر لیجئے جو شخص بھی حسن نیت سے اس کام میں آئے گا، اس کا اثر اسے ضرور ہوگا۔ اس کام میں دعوت بھی ہے اور دعوت ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کی، نماز کی محنت بھی ہے، ساتھیوں کے ساتھ تعلق بھی ہے، ذکر بھی ہے اور محاسبہ بھی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس محنت سے بہت سی خیر اور بھلائی انسان میں آرہی ہے۔ کتنے برے تھے جو جماعت کی وجہ سے اچھے بن گئے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ برے عقیدے والے صالح عقیدے والے بن گئے۔

بے جا اعتراض......اور پھر اعتراضات تو وہ قابل قبول ہیں، جو کام میں گھس کر کئے جاویں اور جو باہر بیٹھ کر اعتراضات کرے وہ قابل قبول نہیں ہوا کرتے، اگر اندر گھس کر کوئی اعتراض کرے تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اندر گھسنے والا کوئی اعتراض کرتا نہیں۔ کیونکہ داخل ہونے کے بعد اسے اس کام کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب باہر کے اعتراضات ہیں جو قابل قبول نہیں۔

یوں تو اعتراضات سے مدرسے والے بھی خالی نہیں۔ اللہ و رسول بھی اعتراضات سے خالی نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی نسبت کہا گیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہنا کسی طرح بھی گالی سے کم نہیں، بخاری شریف کی ایک حدیث میں: ”قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: كَذَّبَنِي ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ، وَشَتَمَنِيْ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ. فَاَمَّا تَكْذِيْبُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ: لَنْ يُّعِيْدَنِيْ وَلَيْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ. وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ: اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، وَاَنَا الْاَحَدُ وَالصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِّيْ كُفُوًا اَحَدٌ.“ ترجمہ: ”اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھ کو جھٹلایا۔ حالانکہ اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرے اس نے مجھے برا بھلا کہا حالانکہ یہ اسے زیبا نہ تھا۔ تکذیب مثلاً یہ کہنا کہ اللہ مجھ کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہ کریں گے۔ حالانکہ پہلی مرتبہ کے مقابلے میں دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ یوں کہتا ہے کہ اللہ صاحب اولاد ہے، حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں اور نہ کوئی میرا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ ہی میرا کوئی شریک وساجھی ہے“۔

آپ خود سوچئے کہ اس سے زیادہ گالی کیا ہوگی کہ کسی آدمی کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں کے سانپ پیدا ہوا ہے اس شخص کے لئے کتنی شرم کی بات ہوگی، حالانکہ سانپ بھی جاندار ہے اور اس معنی کر کے دونوں میں ایک گونہ

مماثلت ومشابہت ہے۔

اور بھائی! اللہ تبارک تعالیٰ تو نور ہیں، پھر انکے لئے بیٹا اور بیٹی ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس طرح رسولوں کو بھی مورد طعن و تشنیع بنایا گیا۔ کسی نے کہا یہ تو کاہن ہیں، کسی نے کہا جادوگر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ ورسول بھی اعتراض سے نہیں بچ سکے تو ہماری اور آپ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ بہرحال اعتراض کرنیوالے تو سب پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہ چاہئے۔

اعتراض کی حقیقت...... اعتراضات کا دائرہ بہت وسیع اور نہایت آسان ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علمی لائینوں میں سب سے زیادہ مشکل کام فتویٰ دینا ہے۔ اس لئے کہ کسی مسئلے کے متعلق فتویٰ دینے کے لئے سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، جب تک تمام جزئیات سامنے نہ ہوں۔ فتویٰ دینا مشکل ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دو واقعے اور دو مسئلے بالکل ایک جیسے مگر حکم دونوں کا جدا جدا، حضرت نے فرمایا کہ: بڑے سے بڑے عالم کا مفتی ہونا ضروری نہیں۔ پھر فرمایا کہ: اس سے آسان کام درس دینا ہے، افتاء میں سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، غور کرنا پڑتا ہے، دماغ پر زور ڈالنا ہوتا ہے اور درس دینے والا ایک عبارت کو دیکھ کر اس کا ماحصل بیان کر دیتا ہے اور فرمایا کہ درس دینے سے بھی آسان کام تقریر کرنا ہے اور وہ بھی عامیانہ اور میں ان تینوں پر ایک جزیہ کا اضافہ کر کے یوں کہتا ہوں کہ ان سب سے آسان ہے اعتراض کا کر دینا، جس پر چاہے اعتراض کر دیجئے، صحابہؓ پر اعتراض، ائمہ مجتہدین پر اعتراض، لطف کی بات یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے تھکتے نہیں اور تھکیں بھی تو کیسے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ عقل کی، بس ہر بات کے متعلق یہ کہہ دیجئے کہ یہ غلط ہے۔

اور اعتراض کرنے کے لئے علم کی بھی ضرورت نہیں، اعتراض کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہوتی نہ علم کی نہ عمل کی اتنا آسان کام ہے اعتراض کا کرنا ایسے آسان کام کو ہر کوئی شخص کرسکتا ہے۔ تو بھائی! اگر کچھ لوگ ایسے گئے گزرے اور آسان کام کو اختیار کرتے ہیں تو کرتے رہیں، اس سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے، آپ اپنے کام میں پورے طریقے سے مشغول رہئے، کل میدان قیامت میں اعتراض کرنیوالے بھی کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والوں کی بھی صفیں لگی ہوں گی، ہر ایک کی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

انعام خداوندی...... یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور آپ کی قسمت کی بات ہے کہ آپ کے حصے میں کام کرنا آیا اور دوسروں کے نصیب میں اعتراض کرنا۔ اس لئے آپ تو خوش رہئے کہ حق تعالیٰ نے آپ لوگوں کو کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اعتراضات سے بچا لیا۔ اور رہ گیا اوروں کا اعتراض کرنا، اس کے لئے آپ لوگوں کا عمل خود جواب ہے، مثل مشہور ہے کہ۔ ''ایک چپ سو کو ہرا دیتی ہے''۔ اور چپ سے بڑھ کر عمل ہے اس سے کچھ بھی اشکال قائم نہیں رہے گا۔

خلاصہ: بہرحال میں نے عرض کیا کہ: اصلاح نفس ضروری ہے اور اصلاح نفس کے طریق کو بھی میں نے بیان

کر دیا اور اس کام میں اصلاح نفس کے تقریباً چاروں طریقے موجود ہیں جو جتنی محنت کرے گا، اتنی ہی ترقی حاصل کریگا۔ اس لئے کہ جب آپ عمل کریں گے تو اس پر اس کام کے ثمرات بھی ضرور مرتب ہوں گے۔ اب تک معترضین کے متعلق جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ ان کے اعتراض کو مان کر کے، اور اگر غور کیا جائے تو سرے سے ان کے اعتراضات ہی قابل تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ اس میں بڑے اور پرانے لوگ بھی تو موجود ہوتے ہیں، جن سے کام کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں اور اصول سے کام کرنے میں ترقی ہوگی، بعض ارباب درس وتدریس ہوتے ہیں اور بعض اہل فتویٰ ان سے آپ کو روکتے بھی نہیں ہیں۔ اگر کسی کو علم حاصل کرنا ہو تو ان سے حاصل کر سکتا ہے مسئلہ معلوم کرنا ہو تو ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ کام کرنے والوں کیلئے یہ سب باتیں ہیں اور نہ کام کرنے والوں کے لئے یہ سارے اعتراضات ہیں، بہر حال نسخہ ہے مکمل ہاں دل ہی اگر نہ چاہے تو اور بات ہے کسی نے صحیح کہا ہے کہ ''اگر تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں'' تو بات بتلانے والوں نے بتلا دی، اعلان کرنے والوں نے آواز بھی لگا دی، منزل بھی بتلا دی' ثمرہ بھی بتلا دیا کہ یہ سامنے آئے گا۔ اب ان حضرات کی ذمہ داری نہیں کہ وہ آپ کی طرف سے چلیں بھی، آپ چلیں گے اور کام کریں گے تو اس کا پھل پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ نفع عام ہے اس لئے اس میں ضرورت ہے کہ سب چلیں۔ اگر آپ تعلیم میں شرکت کر سکتے ہیں تو تعلیم میں شریک ہوں، گشت میں شرکت کر سکتے ہوں، تو گشت میں شریک ہوں اور اگر کچھ اوقات لگا سکتے ہوں تو اوقات بھی لگائیں۔ اور بھائی! اس سے کنارے رہنا بڑی ہی محرومی کی بات ہے۔ فکری طور پر ہو، عملی طور پر ہو، جس درجہ میں بھی ہو، اس میں شریک رہنا چاہئے۔ یہاں آنے کا اصل مقصد حضرت شیخ مدظلہ سے ملاقات تھی پھر اس کے بعد آپ حضرات کی درخواست کو چلتے چلتے پورا کرنا بھی ضروری تھا۔ سو ملنے کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ بہر حال نفس کی اصلاح ہوگی تو انسان کامل ہوگا اور یہ بات حاصل ہوگی ان طریقوں سے۔ حق تعالیٰ ان چند کلمات کو قبول فرمائیں۔ اور ہمیں بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطاء فرمائیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

جماعتی تبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْجَآءَ هَاالْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ . ②

ہمیشہ دین ایک رہا اور شرائع حسب مزاج اقوام نازل ہوتی رہیں...... بزرگان محترم، و برادران عزیز! اللہ کا دین ایک ہی ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا۔ البتہ شریعتیں مختلف ہوئیں۔ مگر اصل دین ایک رہا۔ اصل دین میں بنیادی چیزیں داخل ہیں۔ جیسے وجود خداوندی، توحید الٰہی، رسالت و نبوت، عالم برزخ، عالم حشر، جنت و دوزخ میزان، پل صراط۔ یہ تمام چیزیں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی گئیں، جو بنیادی اصول ہیں۔ آگے شریعتیں عملی پروگرام ہیں، جو ان اصول کے تحت ہیں وہ اقوام کے مختلف مزاج و نفسیات اور ان کی طبعی افتاد کے باعث مختلف رہی ہیں۔ جیسی ضرورت ہوئی، اسی انداز کا عمل ان کو بخشا گیا، اگر قوم سخت مزاج ہوئی، تو شرعی احکام سخت نازل ہوئے۔ اگر کسی قوم کے مزاج میں نرمی تھی، تو احکام میں بھی نرمی رکھی گئی، اگر اعتدال ہے تو احکام میں بھی اعتدال رکھا گیا۔ غرض عملی احکام نفسیات اقوام اور افتاد مزاج کے مطابق حق تعالیٰ نے نازل فرمائے۔

اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ: اَبُوْنَا وَاحِدٌ اُمَّهَاتُنَا شَتّٰى ③ "باپ ہمارا ایک ہے مائیں مختلف ہیں"۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳، ۱۴۔

② بروز جمعرات ۶ اذی الحجہ ۱۳۹۸ھ بمطابق ۱۶ نومبر ۱۹۷۸ء بعد نماز مغرب، مسجد حفائر، مکہ مکرمہ۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قولہ تعالیٰ واذکر فی الکتب مریم، ج: ۱۳ ص: ۱۲۷ رقم: ۳۲۵۹.

باپ سے اصول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دین سب کا ایک ہے اور امہات سے عملی احکام کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی شریعتیں مختلف ہیں۔ اس لئے ہر نبی کے زمانے میں شریعتوں کے اندر اختلاف رہا ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا دور مبارک ہے، اسے یوں سمجھئے کہ وہ اس عالم بشریت کی طفولیت اور لڑکپن کا زمانہ ہے گویا عالم بشریت ایک لڑکا ہے جو آگے جا کے جوان اور بوڑھا ہوا۔ اس زمانے کے احکام بہت ہلکے تھے۔

﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① ''چیزوں کے نام یاد کرا دیئے گئے''۔ جیسے بچوں کو ابتدا آپ یاد کرا دیتے ہیں۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، روٹی ہے، لوٹا ہے وغیرہ۔ عمل کے درجے میں صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام یاد کرا دیئے گئے کہ یہ صبح و شام رٹ لیا کرو۔ لوگ یہی عمل کرتے تھے۔ تو عالم بشریت بالکل سادہ تھا۔ جیسے بچے کا مزاج ہوتا ہے۔ تو احکام بھی بالکل ابتدائی تھے۔ یہ مکمل احکام نہیں تھے جو بعد کی شریعتوں میں نازل کئے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ اس میں لوگ فلکیات کی طرف چل پڑے تھے۔ سورج چاند کو پوجنا اور ستاروں سے اثرات لینا، تو ابراہیم علیہ السلام نے اس زمانے کے طریق کو سامنے رکھ کر وجود خداوندی اور توحید خداوندی کو سمجھایا جس کا قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ② ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں اور فلکیات کی نفسیات سمجھا دی گئی۔ انہوں نے اسی طریق پر قوم کی اصلاح فرمائی اور اس کے مناسب ہی احکام بھی دیئے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا۔ یہود کا مزاج بہت سخت تھا۔ ابتداء ہی سے یہ قوم تلخ اور سخت واقع ہوئی ہے۔ ان میں کبر و نخوت بھی تھا۔ بہر حال اولاد انبیاء علیہم السلام تھی۔ تو بزرگ زادوں میں نسبت کے لحاظ سے کچھ یوں بھی نخوت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہتے تھے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ③ حق تعالیٰ سے ہماری رشتہ داریاں قائم ہیں، اسی لئے تو ہم اولاد انبیاء ہیں۔ تو وہ جلدی ماننے والے نہیں تھے۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا۔ بعض انبیاء کی تکفیر کی، بعض کو قتل کیا۔ گستاخیاں کیں اور جو احکام نازل ہوتے، ان کے مقابلے پر آ جاتے تھے۔ مانتے نہیں تھے، تو یہ ساری شریعت بھی سخت قسم کی نازل ہوئی۔ اگر گوسالہ پرستی کی تو فرمایا گیا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ تو آپس میں باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو قتل کیا۔ ہزاروں آدمی قتل ہوئے۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ رات کو جو عمل کرتے تھے، صبح کو ان کے دروازوں پر لکھا ہوتا کہ یہ بد عملی کی ہے گویا دنیا ہی میں رسوا کر دیا جاتا تھا۔ اتنے سخت احکام دیئے گئے تھے۔

اگر کپڑے پر نجاست لگ گئی، تو پانی سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ قینچی سے اسے کاٹنے کی نوبت آتی تھی۔ حتیٰ کہ اگر بدن پر نجاست لگ گئی تو صرف پانی سے پاک نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ کھال کو کھرچا نہ جائے۔ ایسے شدید ترین

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۴، ۷۵. ③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۸.

احکام تھے اس لئے کہ قوم کے مزاج میں شدت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، وہ اس پہلے عمل کا ردِعمل تھا۔ اس قوم میں نرمی بے حد تھی احکام بھی نرم دیئے گئے۔ فرمایا گیا، اگر تمہارے دائیں گال پر کوئی تھپڑ مار دے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو کہ ایک اور مار دے، خدا تیرا بھلا کرے۔ گویا انتقام لینا اس شریعت میں ممنوع تھا۔ یہود کی شریعت میں انتقام لینا واجب تھا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا دانت توڑو۔ آنکھ پھوڑے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑو۔ ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ①

غرض جیسا عمل کرے، بدلہ لینا واجب ہے۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ معافی نرم خو لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ جو تند مزاج ہوں ان کو معافی کارگر نہیں ہوتی۔ وہاں تو بدلہ لینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ جبھی وہ سیدھے ہو سکتے ہیں۔ تو شریعت موسوی کے اندر انتقام لینا واجب تھا۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ عیسوی شریعت میں اس کا بالکل ردِعمل تھا کہ نہ صرف انتقام لینا ہی جائز نہیں، بلکہ معاف کرنا واجب تھا۔

وہاں یہ تھا کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو کپڑے کا قطع کر دینا ضروری تھا۔ یہاں یہ تھا کہ اگر سارا بدن نجاست میں لت پت ہو جائے، دل کو پاک رکھو، عبادت کرتے رہو، بدن چاہے کیسا ہو، اتنی نرمی کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ شرعی احکام حسب مزاج اقوام نازل کئے گئے ہیں۔ دین اور اصول سب کے ایک رہے ہیں۔

امت محمدیہ کو اجر و ثواب زیادہ دیا گیا اور عمل کا بار کم ڈالا گیا...... جب آخر میں امت مسلمہ آئی تو یہ بوڑھی امت تھی۔ بوڑھے آدمی کے اندر عقل و تجربہ بڑھ جاتا ہے مگر عملی قوت گھٹ جاتی ہے۔ بوڑھے آدمی سے عمل ہونا مشکل ہے۔ مگر دماغ اتنا روشن ہوتا ہے کہ نوجوانوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان سے مشورہ لیں، ان کی رائے پر عمل کریں۔ وہ زمانے کا سرد اور گرم دیکھے چکے ہوتے ہیں تو کوئی تجربے کی بات بتائیں گے۔ یہ امت بوڑھی امت تھی۔

دنیا کا اختتام اسی امت کے اوپر تھا۔ گویا یہ عالم بشریت کے بڑھاپے کا دور تھا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں طفولیت کا دور تھا۔ وہاں بچوں کے مناسب احکام تھے۔ یہاں بوڑھوں کے مناسب احکام ہیں۔ بوڑھوں کے لئے یہ ہوتا تھا کہ عمل کا بار تو ان پر کم ڈالتے ہیں مگر تحسین و آفرین زیادہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شادی بیاہ ہو، تو بڑے میاں کو کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا کام یہ ہے کہ آپ کھانے کے اوپر بیٹھے نگرانی کرتے رہیں۔ نوجوان کھانا تقسیم کریں گے، بڑے میاں صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ شام کو لوگ کہتے ہیں کہ صاحب بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔ بڑی ہمت کے آدمی ہیں۔ حالانکہ صبح سے شام تک بیٹھے ہی رہے اور بڑے میاں نے کیا کیا؟ مگر کہتے ہیں کہ بڑا کام کیا اور بڑے باہمت ہیں۔ حالانکہ ایک رکابی اٹھا کر انہوں نے نہیں دی۔ غرض بوڑھوں پر عمل کا بوجھ

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٤٥.

کم ڈالتے ہیں۔ تحسین اور آفرین زیادہ کرتے ہیں۔

البتہ نوجوانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی رائے پر چلیں۔ اس لئے کہ ان کی رائے میں وزن ہوتا ہے۔ یہی صورت اس امت کی ہوئی کہ تمام امتوں کے احوال اس کے سامنے تھے۔ تو اس امت کا علم کامل اور تجربہ وسیع ہوا۔ پچھلی امتوں کے سامنے بعض باریک مسئلوں کے احکام نہیں تھے، وہ اسی امت کے بارے میں راسخ ہوسکتے تھے اور دنیا کے بارے میں راسخ نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ یہ امت جو تھی اس کے سامنے امت آدم، امت نوح، امت موسیٰ، امت عیسیٰ علیہم السلام کے احوال کھلے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے ایک ایک چیز روشن کردی۔ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تاریخی چیزیں واضح کردیں۔ گویا یہ امت سب کے احوال سامنے رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے یہ روشن ضمیر ہے اور اس کا علم وسیع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اس امت کی شہادت سے دنیا کے فیصلے ہوں گے، چونکہ یہ امتوں کے احوال کو جانتی تھی، اس لئے جس امت کے بارے میں گواہی دے گی کہ یہ باطل پر تھی، وہ عنداللہ بھی باطل پر سمجھی جائے گی، عذاب وثواب کے سارے معاملات اس امت کی شہادت پر ہوں گے۔ اس لئے کہ جاننے والی امت عالم میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگی۔ قرآن حکیم میں فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ① "یہ امت وسط، امت معتدل بنائی گئی۔ اس کو دنیا کی امتوں کے حق میں گواہ بنایا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حق میں گواہ بنیں گے کہ میری امت نے سچ کہا"۔ بہرحال اس امت کو علم دیا گیا لیکن عمل کا بار اس پر کم ڈالا گیا۔ جتنے شاق شاق عمل پچھلی امتوں پر اتارے گئے تھے۔ اس پر عشر عشیر اور نصف بھی نہیں ہے۔ بہت ہلکے ہلکے احکام دیئے گئے مگر اجر زیادہ دیا گیا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی اور دس ہی نہیں بلکہ سات سو ملیں گی اور سات سو ہی نہیں بلکہ ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ② اللہ "جس کے لئے چاہے جتنا چاہے اجر بڑھادے"۔ تو ایک نیکی دس نیکی کے برابر اور وہ سات سو نیکی کے برابر اور وہ ہزار ہا نیکی کے برابر۔ حدیث میں فرمایا: "تَصَدَّقُوْا وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ." ③ "صدقہ کرو اگرچہ چھوہارے کی گھٹلی صدقہ کی جائے"۔ اس گھٹلی کو حق تعالیٰ پالتے ہیں۔ قیامت میں اس کو جبل احد کے برابر کرکے اس کا اجر پیش کیا جائے گا۔ لوگ حیران ہوں گے کہ اتنا بڑا اجر۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے گھٹلی صدقہ کی۔ تو گھٹلی کا جبل احد سے مقابلہ کیا جائے۔ کتنی گھٹلیاں بن سکتی ہیں، اربوں کھربوں بنیں گی۔

امت محمدیہ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مراعات...... مطلب یہ ہے کہ ایک گھٹلی کا اجر کروڑوں گنا زیادہ دیا گیا۔ تو اس امت پر عمل ہلکا رکھا گیا اور اجر زیادہ دیا گیا۔ اگر کوئی ایک نیکی کا ارادہ کرے، ابھی عمل نہیں کیا۔ ایک نیکی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۳۔ ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ او کلمۃ طیبۃ، ج: ۲ ص: ۷۰۳ رقم: ۱۰۱۶۔

لکھی جاتی ہے۔ اگر وہ نیکی کر لی، پھر کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بدی کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جاتا کہ آدمی بدی کا ارادہ کرتا، ایک بدی لکھ دی جاتی۔ مگر نہیں لکھی جاتی۔ ارادے کے بعد اگر بدی سے رک گیا، تو ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے کہ یہ رکنا بھی ایک مستقل نیکی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدی کر لی تو حدیث میں ہے کہ ملائکہ انتظار کرتے ہیں کہ ابھی مت لکھو، ممکن ہے توبہ کر لے۔ ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ.'' ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا'' ۔ اس کا حساب ہی نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو نامہ اعمال صاف ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اور اگر توبہ نہ بھی کی آگے وعدہ دیا گیا کہ ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ﴾ ② تمہاری اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو وہ خود تمہاری بدیوں کو مٹا دیں گی۔ اس کا تدارک اس طرح سے کر دیا انتہائی تسہیل اور سہولت اس امت کو دی گئی ہے کہ عمل کا بار بہت کم ڈالا گیا اور اجر بہت زیادہ دیا گیا۔ پچھلی امتوں کو یہ کہا گیا کہ اگر تم نے نبی کی نافرمانی کی، تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا۔ قوم ثمود کو حضرت جبریل علیہ السلام کی ایک چنگھاڑ نے تباہ کر دیا۔ قوم شعیب پر آگ برسا دی گئی، وہ تہس نہس ہو گئے، قوم فرعون کو دریائے قلزم میں غرق کر دیا گیا۔ تو شدید ترین عذابات آتے تھے۔

اس امت کے بارے میں رحمت اللعالمین کا صدقہ ہے کہ گناہ بھی کر رہی ہے، برائیاں بھی کر رہی ہے۔ مبتلا بھی ہے لیکن فرمایا گیا ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ ③ اللہ اس امت کو عذاب نہیں دیں گے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں اور جب کہ امت میں استغفار کرنے والے موجود ہوں، تو پوری امت کو عذاب میں نہیں مبتلا کیا جائے گا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ میری امت کا استیصال ہو جائے۔ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ ''لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلٰلَةِ'' ④ ''میری امت ساری کی ساری مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی'' فرقے اور پارٹیاں ہوں گی، مبطل اور شکوک و شبہات نکالنے والے بھی ہوں گے۔ مگر ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ وہی کام کرے گی، جو میں نے کیا۔ وہی باتیں کہے گی، جو میں نے کہیں اعتقاد و عمل کا وہی نقشہ قائم کرے گی جو میں نے کیا۔

''لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ'' ⑤ میری امت میں ہمیشہ ایک طائفہ حقہ، موجود رہے گا۔ یہاں طائفہ کا لفظ بولا۔ طائفہ چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں۔ یعنی چاہے چھوٹی جماعت ہو مگر حق پر رہے گی اور من جانب اللہ ان کی مدد کی جائے گی۔ کوئی انہیں رسوا کرنا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۲ ص: ۴۱۹ رقم: ۴۲۵۰.

② پارہ: ۱۲، سورۃ هود، الآية: ۱۱۴. ③ پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآية: ۳۳. ④ المعجم الكبير للطبراني، ج: ۱۱ ص: ۷۸. ⑤ السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في ائمة المضلين ج: ۸ ص: ۱۷۲.

چاہے گا نہیں کر سکے گا۔ لوگ ان کی مخالفت کریں گے، مگر وہ حق سے نہیں ہٹے گی اور برابر آگے چلے گی"۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے اس امت کو بہت سی سہولتیں دی گئی ہیں۔ نیکیوں میں اجر و ثواب کی، بدیوں میں معافی کی، اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں ہیں۔

وحدتِ دین اور اختلافِ شرائع کا قرآن سے ثبوت...... غرض میرا مطلب یہ تھا کہ دین از آدم تا ایں جا ایک ہے۔ آج تک وہی دین ہے، شریعتیں مختلف ہیں۔ تمام انبیاءؑ کا دین ایک ہی رہا۔ یعنی توحید خداوندی، اسی توحید سے پھر سارے اعمال پیدا ہوئے۔ اسی کو فرمایا گیا "کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ① یعنی دین ایک اور شریعتیں مختلف، اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم میں اس کا اشارہ نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دین کے بارے میں ارشاد ہے وہاں فرمایا ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ ② "ہم نے جو وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی تھی۔ وہی وصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کی وہی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کی کہ دین قائم کرو۔ اس میں تفریق مت ڈالو"۔ وہ اول سے لے کر آخیر تک ایک تھا۔ ﴿شَرَعَ لَکُمْ﴾ کے لفظ میں مجموعہ استعمال کیا گیا کہ تم سب کے لئے اللہ نے ایک دین کو مذہب کر دیا دین میں تفریق نہیں ہے۔

اور شریعت کے بارے میں فرمایا ﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ ③ "تم میں سے ہر ایک جماعت اور امت کے لئے ہم نے شریعتیں اور راستے مختلف بنا دیئے"۔ جہاں دین کا لفظ ہے، وہاں مجموعے کو کہا گیا کہ تمہارے لئے ایک دین ہے اور جہاں شریعتوں کا ذکر ہے وہاں ﴿لِکُلٍّ اُمَّةٍ﴾ فرمایا ہر طبقہ اور ہر امت کے لئے فرمایا۔ غرض قرآن کریم سے بالکل تائید ہوتی ہے کہ دین واحد اور شریعتیں مختلف ہیں اور مزاج اقوام کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔

فقہ میں اختلافِ مشرب ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... اب ظاہر بات ہے کہ یہ شریعت تو ایک ہی ہے۔ کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، کوئی نئی کتاب آنے والی نہیں، نئی شریعت آنے والی نہیں۔ ذاتِ نبوی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم خاتم الکتب ہے، شریعت اسلام خاتم الشرائع ہے۔ ہر چیز اس دین کی مختتم، اختتامی اور انتہائی ہے کہ اس کے بعد کوئی نئی چیز آنے والی نہیں ہے۔ مگر اقوام کے مزاج تو مختلف ہیں، بیشک دین

① ذکر الحافظ ابن رجب الحنبلی رحمه اللّٰه تعالیٰ ان دین الانبیاء کلهم واحد وهو الاسلام. فتح الباری، کتاب الایمان ج: ۱ ص: ۷.

② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوری، الآیۃ: ۱۳.

③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۸.

اور شریعت تو ایک ہے لیکن جب یہ دنیا کی مختلف اقوام کیلئے پیغام ہے اور قوموں کے مزاج الگ الگ ہیں۔ یورپین اقوام کا مزاج اور ہے، ایشین کا اور، افریقنوں کا اور۔ اور ہم سب کے لئے ایک ہی شریعت ہے۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شریعت کے اندر ایسے آئمہ ہدایت پیدا ہوں، جو مزاج اقوام کے مناسب شریعت کو سمجھائیں۔ آئمۂ ہدایت مختلف ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام ابن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ یہ چار ائمہ تو چاند اور سورج ہیں کہ پورے عالم میں ان کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور بہت سے ائمہ تفقہ ہیں۔ امام بخاریؒ، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، سفیان ابن عینیہؒ یہ سب صاحب فقہ تھے۔ مگر ان سب کے فقہ دب گئے اور ان چار آئمہ کے فقہ اوپر آ گئے اور عام طور پر دنیا میں انہیں کو فقہاء مانتے ہیں۔ پوری ترکی، پورا افغانستان، ہندوستان کا ایک بڑا حصہ حنفی ہے۔ مغربی ممالک میں اکثریت مالکیوں کی ہے، نجد میں حنابلہ کی اکثریت ہے اور حجاز و مصر میں شوافع کی اکثریت ہے۔ غرض پوری دنیا انہی چار فقیہوں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ انہیں چار کا مجموعہ اہلسنت والجماعت کہلاتا ہے۔ گویا اس وقت اہل السنّت والجماعت پوری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ انہیں کا مذہب رائج ہے۔

تو انبیاء آ نہیں سکتے تھے۔ نئی کتاب نہیں آ سکتی تھی مگر قرآن کریم کو اللہ اتنا جامع بنایا کہ اس کے اندر فقہیں مختلف نکل آئیں۔ ہر فقہ ہر قوم کے مناسب ہے، ایک فقہ شافعی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس پر عمل کرے۔ فقہ حنفی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس کا پابند ہو جائے۔ فقہ مالکی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہے وہ اس کا تابع ہو جائے۔ اسی طرح فقہ حنبلی ہے۔ غرض ایک شریعت اصلی ہے۔ ایک شریعت فروعی ہے۔ اصلی شریعت تو ایک ہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مرحمت فرمائی اور شرائع مختلف ہیں یعنی اجتہادی امور میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف و آئمہ ہدایت نے دنیا میں پیش آنے ولے واقعات و حوادث کے لئے قرآن و حدیث سے احکام نکالے۔ جو خود ایک مستقل فقہ بن گیا۔ ان فقہوں میں ظاہر ہے کہ مزاجوں کا دخل ہے۔ اس لئے جس مزاج کی قوم ہوگی۔ اس فقہ کی طرف چل پڑے گی، جبکہ وہ سب کے سب حق پر ہوں گے اور عنداللہ قبول ہوں گے۔

تصوف میں اختلاف مسلک ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... یہی صورت صوفیاء میں بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ صوفیاء کا جو اصل بنیادی طریقہ ہے، جس کو احسانی سلوک کہتے ہیں، وہ ایک ہی ہے اور وہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ قلب کو پاک بناؤ، ذکر اللہ کی کثرت کرو۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اب قلب کو پاک بنانے کے طریقے کیا ہیں؟ اس میں تجربات ہیں کہ چشتیہ نے اور طریقہ رکھا، نقشبندیہ نے اور طریقہ رکھا، سہروردیہ نے اور طریقہ رکھا۔ یہ درحقیقت قلوب کو مانجھنے کی تدابیر ہیں۔

جب قلوب منجھ گئے، تو آگے ذکر اللہ وہی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے۔ ان حضرات نے کوئی ذکر نیا تجویز نہیں کیا وہی اذکار عشرہ ہیں۔ تسبیح، تحمید، تمجید، تهليل، تكبير ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" تو حوقله، تعوّذ،

تسمیہ، استغفار اور درود شریف یہ سب کتاب وسنت میں موجود ہیں۔تمام طرق کے حضرات یہی اذکار بتلاتے ہیں۔البتہ ان کے طریقے الگ الگ ہیں کہ اس کا دل کدھر چل رہا ہے۔اس کو مانجھا جائے' مانجھنے کے طریقے الگ ہیں، ریاضات ومجاہدات الگ الگ تجویز کئے۔مگر وہ تدابیر کا درجہ ہیں۔اگر کوئی ان کے خلاف کرے تو یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔اس لئے کہ اس کو عین دین نہیں کہتے ۔ دین کی ایک تدبیر کہتے ہیں۔بہر حال فقہ میں دیکھوتو مشرب مختلف ہیں۔تصوف میں دیکھوتو مشاغل مختلف ہیں۔فقہ وتصوف میں دیکھو۔تو علماء کے مسالک مختلف ہیں مگر بنیاد سب کی ایک ہے۔

ابلاغ وتبلیغ کے طریقے مختلف ہوتے رہے مگر سب کا ماخذ ایک رہا......یہی صورت بعینہ دین کے ابلاغ وتبلیغ میں اب واقع ہوئی۔دین کو پہنچانا، وہ تو ایک ہی ہے، جیسے آپ پہنچائیں گے۔وہی اذکار، وہی نماز، وہی روزہ، زکوٰۃ، حج اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔لیکن اس کے پہچانے کے لئے ڈھنگ کیا اختیار کیا جائے؟ کہ کڑوی دوائی کیپسول کے بیچ میں رکھ کے نگلوادی جائے۔اس میں تدابیر کے طور پر طریقے مختلف ہیں۔پھر تدابیر کے درجے مختلف ہوتے رہے ہیں لیکن تدبیروں سے جو چیز پہنچائی گئی، وہ ایک ہے۔اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

اب مثلاً مسلمانوں میں ابتدائی دور میں روایت پر زیادہ زور تھا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت صحیح نہ ہو، لوگ نہیں مانتے تھے۔اس واسطے اللہ نے محدثین پیدا کئے۔انہوں نے روایتوں کی چھان بین کر کے کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا۔اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا، جس میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخیں مرتب کیں، جو راویان حدیث ہیں۔ان کے خاندان، کیریکٹر وکردار، حافظہ، ضبط اوران کی عدالت پر تمام چیزیں لکھیں گویا پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمری مرتب کی۔

پھر علم منکرات الحدیث مرتب کیا کہ حدیث کے بھی درجات ہیں۔قوی، صحیح، ضعیف، متروک، مجہول وغیرہ یہ اصطلاحات مقرر کیں کہ سند متصل ہے تو حدیث مرفوع متصل کہلائے گی۔اگر بیچ میں منقطع ہوگئی۔تو اگر صحابی پر منقطع ہوگئی تو مرسل کہیں گے، وغیرہ۔اصطلاحات مقرر کر کے ایک کانٹا اور میزان بنادی کہ حدیث میں غیر حدیث نہ شامل ہوسکے۔اس میزان پر دیکھ لو۔کھری چیز الگ ہوجائے گی اور کھوٹ الگ ہوجائے گا۔تو ابتدائی دور میں زیادہ زور روایت پر تھا۔تو روایت اورفن تاریخ کے اصول مدون کئے گئے۔روایتی طور پر دین کو نکھار کر کے پیش کر دیا گیا، لوگوں نے قبول کیا۔

پھر ایک زمانہ درایت کا آیا کہ روایتیں تو کتابوں میں جمع ہوگئیں، یکجا ہوگئیں۔لیکن ان روایتوں سے مسائل اوراحکام کا نکالنا، اس میں اجتہاد کی ضرورت تھی۔یہ دور ائمہ مجتہدین کا دور تھا۔تو ائمہ مجتہدین نے مسائل کا استنباط کیا، یہ معلوم کیا کہ حکم نبوی کی علت کیا ہے جس پر یہ حکم دائر ہے۔اس علت کو نکالا۔اس علت میں اختلاف پڑا۔فرعیات میں اختلاف پڑتا چلا گیا۔تو مذاہب میں اختلاف پیدا ہوا۔مگر کل کے کل حق پر رہے۔اس لئے کہ سب کا

ماخذ کتاب وسنت ہے۔ یہ دور اجتہاد کا تھا۔ اس میں روایت پر زور نہیں تھا یہ دیکھتے تھے کہ تفقہ وفقہ کیسا ہے۔ جب تفقہ اور درایت معلوم ہوتی تب لوگ قبول کرتے تھے۔

پھر ایک زمانہ صوفیت پسندیت کا آیا۔ کہ جب تک قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں نہ سمجھاؤ، لوگ سمجھتے نہیں تھے۔ پورے عالم پر صوفیت چھا گئی تھی۔ امام غزالیؒ شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا۔ بہر حال ڈھنگ بدلتے رہے۔ قرآن وحدیث وہی رہا۔ لیکن سمجھانے کے طریقے الگ الگ ہوگئے۔ فروعات الگ الگ ہوگئیں، مگر ماخذ سب کا ایک تھا۔ بنیاد سب کی ایک تھی۔ اس لئے سب کے سب اہل حق تھے۔

اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا کہ عقلیات سے جب تک نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو شاہ ولی اللہ اور امام غزالیؒ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے دین کو عقلی رنگ میں سمجھایا اور جہاں نقلی دلائل تھے، وہاں عقلی دلائل بھی پیش کئے۔ مگر عقل کو نقل کے تابع رکھا۔ عقل، دین کے تابع ہے، دین پر حاکم نہیں ہوسکتی، حاکم دین رہے گا، اس کے خادم کے طور پر عقل بھی چلے گی۔ دین ایک دعویٰ کرے گا، عقل اس کی تائید کرکے اسے ثابت اور واضح کرے گی، خدمت کرنا یہ عقل کا کام ہے۔ اس لئے عقل کو خادم دین بنایا گیا۔ تو یہ دور ایسا تھا کہ جب تک عقلیات سے نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے بعد سائنس کا دور آیا۔ یہاں عقلیات سے زیادہ حسیات ہیں۔ محسوس چیز سے کسی چیز کو سمجھاؤ، تب لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے پھر ایسے علماء کرام پیدا کئے، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا نانوتوی، رحمہما اللہ تعالیٰ ان لوگوں نے محسوسات کے انداز سے دین کو سمجھایا اور حسی مثالوں سے واضح کیا کہ دین حق ہے۔ گویا دین ایک دعویٰ کرتا ہے، محسوسات اس کی خدمت کرتے ہوئے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ جو لوگ منکر تھے، وہ سن کر مجبور ہوئے۔ مثلاً معراج کا مسئلہ تھا۔ تو قدیم فلاسفہ کہتے تھے کہ یہ محال ہے، یہ ممکن نہیں، بالکل صاف انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچ میں کرہ نار ہے وغیرہ۔ اس سے آدمی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذہ معراج ہو نہیں سکتی۔ اب جب لوگ چاند تک پہنچ گئے اور چاند کی مٹی کھود لائے، اب لوگ معراج کو ماننے پر مجبور ہوئے کہ حسیات میں ایک نظیر آ گئی، تو خواہ مخواہ مجبور ہوئے کہ معراج بھی حق ہے۔ جب مادی وسائل سے آپ چاند تک پہنچ سکتے ہیں، تو روحانی وسائل ان سے کہیں زیادہ قوی ہیں۔ ان سے کیوں نہیں پہنچ سکتے؟۔ حاصل یہ نکلا کہ دین دعوے کرے اور مغربیت پسند اس کو ثابت کریں تاکہ ان پر حجتیں تمام ہوں اور وہ جھک مار کر ماننے پر مجبور ہوں۔

ہمارے ہاں انور صابری ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ جب یہ لوگ چاند سے لوٹ کر آئے تو اس نے ایک نظم لکھی، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا، وہ کہتا ہے کہ

سفر سے چاند کے لوٹے جو منکر معراج ۔۔۔ شکست عقل نے کھائی بڑے غرور کے بعد

عقل انکار کرتی تھی۔ اب اسے جھک مار کے ماننا پڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ بیت اللہ تیار کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان عام کردو۔ لوگو! بیت اللہ بن گیا ہے، آکر حج کرو۔

عرض کیا یا اللہ! میری آواز کیسے پہنچے گی؟ فرمایا تم آواز لگاؤ، ہم پہنچائیں گے۔ تو مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا کہ: اے لوگو! بیت اللہ تیار ہوگیا ہے، حج کرو۔ حدیث میں ہے کہ: جن جن کی قسمت میں حج تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔ حتیٰ کہ جو ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے انہوں نے بھی لبیک کہا اور فرمایا گیا، جس نے جتنی دفعہ لبیک کہا، اتنے ہی حج اس کے لئے مقرر ہوگئے، دس دفعہ کہا تو دس حج، بیس دفعہ کہا تو بیس حج۔

اس پر لوگ اعتراض کرتے تھے کہ بھلا یہ ہو کیسے ہوسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آواز مقام ابراہیم سے پوری دنیا میں پہنچ جائے گی؟ لاؤڈ اسپیکر نے سارا مسئلہ حل کردیا۔ آج لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ایک آدمی بولتا ہے تو مشرق سے مغرب تک سب جگہ آواز پھیل جاتی ہے۔ جب مادی وسائل میں اللہ نے قوت دی ہے کہ ایک آواز پورے عالم میں پھیل جائے تو روحانی وسائل میں یہ طاقت کیوں نہیں ہوسکتی؟ کہ آدمی روحانی قوت سے پورے عالم میں آواز پہنچا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی روحانی قوتوں سے وہ سب کام کرتے ہیں، جن کی حسی مثالیں آج مادی قوتوں سے دی جا رہی ہیں۔ اب امت کا مزاج اس پر ہوگیا کہ جب تک دین حسی مثالوں سے نہ سمجھایا جائے۔ لوگ نہیں سمجھتے۔ اللہ نے ایسے علماء کھڑے کردیئے کہ حسی مثالوں سے انہوں نے دین کو سمجھایا۔

تو عقل کا دور آیا تو عقلاء حس کا دور آیا تو سائنس دان کھڑے ہوئے، صوفیت کا دور آیا تو متکلمین کھڑے ہوگئے۔ درایت کا دور ہوا تو فقہاء کھڑے ہوگئے۔ روایت کا دور آیا تو محدثین کھڑے ہوگئے۔ غرض دین ہر حالت میں چلتا رہا اور ہر شعبے میں نمایاں ہوتا رہا۔

جمہوریت پسندی کے زمانے میں دعوت وتبلیغ جماعتی طور پر مؤثر ہے...... اب یہی صورت تھی کہ دین کو دوسروں تک کس انداز میں پہنچایا جائے، تبلیغ کی جائے تو کس انداز سے کی جائے۔ دعوت دی جائے تو کس انداز سے دی جائے۔ یوں تو علماء دعوت دیتے آرہے تھے اور سلسلہ دعوت برابر جاری تھا۔ مگر زمانے کے حالات ہوتے ہیں۔ آج کل جمہوریت پسندی کا زمانہ ہے۔ جب تک کسی چیز کو جماعتی طور پر پیش نہ کیا جائے، لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک آدمی کتنا ہی ثقہ اور بڑے درجہ کا ہو، وہ کہہ رہا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی بات ہے۔ دو ہوں تو کہتے ہیں کہ خیر اور جب جماعت ہو تو جھک مار کے مجبور ہوتے ہیں کہ جماعت مل کر غلط کیسے کرے گی؟ بہرحال انفرادی طور پر برابر علماء دین پہنچاتے رہے۔ اگر نہ پہنچاتے تو آج مسلمان آپ کے سامنے کہاں سے آتے؟ انہی کی محنتوں کا صدقہ ہے کہ آج ہم فخریہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ستر کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ لیکن دین کے راستے تو بند نہیں۔ آئندہ بھی دین کو پھیلنا ہے۔

جماعت میں مادی اور روحانی قوت ہوتی ہے...... اب راستہ یہ آ گیا کہ جب تک کوئی کام جماعتی طور پر نہ ہو، لوگ نہیں مانتے۔ مادی چیزوں میں حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی ٹیمیں بنتی ہیں۔ ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم پاکستان کھیلنے جا رہی ہے اور پاکستان کی ٹیمیں ہندوستان آ رہی ہیں۔ وکلاء کو دیکھو تو ان کی ایک ٹیم ہے۔ ججوں کا ایک طبقہ ہے مزدوروں کی ایک جماعت ہے۔ اگر مزدوروں کو کوئی شکایت ہو ایک آدمی شکایت کرے، کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اگر یونین بنالیں تو جھک مار کے مانتے ہیں، ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو آج کا دور ہی جماعتی رنگ کا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج کس قسم کی جمہوریت ہے۔ اسلام نے کس قسم کی جمہوریت پھیلائی ہے، وہ الگ بحث ہے، اس میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، مگر بالا جمال یہ ہے کہ جب تک جمہوریت اور جماعتی رنگ پیش نہ ہو، وہ چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے اوپر مطمئن نہیں ہوتے، زمانے کے حالات ہیں۔ اب اگر دین پہنچانے ایک آدمی جائے، تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں بھئی! نیک آدمی ہے۔ لیکن اگر جماعت چلی جائے، تو دباؤ پڑتا ہے کہ ہے کچھ بات قرآن نے اس کی اصل بتلائی ہے۔ فرمایا ﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ﴾ ① ”اے پیغمبر! آپ اصحاب قریہ کی مثال بیان کر دیجئے“۔ ایک خاص قریہ اور بستی کے لئے فرمایا گیا کہ آپ مثال بیان کر دیجئے۔ ﴿اِذۡ جَآءَهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ﴾ ② جبکہ اللہ کے نبی اس کے اندر ہدایت کرنے کے لئے پہنچے آ گے فرمایا ﴿اِذۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ اثۡنَيۡنِ﴾ ③ ”ہم نے اس قریہ میں دو رسول بھیجے کہ جا کے ہدایت کرو۔ تبلیغ کرو۔ اللہ کے احکام پہنچاؤ“۔

﴿فَكَذَّبُوۡهُمَا﴾ ④ ”ان دونوں کو انہوں نے جھٹلا دیا“۔ فرماتے ہیں۔ ”فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ“ ”ہم نے انہیں قوت دی اور ایک تیسرے کا اضافہ اور کیا“۔

اب جماعتی حیثیت ہوگئی۔ ”اَلۡاِثۡنَانِ اَوۡفَوۡقَهُمَا جَمَاعَةٌ.“ ⑤ ”دو آدمی یا اس سے بڑھ جائیں، تو جماعت کے حکم میں آ جاتے ہیں“۔ جماعت کا رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ فرد واحد کی بات کو آپ رد کر سکتے ہیں کہ شاید یہ شک یا شبہ میں پڑ گیا ہوگا۔ لیکن جب تین چار مل کر کہیں گے اور ایک دوسرے کی تائید کریں گے۔ پھر یہ وسوسے قطع ہو جاتے ہیں کہ اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ غلطی ہوتی تو چار مل کر غلطی پر کیسے قائم ہوتے؟ عقلاً و عادۃً محال ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں جو تعدد پیدا کیا گیا، وہ اس لئے نہیں کہ ایک نبی کی قوت کافی نہیں۔ انبیاءؑ سارے کے سارے جامع کمالات ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر روحانیت میں کون قوی ہو سکتا ہے؟ تو جہاں تک قوت حق کا جان لینا ہے۔ اس کے لئے ایک نبی بھی کافی ہے۔ پھر یہ ایک کے ساتھ دوسرا کیوں بھیجا گیا؟ عوام کی رعایت کی گئی کہ وہ مان لیں۔ ورنہ فی نفسہ ایک نبی کافی ہے۔ مگر جب دو کو بھی جھٹلایا گیا، تو فرمایا: ﴿فَعَزَّزۡنَا

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳. ② پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴.
⑤ السنن لابن ماجه، كتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب الاثنان جماعة ج: ۳ ص: ۲۳۸.

بِثَالِثٍ ﴾ ② "ہم نے تیسرے کا اور اضافہ کیا"۔ اب جماعت بن گئی۔ جماعت کا جھٹلانا انسان کی عقل سے باہر ہوتا ہے۔ کتنا بھی معاند ہوگا مگر جب جماعت کہے گی تو کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا کہ بھئی کچھ بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ سارے آدمی مل کر جمع ہو کر آئے ہیں۔ تو جماعتی حیثیت غالب ہوتی ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی ہے کہ "یَدُاللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ" اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔ یعنی قوت خداوندی جماعت کی پشت پر ہوتی ہے۔ فردِ واحد سے الگ رہ سکتی ہے مگر جماعت کے اوپر ہوتی ہے۔

حتی کہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں، حدیث تو نہیں ہے، تجرباتی بات ہے۔ کہ اگر چالیس مسلمان جمع ہوں، ان میں کوئی نہ کوئی ایک آدھ ضرور مقبول خداوندی ہوتا ہے۔ چالیس آدمی جب آئیں گے تو ایک کی مقبولیت سب میں کام کرے گی اور اس چیز کو مقبول بنا دے گی۔ بہر حال تعداد اور جماعتی رنگ میں ایک برکت کا اثر ہے۔ مادی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی، مادی تو یوں کہ جب افراد بڑھ گئے، انکار کی گنجائش نہیں رہی اور روحانی طور پر اس طرح کہ جتنے اہل حق بڑھ جائیں گے، حق ہی کو قوت پہنچے گی۔ حق میں اضافہ ہوگا۔ غرض جماعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو مادی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے اور روحانی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے۔

جماعت تبلیغ کی برکت سے عمل کا ماحول پیدا ہوگیا...... ہمارے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے قلب پر اللہ نے تبلیغ کو ایک فن کی صورت میں القاء فرمایا۔ تبلیغ ہو رہی تھی، علماء دعوتیں بھی دے رہے تھے۔ مولانا کے قلب پر اللہ نے الہام فرمایا اور انہوں نے ایک طریقہ مقرر کیا، جو اس زمانے میں موثر ہو اور اس میں جماعتی رنگ ہو کہ ایک ایک فرد نہ جائے، جماعتیں جائیں، لوگوں کو گھروں سے نکال کر لائیں اور جماعت بناؤ، جماعتی طور پر جب آپ گشت کریں گے اور جماعت ایک زبان ہو کر ایک ہی بات کہے گی، قدرتی طور پر اس کا اثر پڑے گا۔ کوئی معاند ہو، کوئی دشمن ہو نہ مانے، دنیا میں ہر زمانے میں معاند اور دشمن رہے ہیں۔ مگر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ عقل والوں کا اعتبار ہے۔ عقلمندوں کے سامنے جماعتی حیثیت کبھی نظر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ تو مولانا کے قلب پر اللہ نے اس طریقے کو القاء فرمایا۔

جب انسان جماعت کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ تو گھر میں عمل سے روکنے والی چیز گھر کی آسائشیں اور راحتیں ہی تو ہوتی ہیں۔ گھر میں آرام کرتا ہے تو کبھی نماز چھوٹ گئی، کبھی کوئی عمل چھوٹ گیا۔ لیکن جب گھر سے نکل گیا تو سامان راحت ہی منقطع ہوگیا۔ اب سوائے اللہ کے نام کے اور کوئی کام باقی نہیں رہ گیا کہ خواہ مخواہ آدمی اللہ ہی کا نام لے۔ گھر سے نکل کر جب مسجد میں آ گیا۔ اب اللہ کا نام نہیں لے گا تو اور کیا کرے گا؟ گویا عمل کرنے اور اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیا۔ تو فقط یہی نہیں کہ دعوت الی اللہ کی جماعتی صورت قائم کی بلکہ ایک عملی صورت بھی قائم کر دی کہ ہر شخص عبادت پر مجبور ہو۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴۔

اس واسطے کہ ماحول کا ایک اثر پڑتا ہے۔ ماحول جب اللہ والوں کا ہوتا ہے، تو آدمی خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ علیہ بارات کے سلسلہ میں تھانہ بھون گئے تھے۔ ایک شادی میں شرکت کرنی تھی۔ جیسے بارات والوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ ہو تو اس سے ملتے جاتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ تھانہ بھون میں موجود تھے۔ باراتیوں نے کہا کہ چلو بھئی! حاجی صاحب سے بھی مل لیں، بزرگ آدمی ہیں۔ مولانا گنگوہی حاضر ہوئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ نے مولانا گنگوہیؒ کو فراست باطنی سے پہنچا لیا کہ اس شخص کے قلب کے اندر کوئی جوہر موجود ہے۔ خود فرمایا کہ کسی سے مرید بھی ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، فرمایا مجھ سے ہی ہو جاؤ۔ یعنی کس تیقن سے فرما رہے ہیں کہ مجھ سے ہی مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ: مرید ہونے کے لئے میں آیا نہیں۔ میں تو بارات میں آیا ہوں۔ فرمایا: ان دونوں میں کوئی تضاد تھوڑا ہی ہے؟ ٹھیک ہے بارات میں آئے تھے۔ اب مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہ میں مرید ہو جاؤں گا تو آپ کہیں گے یہاں رکو اور اللہ اللہ کرو۔ یہ میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ میں بچوں کو پالوں گا یا یہاں بیٹھ کر ذکر اللہ میں مشغول رہوں گا۔ فرمایا: یہ تو ہم نہیں کہتے کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اب حضرت حاجی صاحبؒ بار بار فرما رہے ہیں کہ تم بیعت ہو جاؤ اور مولانا گنگوہی بار بار انکار کر رہے ہیں۔ لیکن بالآخر بیعت ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: بس ایک چالیس دن میرے پاس ٹھہر جاؤ۔ عرض کیا۔ اسی لئے میں بیعت نہیں ہوتا تھا کہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمایا: بیس دن ٹھہر جاؤ۔ انہوں نے کہ میرے پاس بیس دن بھی نہیں ہیں۔ فرمایا: دس دن ہی ٹھہر جاؤ۔ ہوتے ہوتے آخر تین دن پر بات آئی کہ میں تین دن ٹھہر جاؤں گا۔

مجھے سنانا یہ تھا کہ بارات تو رخصت ہو گئی، مولانا گنگوہیؒ آ کر تین دن کے لئے خانقاہ میں مقیم ہو گئے رات کو جب تین بجے کسی نے تہجد پڑھا۔ کسی نے ذکر اللہ کیا۔ اب پڑے پڑے شرم آئی کہ سارے تو اللہ اللہ کر رہے ہیں اور میں پڑا سوتا ہوں، تو خود بھی اٹھ کر وضو کیا اور چار رکعات پڑھیں۔ اگلے دن ارادہ کیا کہ اب میں نہیں پڑھوں گا، چاہے کوئی اٹھے نہ اٹھے۔ تو سو گئے۔ جب رات کے تین بجے لوگ اٹھے، تو ارادہ کیا کہ میں نہیں اٹھوں گا، مگر ماحول سے مجبور تھے، اٹھنا پڑا۔ تو کچھ تہجد پڑھی۔ اللہ اللہ بھی کیا۔ جب اسی طرح تین دن ہو گئے اور قلب پر اس کا اثر نمایاں ہوا، تو حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا۔ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اور ٹھہر جاؤں؟ فرمایا: ہم نے تو ٹھہرنے کو نہیں کہا تھا۔ تمہاری مرضی ہے۔ پھر دس دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ پھر بیس دن، پھر یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن یا کتنے دن وہاں ٹھہرے۔ لیکن بہرحال خلافت لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔ تو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ایک جماعت کا رنگ بنایا' وہاں ایک ماحول بھی تیار کیا۔ اس ماحول کے اثر سے آدمی مجبور ہوگا کہ آدمی ذکر اللہ کرے۔

ماحول کا اثر...... میں نے اپنی عمر میں تین ماحول دیکھے ہیں۔ ایک دارالعلوم دیوبند کا ماحول، ایک گنگوہ کا ماحول

اور ایک تھانہ بھون کا ماحول۔ میری عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ تو گنگوہ کا ماحول یہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ روؤں روؤں سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی ہے۔ ہر ایک سے ذکر اللہ، ہر ایک سے اللہ اللہ۔ اس کا اثر کیا تھا؟

گنگوہ میں خانقاہ کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب ہے اور شہر کے سارے دھوبی اس میں کپڑے دھوتے ہیں۔ تو ساٹھ ستر دھوبیوں کے کپڑے وہاں رکھے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے مٹی کے کنڈے رکھے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کپڑوں پر پانی ڈال کر مارتے ہیں۔ اب دھوبی بے چارے بے پڑھے لکھے جاہل، جو کسی چیز سے واقف نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑا اچھالا اور اس پر مارا، اور ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ، اِلَّا اللّٰہُ سارا تالاب گونج اٹھتا، حالانکہ وہ جاہل اجہل تھے۔ لیکن یہ ماحول کا اثر تھا۔ خانقاہ سے جو ہر وقت اللہ اللہ کی اواز آتی تھی۔ تو دھوبیوں میں بھی وہ اللہ اللہ کی آواز چل پڑی۔ وہ بھی ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ تو وہاں کے ماحول کا اثر تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں یہ دیکھا کہ وہاں بے نماز رہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر نماز کے لئے ایک ڈیڑھ ہزار آدمی حجروں سے نکل کر مسجد میں آئے گا، تو کوئی کہاں تک بے نماز رہے گا، خواہ مخواہ شرما شرمی نماز پڑھے گا۔ تو یہاں بے نمازی رہنا بڑا مشکل ہے۔ اتفاقاً کسی کی قضاء ہو جائے، وہ الگ چیز ہے۔ لیکن تارک نماز بن جائے، یہ ممکن نہیں یہ ماحول کا اثر ہے، نماز پڑھنے پر مجبور ہے۔

تھانہ بھون کا یہ ماحول تھا کہ معاملات کی سچائی، دیانت اور تقویٰ۔ وہاں ہر طرح کے لوگ مقیم تھے امیر، بھی غریب بھی۔ کسی حجرے کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی تالا لگا کر گیا ہو۔ ایک شخص کو بھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں تعلیم یہ ہوتی تھی، دیانت اور تدین پر قائم رہو۔ ایک دوسرے کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے حتی کہ اگر کسی کی کوئی چیز گر گئی، اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر حفاظت سے رکھو۔ یہیں پڑی رہنے دو۔ ممکن ہے وہ چیز والا آئے اور وہاں سے اٹھا کر لے جائے۔ ایک شخص تولیہ بھول گیا' تین دن تک مسجد کے فرش پر پڑا رہا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر لے گیا۔ یہاں دیانت، صفائی اور سچائی معاملات پر زور تھا۔ یہاں کے ماحول میں بد دیانت رہنا مشکل تھا۔

دارالعلوم کے ماحول میں بے نماز رہنا اور گنگوہ کے ماحول میں رہ کر غافل رہنا مشکل تھا۔ ذکر اللہ کی کچھ نہ کچھ توفیق ہوتی تھی۔ ماحول کا قدرتی اثر ہوتا ہے، جو قلب کے اوپر پڑتا ہے۔ یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کر کے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں۔ کوئی چلہ دے گا، کوئی دو چلے دے گا، کوئی دس دن، کوئی بیس دن ایک جگہ جمع ہوں گے، اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان سے غافل رہے گا۔ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوگا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا، فقط تعلیم و تربیت ہی کا راستہ نہیں، بلکہ عملی راہ بھی ہموار کر دی۔ تو جماعتی حیثیت اس لئے ڈالی تاکہ لوگ اس کو قبول کریں۔ انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو، یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت میں جانے والے کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ پہلے بے نماز تھے، اب

نمازی بن گئے۔ یہ تھوڑا اثر ہے؟ قدرتی من جانب اللہ اثر ہے۔ جب اس صحبت اور ماحول میں آئے گا، ممکن نہیں کہ آدمی اثر قبول نہ کرے۔

حدیث شریف میں نیک صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی گئی ہے۔ عطار کی دکان سے اگر آپ عطر نہ بھی خریدیں، کم سے کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ میں فرحت تو ہو ہی جائے گی۔ اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے۔ لوہار کی دکان پر جاؤ گے تو کالک ہی کپڑوں کے اوپر لگ جائے گی۔ کوئی پتنگا ہی آ لگے گا، کپڑا ہی جل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ مضرت پہنچے گی۔ تو نیک صحبت سے ہمیشہ پاکیزہ اثرات پھیلتے ہیں اور بری صحبت سے برے اثرات پھیلتے ہیں۔

جماعت میں تربیت باطن بھی ہوتی ہے...... حضرت مولانا نے نیک صحبت کا ڈھنگ ڈال دیا کہ آدمی خواہ مخواہ ہی نیک بنے۔ ارادہ نہ بھی کرے، تب بھی نیک بننے پر مجبور ہوگا۔ کچھ ذکر اللہ، نماز اور روزے میں لگا، کچھ دیانت پیدا ہوئی، کایا پلٹ گئی۔ اتنے حالات بدل گئے تو اور آپ کیا چاہتے ہیں؟۔ پھر ایثار اور ایثار کے ساتھ قناعت۔ ان چیزوں کی بھی تعلیم موجود ہے جو تربیت باطن ہے۔

اس لئے کہ جب آپ باہر جائیں تو گھر کا سارا سامان تو لے جا نہیں سکتے۔ زہد کی شان پیدا ہوگئی، پھر جب تک جڑے رہیں گے، تو ایک دوسرے کی اعانت بھی کریں گے۔ تو ایثار کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں خدمت گذاری کا جذبہ، ایثار کا جذبہ، ہر ایک کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو جماعت کی برکت سے من جانب اللہ پیدا ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ایمان دو چیزوں کا نام ہے۔ ''اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ'' اللہ کے اوامر کی تعظیم دل میں بیٹھ جائے اور مخلوق کی خدمت کا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے۔ جماعتوں میں نکلنے سے بحمد اللہ، اللہ کی عظمت بھی دل میں بیٹھتی ہے اور خدمت خلق کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ ایک دوسرے کی اخلاص کے ساتھ خدمت گذاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔

جو لوگ اپنا خرچ کر کے دنیا کے ملکوں میں جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایثار ہی کر رہے ہیں۔ ایثار کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں اپنے خرچ پہ نکلیں۔ جو اپنا خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ دوسرے کی خدمت سے کیسے گریز کرے گا۔ خود بخود خدمت خلق اللہ کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

جماعت تبلیغ کی مقبولیت کے آثار...... تو اس دور میں اصلاح کا اور طریقہ اس کے سوا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ طریقہ مولانا کے قلب مبارک پر وارد کیا اور اس تیس چالیس برس کے اندر اندر جماعتیں پھیلیں۔ دنیا کا کوئی ملک جہاں ہمارا جانا ہوا۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ جماعت تبلیغ وہاں موجود نہ ہو۔ لندن، فرانس، امریکہ اور افریقہ میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ من جانب اللہ مقبولیت کی بات ہے کہ اللہ کا نام لینے والے ہر جگہ پہنچ جائیں اور خدا

کے نام کی منادی دیں اور اعلان کریں۔ یہ آثارِ مقبولیت ہیں۔

اور میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بناء ڈالنے والے خود مقبولانِ الٰہی ہیں۔ لوگ کچھ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ لیکن بشری کارخانہ کونسا ایسا ہے جس پہ اعتراض نہیں ہوتے۔ مگر میں سب کا جواب ایک ہی دیتا ہوں کہ بھئی! ایک عارف باللہ کے قلب میں یہ چیز من جانب اللہ آئی۔ اس واسطے وہ امرِ خیر ہے۔ اگر یہ کسی لیڈر کے ذہن میں آتی، میں یہ سمجھتا کوئی سیاسی مصلحت ہوگی۔ کسی وطنی آدمی کے ذہن میں آتی، میں سمجھتا کوئی وطنی مصالح ہوں گی۔ لیکن ایک اللہ والے کے دل پر یہ چیز وارد ہوئی۔ اس میں فی الحقیقت خیر ہی خیر ہے۔ اس میں من جانب اللہ برکات کے آثار ہیں۔ تو سب جوابوں کا ایک ہی جواب ہے کہ اس سلسلہ کو اہل اللہ نے اٹھایا ہے۔ اس میں ان شاء اللہ خیر ہے۔ جماعتوں کا نکلنا، اس میں لوگوں کی اصلاح ہو جانا۔ یہ خود اس کی ایک دلیل ہے کہ اس کی برکات پھیل رہی ہیں۔ ملکوں کے اندر پھیل رہی ہیں۔

ہم فرانس میں گئے، وہاں پر ظاہر ہے کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں تھا۔ ہم پہنچے، ہوائی اڈے پر سینکڑوں آدمی استقبال کے لئے موجود ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں۔ پہلی دفعہ آنا ہوا ہے۔ بہر حال وہ سمجھے کہ ہمارا ایک خادم آ رہا ہے، ہم سب چلیں، وہ ہوائی اڈے پر آ گئے۔ اب یہ ایثار اور خدمت، یہ جذبۂ خدمت ہی کی بات ہے، ورنہ میں کیا چیز تھا۔ ایک معمولی آدمی، میری کوئی حیثیت نہیں۔ مگر محبت میں یہ سب آ گئے جگہ جگہ یہی دیکھا۔

اب انہوں نے کہا کہ تقریر بھی کرو۔ ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔ وہاں سارے عرب تھے۔ میں نے کہا کہ: مجھے تو عربی بولنے کی قدرت نہیں ہے۔ کتابوں میں پڑھی تھی، مگر بولنے کا تعلق تو مشق ہے۔ میں نے کہا کہ: میں اردو میں تقریر کروں گا، کوئی صاحب بعد میں عربی میں ترجمہ کریں۔ مگر وہاں کے عربوں نے کہا ہم عربی میں تقریر سنیں گے، چاہے پانچ ہی منٹ ہو، تو صاحب وہاں پھر عربی میں تقریر بھی کی۔ پندرہ بیس منٹ ٹوٹی پھوٹی جو سمجھ میں آئی۔ وہ کر دی۔ بہر حال ہر جگہ امریکہ وغیرہ میں یہی دیکھا۔ ہر جگہ جماعت موجود۔ بغیر مقبولیت من جانب اللہ کے یہ چیز پیدا نہیں ہوسکتی کہ قلوب پر الگ اثرات ہیں، عمومیت الگ ہے، ملکوں میں پھیل جانا الگ ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کی دلیل ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ سلسلہ اتارا گیا اور یہ مقبول خداوندی بھی ہے۔

برما جب جانا ہوا تو میں نے دو ہی چیزوں پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ بقدرِ ضرورت تعلیم دو تاکہ مسائل معلوم ہوں۔ سب کا عالم بننا ضروری نہیں۔ جزوی طور پر عالم ہونا فرضِ کفایہ ہے۔ اگر ہزاروں میں سے ایک بھی بن گیا۔ پوری جماعت کا فرض ادا ہو گیا۔ لیکن دیندار بننا ہر ایک پر فرض ہے اور دینداری کے لئے کچھ ابتدائی مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس واسطے ابتدائی تعلیم اور اس کے ساتھ پھر سلسلہ تبلیغ کے اندر لگو۔ اس سے تمہارے قلوب کی بھی اصلاح ہوگی، اعمال کی بھی اصلاح ہوگی اور دین بھی پھیلے گا۔ اس کی اشاعت ہوگی۔ بحمد اللہ جماعت کے اثرات وہاں محدود نہیں، بلکہ پھیل رہے ہیں اور پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

تبلیغ دین میں جماعتی حیثیت کا رد کرنا مشکل ہوتا ہے.....تو آیت میں نے یہ پڑھی تھی کہ ہم نے رسول بھیجے۔ دو کو انہوں نے جھٹلا دیا تو ہم نے تیسرے کا اضافہ کیا۔ یہ جماعتی صورت پیدا ہوگئی۔ جماعتی حیثیت کا ٹھکرانا بڑا مشکل ہوگا۔ ماننا نہ ماننا، عمل کرنا نہ کرنا تو لوگوں کے اختیار میں ہے۔ لیکن عقلی طور پر اس کو کوئی رد کرے، یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک جماعتی آواز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ رد کی جا سکے۔ بحمد اللہ یہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو توفیق دی اور جماعت کے ساتھ جو بھی وابستہ ہوا۔ ان کو توفیق دی اور اس توفیق سے بڑا کام ہوا۔

تعلیم و تبلیغ کا باہمی تقابل نہیں ہے...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ: یہ جماعت اس وقت ہمارے لئے آبرو ہے۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ بھائی! تم نے تبلیغ کیوں نہیں کی؟ ہم کہیں گے کہ ہماری جماعت تبلیغ کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کوئی جماعت تعلیم میں لگی ہوئی ہے، کوئی تبلیغ میں لگی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم عمل ہے، تقسیم عمل سے عمل دو نہیں ہوتے، بنیاد سب کی ایک ہوتی ہے۔ اب دارالعلوم میں ایک جماعت منتظمین کی ہے، وہ درس نہیں دے سکتی۔ مدرسین کی جماعت انتظام نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں مدمقابل تھوڑا ہی ہیں۔ جو جماعت انتظام کر رہی ہے، وہ مدرسین کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ جو درس دے رہے ہیں وہ منتظمین کو تقویت پہنچا رہے ہیں، تو جو جماعت تبلیغ کر رہی ہے، وہ جماعت تعلیم کو تقویت پہنچا رہی ہے، میں نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود ان کا مقولہ سنا، ان کی شان عجیب تھی، فرمایا: ''بھائی! یہ سلسلہ میں نے اس لئے جاری کیا ہے کہ مدرسوں کو طالب علم ملیں اور مشائخ کو مرید ملیں''۔ اس واسطے یہ سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ علم بھی پھیلے اور اخلاق بھی درست ہوں۔

اور مولانا مرحوم اس حد تک تھے کہ جب یہ کام ابتدائی شروع ہوا، تو ہر چھ مہینے کے بعد دہلی میں گزارتے تھے۔ کچھ دارالعلوم دیوبند میں، کچھ مظاہر العلوم میں۔ اور غایت تواضع سے فرماتے کہ: بھائی اتنا کام تو میں نے کر لیا۔ اب بتاؤ آگے کیا کروں؟

حالانکہ وہ خود ہی جاننے والے تھے۔ ان کے قلب پر یہ چیز وارد ہوئی تھی۔ لیکن تواضع کی انتہا تھی کہ دوسروں سے پوچھتے، حتیٰ کہ ہم جیسے چھوٹوں سے کہتے کہ بھئی! اب آگے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ پوچھ رہے ہیں۔ آپ تو خود دوسروں کے لئے راہنما ہیں۔ مگر یہ کمال تواضع تھا کہ سب کچھ کر کے بھی سمجھتے تھے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور چھوٹوں سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ ان کی شان تھی۔

ایک اللہ والے کے اخلاص نے پوری دنیا کو متحرک کر دیا......اور ایک دھن تھی اور ایسی دھن تھی کہ کسی کو کھانے کی اور سونے کی نہیں ہو سکتی۔ وہی دھن اللہ کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔ وہی دھن اور جذبہ ہے کہ جماعت آج تک حرکت میں ہے۔ ایک اللہ والے کے قلب کے اخلاص نے سب کو متحرک بنا رکھا ہے۔ بہر حال جماعت بھی مبارک ہے، اس کا کام بھی مبارک ہے اور جتنا زیادہ کیا جائے، جتنی اس میں شرکت زیادہ ہو، وہ انشاء اللہ باعث خیر و برکت ہوگی۔ جتنا وقت ہے دو، چلہ لگاؤ، دو چلے لگاؤ وہ انشاء اللہ خیر ہی خیر پائیں گے۔ کوئی برائی اور شر

نہیں ہوگی۔ دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی انشاء اللہ درست ہوگی۔ بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ بَارِكْ وَسَلِّمْ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

فضیلت النساء

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ②

تمہید...... بزرگانِ محترم! قرآن شریف کی آلِ عمران سے تین آیتیں اس وقت میں نے تلاوت کیں۔ ان میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت مریم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا جس میں ملائکہ نے حضرت مریم کو خطاب فرمایا ہے۔ اس جلسہ کے منعقد کرنے کی غرض وغایت چونکہ عورتوں کو خطاب ہے اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو مردوں کے ہیں بلکہ بعض امور میں مردوں سے عورتوں کا حق زیادہ ہے۔ اس لئے کہ بچوں کی تربیت میں سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اسی سے بچہ تربیت پاتا ہے۔ سب سے پہلے جو سیکھتا ہے، ماں سے سیکھتا ہے، باپ کی تربیت کا زمانہ شعور کے بعد آتا ہے، لیکن ہوش سنبھالتے ہی بلکہ بے ہوشی کے زمانے میں بھی ماں ہی اس کی تربیت کرتی ہے۔ گویا اسکی تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔ اگر ماں کی گود علم، نیکی، تقویٰ اور صلاحیتوں سے بھری ہوئی ہے، وہی اثر بچے میں آئے گا۔ اور اگر خدانخواستہ ماں کی گود ہی ان نعمتوں سے خالی ہے تو بچہ بھی خالی رہ جائے گا۔ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج　　　تا ثریا می رود دیوار کج

کسی فارسی کے شاعر نے کہا ہے کہ: جب عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی جائے' تو اخیر تک عمارت ٹیڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ شروع کی اینٹ اگر سیدھی رکھ دی جائے تو اخیر تک عمارت سیدھی چلتی ہے۔ جس چیز کا آغاز اور ابتداء درست ہو جائے اس کی انتہا بھی درست ہو جاتی ہے۔ اس واسطے عورتوں کا مردوں سے زیادہ حق

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۲، ۴۳۔ ② ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ۔

ہے اور ہم اسی حق کو زیادہ پامال کر رہے ہیں۔ مرد تو ہر جگہ موجود ہیں اور عورتوں کو سنانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر عورتیں مردوں کے حکم سے آئی ہیں تو مردوں کا شکریہ!

اور اگر از خود آئی ہیں تو پھر ان کے دینی جذبے کی داد دینی چاہئے کہ ان کے اندر بھی از خود ایک جوش و جذبہ ہے کہ دینی باتیں سیکھیں اور معلوم کریں۔ بہر حال سب سے زیادہ خوشی یہ ہے کہ ان کے اندر دین کی طلب ہے۔ اگر خود پیدا ہوئی تو وہ شکریئے کی مستحق ہیں اور اگر طلب پیدا کی گئی تو اس طلب کے پیدا کرنے والے بھی اور جنہوں نے اس کو قبول کیا وہ بھی شکریئے کے مستحق ہیں۔ اس واسطے میں نے کہا: مردوں سے عورتوں کا زیادہ حق ہے، اس لئے کہ زندگی کی ابتداء انہی سے ہوتی ہے۔

عورتوں کی قوت عقل...... اس وجہ سے بھی کہ بچوں کا قصہ بعد میں آتا ہے خود خاوند بھی عورت سے متاثر ہوتا ہے۔ عورتیں جب کسی چیز کو منوانا چاہتی ہیں تو منوا کے رہتی ہیں۔ وہ ضد کریں، ہٹ دھرمی کریں یا کچھ کریں خاوند کو مجبور کر دیتی ہیں۔ اس میں ایک پہلو جہاں عورتوں کے لئے عمدہ نکلتا ہے وہاں ایک بات کمزوری کی بھی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَارَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّ دِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنِ احْدٰكُنَّ'' ① ''یہ عورتیں ہیں تو ناقص العقل ان کی عقل کم ہے، مگر بڑے بڑے کامل العقل مردوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں''۔ اچھے خاصے عقل مند بھی ان کے سامنے پاگل بن جاتے ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ یہ کام ہو تو مرد ان کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اور یہاں آپ کے ہاں بھی ایسا ہی ہوگا اس لئے کہ عورتوں کا مزاج سب جگہ ایک ہی ہے اور مردوں کی ذہنیت بھی ایک ہی ہے البتہ تمدن کا فرق ہے۔

شادی بیاہ وغیرہ میں جو اکثر رسمیں ہوتی ہیں وہ رسمیں تباہ کن ہوتی ہیں۔ وہ دولت اور دین کو بھی برباد کرتی ہیں، جب مردوں سے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! کیوں ان خرافات میں پڑے ہوئے ہو، تم سمجھدار اور عقل مند آدمی ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ دولت اور دین بھی برباد ہو رہا ہے۔ تو کیوں ایسا کرتے ہوں؟۔ کہ جی عورتیں نہیں مانتیں کیا کریں۔ گویا عورتیں حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور یہ غلام و رعایا ہیں ان کا فرض ہے کہ اطاعت کریں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہیں تو یہ ناقص العقل، مگر اچھے بڑے عقل والوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں اور انھیں بے وقوف بنا دیتی ہیں۔ تو جب عورت میں یہ قوت موجود ہے کہ عقل مند کو بھی بے قوف بنا دیتی ہے اور اچھے بھلے مرد کو مجبور بنا دے، اگر وہ کسی اچھی چیز کے لئے مرد کو مجبور کرے گی تو مرد کیوں نہیں مجبور ہوگا؟

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے یوں کہہ دے کہ: جناب سیدھی بات ہے کہ آپ کا حکم واجب الاطاعت ہے۔ آپ خدا کی طرف سے میرے مربی سب کچھ ہیں لیکن آپ نماز نہیں پڑھتے، جب تک آپ نماز نہیں پڑھیں گے میں بھی آپ کے حکم کی پابند نہیں ہوں۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات، ج: ۱ ص: ۸۶ رقم: ۷۶.

وہ جھک مارے گا ضرور پڑھے گا، چاہے خدا کی نہ پڑھے، بیوی کی ضرور پڑھے گا۔ جب عورتیں ضد کر کے دنیا کی بات منوالیتی ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین کی بات نہ منوالیں۔ عورتوں کی بدولت بہت سے خاندانوں کی اصلاح ہوگئی ہے۔ عورتوں نے ضد کی مرد مجبور ہوگئے۔ ہمارے ہاں بعض خاندان ایسے تھے جو کچھ خرافات میں مبتلا تھے۔ اس واسطے کہ گھر میں دولت تھی کہیں سینما، کہیں تھیٹر وغیرہ۔ نماز کا تو کہیں سوال ہی نہیں اتفاق سے عورت نہایت صالح اور دیندار گھرانے کی آ گئی چند دن اس نے صبر کیا بعد میں اس نے کہا صاحب! یہ نبھاؤ بڑا مشکل ہے اس واسطے کہ رمضان آئے گا تو میں روزے سے رہوں گی اور تم بیٹھ کر کھانا کھاؤ گے اور پکانے پر مجھے مجبور کرو گے میں پکانے کے لئے مجبور نہیں ہوں جہاں چاہے پکواؤ اس گھر میں یہ نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ اس بد دینی میں تمہاری اعانت کرسکوں یہ خود گناہ کی بات ہے۔ یا تو اپنا بندوبست کر دیا پھر ان خرافات کو چھوڑ دو۔ آخر مرد مجبور ہوئے، نماز روزے کے پابند ہوگئے اور ان میں بہت سی اچھی خصلتیں پیدا ہوگئیں اس لئے سب سے بڑا مربی تو عورت ہے جو گھر کے اندر موجود ہے اس کی تربیت سے آدمی کام لے۔

اس لئے اپنی بہنوں سے یہ خطاب ہے کہ جب وہ ایسا دباؤ ڈال سکتی ہیں کہ مرد ان کے سامنے مجبور ہیں۔ تو جہاں دنیا کے لئے زیور، کپڑے لانے کے لئے، برتن لانے کے لئے گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں۔ اگر دیندار گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالیں تو یقیناً وہ دیندار بنیں اور وہ اپنے خاوند کے لئے اصلاح کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس لئے ان کی دل میں نیکی، تقویٰ اور بھلائی کا جذبہ ہونا چاہئے تا کہ خاوند پر بھی اس کا اثر پڑے۔ تو ایک عورت بچوں پر، خاوند پر اور کنبہ والوں پر بھی بہتر اثر ڈال سکتی ہے۔

عموماً سننے میں آیا ہے کہ خاندانوں میں جو جھگڑے اور تفریقیں پیدا ہوتی ہیں عورتوں کی بدولت پیدا ہوتی ہیں ایک دوسرے کو اتار چڑھاؤ کر کے بدظن بنا دیتی ہیں دو حقیقی بھائیوں میں لڑائی پیدا کر دیتی ہیں حتیٰ کہ خاندانوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اس کے برعکس اگر عورت نیک نہاد اور نیک طینت ہے تو بڑے بڑے جھگڑے ختم کرا دیتی ہے خاندان مل جاتے ہیں تو اپنی اس طاقت کو نیکی میں کیوں نہ خرچ کیا جائے، برائی اور بدی میں کیوں خرچ کیا جائے؟ جب اللہ نے ایک طاقت دی ہے تو اس کو صحیح راستے پر خرچ کیا جائے۔

دینی ترقی کے لئے مرد و عورت کے لئے ایک ہی راستہ ہے...... اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی۔ اس میں خصوصیت سے عورتوں ہی کے واقعات کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ ترین بی بی کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی اس آیت کے پڑھنے کی نوبت آئی کہ عورتوں کو یہ شکایت پیدا نہ ہو جب خطاب کیا جاتا ہے۔ مردوں ہی کو کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ نے مردوں ہی کو خطاب کیا تا کہ یہ غلط فہمی ان کی رفع ہو جائے۔ جیسے مردوں کو خطاب کیا ہے۔ عورتوں کو بھی کیا ہے۔ کہیں مرد عورت دونوں کو ملا کر خطاب کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ جو دین کی ترقی کا راستہ مرد کے لئے ہے وہی عورت کے لئے ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ

وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا﴾ ① مسلم مرد، مسلم عورت، مومن مرد اور مومن عورت، عبادت گزار مرد اور عبادت گزار عورت، سچا مرد اور سچی عورت، صدقہ دینے والا مرد اور صدقہ دینے والی عورت، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورت، حیاء کی حفاظت کرنے والا مرد اور حیاء کی حفاظت کرنے والی عورت، اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والا مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورت۔ ان کے لئے وعدہ دیا ہے کہ اللہ نے ان کے لئے مغفرت، اجر عظیم اور آخرت کے درجات تیار کیے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کے راستہ پر چل کر جتنی ترقی مرد کر سکتا ہے۔ وہی بعینہ عورت بھی کر سکتی ہے۔ اگر ایک مرد ولی کامل بن سکتا ہے تو عورت بھی ولی کامل بن سکتی ہے۔ اسلام میں جیسے مردوں میں اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔ ویسے ہی عورتوں میں بھی اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔ اس بارے میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ولایت کے مقام کو پہنچی ہیں اور ولی کامل گذری ہیں۔ ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہیں کہیں حضرت رابعہ بصریہ، کہیں رابعہ عدویہؒ ہیں پھر صحابیات جتنی ہیں وہ تو ساری کی ساری اولیائے کاملین میں سے ہیں تو تابعین، تبع تابعین اور بعد کے لوگوں میں بڑی بڑی کامل عورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ پھر ہر فن کے اندر پیدا ہوئیں، محدث، مفسر، ادیب، شاعر اور مورخ بھی گذری ہیں۔ ان کی تصنیفات ہیں اور ہزاروں مرد ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اگر عورت دینی ترقی نہ کر سکتی تو یہ عورتیں کہاں سے پیدا ہوگئیں؟

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری وحی کا آدھا علم میرے سارے صحابہؓ سے حاصل کرو اور آدھا علم تنہا عائشہؓ سے حاصل کرو۔ گویا صدیقہ عائشہؓ اتنی زبردست عالمہ ہیں گویا نبوت کا آدھا علم صدیقہ کے پاس ہے۔ آدھا علم سارے صحابہؓ کے پاس ہے۔ صدیقہ عائشہؓ ایک عورت ہی تو ہیں۔ تو عورت کو اللہ نے وہ رتبہ دیا کہ ہزار ہا ہزار صحابہؓ ایک طرف اور ایک عورت ایک طرف اس سے معلوم ہوا۔ عورت جب ترقی کرنے پہ آتی ہے تو اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ بہت سے مرد بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تو اللہ کی طرف سے عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے۔ چاہے دنیا میں ترقی کریں یا دین میں علم و فضل میں بھی برابر چل سکتی ہیں۔

آپ نے امام ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہوگا۔ جن کی کتاب طحاوی شریف جو حدیث شریف کی کتاب ہے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ عورت کا طفیل ہے امام طحاویؒ کی بیٹی نے حدیث کی کتابیں املاء کی ہیں۔ باپ حدیث اور اس کے مطالب بیان کرتے تھے، بیٹی لکھتی جاتی تھی۔ اس طرح کتاب مرتب ہوگئی۔ گویا جتنے علماء اور محدث

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۵.

گذرے ہیں۔ یہ سب امام ابی جعفر کی بیٹی کے شاگرد اور احسان مند ہیں۔ یہ بھی ایک عورت تو تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ امام طحاویؒ کی بیٹی تو محدث بن سکے، ہماری کوئی بہو بیٹی نہ بن سکے؟ وہی نسل ہے، وہی چیز ہے، وہی ایمان، وہی دین ہے۔ وہ علم آج بھی موجود ہے۔ توجہ اور بے توجہی کا فرق ہے۔ ان لوگوں نے توجہ دی تو عورتیں بھی ایسی بنیں کہ بڑے بڑے مرد بھی ان کے شاگرد بن گئے آج توجہ نہیں کرتیں، کمال نہیں پیدا ہوتا مگر صلاحیتیں موجود ہیں۔

عورت میں غیر معمولی ترقی کی صلاحیت موجود ہے...... بہر حال علماء اسلام نے ان بڑی بڑی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو ولایت کے مقام تک پہنچی اور کامل ہوئی ہیں ہاں البتہ کچھ عہدے اسلام نے ایسے رکھے ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے۔ وہ اس بنا پر کہ عورت کا جو مقام ہے وہ حرمت وعزت کا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں میں خلط ملط اور ملی جلی پھرے اس سے فتنے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برائیوں کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے عورتوں کو ایسے عہدے نہیں دیئے گئے جس سے فتنوں کے دروازے کھلیں۔ لیکن صلاحیتیں موجود ہیں۔

صلاحیت اس حد تک تسلیم کی گئی ہے کہ علماء کی ایک جماعت اس بات کی بھی قائل ہے کہ عورت نبی بن سکتی ہے۔ رسول تو نہیں بن سکتی مگر نبی بن سکتی ہے۔ نبی اسے کہتے ہیں جس سے ملائکہ علیہم السلام خطاب کریں اور خدا کی وحی اس کے اوپر آئے۔ رسول اسے کہتے ہیں جو شریعت لے کر آئے اور خلق اللہ کی تربیت کرے اس لئے تربیت کا مقام تو نہیں دیا گیا مگر ان کے نزدیک نبوت کا مقام عورت کے لئے ممکن ہے۔

حتی کہ ظاہر یہ کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں۔ فرشتے نے خطاب کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی تھیں اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام جو ابتداء سے ہی مسلمان تھیں۔ وہ نبوت کے مقام پر پہنچیں تو نبوت سے بڑا عالم بشریت میں انسان کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ خدائی کمالات کے بعد اگر بزرگی کا کوئی درجہ ہے، تو وہ نبوت کا ہے۔ اس سے بڑا کوئی درجہ نہیں جب عورت کو یہ درجہ بھی مل سکتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ عورت کی صلاحیتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ سب مقام طے کر سکتی ہے۔ البتہ رسول نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ رسول کے یہ معنی ہیں کہ وہ شریعت کے ساتھ تربیت کرے، اس لئے عورت کو اس مقام پر نہیں لایا گیا کہ وہ اجنبی مردوں کی تربیت کرے۔ اس میں چونکہ فتنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے یہ مقام چھوڑ دیا گیا۔

یا جیسے شریعت اسلام کا مسئلہ ہے کہ قاضی جج اور چیف جسٹس نہیں بنائی جائے گی کہ وہ فیصلے کرنے لگے اس لئے کہ جب وہ فیصلہ کرنے بیٹھے تو مدعی اور مدعی علیہ اس کے سامنے آئیں گے۔ اس کو حق ہے کہ جرح کرے گواہوں کی حالت کو دیکھے۔ سب اس کے آمنے سامنے ہوں گے۔ اس میں پھر فتنے کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے اس مقام پر عورت کو نہیں لایا گیا حاصل یہ ہے کہ اگر عورت محنت وتوجہ کرے تو کوئی مقام بزرگی اور علم فضل کا ایسا نہیں ہے جو عورت کو حاصل نہ ہو۔ امام طحاویؒ کی بیٹی، حضرت رابعہ بصریؒ حضرت رابعہ عدویہؒ ہزاروں لاکھوں کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عورتیں، تابعین کی بیویاں، بیٹیاں۔ یہ بڑی بڑی عالم اور فاضل گزری ہی ہیں۔

عورت اولیائے کاملین کے لئے مربی بھی بن سکتی ہے.....حضرت رابعہؒ کے واقعات میں ہے کہ ایک دن جوش سے چلیں۔ایک برتن میں آگ تھی اور ایک برتن میں پانی تھا۔بہت ہی جذبے اور جوش کے ساتھ جارہی ہیں۔

لوگوں نے کہا: اے رابعہ کہاں چلی؟ کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن اور ایک ہاتھ میں پانی کا برتن کہاں جارہی ہو؟۔جوش میں آکر کہا کہ میں اس لئے جارہی ہوں کہ اس آگ سے جنت کو جلادوں اور اس پانی سے جہنم کو بجھادوں اس لئے کہ جو عبادت کرتا ہے جنت کی طمع میں کرتا ہے یا دوزخ سے ڈر کر کرتا ہے۔اپنے مالک کی محبت میں کوئی عبادت نہیں کرتا۔میں اس لئے جارہی ہوں تاکہ ان دونوں کو ختم کروں تاکہ بندوں میں خلوص پیدا ہو۔ اخلاص اور محبت خداوندی کا مقام پیدا ہو۔اس مقام کی عورتیں بھی گذری ہیں جن کے جذبات کا یہ عالم ہے۔عورتوں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کاملین کی تربیت کی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ تابعی ہیں اور صوفیاء کے امام ہیں اور سلسلہ چشتیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ ان کے مکان پر آئیں کوئی مسئلہ پوچھنا تھا یا کوئی بات کرنی تھی معلوم ہوا حضرت حسن بصریؒ مکان پر نہیں ہیں۔پوچھا کہاں گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے پر گئے ہیں اور ان کی عادت یہ ہے کہ اپنا ذکر اللہ یا عبادت وغیرہ دریا کے کنارے پر کرتے ہیں۔بعض اہل اللہ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے ذکر اللہ کرنے کے لئے جنگلوں کی راہ اختیار کی۔یا پہاڑوں میں بیٹھ کر اوراد کرتے ہیں اس میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اور دریا کے کنارے پر بیٹھنے کے بارے میں صوفیاء لکھتے ہیں کہ قلب میں تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔مادی تاثیر اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ پانی کے کنارے پہنچ کر قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔جتنی فرحت اور نشاط پیدا ہوگا اتنا ہی قلب ذکر اللہ کی طرف مائل ہوگا بنیادی اور باطنی وجہ اس کی یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی خود اللہ کی تسبیح کرتا ہے اللہ کا نام لیتا ہے اور ذکر کرتا ہے۔پانی کے ذکر کا اثر بھی انسان کے قلب پر پڑتا ہے تو اس کی طبیعت اور زیادہ ذکر اللہ کی طرف مائل ہوجاتی ہے ان وجوہ کی بناء پر حضرت حسن بصریؒ اکثر دریا کے کنارے پر جاکر عبادت کرتے تھے۔

بہرحال رابعہ بصریہ کو معلوم ہوا کہ حسن بصری اپنی عادت کے مطابق ذکر و عبادت کرنے کے لئے دریا کے کنارے پر گئے ہوئے ہیں۔یہ بھی وہیں پہنچ گئیں۔وہاں جاکے یہ عجیب ماجرا دیکھا کہ حسن بصریؒ نے پانی کے اوپر مصلی بچھا رکھا ہے اور اس کے اوپر نماز پڑھ رہے ہیں۔نہ مصلی ڈوبتا ہے نہ تر ہوتا ہے گویا کرامت ظاہر ہوئی۔ رابعہ بصریہ کو یہ چیز ناگوار گذری اور اسے اچھا نہ سمجھا کیونکہ یہ عبدیت اور بندگی کی شان کے خلاف ہے۔بندگی کے معنی یہ ہیں بڑے سے بڑا بزرگ لوگوں میں ملا جلا رہے۔کوئی امتیازی مقام پیدا کرنا یہ ایک قسم کا دعویٰ اور صورۃً تکبر ہے کہ میں سب سے بڑا ہوں اس لئے کہ تم وہ کام نہیں کرسکتے جو میں کرسکتا ہوں۔گویا میں بڑا صاحب کرامت اور صاحب تصرف ہوں، زبان سے اگرچہ نہ کہے مگر صورت حال سے ایک دعویٰ پیدا ہوتا ہے کہ اور اہل

اللہ کے نزدیک سب سے بڑی چیز جو ہے وہ دعویٰ کرنا ہے اس لئے کہ اس میں تکبر اور کبر کی علامت ہے اور ولایت کا مقام یہ ہے کہ تکبر مٹ کر خاکساری پیدا ہو۔ تو جس بزرگ میں تکبر یا کبر کی صورت بن جائے وہ بزرگ ہی کیا ہوا؟۔ حضرت رابعہؒ کو یہ چیز اس لئے ناگوار گزری کہ حسن بصریؒ بزرگوں کے امام اور وہ ایسی صورت پیدا کریں جس سے دعویٰ نکلتا ہو کہ میں بھی کوئی چیز ہوں، میں گویا بڑا کرامت والا ہوں۔ حسن بصریؒ کے لئے یہ زیبا نہیں تھا۔ یہ شانِ عبدیت کے خلاف ہے۔

بلکہ درپردہ گویا یہ دعویٰ ہے کہ میں خدائی اختیارات رکھتا ہوں کہ تم اسباب کے تحت مجبور ہو کے پانی پر کشتی سے جاؤ اور میں مجبور نہیں ہوں۔ میں پانی پر ویسے ہی چل سکتا ہوں، میرے پاس خدائی قوتیں موجود ہیں۔ جب یہ دعویٰ ہو گیا تو بزرگی کہاں رہی؟ اس واسطے یہ چیز اچھی نہ معلوم ہوئی۔ مگر چونکہ یہ بھی بزرگ ہیں تو انہوں نے اصلاح کی، اصلاح کس طرح کی؟ زبان سے کچھ نہیں کہا عمل سے اصلاح کی۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے پانی کے اوپر مصلیٰ بچھا رکھا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ اپنے مصلے کو ہوا کے اوپر اڑا کر اس کے اوپر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اب مصلیٰ ہوا کے اوپر لٹکا ہوا ہے اور نماز پڑھ رہی ہیں۔ حسن بصریؒ سمجھ گئے کہ مجھے ہدایت کرنی مقصود ہے۔ فوراً اپنا مصلیٰ لپیٹا اور دریا کے کنارے پر آ گئے۔

رابعہ بصریہؒ نے بھی ہوا سے مصلیٰ لپیٹا اور نیچے آئیں اور آ کر دو جملے ارشاد فرمائے۔ وہ کتنے قیمتی اور زریں جملے تھے کہ دین و دنیا کے ساری نصیحتیں ان دو جملوں میں چھپی ہوئی تھیں، فرمایا: اے حسن بصری!

برآب روی خسے باشی، برہوا پری مگسے باشی ‌‌ ‌ دل بدست آر کہ کسے باشی

اے حسن بصریؒ! اگر تم پانی پر تیر گئے تو کوڑا کباڑ اور کچرا بھی پانی کے اوپر تیرتا ہے یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے اور اگر رابعہ ہوا میں اڑی تو مکھیاں بھی تو ہوا میں اڑتی ہیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ اپنے نفس کو قابو میں کرو، اس پر کنٹرول حاصل کرو، تاکہ صحیح معنی میں انسان بنو۔ انسان بننا کمال ہے مکھی بننا کمال نہیں ہے۔ آدمی بننا کمال ہے۔ کوڑا کچرا بننا کمال نہیں ہے۔

ہم اگر ہوائی جہاز سے پچاس ہزار فٹ بلندی پر اڑ جائیں بے شک یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ مگر یہ حیوانیت کا کمال ہے۔ انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ اگر ہم ڈبکی کشتی کے ذریعہ سمندر کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ تو یہ بھی حیوانیت کا کمال ہے۔ اس لئے کہ مچھلیاں بھی تو پہنچتی ہیں۔ آدمی سے ہم اگر مچھلی بن گئے تو کون سا کمال کیا، اسی طرح ہوا میں کرگسیں بھی اڑتی ہیں اگر آدمی سے کرگس بن گئے تو کون سا کمال ہوا۔ یہ حیوانیت کا کمال ہے انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور عرش پہ باتیں کر رہا ہو۔ اپنے مصلیٰ کے اوپر ہو اور خدا سے اسے نیاز حاصل ہو۔ معاملات وہاں سے چل رہے ہوں۔ دیکھنے میں وہ فرشی ہو مگر حقیقت میں وہ عرشی ہو۔ فرش پر بیٹھے ہوئے عرش کے اوپر مقام ہو۔ یہ سب سے بڑا انسانیت کا کمال ہے جس کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام نے سکھلایا۔

تو رابعہ بصریہؒ نے کتنی قیمتی بات کہی کہ حضرت حسن بصریؒ نادم اور اور شرمندہ ہوئے اور توبہ کی کہ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں اسے بڑا کمال سمجھ رہا تھا مگر آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ دیکھئے رابعہ بصریہ عورت ہے اور حسن بصریؒ مردوں کے امام ہیں۔ یہ ایک عورت ایک مرد کامل کو ہدایت کر رہی ہے اور اسے راستہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لئے عورت اگر کمال پیدا کرنا چاہے تو وہ بڑے بڑے مردوں کی مربی بن سکتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پوری امت کی استاذ ہیں...... ابن عباس رضی اللہ عنہما بڑے جلیل القدر صحابی ہیں امت میں سب سے بڑے مفسر قرآن ہیں۔ لیکن حضرت عائشہ کے شاگرد ہیں۔ علم زیادہ تر انہی سے سیکھا ہے۔ فتوے کی ضرورت ہوتی تھی تو صدیقہ عائشہؓ سے فتویٰ لیتے تھے۔ تو ابن عباسؓ ساری امت کے استاذ ہیں اور ان کی استاذ حضرت عائشہؓ ہیں گویا حضرت عائشہ علوم و کمالات کے اندر پوری امت کی استاذ ہیں۔

بعض صحابہ حضرت عائشہ سے کہا کرتے تھے کہ: ''مَا هٰذِهٖ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَآ اٰلَ اَبِيْ بَكْرٍ''① ''اے آل ابی بکر! یہ پہلی برکت نہیں۔ تمہاری تو اتنی برکتیں ہیں کہ امت احسان سے تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی''۔ اس لئے کہ حضرت عائشہؓ کے سوالات کرنے سے ہزاروں مسئلے کھلے ہیں، بڑی ذہین و ذکی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات ایسے کیا کرتی تھیں کہ دوسرے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ جواب میں آپؐ علوم ارشاد فرماتے: یہ ساری امت پر احسان تھا اگر وہ سوال نہ کرتیں تو علم نہ آتا۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اگر کسی شخص کے تین بچے پیدا ہوں اور پیدا ہونے کے بعد دودھ پینے کی حالت میں گذر جائیں برس دن یا چھ مہینے کے بعد انتقال کر جائیں تو وہ تینوں کے تینوں ماں باپ کی نجات کا ذریعہ بنیں گے، شفاعت کریں گے اور اس طرح سے کریں گے گویا اللہ تعالیٰ کے اوپر اصرار کریں گے کہ ضرور بخشنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کے لئے جہنم کا حکم ہو جائے گا کہ یہ سزا کے مستحق ہیں، یہ جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہ تین بچے ملائکہ کے آگے آ کے سامنے سے روکیں گے کہ یہ ہمارے ماں باپ ہیں، آپ ان کو کہاں لے کے جا رہے ہیں؟ وہ کہیں گے انہیں جہنم کا حکم ہے۔ بچے کہیں گے ہم نہیں جانتے یہ ہمارے ماں باپ ہیں جیسے بچے کی ضد ہوتی ہے۔ اس طرح ضد کریں گے۔ وہ کہیں گے حکم خداوندی ہے، بچے کہیں گے، ہوگا۔ اللہ نے ہمیں تو معصوم بنایا ہم انہیں نہیں جانے دیتے ہمارے ہوتے ہوئے نہیں جائیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام کو لوٹنا پڑے گا اور عرض کریں گے۔ الٰہی! یہ بچے راستہ روک رہے ہیں جانے نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کی ضد کے آگے فرشتوں کی نہیں چلے گی۔

جیسے باپ اگر بادشاہ بھی ہو اور بچہ ضد کرے تو بادشاہ کو بھی بچے کی ماننی پڑتی ہے اس کی حکومت کی ساری

---

① الصحيح للبخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ، ج: ١ ص: ٣، رقم: ٣.

قوت دھری رہ جاتی ہے۔اسی طرح فرشتوں کی طاقت بھی رکھی رہ جائے گی اور وہ مجبور ہو جائیں گے۔ بچے انہیں لوٹا دیں گے تو فرشتے عرض کریں گے کہ خداوندا! آپ کا ارشاد تھا کہ انہیں جہنم میں ڈالدو، یہ بچے روک رہے ہیں، ضد کر رہے ہیں، جانے نہیں دیتے حق تعالیٰ فرمائیں گے، ارے نادان بچو! تمہارے ان ماں باپ نے یہ برائی کی، یہ برائی کی، یہ گناہ کیا، یہ معصیت کی۔ یہ جہنم کے مستحق ہیں۔

یہ کہیں گے ہم نہیں جانتے انہوں نے کیا کیا، یہ تو ہمارے ماں باپ ہیں۔ اگر آپ کو انہیں جہنم میں ہی بھیجنا ہے تو ہمیں بھی بھیج دیجئے۔ اب ظاہر ہے کہ معصوم تو جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے اور اگر آپ نے ہمیں جنت میں بھیجنا ہے تو ہم انہیں بھی لے کے جائیں گے۔

حق تعالیٰ حجت کریں گے جواب دیں گے بچے وہاں بھی ضد کریں گے اخیر میں حق تعالیٰ فرمائیں گے ’’جاؤ ارے جھگڑالو بچو! ہمارا پیچھا چھوڑو۔ لے جاؤ ان ماں باپ کو جنت میں۔ چنانچہ ان کو جنت میں لے جائیں گے‘‘۔ یہ حدیث آپ نے صدیقہ عائشہ کو سنائی، اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سوال کرتی ہے کہ یارسول اللہ! اگر کسی کے دو بچے اس طرح گذر جائیں۔ فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھر سوال کیا اگر ایک بچہ گذر جائے۔ فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے حتی کہ فرمایا کہ: اگر کوئی حمل ضائع ہو جائے بشرطیکہ بچے میں جان پڑ گئی ہو۔ اس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس طرح سے ضد کر کے اپنے ماں باپ کو بخشوائے گا۔

اب دیکھئے چھوٹا بچہ جب گذرتا ہے تو ماں باپ پر اور بالخصوص ماں پر کیا گزرتی ہے اس کے تو وہ جگر کا ٹکڑا تھا اس نے نو مہینے اسے اپنے پیٹ میں رکھ کے پالا ہے۔ پرورش کیا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد جب گذر جاتا ہے تو باپ کو تو کچھ جلدی صبر بھی آ جاتا ہے مگر ماں کو نہیں آتا، اس لئے کہ اس کے لئے تو ایسا ہے جیسے اس کے بدن کا ٹکڑا کٹ کے ضائع ہو جائے‘ تو ماں بہت زیادہ پریشان ہوتی ہے لیکن جب یہ حدیث سنے گی کہ یہ میری نجات کا سبب بنے گا تو شاید اسے خوشی پیدا ہو جائے کہ میرے لئے کوئی دکھ نہیں اگر ضائع ہو گیا تو بلا سے ضائع ہو گیا، میرے لئے تو جنت اور نجات کا سامان ہو گیا۔

اگر صدیقہ عائشہؓ یہ سوال نہ فرماتیں نہ اتنا علم کھلتا نہ اتنی آسانی پیدا ہوتی۔ ہم تو یہی کہتے اگر تین بچے گزریں تو پھر جنت کا وعدہ ہے اور اگر دو یا ایک ہوا پھر جنت کا وعدہ نہیں۔ مگر صدیقہ کے سوال کرنے سے معلوم ہوا دو اور ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ بلکہ حمل ساقط ہو جائے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بشرطیکہ روح پڑ گئی ہو۔ تو صدیقہ عائشہؓ کی ذہانت وذکاوت اور سوال کرنے سے امت کے لئے کتنی بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ کتنے راستے نکلے، تو عورتیں ایسی بھی گذری ہیں جنہوں نے ہزاروں مردوں کے راستے درست کر دیئے اور ان کے لئے ہدایت کا سبب بن گئیں۔

عورت کے اندر بھی غیر معمولی تحمل کی صلاحیت موجود ہے ...... شادی اور غمی ایسی چیز ہوتی ہے کہ اس میں آدمی کچھ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ زیادہ غم پڑے جب بھی پاگل سا ہو جاتا ہے۔ زیادہ خوشی آئے جب بھی آپے

سے باہر ہو جاتا ہے۔ایسے میں اگر کوئی سنبھال لے وہ بڑا محسن ہوتا ہے۔اسلام میں ایسی بھی عورتیں گذری ہیں انہوں نے ایسے وقتوں میں مردوں کو سنبھالا۔حالانکہ مرد بہ نسبت عورت کے قوی القلب ہوتا ہے۔عورت کا دل گو اتنا قوی نہیں لیکن عورت میں سمجھ بوجھ اور دین و دیانت ہے تو بڑے بڑے قوی مردوں کے سنبھالنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان کا چھ سات برس کا بچہ بڑا ہونہار حسین و جمیل، بیمار ہوا۔اس زمانے کے مطابق دوا دارو کی گئی مگر بچہ اچھا نہ ہوا۔ادھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اچانک سفر پیش آیا اور انہیں ضروری جانا پڑ گیا۔تو بیوی سے کہا کہ: دیکھو مجھے مجبوری کا سفر پیش آ گیا، میرا جانا ضروری ہے اور بچے کی حالت ایسی ہی ہے، ذرا دوا اور تیمارداری اچھی طرح سے کرنا اور میں جلدی آ جاؤں گا۔کوئی زیادہ دیر کے لئے مجھے نہیں جانا۔یہ فرما کر حضرت جابرؓ چلے گئے۔

جب آنے کا دن ہوا تو بچے کا انتقال ہو گیا۔آپؓ گھر میں تشریف لائے اور بیوی کی دانشمندی، ودیانت دار اور ہوشیاری یہ ہے۔ورنہ اگر کوئی آج کی طرح کی بیوی ہوتی جب وہ دیکھتی کہ خاوند آ رہے ہیں۔تو وہ بڑا رونا شروع کر دیتی تا کہ معلوم ہو بڑا غم پڑا ہوا ہے۔مگر دانشمند تھیں۔اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے آنے کا وقت ہوا تو اپنے کو سنبھالا اور صورت ایسی بنائی کہ اسے کوئی غم نہیں ہے اور بچے کو اندر لٹا دیا۔اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔

حضرت جابرؓ آئے۔تو جیسے عرب کا دستور ہے۔بیوی نے بڑھ کر استقبال کیا، مصافحہ کیا اور اپنے خاوند کے ہاتھ چومے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ کہا: "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ بِعَافِیَۃٍ وَخَیرٍ" خدا کا شکر ہے عافیت میں ہے اور بڑی خیر سے ہے۔غلط بات بھی نہیں کی اس لئے کہ مرنے کے بعد بڑی عافیت و خیر ہوتی ہے۔تو ایسا جملہ کہا کہ غلط بھی نہ ہو اور خاوند کو تسلی بھی ہو جائے۔وہ مطمئن ہو گئے۔

ان کے ہاتھ دھلائے کھانا کھلایا۔اس لئے کہ آتے ہی صدمے کی خبر سنا دیتیں ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔پھر کہاں کا کھانا ہوتا، وہ اس کے سوگ میں لگ جاتے۔

کھانا کھلاتے کھلاتے کہا: میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں۔اس میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ فرمایا پوچھو۔کہا اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے اور اس کی میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے لئے رکھواتا ہوں۔برس دن کے بعد واپس لے لوں گا۔تو شریعت کا اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

فرمایا حکم کھلا ہوا ہے۔اس کو ٹھیک وقت پہ ادا کرنا چاہئے۔کہا، اگر امانت کے ادا کرتے ہوئے دل گھٹنے لگے اور دل نہ چاہے۔فرمایا: دل گھٹنے کا حق کیا ہے۔چیز دوسرے کی ہے۔اپنی چیز پہ آدمی گھٹے جب دوسرے کی امانت ہے اور وقت مقرر تھا۔اب اس نے مانگ لی، تو گھٹنے اور غم کرنے کا کیا حق ہے؟ کہا شریعت کا یہی مسئلہ ہے؟ فرمایا ہاں مسئلہ یہی ہے۔

کہا: وہ بچہ جو تھا وہ امانت تھا اللہ نے وہ سات برس کیلئے رکھوایا تھا۔کل قاصد پہنچ گیا کہ امانت واپس کر دو۔

میں نے امانت واپس کر دی۔ تو ہمیں گھٹنے کا تو کوئی حق نہیں؟ فرمایا نہیں ہے اور بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے ایسی تسلی دی کہ مجھے بجائے غم کے خوشی ہے کہ ہم امانت ادا کر چکے اور بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہ عورتیں ہی تھیں جو اس طرح سے تسلی بھی دیتی تھیں۔ مگر یہ ان عورتوں کا کام تھا جن میں حوصلہ اور دین و دیانت کا جذبہ تھا۔ اور اگر عورتیں رواج کے مطابق چلیں تو آنکھوں میں نہ بھی آنسو ہوں مگر جب تعزیت کے لئے کوئی آئے تو بنا بنا کر رونا شروع کر دیں گی۔ دوسرے آئیں وہ بھی رونا شروع کر دیں۔ تیسرے آئیں وہ بھی۔ لیکن تحمل کی بات یہ ہے کہ روتے ہوؤں کو تھام لیا جائے غم زدہ لوگوں کو تھام لیا جائے اور تسلی دی جائے، یہ کام کیا تو مرد کرتے ہیں مگر عورتیں بھی ایسے حوصلے کی گذری ہیں جنہوں نے مردوں کے غموں کو ہلکا کر دیا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان..... حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجہ پاک ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ: ساری امت پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا احسان ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی آئی اور عالم غیب سے پہلی بار سابقہ پڑا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آپ ﷺ نے اصلی شکل میں دیکھا۔ ورنہ انسانی صورت میں آتے تھے۔ صحابہؓ میں حضرت دحیہ کلبیؓ بہت خوبصورت اور حسین و جمیل صحابیؓ تھے ان کی شکل میں حضرت جبرائیل آیا کرتے تھے۔ صحابہ دیکھتے تھے کہ دو دحیہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک ادھر ایک ادھر جانتے تھے کہ یہ دحیہ کلبی صحابی ہیں اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ تو دو مرتبہ اصل شکل میں حضور علیہ السلام نے دیکھا۔ ایک تو جب غار حرا میں سب سے پہلی وحی آئی ہے۔ اس وقت اپنی اصلی شکل میں نمایاں ہوئے اور ایک معراج کی شب میں۔ اور یہ دیکھنا اس شان سے تھا کہ ان کے چھ، چھ سو بازو ہیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک جتنی فضا ہے، سب ان کے بدن سے گھری ہوئی ہے۔ اتنا عظیم قد و قامت ہے کہ سر آسمان پر ہے، پیر زمین پر ہیں۔ موڈھے جنوب و شمال میں، چھاتی اور سینہ مشرق و مغرب میں ہے۔ گویا پوری فضا جبرائیل علیہ السلام کے بدن سے بھری ہوئی ہے۔ چہرہ سورج کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک تاج بھی ان کے سر پر رکھا ہوا ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ اس سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں اور ایک سبز رنگ کا کپڑا ہے جو ان کے بدن پر پڑا ہوا ہے۔ تو اتنی حسین و جمیل شکل مگر اتنی عظیم دیکھ کر، ایک دفعہ تو آپ ﷺ گھبرا گئے اور آپ ﷺ کے اوپر ہیبت اور لرزہ طاری ہوا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ رجال غیب کو اس طرح سے دیکھا اور دیکھا بھی اتنی عظیم شکل میں۔ آپ گھبرا کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ" مجھے کمبل اڑھاؤ، کمبل اڑھاؤ مجھے ڈر ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا، میری جان نکل جائیگی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: کیا واقعہ ہوا؟

آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، تو حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور فرمایا: "کَلَّا وَاللّٰہِ لَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا

اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِءُ الضَّیْفَ وَ تَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تُعِیْنُ عَلٰی نَوَآئِبِ الْحَقِّ" ① "خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ صلہ رحمی، غریبوں کی مدد اور مہمان نوازی آپ کرتے ہیں، مسکینوں کو آپ پناہ دیتے ہیں۔ ساری دنیا کی خیر خواہی میں لگے ہوئے ہیں ایسے بندوں کو اللہ ضائع نہیں کیا کرتا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں آپکی جان نہیں جاسکتی"۔

یہ تو زبان سے تسلی دی۔ اور عمل یہ کیا کہ ہاتھ پکڑ کر ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ عرب کے لوگوں میں بہت بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے تھے۔ مذہباً نصرانی تھے اس لئے انجیل اور تمام آسمانی کتابیں لکھا بھی کرتے تھے اور ان کو یہ کتابیں یاد تھیں اور ان کے علوم سے واقف بھی تھے۔ مشرکین عرب یا خاندان قریش میں ایک یہ تھے جو اہل کتاب میں شامل ہوئے اور آسمانی کتابوں کے بڑے زبردست عالم ہوئے۔ حضرت خدیجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس لے گئیں کہ انکے حالات کا صحیح پتا وہ دے سکتا ہے جو عالم ہو اور دینی و تاریخی علوم سے واقف ہو۔ حضرت خدیجہؓ جب انکے پاس پہنچیں اور کہا ذرا سنئے یہ آپ کا بھتیجا کیا کہتا ہے۔

"اِسْمَعْ لِا بْنِ اَخِیْکَ؟" اپنے بھائی کے بچے سے پوچھئے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا حالت اس کو پیش آئی؟ ورقہ بن نوفل نے بڑی شفقت سے فرمایا: "یَا ابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَرٰی؟" میرے بھتیجے کیا بات تم نے دیکھی؟ کیوں گھبرائے ہوئے ہو۔ آپ نے سارا واقعہ سنایا کہ میں اس طرح غار حرا میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی شخصیت نمایاں ہوئی۔ یہ اس کی شکل تھی اور یہ اس نے مجھ سے خطاب کیا۔ ②

ورقہ ابن نوفل نے کہا: اَبْشِرْ اَبْشِرْ۔ خوشخبری حاصل کر۔ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لے کر آتا تھا اور دیگر پیغمبروں کے پاس آتا تھا۔ خدا نے تم کو اس امت کا پیغمبر بنایا ہے جس کی خبریں سننے میں آرہی تھیں وہ تم ہی معلوم ہوتے ہو، اس لئے تم نہ گھبراؤ۔ یہ تو تمہارے لئے بشارت ہے۔ اور کہا کہ "کاش جب تم تبلیغ کا نام لے کر کھڑے ہو اور اسلام کی دعوت دو، میں اس وقت زندہ ہوتا تو تمہاری مدد اور اعانت کرتا۔ لیکن میں تو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہوں"۔

سو برس سے زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ بڑے معمر اور بوڑھے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ایسا کٹھن معاملہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ یہ معاملہ کوئی بدنی بیماری کا نہیں تھا کہ کوئی بخار آ گیا ہو، کھانسی آ گئی ہو، یہ روحانی معاملہ تھا اور روحانی معاملہ بھی وہ جو پیغمبروں سے پیش آتا ہے۔ کسی معمولی ولی کا بھی نہیں بلکہ نبی الانبیاء کا معاملہ تھا۔ اس میں تسلی دینے کے لئے ایک عورت کھڑی ہوئی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، ہمارے زمانے کی کوئی عورت ہوتی تو وہ گھبرا کے کہتی۔ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ جلدی سے کمبل اڑھاؤ اور ایک واویلا شروع ہو جاتا۔ لیکن انکا

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

گھبرانا تو بجائے خود ہے۔اس ذات اقدس کو تسلی دی جو پورے عالم کی سردار بننے والی تھی۔ان کے دل کو تھامنے کی کوشش کی۔قول سے الگ تھاما، عمل سے الگ تھاما۔زبان سے یہ تسلی دی کہ آپ وہ نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع کرے۔آپ تو سرتاپا بزرگ ہی بزرگ، خیر ہی خیر ہیں۔عادت اللہ یہ ہے کہ ایسی ہستیوں کو اللہ کھویا نہیں کرتا اور عمل یہ کیا کہ ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔یہ ایک عورت ہی تھی جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا درحقیقت پوری اس امت کو تسلی دینا ہے جو قیامت تک آنے والی ہے۔گویا اکیلی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان ہے۔ ①

میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتیں ایسی ایسی بھی گزری ہیں اس لئے عورتوں کا یہ خیال کرنا کہ ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ گھر میں بیٹھ جائیں۔کھانا پکا دیا۔زیادہ سے زیادہ بچوں کے کپڑے سی دیئے اور زیادہ ہوا، ان کی تربیت کردی۔اس سے زیادہ ہم ترقی کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ میدان مردوں کا ہے۔ولی بھی مرد بنے گا، امام بھی مرد بنے گا، مجتہد اور خلیفہ بھی بنے گا۔ہم اس کام کے لئے نہیں ہیں۔تم چاہو تو مجتہد، ولی کامل بن سکتی ہو۔اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ الہام کا معاملہ ہو کہ تمہارے اوپر الہام آئے۔تم یہ بھی کرسکتی ہو۔جو ایک بڑے سے بڑے ولی کا حال ہوسکتا ہے۔وہ ایک عورت کا بھی ہوسکتا ہے۔بشرطیکہ عورت توجہ کرے مگر یہ توجہ نہیں کرتیں۔یہ ساری بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ یہ غلط فہمی رفع ہوجائے کہ عورت کے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ ہم نہ دینی ترقی کے لئے ہیں نہ عملی ترقی کے لئے اس کام کے لئے تو مرد ہیں۔

عورتوں کی علمی واخلاقی ترقی میں مرد سنگ راہ ہیں...... اگر برا نہ مانا جائے تو میں کہوں گا اس میں زیادہ قصور مردوں کا ہے۔یہ خیال انہوں نے اپنے عمل سے پیدا کیا ہے۔زبان سے تو کسی نے نہیں کہا ہوگا۔مگر غریب عورتوں کے ساتھ جو طریق عمل برتا گیا ہے۔کہ نہ ان کو تعلیم وترقی دینے کا بندوبست، نہ دین سکھلانے کا بندوبست۔

گویا عملاً زبان حال سے آپ نے انہیں باور کرا دیا کہ تم اس لئے پیدا ہی نہیں کی گئی ہو کہ دینی واخلاقی ترقی کرو۔یہ کچھ کریں گے تو ہم کریں گے۔اور ہم بھی افریقہ میں رہ کے نہیں کریں گے۔کوئی ہندوستان میں رہ کر ترقی کرلے تو کرے۔ہم اس لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے نہ ہماری عورتیں اس لئے پیدا کی گئیں۔

جب آپ نے اپنے طرز عمل سے عورتوں کے راستے بند کردیئے ہیں۔تو ان غریب عورتوں کا کوئی قصور نہیں یہ قصور اصل میں مردوں کا ہے اور قیامت کے دن ان مردوں سے باز پرس ہوگی کہ تم نے کیوں تربیت کی طرف توجہ نہیں کی؟ کیوں ان کو تعلیم نہ دی۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ" ②

"تم میں سے ہر شخص بادشاہ ہے اور قیامت کے دن ہر بادشاہ سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا

① الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب فضيلة الامام العادل وعقوبة الجائر، ج: ۱۳ ص: ۱۴۵۹ رقم: ۱۸۲۹.

② الصحيح للبخاری، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن ج: ۳ ص: ۲۱۴.

کہ اپنی رعیت کو کس طرح سے رکھا؟'' آرام سکھ سے رکھا یا تکلیف سے؟ صحیح تربیت کی یا نہیں کی؟ دین پر لگایا یا دین سے ہٹایا تو فرمایا، ہر گھر کا مرد بادشاہ ہے اور جتنے گھر میں رہنے والے ہیں وہ درحقیقت اس کی رعایا ہیں۔اس کے زیر عیال ہیں۔قیامت کے دن سوال ہوگا کہ گھر والوں کے ساتھ تم نے کس قسم کا برتاؤ کیا؟ ملک کا بادشاہ ہے تو پورا ملک اس کی رعیت ہے۔قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعیت کو کس حال میں رکھا انکی آسائش کی خبر لی یا انہیں تکلیفیں پہنچائیں۔ان کو آبرو بخشی یا انہیں بے آبرو اور بے عزت کیا؟ ان کو ایذا پہنچائی یا ان کی راحت رسانی کا سامان کیا یہ ہر بادشاہ سے سوال ہوگا۔استاذ سے اس کے شاگردوں کی نسبت سوال ہوگا کہ تیرے شاگرد تیرے حق میں بمنزلہ رعیت کے تھے۔تو ان کا بادشاہ تھا۔وہ تیری حکم برداری کرتے تھے تو نے ان پر کیا کیا حکم چلایا۔شیخ سے اس کے مریدین کی نسبت سوال ہوگا کہ مریدین بمنزلہ رعیت کے تھے تو حکم کرنے والا تھا تجھے منوانے کا مقام دیا گیا تھا اور وہ ماننے والے تھے۔تو نے کیا کیا چیزیں منوائیں۔تو نے اس سے دین منوایا یا بری چیزیں اس سے منوائیں۔غرض ہر شخص سے سوال کیا جائے گا۔تو آپ سے اور مجھ سے بھی سوال ہوگا۔عورتوں کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔کیونکہ وہ ہمارے زیر تربیت اور زیر عیال ہیں۔

عورتوں کے بارے میں مرض الموت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ توجہ عورتوں کی طرف دی ہے۔حتیٰ کہ عین وفات کے وقت جو آخر کلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہے وہ یہ تھا کہ ''اِتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَآءِ'' ① ''اے لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو''۔ یہ امانتیں ہیں جو تمہارے سپرد کی گئی ہیں۔ایسا نہ ہو کہ تم امانت میں خیانت کرو اور قیامت کے دن تم سے باز پرس ہو۔ یہ آخری کلمہ ہے جو عین وفات کے وقت فرمایا ہے۔وہ یہ تھا کہ عورتوں کی فکر کرو کہیں یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ان کو خراب نہ کر دیا جائے، ان کی تربیت نہ تباہ ہو جائے۔ان کا دین نہ برباد ہو جائے اور دنیا نہ خراب ہو جائے۔

تو جس ذات اقدس نے خود عورتوں کے بارے میں اتنی توجہ کی، اس کی امت کا بھی فرض ہے کہ وہ توجہ کرے۔حدیث میں ہے کہ: ''اِنَّ اَكْرَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُكُمْ اَهْلًا'' ② تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور عورتوں، بیویوں کے ساتھ لطف و مروت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔مطلب یہ کہ جو عورتوں کے ساتھ زیادتی اور سختی سے پیش آئے، جو ان کا دل دکھائے وہ قابل تکریم نہیں ہے۔اس حدیث کا حاصل یہی ہے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی اور پوری توجہ فرمائی اور عین وفات کے وقت آپ نے جو نصیحت ارشاد فرمائی وہ عورتوں کے بارے میں تھی۔اس سے اندازہ کیجئے کہ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ ج: ٢ ص: ٨٨٦ رقم: ١٢١٨.

② الحديث اخرجه البخارى ولفظه: ان من خياركم احسنكم اخلاقاً، كتاب المناقب، باب صفة النبى صلى الله عليه وسلم ج: ٣ ص: ٣٠٥.

امت کے لئے نبی اکرمؐ نے جہاں اتنا خیال کیا، امت کیا خیال کر رہی ہے؟ امت نے یہ کیا کہ طرزِ عمل سے یہ باور کرا دیا کہ تم نہ دینی ترقی کے قابل نہ دینی عمل کے قابل۔ یہ تمہارا کام ہی نہیں بس تمہارا کام یہ ہے کہ اگر تم غریب ہو تو گھر بیٹھ کے کھانا پکاؤ اور اگر تم دولت مند ہو تو کھانا ملازمہ پکالے گی۔ تم اچھے کپڑے پہن لیا کرو، بہترین زیور پہن لیا کرو اور جو جی میں آئے آرائش زیبائش کر لیا کرو۔ بس قصہ ختم ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا۔

عشقِ صورت سے حقیقت کی محبت ختم ہو جاتی ہے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بدنوں کو تو سنوار دیا لیکن دلوں کو بھی سنوارا ہے؟ بدن کی آرائش و زیبائش تو چند دن کی بہار ہے یہ چند دن میں ختم ہونے والی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا تین دن میں بتلا دیتا ہے۔ ساری جوانی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اگر آدمی جوانی کے اوپر ناز کرے اور چہرے کی تازگی و رونق پر اترائے تو تین دن کا بخار بتلا دیتا ہے کہ جوانی کی یہ حقیقت تھی۔ چہرے کی سرخی بھی ختم، منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور تین دن میں بخار سے ایسا حال ہو گیا اور بخار نے بتلا دیا کہ سب سے بڑا مربی اور ناصح میں ہوں۔ یہ بتلا دیتا ہے کہ جس کے لئے سارا سب کچھ کیا جا رہا ہے اس کی یہ قدر و قیمت ہے۔

اس واسطے اہل اللہ نے اس کی خاص طور پر تاکید کی ہے کہ صورتوں کے حسن و جمال میں زیادہ مت گھسو سیرت کے حسن و جمال کو دیکھو، اخلاق کی پاکیزگی کو دیکھو۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں اللہ اللہ سیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی آتے تھے۔ ایک شخص آیا۔ ابھی بے چارہ نیا تھا بزرگی نے اس کے دل میں گھر نہیں کیا تھا، شیخ سے بیعت ہوا۔ شیخ نے اسے اللہ اللہ بتا دی۔ اس نے بھی ذکر اللہ شروع کر دیا اور طریقہ یہ تھا کہ خانقاہ میں جتنے مریدین ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا۔ ایک باندی تھی جو کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔ یہ مرید جو نو وارد تھے۔ باندی انہیں کھانا دینے کے لئے آئی باندی ذرا اچھی صورت کی تھی۔ ان کی طبیعت اس کی طرف مائل ہو گئی۔ اب جب وہ کھانا لے کے آئے۔ یہ اسے گھورنا شروع کر دیں۔ شیخ کو پتہ چل گیا کہ یہ باندی کی صورت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ جتنا صورت و شکل میں الجھیں حقیقت اتنی کم ہو گی اور ذکر اللہ وغیرہ چھوٹ گیا بس یہ نگاہ بازی رہ گئی۔ جب وہ آئے اسے گھور رہے ہیں نہ اللہ کا نام اور نہ ذکر، عادت اللہ یہی ہے کہ بندہ صورتوں میں جتنا الجھتا ہے حقیقت سے اتنا ہی بے خبر بن جاتا ہے۔ جب صورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا حقیقت کا عشق ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ صورت کے دیکھنے میں لگ گئے اور جو حقیقت تھی اللہ اللہ کرنا اور یادِ خداوندی، اس سے غفلت شروع ہو گئی۔

شیخ کو پتہ چل گیا کہ ہمارے مرید اس بلا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سبحان اللہ انہوں نے بڑی تدبیر سے علاج کیا۔ انہیں بلا کر یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی۔ ایسا مت کرو۔ بلکہ ایک تدبیر اختیار کی اور ہنسی کی تدبیر اختیار کی اور ان کی اصلاح بھی ہو گئی۔

وہ یہ کہ دستوں کی ایک دوا لا کر اس باندی کو کھلا دی۔ جمال گھوٹا یا کوئی دوسرا مسہل صبح سے شام تک اسے بڑی

تعداد میں دست آ گئے اور باندی کو یہ حکم دیا کہ ایک چوکی رکھ دی گئی ہے اس پر جا کر حاجت کرنا۔ وہ بیچاری ہر دس منٹ کے بعد جاتی۔ شام کو جب وہ چہرے کی سرخی باقی نہ رہی، ہڈی کو چمڑہ لگ گیا۔ صورت دیکھو تو دیکھ کے نفرت آئے اور وہ جو گلاب سا چہرہ کھل رہا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ ایک زردی سی چھاگئی۔

شیخ نے اب اس کو کہا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کے جا اور تیرے ساتھ جو معاملہ کرے مجھے اس کی اطلاع دینا۔ اب وہ کھانا لے کے آئی تو انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب وہ آئے اور میں اس کو گھوروں۔ اور اب جو آئی تو دیکھا کہ ہڈیاں نکلی ہوئیں، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں، سرخی کی بجائے زردی چھائی ہوئی۔ انہیں بڑی نفرت پیدا ہوئی۔ کہا رکھ دے کھانا اور چلی جا جلدی یہاں سے وہ بیچاری کھانا رکھ کے چلی گئی۔ شیخ سے اس نے جا کے کہا، یہ اس نے کہا اور کہا بجائے اس کے کہ مجھے دیکھے، کہا چلی جا یہاں سے شیخ سمجھ گئے کہ علاج ہو گیا۔ شیخ تشریف لائے اور اس مرید سے فرمایا کہ میرے ساتھ تشریف لے چلئے، انگلی پکڑ کے لے گئے۔ وہ جو قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں کثیر تعداد دستوں کی نجاست بھری ہوئی تھی۔ فرمایا یہ ہے آپ کا معشوق اسے لے جائیے۔ اس لئے کہ جب تک یہ باندی میں موجود تھا باندی سے محبت تھی۔ اب یہ نکل گیا اور تو کوئی چیز نہیں نکلی۔ آپ کو نفرت ہو گئی معلوم ہوا اس باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے محبت تھی۔ اس گندگی کو احتیاط سے لے جائیے اور صندوق میں رکھیئے یہ آپ کا معشوق و محبوب ہے ؎

عشق صورت آخرت ننگے بود

حقیقت یہ ہے کہ صورتوں کا عشق گندگی کا عشق ہے۔ سیرت کا عشق پاکیزگی کا عشق ہے۔ اعلیٰ ترین سیرت اخلاق ہیں محبت کے قابل یہ چیز ہے۔

صورت کی خوبیاں فتنہ اور سیرت کی خوبیاں امن پیدا کرتی ہیں...... بلکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ صورت کی خوبی فتنے پیدا کرتی ہے اور سیرت کی خوبی امن پیدا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ''فَاِذَا قَدْ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ. '' ''آدھا حسن اللہ نے ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو عطا کیا''۔ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے بڑے حسین و جمیل تھے یوسف علیہ السلام پر جتنی مصیبتیں آئیں وہ صورت کے حسن کی وجہ سے آئی ہیں۔ بھائیوں نے کنعان کے کنویں میں ڈالا، مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ نو برس تک جیل خانہ بھگتا۔ یہ ساری صورت کی مصیبت تھی اور جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا۔

اس وقت خود حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ① مجھے مصر کی سلطنت دیدو، تو وجہ یہ نہیں بیان کی کہ ''اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ'' میں بڑا خوبصورت ہوں اس لئے مجھے بادشاہ بنا دو

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بلکہ یوں فرمایا ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ① "مجھے سلطنت بخش دو اس واسطے کہ میں عالم ہوں"۔ میں جانتا ہوں کہ سلطنت کس طرح سے چلتی ہے میں اپنے علم و کمال سے سلطنت چلا کے دکھلاؤں گا۔ تو مصیبتوں کا جب وقت آیا تو حسن و جمال سامنے آیا اور سلطنت ملنے کا وقت آیا تو اندرونی سیرت، علم و کمال سامنے آیا۔ اس لئے صورت کی خوبیاں فتنے میں مبتلا کرتی ہیں اور سیرت کی خوبیاں دنیا میں امن پیدا کرتی ہیں۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ: اگر غریب گھرانے کی عورت ہے تب تو بڑے سے بڑا کام مردوں کی طرف سے کیا سپرد ہوتا ہے؟ یہ کہ کھانا پکا کے دے، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پال پرورش کر دے۔ اس کے فرائض ختم ہو گئے۔ اور اگر امیر گھرانے کی عورت ہے تو وہ بچوں کی دیکھ بھال نہیں کرے گی وہ ملازمہ کرے گی کھانا بھی وہ پکائے گی ان کا کام یہ ہے کہ ذرا اچھے کپڑے پہن لئے۔ اچھا زیور پہن لیا، ذرا اور آزاد ہوئیں تو تفریح کے لئے بازار بھی ہو آئیں۔ یہ کام کر لیا اور زندگی کے فرائض ختم ہو گئے۔

آگے یہ کہ تمہاری سیرت کیسی ہے؟ تمہارا قلب کیسا؟ اخلاق کیسے؟ اس میں علم ہے یا نہیں؟ آخرت کا تعلق ہے یا نہیں؟ اللہ کے سامنے جانے کا کچھ خطرہ تمہارے سامنے ہے یا نہیں؟ قبر و حشر میں کیا گذرے گی انجام کیا ہوگا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بس کھا لیا، پی لیا، عمدہ لباس پہن لیا، بہتر سے بہتر زیور پہن لیا اور فرائض ختم ہو گئے۔

یہ تو اللہ کے ہاں سوال ہوگا کہ تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کیا اس لئے کہ رعیت کو اچھا کھلا دو، پہنا دو اور ہم سے غافل کر دو؟ اس لئے تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کہ مقصد کی طرف متوجہ کرو۔ وہ یہ کہ ہماری طرف متوجہ کرتے جس کے لئے تمہیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ یہ نہیں کیا تو تم سزا کے مستحق ہو، اس لئے میں سمجھتا ہوں اس میں عورتوں کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سارا مردوں کا قصور ہے کہ نہ ان کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں نہ ان کی تربیت کا، ان کی دلداری کا بڑے سے بڑا طریقہ ان کے ہاں یہ ہے کہ جو ان کی خواہش ہو وہ پوری کرو کپڑے، زیور دیدو، بس فرض ختم ہو گیا۔ یہ نہیں کرتے کہ ان کے دل کو سنواریں، ان کی روح میں آراستگی پیدا کریں کیا قیامت کے دن اس بارے میں ہم سے سوال نہیں ہوگا؟ کیا ہم سے پوچھا نہیں جائے گا؟ ضرور پوچھا جائے گا؟ ضرور پرستش ہوگی۔ اس جوابدہی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ دولت میں رہ کر عورت متقی بن سکتی ہے...... اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب عورت کی گود علم و کمال سے خالی ہوگی تو بچے میں علم کہاں سے آئے گا؟ بچہ تو ماں کی گود سے علم حاصل کرتا ہے۔ وہاں جہالت ہے تو وہ بھی جاہل ہوگا۔ وہاں محض ظاہری ٹیپ ٹاپ کی خواہش ہے بچے میں بھی یہی ٹیپ ٹاپ پیدا ہوگی اسے بھی دل کے سنوارنے کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا اور وہ بڑی عبرت کا واقعہ ہے۔ وہ اس کا ہے کہ اگر عورت دیندار بننا چاہے اور اس کو بنانا چاہیں تو بڑے بڑے آرام اور عیش میں رہ کر بھی دیندار بن سکتی ہے۔ اور بد دین بننا چاہے فقر و فاقہ میں

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بھی بددین بن سکتی ہے۔ دین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی بھک منگا بن جائے تو دین دار بنے گا اور اگر کوئی کروڑپتی ہوگیا، تو وہ دین دار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ غلط ہے۔ دین دار بننا چاہے تو کروڑپتی بن کے بھی دیندار بن سکتا ہے اور نہ بننا چاہے تو فاقہ مست ہو پھر بھی بددین بن سکتا ہے اس پر میں واقعہ عرض کرر ہا ہوں۔

وہ یہ کہ کابل کے بادشاہوں میں امیر دوست محمد خاں بہت دیندار بادشاہ گذرے ہیں، امیر امان اللہ خان مرحوم کے باپ امیر حبیب اللہ خاں تھے اور حبیب اللہ خاں کے باپ امیر عبدالرحمٰن تھے، ان کے باپ دوست محمد خاں تھے اور انکا زمانہ تھا۔ ان کے زمانے میں کسی دوسرے بادشاہ نے افغانستان کے اوپر حملہ کیا اور فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ امیر صاحب کو اس سے صدمہ بھی ہوا اور دکھ بھی کہ ایک بادشاہ نے میری سلطنت پر حملہ کردیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہت بھی ختم ہو اور آنے والا ملک کو برباد کردے۔

اسی فکر میں شاہی محل میں اندر تشریف لائے، انکی بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ بیگم سے یہ کہا کہ: آج ایسی خبر آئی ہے کہ کسی بادشاہ نے حملہ کیا ہے۔ میں نے اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا ہے تا کہ وہ جا کے دشمن کا مقابلہ کرے۔ بیگم نے کہا ٹھیک کیا اور گھبرایئے مت اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ غرض اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے اور اس کو ملک میں نہ آنے دے اور اسے دور دھکیل دے۔ شہزادہ فوج لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن امیر صاحب گھر میں آئے اور چہرے پر غم کا اثر بیگم سے کہا کہ: آج ایک بڑے صدمے کی خبر آئی ہے اور وہ یہ کہ میرا شہزادہ ہار گیا۔ اس نے شکست کھائی اور دشمن ملک کے اندر چڑھا ہوا آرہا ہے اور میرا بیٹا شکست کھا کر واپس بھاگتا ہوا آرہا ہے مجھے اسکا بڑا صدمہ ہے، ملک بھی جارہا ہے اور یہ بات بھی پیش آگئی۔

بیگم نے کہا: یہ بالکل جھوٹی خبر ہے اور آپ اس کا بالکل یقین نہ کریں۔ اس نے کہا جھوٹی نہیں ہے یہ تو سرکاری پرچہ نویس نے اطلاع دی ہے۔ محکمہ سی آئی ڈی کی اطلاع ہے۔ اس نے کہا آپ کا محکمہ بھی جھوٹا ہے اور سی آئی ڈی بھی آپ کی جھوٹی ہے۔ یہ غلط خبر ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔

اب امیر صاحب کہہ رہے ہیں کہ سلطنت کی باضابطہ اطلاع ہے۔ یہ گھر میں بیٹھ کے کہہ رہی ہے کہ خبر جھوٹی ہے اس نے کہا کہ نہیں یہ باضابطہ بھی بالکل جھوٹ ہے۔ امیر نے کہا کہ: اب اس عورت سے بیٹھ کر کون جھک جھک کرے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ نہ کوئی دلیل نہ کوئی حجت میں دلائل بیان کرر ہا ہوں کہ محکمہ کی اطلاع اور ضابطہ کی خبر۔ اس نے کہا سب جھوٹ اب اس سے کون بحث کرے۔

جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① فرمایا کہ عورت میں کچھ عقل کی کمی ہوتی ہے۔ جب بحث ہوتی ہے تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچپن سے زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے۔ جب ابتداء ہی سے رات دن سونا چاندی دل میں گھس

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸.

گیا تو علم اور کمال کہاں سے گھسے گا۔ ایک چیز گھس سکتی ہے یا سونا گھس جائے یا علم۔ ذرا دودھ پینا چھوٹا تو اس کے کان میں سوراخ کر دیا تا کہ اس میں سونے کی بال پڑ جائے اور ذرا بڑی ہوئی تو ناک میں سوارخ کر دیا تا کہ اس میں سونے کی بالی بھی ڈال دو اور زیادہ ہوا تو گلے میں سونے کا طوق ڈال دیا، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں ڈالدیں اور پیروں میں سونے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ غرض سونے چاندی کی قیدی۔ اور واقعی اگر عورتوں سے یوں کہا جائے کہ تمہارے بدن میں کیلیں ٹھونکی جائیں گی مگر وہ سونے کی ہوں گی۔ فوراً راضی ہو جائیں گی۔ جلدی کرو ٹھونک دو۔ مگر کیل سونے چاندی کی ہونی چاہئے۔ اس درجہ سونے اور چاندی کی محبت میں گرفتار ہیں کہ بدن چھدوانے کو تیار ہیں مگر سونا اور چاندی ہو۔ جب اس درجہ پر بات ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جو قرآن نے فرمایا:

﴿اَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① وہ جو سونے اور چاندی میں نشو ونما پاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی قوت نہیں پیدا ہوتی۔ جب خاوند سے بحث ہوتی ہے وہ تو حجتیں پیش کرتا ہے اور یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی ہے کہ نہیں یوں ہوگا۔

تو امیر صاحب نے دیکھا کہ بھئی میں حجت بیان کر رہا ہوں سرکاری خبریں دے رہا ہوں۔ یہ کہتی ہے سب غلط ہیں۔ اب اس عورت سے کون بحث کرے۔ محل سرائے سے واپس چلے آئے۔ دوسرے دن بڑے خوش خوش آئے اور کہا مبارک ہو۔ جو تم نے کہا تھا بات وہی سچی نکلی۔ خبر یہ آئی ہے کہ میرا شہزادہ فتح پا گیا اس نے دشمن کو بھگا دیا اور وہ کامیابی کے ساتھ واپس آ رہا ہے۔

بیگم نے کہا الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری بات اونچی کی اور میری بات سچی کر دکھائی۔ امیر نے کہا آخر تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا جو تم نے کل یہ حکم لگا دیا کہ میرا محکمہ بھی جھوٹا سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس بھی جھوٹی۔ تو تمہیں کوئی الہام ہوا تھا؟

اس نے کہا کہ مجھے الہام سے کیا تعلق اول تو میں عورت ذات، پھر ایک بادشاہی تخت پر بیٹھنے والی۔ یہ بزرگوں کا کام ہے کہ انہیں الہام ہو۔ بھلا مجھے الہام سے کیا تعلق؟ میں ایک معمولی عورت۔ انہوں نے کہا کہ آخر تم نے اس قوت سے کس طرح کہہ دیا کہ سب بات غلط ہے اور واقعہ بھی وہی ہوا کہ وہ غلط ہی ثابت ہوئی۔

اس نے کہا اس کا ایک راز ہے، جس کو میں نے اب تک کسی کے سامنے نہیں کھولا اور نہ اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ امیر نے کہا وہ کیسا راز ہے؟ اب امیر صاحب سر ہو گئے کہ آخر ایسا کون سا راز ہے جو خاوند سے بھی چھپا ہوا رہ جائے۔ اس نے کہا صاحب! کہ ایسی بات ہے کہ میں اس کو کہنا نہیں چاہتی۔ ''اَلْاِنْسَانُ حَرِيْصٌ فِيْ مَامُنِعَ.'' مثل مشہور ہے کہ جس چیز سے روکا جائے اس کی اور زیادہ حرص بڑھتی ہے کہ آخر اس میں کیا ہوگا۔ تو امیر صاحب نے کہ اب تو بتانا پڑیگا۔ جب بہت زیادہ سر ہو گئے تو اس نے کہا آج تک میں نے یہ راز چھپایا اب کھولے دیتی ہوں۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

وہ راز یہ ہے کہ مجھے اس کا کیوں یقین تھا کہ شہزادہ فتح پا کے آئے گا یا قتل ہوگا مگر شکست نہیں کھا سکتا۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کے نہیں آسکتا۔ یہ میرا یقین کس بنا پر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ میرے پیٹ میں تھا۔ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اس نو مہینے ایک مشتبہ لقمہ بھی اپنے پیٹ میں نہیں ڈالوں گی۔ رزق حلال کی کمائی میرے پیٹ میں جائیگی اس لئے کہ ناپاک کمائی سے خون بھی ناپاک پیدا ہوتا ہے اور ناپاک خون سے اخلاق بھی گندے اور ناپاک پیدا ہوتے ہیں تو میں نے عہد کیا اور نو مہینے اس کو پورا کیا کہ لقمہ حرام تو بجائے خود ہے۔ میں نے کوئی مشتبہ لقمہ بھی پیٹ میں نہیں جانے دیا۔ خالص حلال کی کمائی سے پیٹ کو بھرا۔ ایک تو میں نے یہ عہد کیا اس کو لازم رکھا اور اس پر عمل کیا۔

دوسری بات میں نے یہ کی کہ جب یہ پیدا ہو گیا تو ہزاروں دودھ پلانے والی ملازمات تھیں میں نے اس کو انہیں نہیں دیا، اپنا دودھ پلایا۔ دودھ پلانے کا طریقہ یہ تھا۔ جب یہ روتا میں پہلے وضو کرتی، دو رکعت نفل پڑھتی اس کے بعد اسے دودھ پلاتی۔ دعائیں بھی مانگتی۔ تو اندر پاکیٔ غذا پھر اللہ کی طرف توجہ۔ غرض دودھ بھی پاک، اس سے پیدا ہونے والا خون بھی پاک اور پاک خون سے پیدا ہونے والے اخلاق بھی پاک۔ اس لئے اس کے اندر بداخلاقی نہیں ہوسکتی۔ پشت دکھلا کر آنا اور بزدلی کرنا۔ یہ کمینے اخلاق میں سے ہے۔ شجاعت اور بہادری یہ پاکیزہ اخلاق میں سے ہے۔ جب اس کا خون پاک تھا تو یہ کیسے ممکن تھا یہ بزدل بنتا۔ یہ ممکن تھا یہ قتل ہو جاتا، شہید ہو جاتا، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ پشت کے اوپر زخم کھا کر واپس آتا اور بزدلی دکھلاتا، جب اس کے خون میں ناپاکی نہیں تو اس کے افعال میں ناپاکی کہاں سے آئے گی؟

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ شکست کھا کر آئے ہاں آپ یہ کہتے کہ شہید ہوگیا۔ میں یقین کر لیتی کہ وہ قتل ہو گیا۔ اس بناء پر میں نے یہ دعویٰ کیا تھا آج میں نے یہ راز کھولا۔ آپ اندازہ کریں کہ امیر دوست محمد خاں کی بیوی ایک اقلیم کی ملکہ ہیں۔ ہزاروں فوجیں اور سپاہ، حشم و خدم اس کے سامنے ہیں اور وہ جب تخت سلطنت پر بیٹھ کر اتنی متقی بن سکتی ہے تو ہماری بہو بیٹیاں معمولی گھرانوں میں رہ کر کیوں نہیں متقی بن سکتیں۔ ہمارے پاس کونسی ایسی دولت ہے۔ ہم اگر لکھ پتی یا کروڑ پتی بنیں سارے افریقہ کے مالک تو نہیں ہو گئے ہفت اقلیم کے بادشاہ تو نہیں ہو گئے۔ ایک ملکہ اور بادشاہ کی بیوی جب یہ تقویٰ دکھلا سکتی ہے تو میری بہنیں کیوں نہیں تقویٰ دکھلا سکتیں؟ میری بیٹیاں کیوں نہیں یہ تقویٰ دکھلا سکتیں؟ ان کے پاس تو اتنی دولت بھی نہیں کہ دولت کے قصہ سے کوئی وقت فارغ نہ ہو۔ فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ اگر دیندار بننا چاہیں عورت ہو یا مرد کروڑ پتی بن کے بھی بن سکتا ہے۔ نہ بننا چاہے تو فاقہ زدہ ہو کے بھی دین دار نہیں بن سکتا۔ بددین رہے گا۔ یہ اپنے قلب پر موقوف ہے اور قلب میں یہ جذبہ جب پیدا ہوگا جب اس قلب کی تربیت کی جائے اس کو تعلیم دی جائے اس میں علم ڈالا جائے اس میں اللہ کی عظمت پیدا کی جائے۔ اس میں حلال کی کمائی کی رغبت پیدا کی جائے، ناجائز باتوں سے بچنے کے جذبے پیدا کئے جائیں تب قلب میں صلاحیت آئے گی۔ پھر جو اولاد تربیت سے پیدا

ہوگی وہ صالحین میں سے ہوگی۔ وہ خود بخود تقویٰ وطہارت اور نفس کی پاکیزگی لئے ہوئے پیدا ہوگی تو واقعہ یہ ہے کہ بنیاد عورت سے چلتی ہے۔ مگر عورت کے بنانے کی بنیاد مردوں سے چلتی ہے، انجام کار ہماری آپ کی کوتاہی نکلتی ہے ہماری بہنوں کا کوئی قصور نہیں۔

پیدا ہوتے ہی بچہ تربیت کا محتاج ہوتا ہے...... یہ میں کوئی ان بہنوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا کہ بھئی آج فقط عورتوں کا جلسہ ہے اس لئے ایسی بات کہہ دوں جس سے وہ ناراض نہ ہوں۔ ایسا نہیں بلکہ امر حقیقت ہے کہ اگر ہم صحیح تربیت کریں۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ چار پانچ برس کی بچی بے چاری کیا جانتی ہے۔ جس راہ پہ ڈالدیں گے پڑ جائے گی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: پیدا ہوا ہوا بچہ اسی وقت سے تربیت کے قابل بن جاتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب چار پانچ برس کا ہوگا جب اس کو تعلیم وتربیت دیں گے، ایسا نہیں ہے بلکہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ بچہ مہینے بھر کا ہے۔ اسے ظاہر میں کوئی عقل وشعور اور تمیز کچھ نہیں۔ لیکن اس کے سامنے کوئی برا کلمہ مت کہو اور کوئی بری ہیئت بھی اس کے سامنے مت اختیار کرو، اس لئے کہ اس کو ہوش تو نہیں مگر اس کا قلب ایسے ہے جیسے سفید کاغذ، آنکھ کے راستے جو ہیئت جائے گی وہ اس کے قلب کے اوپر جا کے چھپ جائے گی۔ آپ برا کلمہ کہیں گے یا گالم گلوچ کریں گے۔ وہ کان کے راستہ سے جا کر اس کے دل پر چھپ جائے گا۔ جب وہ ہوش سنبھالے گا تو وہی باتیں بکتا ہوا ہوگا۔ غرض تربیت وہاں سے شروع ہوتی ہے ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے اسے کیا شعور ہے؟ جو چاہے اس کے سامنے کہہ دو اور چاہو کر گزرو، جو چاہو ہیئت بنالو، اسے کیا شعور؟ یہ درست ہے کہ اسے تمیز اور شعور نہیں ہے مگر یہ چیز کان، آنکھ کے راستہ سے جا کر دل پر چھپتی ہے۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے بات بھی کرو تو تہذیب اور شائستگی کی کرو، کوئی بے جابات مت کرو، وہ بے جابات اس کے دل میں گھر کر جائے گی اور جب کوئی ہیئت دکھلاؤ تو بری ہیئت مت دکھلاؤ، اچھی ہیئت دکھلاؤ۔ آنکھ کے راستے سے وہی ہیئت اس کے دل پہ چھپے گی۔ اس بنا پر کہتے ہیں کہ تربیت پانچ برس کی عمر میں نہیں ہوتی۔ پیدا ہوتے ہی تربیت کا موقع آجاتا ہے۔

بچہ ماں باپ کا نقال ہے...... یہ جب ہوگا جب خود ماں باپ میں تقویٰ وپاکیزگی اور احتیاط موجود ہو۔ جتنی یہ پاکیزگی برتیں گے، اتنی ہی پاکیزگی بچے کے قلب میں پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے بچے عموماً گالیاں دیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ شہروں کے تہذیب یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دیہات میں خود ماں باپ گالیاں بکتے ہیں۔ بچے کے دل میں بھی وہی چھپتی رہتی ہیں۔ شہر میں ذرا تہذیب کے کلمے ہوتے ہیں۔ وہ چھپتے رہتے ہیں اس کا اثر پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے آداب میں سے یہ رکھا ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کے لئے سب سے پہلے

بندوبست نہ روٹی کا کیا کہ اسے دودھ پلاؤ، نہ کپڑے کا کیا۔ خیر وہ بھی پہنا دے۔ پہلا بندوبست یہ کیا کہ اس کے (اسے غسل دینے اور ظاہری الودگی سے پاکی کے بعد) دائیں کان میں اذان دو اور بائیں میں تکبیر، اذان کہنا ایسا ہے جیسے دیوار کے سامنے کہے تو دیوار کو کیا خبر؟

تو یہی بات آتی ہے کہ اسے خبر تو نہیں ہے مگر کان کے راستے جب 'اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ' پہنچے گا تو دل میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ کلمہ جب پہنچے گا تو دل میں اس کی چھاپ لگ جائے گی جب آپ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہیں گے دل پر رسالت پر ایمان لانا چھپ جائے گا۔ جب حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کہیں گے کہ آپ کہیں گے کہ آپ نماز کی طرف دوڑو، یہی جملہ چھپ جائے گا۔ تو دائیں کان کو آپ نے توحید و رسالت، عمل صالح اور اللہ کی عظمت و بڑائی سے بھر دیا۔ اور بائیں کان کو تکبیر سے بھر دیا۔ اس میں اللہ و رسولؐ اور دین کی عظمت دل میں بٹھلائی۔ تو اذان و تکبیر ہوگئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ اس اذان اور تکبیر کی نماز کونسی ہے؟ جو جنازہ کی نماز آپ پڑھیں گے اس کی یہ اذان و تکبیر ہے۔ دنیا میں آتے ہی اذان دی گئی تکبیر بھی کہی گئی۔ اور دنیا سے جاتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھی گئی یہ اس کی اذان و تکبیر تھی تا کہ ایک مومن بچے کی ابتداء اور انتہاء دونوں اللہ کے نام پر ہوں تو اللہ اکبر سے زندگی شروع ہوئی اور اسی پر ختم ہوگی۔ زندگی کا اول و آخر خدا کے نام سے چلا۔

اس کی بنا یہی ہے کہ ابتداً ہی جو اس کے دل میں چھپے اللہ کا نام چھپے کوئی گالم گلوچ اور برا کلمہ نہ چھپے اب اگر آپ تربیت دیں گے تو دل میں پیدا ہوتے ہی بیج تو آپ نے ڈال دیا۔ اب نماز کے لئے کہیں گے تو بیج موجود ہے اس میں پھل پھول لگنے شروع ہو جائیں گے عمل صالح شروع ہو جائے گا۔ ہاں خدانخواستہ تربیت نہ کی تو وہ جو بیج ڈالا تھا، وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

زمین میں آپ بیج ڈالدیں لیکن نہ پانی دیں نہ دھوپ سے بچائیں بیج جل کر ختم ہو جائے گا۔ امید بھی نہیں رہے گی کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہو۔ اس لئے بیج تو توحید و رسالت کا پیدا ہوتے ہی ڈال دیا جاتا ہے۔ آگے ماں باپ کو حکم ہے کہ "مُرُوْا صِبْیَانَکُمْ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا" ① ''بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جاویں'' اور مار کر پڑھاؤ جب وہ دس برس کے ہو جائیں۔ یہ گویا تربیت اور آبیاری ہے کہ بیج وہاں ڈالا تھا اب پانی دینا شروع کرو۔ دھوپ سے بچاؤ تا کہ وہ بیج پھل لائے اور درخت بن جائے۔ یہ تربیت ہوگی تو اس کے بچے اور بچیاں بھی مستحق ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی۔ آگے ماں باپ قصوروار ہیں اولاد قصوروار نہیں ہے۔ اولاد جب قصوروار بنے گی جب وہ عاقل بالغ ہو، شریعت کا خطاب متوجہ ہو۔ پھر اس سے مواخذہ ہوگا۔ مگر ابتدائی تعلیم نہ دینے کا مواخذہ ماں باپ سے ہوگا کہ کیوں نہ تم نے صحیح راستے پر ڈالا؟ کیوں غلط راستے پر ڈالا؟

عورتوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت...... تو اس کی ضرورت ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا بھی صحیح طریق پر

① المسند للامام احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ج: ۲ ص: ۱۸۰ رقم: ۶۶۸۹۔

بندوبست کیا جائے مثلاً ہمارے ہاں یہ قدیم زمانے میں دستور تھا بلکہ اب بھی کچھ قصبات میں ہے کہ اسکول یا کالج نہیں قائم ہوتے بلکہ محلے میں جو بڑی بوڑھیاں ہیں اور وہ پڑھی لکھی ہوئی ہیں تو محلے کی بچیاں ایک گھر میں جمع ہوجاتی ہیں۔ وہ گھر کے کام کاج بھی کر رہی ہیں، قرآن شریف بھی پڑھ رہی ہیں، ترجمہ بھی پڑھ رہی ہیں مسئلے مسائل کے لئے ان کو بہشتی زیور پڑھایا جارہا ہے۔ یہ ان کی گھریلو تعلیم ہوجاتی تھی۔ جب یہ چیز کم ہوگئی تو مدرسے کھلے بچیاں وہاں پڑھنے چلی جاتی ہیں بہرحال کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو جیسے خودرو درخت ہوتے ہیں کہ جدھر کو ان کا جی چاہے چلی جائیں۔

بہرحال ان کو گھریلو تعلیم دی جائے۔ جو عورتیں قرآن شریف پڑھی ہوئی ہیں یا اردو جانتی ہوں یا انہیں اپنی زبان میں مسائل معلوم ہوں یا کوئی کتاب ہے وہ پڑھائیں تاکہ ابتداء سے مسئلے مسائل کا علم ہو۔

اس لئے کہ شریعت اسلام نے علم کے سلسلے میں دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ ہر انسان پر مرد ہو یا عورت واجب ہے اور ایک درجہ فرض کفایہ ہے کہ سو میں سے ایک ادا کردے تو سو کے لئے کافی ہے۔ وہ حصہ جو ہر ہر شخص پر واجب ہے وہ ضروریات دین کا ہے کہ جس سے عقیدہ معلوم ہوجائے، اخلاق کا پتہ چل جائے حقوق کی ادائیگی، ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں۔ اللہ و رسول کا کیا حق ہے؟ کچھ عبادت، کچھ معاشرت، کچھ اخلاق، کچھ اعتقادات یہ سیکھنے تو واجب ہیں خواہ مرد ہو یا عورت اور ایک ہے پورا عالم بننا۔ یہ ہر ایک کے اوپر فرض نہیں ہے سو دو سو میں سے اگر ایک دو بھی عالم بن گئے تو سب کے لئے کافی ہے۔ ہاں ایک بھی نہیں بنے گا تو سب گنہگار رہوں گے۔

غرض فرض کفایہ کی یہ شان ہے کہ پوری قوم مل کر فرض کو چھوڑ دے تو پوری قوم گنہگار رہے۔ لیکن اگر ایک فیصد کو عالم بنادیا، عمل دکھلا دیا تو ساری قوم کے اوپر سے گناہ ہٹ گیا۔ تو ایک فرض عینی ہے، یعنی ہر ہر شخص گنہگار، جو نہیں کرے گا وہی گنہگار رہوگا۔ اس لئے اتنا حصہ عورت اور مرد دونوں کے لئے ضروری ہے جس سے وہ یہ سمجھیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ ہم مسلمان کیوں ہیں؟ ہم پر کیا چیزیں فرض ہیں؟ ہم پر کیا ضروریات عائد ہوتی ہیں۔ عورت بھی اور مرد بھی اس کا حقدار ہے۔ اس کا سکھانا فرض ہے۔ خود مرد اپنی بچیوں کو سکھلائیں یا مرد کسی ایک عورت کو پڑھادیں وہ عورت اور عورتوں کو تیار کردے کہ وہ گھروں میں جاکے یا کسی ایک جگہ مدرسہ قائم کرکے ان بچیوں کو پڑھادے۔ اس سے زیادہ کوئی قصہ نہیں۔ ذرا توجہ کی جائے تو یہ معاملہ باآسانی ہوسکتا ہے۔

رہا عالم بنانا، سب کیلئے عالم بننا ضروری نہیں ہے۔ نہ مردوں کے لئے نہ عورتوں کیلئے۔ قوم میں سے ایک دو بھی بن گئے یا باہر جاکے بن گئے، ہندوستان جاکے بن گئے۔ پوری قوم سے گناہ ہٹ گیا، اس عالم کا فرض ہے، وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے جو ان کی دینی ضروریات ہیں انہیں پورا کرے، انہیں مسائل بتلائے۔ فتویٰ دے، الجھنوں میں شرعی طور پر ان کی راہنمائی کرے۔ دل وساوس میں الجھ گئے ہوں تو فکر کا راستہ درست کرے۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ عورتیں بھی علم واخلاق کی اتنی حقدار ہیں۔ جتنے آپ حقدار ہیں۔ جتنا حصہ آپ پر ضروری ہے وہ ان پر بھی ضروری ہے۔ ان کی دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے۔ اگر آپ نہیں کرتے تو آپ سے مؤاخذہ ہوگا۔ اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے تھے اور آیت یہ تلاوت کی تھی۔ ﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ملائکہ علیہم السلام جب آئے اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے خطاب کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں، نہایت مقدس اور پاکباز بی بی ہیں حتیٰ کہ بعض علماء ان کے نبی ہونے کے قائل ہیں۔ ان سے ملائکہ نے خطاب کیا اور کہا:

اے مریم! بشارت حاصل کر اللہ نے تجھے منتخب کیا تجھے پاکباز اور مقدس بنایا اور تیرے زمانے میں جتنی عورتیں ہیں ان سب پر تجھے فضیلت، بڑائی اور بزرگی دی۔ جب اللہ نے یہ انعام تجھے دیا اور برتر و برگزیدہ کر دیا۔ تو تیرا کام کیا ہے؟

﴿يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ﴾ ② ”اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے عبادت گذار بندی بن کے رہ“ ﴿وَاسْجُدِيْ﴾ سجدے اختیار کر ﴿وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ③ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ رکوع سے مراد نماز ہوتی ہے، جہاں رکوع کا لفظ آتا ہے وہاں نماز کا ذکر ہے وہاں محض رکوع نہیں بلکہ پوری نماز مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نماز قائم کرو، عبادت خداوندی کو اپنا شعار اور اپنی طبیعت بناؤ۔

اس لئے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ مریم علیہا السلام کتنی بڑی پارسا اور پاک بی بی ہیں۔ ان کو اللہ نے کتنا بڑا مقام دیا کہ فرشتوں نے ان سے خطاب کیا یہ شرف کس کو حاصل ہوا؟ یہ بڑی قسمت کی چیز ہے۔ یہ ایک عورت کو شرف حاصل ہوا اگر حضرت مریم علیہا السلام کو یہ شرف حاصل ہوا۔ ہماری بہو بیٹیوں کو کیوں نہیں ہوسکتا بشرطیکہ وہ بھی وہی کام کریں جو حضرت مریم نے کئے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کی کچھ اور خصوصیات تھیں وہ ان کے ساتھ خاص تھیں۔ لیکن جو بڑائی اور کمال اللہ نے دیا تھا اس کے دروازے اللہ نے کسی کے لئے بند نہیں کئے۔ مریم علیہا السلام اگر ولی کامل بن سکتی ہیں تو ہماری عورتیں بھی ولی کامل بن سکتی ہیں۔ نبوت کا بے شک دروازہ بند ہوگیا۔ نبی اب کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی نبوت قیامت تک کیلئے کافی ہے۔ اس نبوت کے طفیل میں بڑے بڑے محدث، امام، مجتہد، اولیائے کاملین اور مجدد پیدا ہوں گے۔ فیضان قیامت تک اسی نبوت کا کام کرتا رہے گا۔ گویا اتنی کامل نبوت ہے کہ اسے ختم کرکے کسی اور نبوت لانے کی ضرورت نہیں۔ جو مراتب تھے اس ذات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی مرتبہ نبوت کا باقی نہیں رہا جس کے لانے کے لئے کسی کو بھیجا جائے کہ اس پر یہ مرتبہ پورا کیا جائے۔

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۲. ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳.
③ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳.

ایک ہی ذات پر سارے مراتب ختم ہوگئے یہ وہی ذات ہے جس کی روشنی قیامت تک چلتی رہے گی، روشنی کو پہنچانے والے اللہ تعالیٰ ہزاروں آئینے پیدا کر دے گا کہ آئینۂ آفتاب کے سامنے ہوگا اور عکس اندھیرے مکان میں ڈالدے گا۔ وہ بھی روشن ہو جائے گا۔ تو نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا مگر ولایت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس لئے اس نبوت کے نیچے رہ کر جو بڑے سے بڑا کمال مرد کو مل سکتا ہے وہ عورت کو بھی مل سکتا ہے۔ عورتیں مایوس نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ علم وغیرہ تو مردوں کے لئے ہے، ہم صرف گھر میں بیٹھنے کے لئے ہیں۔ گھر میں ہی بیٹھ کر سب کچھ مل سکتا ہے اگر محنت کی جائے اور یہ توجہ کریں۔ اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی اس کے تحت تھوڑی سی تشریح عرض کی۔ خدا کرے ہمارے قلوب قبول کریں اور ہمارے دل مائل ہوں اور ہم حقوق کو پہچانیں۔ ہمیں اگر راعی بنایا گیا ہے تو ہم اپنی رعیت کی خبر گیری کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطاء فرماوے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

وَلَوْكَانَ النِّسَآءُ كَمَا ذُكِرْنَا لَفُضِّلَتِ النِّسَآءُ فَلَا التَّانِيْثُ لِاسْمِ الشَّمْسِ عَيْبٌ

عَلَى الرِّجَالِ وَلَا التَّذْكِيْرُ فَخْرٌ لِلْهِلَالِ

پیغامِ ہدایت...... ایک خط جو شادی کے موقع پر ارسال فرمایا① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ

شادی اور نکاح سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور اسے اسلام نے صرف معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ عبادات کے زمرہ میں شمار کیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اذا تزوج العبد فقد كمل نِصْفُ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ.'' ② ''نکاح آدھا دین ہے آدمی کو چاہئے کہ بقیہ آدھا دین تقویٰ اور طہارت سے حاصل کرے''

نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ عفت، پاکدامنی اور خیال کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے آدمی حرام سے بچتا ہے اور حلال کے دائرہ میں محدود رہتا ہے۔ نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ اتحاد باہمی اور قبائل اور خاندانوں کے باہمی تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔ کتنے ہی اجنبی باہم مربوط ہو جاتے ہیں اور پہلے سے بیگانے ہوں تو یگانگت بڑھ جاتی ہے اور باہمی حقوق قائم ہو جاتے ہیں اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے جہاں آبائی اور جدی نسب کو محل نعمت میں شمار فرمایا وہیں صہری اور سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا ارشاد خداوندی ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا.﴾ ③ ''اور اللہ ہی وہ ہے جس نے ایک قطرہ پانی سے بشر کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے نسب آبائی اور سسرالی رشتہ پیدا فرمایا''۔

① از رسالہ دار العلوم دیوبند، ماہ جون ۱۹۷۵ء۔ ② شعب الایمان، للبیهقی، ج: ۴، ص: ۳۸۳، رقم: ۵۴۸۶. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱ ص: ۴۳۱. ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۵۴.

پس جیسے نسب کو نعمت ظاہر فرما کر بشر پر اپنا احسان جتایا کہ یہ نعمت اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں دے سکتا ایسے ہی سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا کہ اجنبی دلوں کو اس طرح باہم ملا دینا بھی اسی کا کام ہے جو کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے نکاح کی غرض وغایت ظاہر فرماتے ہوئے اسے اپنی قدرت کی نشانی اور آیت قرار دیا۔

کیا یہ قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ نکاح سے ایک منٹ پہلے مرد عورت باہم اجنبی ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بعینہ اپنا دکھ درد نہیں سمجھتے اگر کبھی اجنبی عورت کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سوائے عام انسانی ہمدردی کے آدمی اس کی کوئی خاص ٹیس اور چبھن اپنے دل میں اس طرح محسوس نہیں کرتا کہ بے چین ہو جائے اور اپنے دکھ درد کو بھول جائے۔ لیکن نکاح سے ایک منٹ بعد اگر عورت کے دکھ درد کی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو وہ متفکر، پریشان اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دکھ درد کو بھول کر منکوحہ کے دکھ درد کے مداوے میں مستغرق ہو جاتا ہے یہی صورت عورت کی بھی ہے۔ یہ دلوں کا ملاپ اور قلوب کی وحدت کیا محض قدرت کا ہی کرشمہ نہیں کہ دلوں کی دنیا یکدم بدل ڈالی اور جانبین کے دلوں میں انقلاب عظیم رونما فرما دیا اس لئے اگر اسے آیت اور نشانی فرمایا گیا ہے تو وہ ایک حقیقت واقعی ہے محض کوئی نظریہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دو کا یہ ملاپ فریقین کے متعلقین کا بھی قدرتی ملاپ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے کے اور لڑکے والے لڑکی والے کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں اور باہم یگانگت محسوس نہ کریں اس لئے نکاح جیسے خود ایک آیت اور قدرت کے کرشموں کی ایک عظیم نشانی ہے ایسے ہی وہ باہمی اتحاد و یگانگت کا بھی ایک معجزانہ وسیلہ ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرما کر قبائل کو اپنے ساتھ ملایا، باہم شیر وشکر فرمایا اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے تعلق کی پختگی اور مضبوطی کا اہتمام تھا طلاق جو قاطع نکاح ہے باوجود جائز ہونے کے عند اللہ اس کو مبغوض قرار دیا۔

چنانچہ فرمایا: ''اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَاللّٰهِ الطَّلَاقُ'' ''جائز چیزوں میں سب سے زیادہ عداوت خدا تعالیٰ کو طلاق سے ہے''۔ کیونکہ یہ قاطع نکاح ہے۔ نکاح جو ذریعہ اتحاد وحدت ہے تو طلاق قاطع اتحاد و ملاپ بھی ہے اس حال میں کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد وحید توحید کے ساتھ اتحاد باہمی بھی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا جائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے اور خدا سے ٹوٹے ہوئے دل کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس لئے وہ نکاح کے تعلق میں کسی ادنیٰ اختلال کو بھی کیسے گوارہ فرما سکتے تھے البتہ نکاحی تعلق مضبوط سے مضبوط اور ذریعہ اتحاد بنانے کا جو راستہ شریعت الٰہی نے طے فرما دیا وہ بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں ایک شفقت ایک اطاعت، جس سے معاشرہ کی گاڑی چلتی ہے۔

خاوند کو تو حکم دیا کہ وہ بیوی کے ساتھ انتہائی شفقت اور دلداری سے پیش آئیں اور نرم اخلاق سے اس کے دل کو موہ لینے کی سعی میں لگے رہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''اِنَّ اَكْرَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُكُمْ اَهْلاً.'' (یعنی) ''تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق

پا کیزہ ہوں اور بیوی کے ساتھ لطف و مدارات کا برتاؤ کرتا ہو'' حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے بیوی کے منہ میں لقمہ دے دینا بھی صدقہ کے حکم میں ہے جس پر اجر دیا جاتا ہے اور اسے عبادت شمار کیا جاتا ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ انتہائی ملاطفت اور دل جوئی کا عمل فرماتے تھے اس لئے بیویوں کے ساتھ دل جوئی اور ان پر لطف وکرم اور شفقت ومحبت کے برتاؤ سے جہاں نکاح کی حقیقی غرض و غایت نکلتی ہے وہیں اس سے قلوب میں سکون اور باہمی مودۃ و اتحاد پیدا ہوتا ہے، ارشاد باری ہے ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم میں آپس میں مودۃ اور رحمت پیدا ہو، بلاشبہ اس میں فکر کرنیوالوں کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں (کہ بے تعلق قلوب میں وہ کس طرح اچانک تعلق خاص بلکہ محبت باہمی کا علاقہ قائم فرما دیتا ہے)''۔

اور یہ اس لئے کہ بیوی خاوند کی وجہ سے اپنے گھر بار، ماں باپ، اپنے عزیز واقرباء کو چھوڑ چھاڑ کر خاوند کے گھر آتی ہے کہ اس کی بن کر رہے اگر وہ بھی ملاطفت اور شفقت سے دست کش ہو جائے اور اس کے ساتھ بے رحمی اور ایذا رسانی کا برتاؤ کرے تو یہ غریب عورت کہاں جائے نہ ادھر کی رہے گی نہ ادھر کی اپنے عزیز تو خاوند کی وجہ سے چھوٹے اور خاوند بھی اپنا نہ ہوا تو اس غریب کا ٹھکانہ ہی کیا باقی رہا سوائے اس کے کہ غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی ختم کر دے۔

ادھر بیویوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت اور اتباع میں سرگرمی دکھلائیں اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے خاوند کا دل ٹوٹے اور بیوی سے بیزار ہو جائے۔ جس سے اس تعلق کی غرض و غایت ہی فوت ہو جائے جیسے بدمزاجی، درشت کلامی، سرکشی اور نافرمانی اور شوہر کے مال میں خیانت یا مال کو بجائے شوہر کے گھر بار پر خرچ کرنے کے اس کی اجازت کے بغیر اپنے میکے پر صرف کرنے لگے جو بلاشبہ خیانت ہوگی اور خاوند کے لئے بد دلی اور بیزاری کا باعث ہوگا، جس سے یقیناً اس تعلق کی خوشگواری اور نفس تعلق ہی کی بقاء میں خلل پڑ جائے گا۔ جس کے اثرات پورے گھرانے پر پڑنا قدرتی امر ہے اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتہائی بات فرما دی کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کیا کریں چونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک اور قطعی حرام ہے اس لئے یہ امر نہیں کیا مگر اس سے اطاعت شوہر کی انتہائی تاکید برآمد ہوتی ہے کہ حرام اطاعت کے سوائے کوئی بھی اطاعت ایسی نہیں ہے جس کے لئے بیوی مامور نہ ہو اس لئے احادیث میں فرمایا کہ: اگر شب میں بیوی خاوند کیساتھ سرکشی برتتی ہے تو تمام ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں یہی صورت دن کو بھی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ دو ہی باتیں اطاعت شوہر، ملاطفت زوجہ وہ ہیں جن کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان دونوں باتوں کا تعلق کسی ظاہری نمائش یا زینت پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی حقیقت پر رکھا گیا جو لافانی اور جاودانی ہے مثلاً

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱۔

اگر خاوند کی ملاطفت کا تعلق عورت کے ظاہری حسن و جمال، مال و دولت اور عرض وجاہت وعزت سے ہے تو یہ تمام چیزیں دنیا ہی میں پائیدار نہیں ہیں چہ جائیکہ آخرت میں کارآمد و نافع ثابت ہوں اس لئے کہ جب یہ کم یا گم ہوں تو شوہر کی ملاطفت ختم ہو جائے گی اور تعلقات میں کشیدگی بلکہ آخر کار انقطاع تعلق تک نوبت پہنچے گی اور اگر اس تعلق کی بنیاد عورت کی دین داری پر رکھی جائے تو دین سدا بہار اور دنیا کے بعد آخرت تک ساتھ جانے والا ہے اس لئے اس پر مبنی شدہ تعلق بھی دائمی اور مضبوط اور خوشگوار رہے گا جس میں کوئی عارضی چیز خلل انداز نہ ہوگی اس لئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان امور کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: ''تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ.'' ① ''عورت سے نکاح (بظاہر اسباب) چار وجوہ سے کیا جاتا ہے اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے، اس کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے، اس کی عرفی عزت و وجاہت کی وجہ سے، اس کی دینداری کی وجہ سے سوتم ان تمام امور میں دینداری کو ترجیح دو''۔

ظاہر ہے کہ مال و جمال اور عرفی حیثیت آنی جانی چیزیں ہیں اگر بیوی پر لطف و شفقت ان کی بناء پر ہے تو اول تو یہ لطف و شفقت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور جس حد تک ہے بھی تو اس کے زوال سے تعلق زائل ہو جائے گا اور گھریلو زندگی میں ناچاقی اور بیزاری رونما ہو جائے گی جس سے گھر تباہ ہونے کی صورت پیدا ہوگی لیکن اگر نکاح کا مبنیٰ عورت کی دینداری ہے جو خاوند کے بھی دیندار ہونے کی کھلی علامت ہے۔ اور لطف و شفقت اس بناء پر ہوگا تو اس کی بنیاد خوف خدا پر ہوگی اور آدمی محسوس کرے گا کہ جب خدا نے اسے میرے ذمہ لگا دیا تو حسب اوامر خداوندی اس کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کروں خواہ وہ حسین و جمیل ہو یا نہ ہو، مالدار ہو یا نہ ہو، صاحب جاہ و منزلت ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ سے یہ ملاطفت و شفقت عین دین ہوگی اور مرتے دم تک قائم رہے گی ہاں اگر حق تعالیٰ دینداری کے ساتھ ساتھ حسین و جمال، مال و منال بھی جمع فرما دیں تو یہ سونے پہ سہاگہ ہے لیکن یہ امور تعلق کی بنیاد بنانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ ہر آن قابل زوال و اختلال ہیں۔ بہر حال نکاح کے تعلق میں پختگی اور پائیداری ان دو ہی امور سے آتی ہے شوہر کی اطاعت اور زوجہ کی دلداری۔ دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ زوجہ کوئی باندی نہیں ہوتی، بلکہ شریک حیات اور رفیقہ زندگی ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ اونچ نیچ کا برتاؤ کسی طرح بھی جائز نہیں، وہ قابل احترام بنائی گئی ہے نہ کہ مورد تذلیل و اہانت۔ چنانچہ عرب ممالک میں آج بھی اگر عورت سامنے آ جائے تو ''حرمۃ'' کہہ کر لوگ توقیر کے ساتھ اسے راستہ دیتے ہیں نیز اگر اس کی حرمت وعزت باقی نہ رہے تو گھر والے بلکہ اولاد تک بھی اس کی عزت نہیں کر سکتی اس لئے شریعت نے جہاں مرد کو عورت پر حقوق دیئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی مرد پر حقوق دیئے ہیں تاکہ وہ معاشرہ میں باعزت رہے چنانچہ قرآن حکیم نے ارشاد

① الصحیح لمسلم، کتاب النکاح، باب استحباب نکاح ذات الدین، ج: ۲ ص: ۱۰۸۶ رقم: ۱۴۶۶.

فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ﴾ ① ”اور عورتوں کے بھی حقوق (مرد پر) اسی طرح ہیں جس طرح (مرد کے حقوق) عورت پر ہیں“۔

مثلاً اگر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی خلع کا حق سونپا گیا ہے اگر نزاع باہمی ہے تو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے افراد کو حکم منتخب کرنے کا برابری کے ساتھ حق دیا گیا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ عورت کو لاوارث بنا کر مرد کے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ باعزت اور باحقوق بنا کر دیا ہے پس اگر بیوی کو اطاعت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے تو مرد کو دلداری کا۔ تو یہ دونوں کے منصب کا تقاضا ہے کوئی اونچ نیچ پیش نظر نہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرتی مساوات کے ساتھ شوہر کی شفقت و اعانت اور زوجہ کی فرمانبرداری ہی سے گھریلو زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو سکتی ہے جس کا اسلام نے راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین اور دینی جذبات کی پائیداری اور شرعی معاشرت کی پابندی کے سوا دوسرا نہیں ہے اس لئے شوہر اور زوجہ کے مطالعہ میں ایسی کتابیں رہنی چاہیں جن میں زوجیت کے حقوق اور اسلامی معاشرہ، رہن سہن اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کے طریقے واضح ہوں اور وہ بکثرت شائع شدہ ہیں جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بہشتی زیور یا حقوق الزوجین یا حقوق المعاشرۃ وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ احقر کی شرکت و حاضری نکاح سے یہ پیغام زیادہ نافع ہوگا شرکت تو وقتی چیز رہتی ہے اور یہ دوامی دستور العمل ہوگا۔ (وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ.)

پیغام ہدایت...... ایک خط کا جواب ② محترم المقام زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا مفصل گرامی نامہ ملا۔ میں سفروں میں رہا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے اپنے کچے مگر سچے حالات تحریر فرمائے اور اپنی اصلاح سے مایوسی ظاہر فرمائی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کفر ہے، مایوس ہرگز نہ ہو جائیے، کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے نہ رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے مرض پیدا کئے تو علاج بھی پیدا کئے ہیں تاکہ بندوں کی عزیمت عمل اور اندورنی جوہر، ہمت قوی، عزیمت اور مدافعت کا ظہور ہو۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق امراض پیدا ہی نہ کئے جاتے باطنی امراض میں کفر و فسق کا نام و نشان ہی نہ ہوتا اور امراض باطن کے اسباب شیاطین اور کفار اور فساق کا ماحول پیدا ہی نہ کیا جاتا تو علاج اور اس کے اسباب یعنی اچھے اعمال، اچھے اشخاص کے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور جب نہ اچھے ہوتے اور نہ برے، اچھائی ہوتی اور نہ برائی تو دنیا آخر کس چیز کا نام ہوتا، جسے پیدا کیا جاتا، بالفاظ دیگر دنیا ہی نہ پیدا کی جاتی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ دنیا کا پیدا کیا جانا قرین حکمت تھا تو خوبی کے ساتھ خرابی، نیکی کے ساتھ بدی، تقویٰ کے ساتھ فجور، اسلام کے ساتھ کفر کا پیدا کیا جانا بھی ضروری اور عین حکمت تھا، تاکہ کفر کے مقابلہ سے اسلام کی قوت، فسق کے مقابلہ سے تقویٰ کی طاقت، بدی کے مقابلہ سے نیکی کی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸. ② از رسالہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۵۸ء۔

رفعت، کذب کے مقابلہ سے صدق کی عزت و فخامت نمایاں ہو آپ کے تخیل کے مطابق کہ اس شیطان کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا۔ شیطان پیدا نہ ہونا چاہئے تھا تا کہ آپ کو نہ ورغلاتا لیکن پھر آپ ہی کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت تھی نیز آپ میں مدافعت شر کی قوتیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی اور نیکی و بدی میں امتیاز کی قوت یعنی عقل پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور قوت ارادی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ حق کو باطل سے ممتاز دیکھ کر حق کی طرف اپنے ارادے سے دوڑیں اور یہ سب غیر ضروری تھا، تو وہ انسان کہاں رہتا، جس میں نہ قوت ارادی ہوتی نہ قوت تمیزی نہ عقل ہوتی نہ عزیمت ہوتی نہ طاقت مدافعت ہوتی، تو انسان کیا ہوتا، اینٹ پتھر کا ایک تودہ ہوتا اور جب ساری کائنات انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان کا یہ عالم کہ وہ ایک تودۂ خاک، تو کائنات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے علم و عقل سے استعمال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا آپ کی رائے کے مطابق اور وہ بھی آپ کی کم ہمتی کی وجہ سے اس دنیا کو ناپید رہنا چاہئے تھا اور اب بھی اگر وہ ہے تو اسے صرف ایک تودۂ خاک ہونا چاہئے یہ سوائے تخیلات فاسدہ کے اور کیا ہے۔

آپ نے جو کچھ نیکی یا بدی کی، ارادہ و اختیار سے کی، اللہ تعالیٰ نے مجبور کر کے نہیں کرائی، کب ایسا موقع آیا کہ آپ اینٹ، پتھر کی طرح مسلوب الاختیار ہو گئے ہوں کہ آپ چاہتے ہوں نیکی کرنا مگر زبردستی آپ کا اختیار چھین کر آپ سے بدی کرادی گئی۔ اس لئے اپنے کئے دھرے کو تقدیر کے سر ڈال کر بری الذمہ ہونے کی کوشش نہ کیجئے کہ یہ انتہائی جسارت اور گستاخی ہے۔ ایک تو آدمی بدی کرے اور اوپر سے بری الذمہ بن کر بدی کو اپنے مالک کے سر تھوپنے کی کوشش کرے۔

ان سارے فاسد تخیلات کا یک ہی علاج ہے، سب سے پہلے اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین کیجئے کہ آیا وہ دنیا ہے یا آخرت، اگر دنیا ہے تو اس کے کمانے کی فکر میں لگ جائیے اور حلال و حرام کا کوئی سوال نہیں جو جی میں آئے یا نام نہاد عقل میں آئے کرتے رہیے بجز اس کے کہ جسے دنیا برا سمجھے دنیا کی خاطر اسے ترک کیجئے، جسے اچھا سمجھے اسے اختیار کرتے رہئے عاقبت کی فکر کو ترک کر دیجئے اور اگر آخرت ہے تو اسے کمانے کی فکر کیجئے تو پھر اخروی قانون سے مدد لیجئے کہ اس کی رو سے کون سی چیز حلال ہے، کون سی حرام اور دونوں دائروں میں خواہ دنیا ہو یا آخرت بہر حال اپنا ارادہ صرف کرنا ہوگا اور اختیار سے کام کرنا ہوگا، تقدیر کے حوالہ کر کے بری الذمہ ہونا ہے تو آج سے ملازمت، تجارت، زراعت سب ترک کر دیجئے کہ جو مقدر ہوگا، آپ ہی مل رہے گا، لیکن اس دائرہ میں اسباب رزق کا اختیار کرنا آپ کے نزدیک ضروری ہے، اس لئے زندگی کا ایک نصب العین متعین کر کے اپنی قوت مدافعت کا جائزہ لیجئے کہ وہ اس کی حد تک یہ زندگی کے نصب العین کے اجزاء کو حاصل کرنے اور اس کی منافی اشیاء کو دفع کرنے میں کام کرتی ہے۔

اخروی نصب العین کے لئے دستور العمل شریعت ہے، جس کے پانچ ارکان ہیں۔ عبادات، اخلاق،

اعتقادات، معاملات، عقوبات اور سب اختیاری ہیں، ان سب کو بنام خدا شروع کیجئے، فرائض کی پابندی، اخلاق کی تکمیل کے لئے کسی متخلق با خلاق اللہ کی طرف رجوع، عقیدہ کی اصلاح اور تخیلات فاسدہ سے گریز، معاملات میں فقہ کی پابندی، خود علم نہ ہو تو پوچھ پوچھ کر عمل۔

عقوبات کے سلسلہ میں مادی سزائیں مادی قوت نہ ہونے کی وجہ سے آج نہیں دی جاسکتی ہیں تو اسے بھی اللہ کی رحمت کہنا چاہئے اور اس کے قائم مقام استغفار کو رکھا جائے، جس کے معنی ماضی پر ندامت مستقبل کے لئے عزیمت کہ کچھ بھی ہو آئندہ یہ معصیت ہرگز نہیں کرنی، پھر بھی اتفاقاً شہوات سے مغلوب ہو کر ہو جائے تو پھر توبہ اور اپنے اوپر مالی جرمانہ جو صدقات کی صورت سے ہو، کیا جائے، ماحول کو حتی الامکان بدلا جائے، اگر وہ معصیت کا ماحول ہے اور دل کی کمزوری سے اس کے اثرات سے بچاؤ زیادہ دشوار ہو تو ماحول کی تبدیلی کی پوری سعی کی جائے جب اللہ کے لئے آدمی اپنے منافع تک ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اسے ادھر میں چھوڑ دیں، ادھر سے بلاشبہ دستگیری ہوگی ان سب عملی ونظری مفاسد سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ذکر اللہ کی کثرت ہے زبان کو ذکر سے تر رکھا جائے، صبح وشام ذکر کا کوئی معمول کرلیا جائے، مثلاً صبح وشام سو سو مرتبہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' اور کلمہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر کیا جائے یعنی ایک تسبیح حسبنا کی اور ایک تسبیح کلمہ توحید کی صبح اور ایک شام کو، اس کے خلاف خیالات فاسدہ آ دیں تو لاحول پڑھی جائے جب نصب العین آخرت قرار دے لیا گیا تو منافی آخرت خیالات کو سوائے لاحول سے دفع کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے، یہ کثرت ذکر خود ہی قلب کو پاک کرے گا خیالات فاسدہ کو کم یا گم کرے گا قلب کی سختی کو مٹا کر رقت پیدا کر دے گا، اور برے ماحول سے نفرت دلا کر اچھے ماحول کے جذبات پیدا کرے گا، اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اس دستور العمل کو اختیار کر لیجئے اور برے خیالات پر لاحول بھیجئے، اس کے سوا دوسری راہ اصلاح کی نہیں، ساتھ ہی کسی کو اپنا رفیق عمل بنا لیجئے جو نیک مشورہ دے، اور کسی ایک کو مرجع افکار بنائیے کہ وہ وساوس اور ضعطوں کے وقت سنبھالتا رہے حاصل یہ کہ بیماری ہے تو طبیب متعین کیجئے اور اس کے سامنے حالات کی اطلاع، تدابیر کا اتباع اس پر اعتماد اور اس سے اعتقاد قائم کر کے ان چاروں باتوں کو مشعل راہ بنائیے۔ بھروسہ خدا کے فضل پر کیجئے مگر فضل کی علامت نیک عمل کو سمجھئے اگر وہ نہیں ہے تو سمجھئے کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ کسی اور بات کی حاجت نہیں، اسی لئے سر دست اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت، استقامت، ہمت اور عزیمت عطا فرمائے اور حسن انجام نصیب فرماوے، آمین، والسلام۔

(حضرت حکیم الاسلام) محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۷۷۔۹۔۱۱

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

حرف آغاز...... ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا۔ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر ناکارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا۔ چونکہ صدر مملکت نے صرف ایک گھنٹہ دیا تھا۔ اس لئے اجلاس کی پہلی نشست کی ساری کاروائی ایک ہی گھنٹہ میں پوری کی جانی ضروری تھی۔ ابتداء میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج و ڈائریکٹر ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ نے اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پندرہ پندرہ منٹ صدر جلسہ اور صدر مملکت کی تقریروں کے لئے تھے۔ احقر نے اولاً اپنی تقریر سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے چونکہ اس اہم موضوع پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہ تھا اس لئے تقریر میں چند بنیادی اور اساسی نقاط ہی بیان کئے جاسکے۔ البتہ نشست کے اختتام پر جب اس کا ذکر آیا تو ذمہ داران جامعہ نے اسے مناسب خیال فرمایا کہ یہ تفصیلات نقاط، مقالہ کے طور پر لکھ کر ارسال کر دی جائیں جس میں باقیماندہ نقاط بحث بھی شامل ہوں۔ اس لئے یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے۔ جس میں وہ سب بنیادیں بھی ہیں جو اجلاس میں زبانی بیان کی گئی تھیں اور باقیماندہ نقاط بھی آ گئے ہیں جو وہاں بیان میں نہ آسکتے تھے۔ ممکن ہے کہ ترتیب میں فرق ہو لیکن مقاصد سب آ گئے ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلہ میں چند بنیادی نقاط پیش کر دوں جنہیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک از بس ضروری ہے۔

عالم بشریت میں فکر و تفکر کی اہمیت...... پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایسی ایک عظیم اصولی بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور سب اسی کی دست نگر ہیں، جو بلا فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ حواس خمسہ ہوں یا عقلی و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ، حدس و تجربہ ہو یا جو ہر قیافہ ان سب کی قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر

نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سرچشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی جاتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حدتام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جو ہر غیر انسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آ موجود ہوگا۔ گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہئے، یہ صغریٰ کبریٰ ملانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے، نیز عرف عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جیسے لومڑی اور گدھے، بھینس کو عام طور سے احمق اور بلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ ؎

مسکن خر اگرچہ بے تمیز است ۔۔۔ چون بارہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا کہ ؎

جاموش بے وقوف و بے ہوش ۔۔۔ چوں شیر دہد تو چشم از وپوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حدتام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہوسکتا، البتہ فکر و تدبیر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے انکشافات سے جزئیات پیدا کر لینا اور جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا نکال لینا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کو سمجھنا، نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا، نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح معاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلاشبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں، اسی لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہوسکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہوسکتی ہے۔ کیونکہ فکر مندی، فکر نمائی اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوع بشری کے لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات مابعد الممات تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے، جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں۔ اس لئے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حدتام تک کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا

ہے۔ پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش، ذوق و وجدان اور حدس و تجربہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے، بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران متصرف اور انکی روح ہے، جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمائشی کروفر کا بازار گرم ہو اور باجوں، گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن اگر راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا۔ اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کی فکر میں ڈوبا ہوا تھا، مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان نہ خود دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال وفکر ہی دیکھتی سنتی ہے۔ یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی صورت عقل و دوراندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کسی نظریئے کی سوچ میں محو ہو تو دوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ لئے جائیں، نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا۔ کیونکہ اس کی قوت فکر یہ کسی دوسرے میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس نظریئے پر غور کر سکے۔ اسی طرح روحانی احوال و کیفیات کا ادراک بھی قوت فکر یہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر غیبی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے۔ احسان یا تصوف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ سو یہ قوت فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے؟

انسان کی فکری قوت کی کارپردازی...... بہر حال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت میں حقیقی کار پرداز صرف یہ فکر ہی قوت ہے۔ وہ متوجہ نہ ہو تو قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوت عاملہ سب معطل رہ جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں۔ جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ یہی قوت فکر جب غیبیات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوت فکر یہ نہ صرف یہ کہ انسان ہی کی خصوصیت ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندورنی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ چنانچہ جو قومیں ان حسی طاقتوں' آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزات انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضاء و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے

اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اس قوت فکریہ کی نابینائی ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ ① ''بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم، فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کام بھی انجام دیتے جائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے جبکہ اس کی غرض و غایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری روح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی روح نکال کر لاتی ہے۔ ارشاد حق ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ ② ''اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے) ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہرا) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو''۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکر ہی کے تعطل سے ہوتا ہے، جس کو قرآن نے عقل و ابصار سے تعبیر کیا ہے گویا جس مبصر و مسمع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوۃ مفکرہ کے غور و فکر سے تعلق ہو تو وہ مبصر و مسمع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے۔ پھر اس طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا: جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال و افعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس، حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں وہ فکر شعور نہ تھا جو حقیقی معنی میں دیکھتا اور سنتا ہے جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد حق ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ③ ''ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو ہیں یہی لوگ غافل ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ فقہ قلب اصل ہے، جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے، وہ نہ ہو تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا اور غیر قابل التفات

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔ ② پارہ: ۱۱ سورۃ یونس، الآیۃ: ۴۲، ۴۳۔ ③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔

جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار......اسی طرح عقل کے بارے میں بھی قرآن کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوت فکر ہے۔ عقل محض نہیں، یعنی عقل طبعی کی سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کی فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے۔

تو عقلی شعور بھی بے شعور اور نا قابل اعتنا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے قلوب کے جو بے فکرے ہوں۔قرآن نے انہیں عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ ① ’’اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسی سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' ان میں سے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں‘‘۔

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجود یکہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنہیں سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ چرند و پرند بھی اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف و طمع کا اثر بھی لیتے ہیں، لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے۔ وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں، آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے، بے فکری اور بے توجہی سے عقلی تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے، بہر حال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز......یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لئے انفسی آیات، کہیں شرعی اور علمی آیات سامنے رکھی ہیں اور کہیں وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے۔انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ② ’’تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے؟‘‘

کہیں آفاقی آیات پیش کیں جیسے ﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ③ ’’کیا وہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (وفکر) نہیں کرتے؟‘‘

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کر کے فرمایا ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ

① پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴. ② پارہ: ۲۶ سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱. ③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۸۵.

اَنَّـهُ الْحَقُّ﴾ ① ''ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے''۔

کہیں شرعی آیات پیش کہیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا۔ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ ② ''کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے''۔

کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیاتِ طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ تاکہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آ جائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں' فرمایا ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ﴾ ③ ''آپ فرما دیں اے پیغمبر! کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور فرادی فرادی اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے اس ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے''۔ ﴿اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ ④ ''کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے؟''

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو ''لب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے۔ منکشف شدہ علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا کہ ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ⑤ ''جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطاء کر دی گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں''۔

حاصل کلام...... حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے، جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ، مگر وہ صورتِ عقل ہے جو مادۂ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کر لیتا ہے لیکن لب اور لباب حقیقتِ عقل ہے جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہیں۔ اسی کا نام فکر ہے، یہ حکمت جسے خیر کثیر کہا گیا ہے۔ محض عقل طبعی سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لب کہا گیا ہے۔

بہرحال قرآن حکیم نے اس خاص قوتِ فکر کو جس کا تعلق قوانین الٰہی، معرفتِ خداوندی، حقائق نبوت اور اس کے ایوان کے انکشاف سے ہے جسے صبغت اللہ کہا گیا ہے۔ اسی کو کہیں فقہ قلبی سے، کہیں لب (عرفانی) کہیں نظر

① پارہ: ۲۵ سورۃ حم السجدۃ، الآیۃ: ۵۳۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۲۔ ③ پارہ: ۲۲ سورۃ السبا، الآیۃ: ۴۶۔
④ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۸۴۔ ⑤ پارہ: ۳ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔

(باطن) سے، کہیں بصیرت سے اور انصباغ من اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں، حواس عقل، وجدان عقل اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق تشریع و تکوین اور کمالات ذات و صفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی ہے اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر چشم بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں، بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کی امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر فکر ان میں سے اصولی، کلی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام...... خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے، فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کی امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتی تو اجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ امت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے۔ مگر اجتہاد کی جنس بہر حال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی، اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے اکتشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے، بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے، کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم و جدید کی دوئی ختم کر کے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لئے قرآن حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اسی مرکزی نقطہ کے نیچے جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطۂ منہاج نبوت...... اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی فکر کے لئے سب سے پہلی فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے

جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاجِ نبوّت ہے۔ جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے اس منہاجِ نبوّت کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس امت میں نبی امت نے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کی فکرِ جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں، نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا؟

منہاجِ نبوّت کا امت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر..... غور کیا جائے تو اس منہاجِ نبوّت نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیتہً ترک کر کے زاویہ نشین ہو جائیں۔ شہری آبادیوں تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو، نہ در، نہ معاشرہ ہو، نہ معیشت ہو، نہ انسانی روابط ہوں، نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو، نہ اجتماعیت کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے، نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرت کا تقاضا۔ اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" ① ''اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں''۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادتِ الٰہی اور طاعتِ نبویؐ سے بیگانہ ہو کر کلیتہً نظامِ دنیا سنوارنے، اور جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو، نہ عقائد رہیں نہ عبادات نہ فرائض رہیں نہ سنن نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر خواہی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ دن رات ہوائے نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب، عیش و طرب، و آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش، مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سو اسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی، متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ﴿ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور دنیاوی زندگی

---

① قال الحافظ ابن حجر: لم اره بهذا اللفظ لكن في حديث سعد بن ابي وقاص عند الطبراني ان الله ابدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة دیکھئے: فتح الباری ج:۱۳ ص:۲۹۳. ② پارہ:۴، سورة آل عمران، الآية:۱۸۵.

تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے"۔

بلکہ اس افراط وتفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرانے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے۔ یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے شعبوں کو زیر استعمال رکھ کر ان ہی سے آخرت پیدا کی ہے، چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ." ① "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے، اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجر آخرت ہے وہیں حظ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثواب آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیش نظر ہے۔ اگر طیبات رزق میں بہ نیت حسن عبادت کی قوت رکھی گئی ہے۔ وہیں کام ودہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔

اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرت حیاء اور ستر عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسن دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے۔ اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر ونخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت اختیار کی گئی ہے جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تخت شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظ ملک، خدمت خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار وعزت اور سیاست وقیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے بہر حال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب واکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

فکر دنیا کن اندیشہ عقبیٰ مگذار ۔۔۔ تا بعقبیٰ نہ رسی، دامن دنیا مگذار

غرض منہاج نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے، جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں، اس لئے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیب نفس، تدبیر منزل، سیاست مدن، تسخیر اقالیم، تعظیم امر اللہ، شفقت علی خلق اللہ، نظام اجتماعیت، جماعتی تنظیم ومرکزیت، اخلاق وایثار کی منظم تربیت، نظام عبادت اور نظام امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکر آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے تاکہ یہ قوم جامع دین ودنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد، مقلد اور مقتدی

---

① علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیہ مع ایرادالغزالی لہ فی الاحیاء وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمرؓ مرفوعاً: الدنیا قنطرة الآخرة فاعبروھا ولا تعمروھا. دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۱۱۸.

بنے، اسے خوددار بنا کر امام اقوام اور داعیِ حق وصداقت کی حیثیت دی گئی ۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام　　　ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

تشکیل جدید میں آج کی ضرورت...... پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا، اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے جدید ہوں اور دلائل قدیم تا کہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اصول اور قوعد کلیہ اور ضوابطہ کی پابندی کی اہمیت...... اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوت کے تمام عقائد و احکام واخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں، تا کہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید کی تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔

اگر ایک شخص سائنس کی فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو یا منطق وفلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صرف ونحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہوسکے گا، اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا تا کہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد ومقاصد تک پہنچا ہوا ہے یہ اصول وقواعد ہی درحقیقت منہاج نبوت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں؛ جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد واضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔

اصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ...... البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کئے ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور

ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے۔اس لئے ان میں بہر حال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی، جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی۔جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے، خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ وہ اجتہادی ہوں۔جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں۔اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل وترتیب عمل میں آسکے گی نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہوسکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہوسکتا۔جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے، یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہوسکتی، بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔یہی وجہ ہے کہ جن اصولوں کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور وخوض کیا جائے۔مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو۔﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ ① ”آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے“۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا دیا گیا کہ: تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ② ”آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے“۔یا اسی طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرما دیا گیا کہ: تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ○ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ○ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا﴾ ③ ”یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب

① پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۸۹. ② پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۵.

③ پارہ:۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ:۴۲،۴۴.

ہوگا، سواس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے"۔

بہر حال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب۔ اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہواور سعادت دارین حاصل ہوتی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عملی سے بنتی ہے جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے، اسی لئے کسی مربی نفس ربانی کی ضرورت ہے، ربانی کی تفسیر ابن عباسؓ نے "اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِهَا" سے کی ہے۔ "یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداء چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے"۔ اس لئے قرآن کریم نے تذکیر مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت وسلطنت) کی بنیادی غرض وغایت ٹھہرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہوتا کہ علم اور عمل دونوں جمع ہوسکیں کہ اس کے بغیر ہماری فکر اور اس کی تشکیل پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل مطلب...... حاصل یہی ہوا کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح وانتخاب جدا بات ہے۔ وہ اہل علم کا کام ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت، وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے بھی معقول اور دل پذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم وانشکاف نہیں ہوسکتا ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت وشکل سامنے آسکتی ہے اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعہ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیز ہیں وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔

فقہاء متقدمین کے استخراج جزئیات کی افادیت...... اس سے ہی ان حوادث، وواقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہاء امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس ضرور کیا یا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کار آمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کرسکیں، ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی، اس لئے

بجائے اس کے کہ ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں پھر بھی اگر مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کر سکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑ ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاء امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کر کے جمع کر دیئے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا جس میں ہر شعبہ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لئے فکر جدید کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن و استہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اس کی گرد جھاڑی صاف کیا اور تناول فرما لیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں دولتمندوں اور سیر چشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے فرمایا: ''أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ.'' ''کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟'' غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزئیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر و طعن، لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوّت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا۔ مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال و حوادث کے پیش نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوئی یا مجبوری یا آجکل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جا سکے۔

بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جا سکتے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے۔ جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے، جو ذات حق، ذات نبوی اور ذات صحابہؓ سے وابستہ ہے، اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں ''حبیبی'' کا لفظ استعمال فرما کر

اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہوتو قانون عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزئیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا، اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی میں آزادی ضمیر اور حریت رائے کی حدود...... لیکن اس انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادی ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عام سے عام آدمی بھی اس قانون حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کرسکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارہ کار نہیں ہوتا، اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامت صغریٰ ہے، جو کلیتہً امامت کبریٰ یعنی امامت وخلافت پر منطبق ہے، وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔ وہاں اگر جہاد میں ہر نقل وحرکت پر نعرہ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر امام کے حق میں سمع وطاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے، وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں، اس صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کا مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہوتو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہوتو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ سجدہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہوجائیں وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی ہوجائے اور وہ سجدہ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطاء میں ساتھ دیں اور سجدہ سہو کریں۔

لیکن حریت وآزادی یہ ہے کہ اگر امام قرات یا افعال صلوۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرلے یا قرات صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہوجائے اور اسے درست نہ کرلے، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر وتسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہوجائے۔

بعینہ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المومنین کی سمع وطاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر وسزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطاء ولغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔

فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیر المومنین ممبر پر کھڑے۔ ہوکر

خطبے میں اعلان فرمار ہے تھے، ''لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مالِ غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ بن عمر) دے گا، صاحب زادے نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا تھا، ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کردی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے، تب اعرابی نے کہا کہ: اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ بہر حال منہاج نبوت کے مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقلید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلا پن گوارا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک عام آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگزاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا۔ لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول وقوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جب کہ ان ہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اصول کی عالمگیریت پر واقعاتی حقیقت کے شواہد...... آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنی ان کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں' اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہو سکتا، لیکن جب انہیں اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے تربیت پا کر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق ومغرب کو روشنی دکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا۔ اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہو سکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جا سکتا۔ بالخصوص جب کہ ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم وفضل نے استخراج مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں۔ جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لئے تمدن ومعاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا، بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے، ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انہیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکران باب فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے۔ بالخصوص مسائل کے طرز استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید میں نئے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک دور میں نظری فلسفہ نے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چولے میں نہ آئے تو رازیؒ وغزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی، ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور

عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور میں معاشی فلسفہ کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا اور وقت کے مسائل حل کئے۔ ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم (دیوبند) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو شواہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجت فرما دیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے الوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو درحقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے۔ البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں۔

دور جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت و شوکت...... آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے، مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو۔ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لئے قابل التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا۔ بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا، حالات متحرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین و دنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے سے کوئی سبق نہیں لیا اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دور جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل...... بہرحال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل و ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہو گی جبکہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ،

مرادات خداوندی کے ساتھ تقید، رضاء حق کی پاسداری، اجتماعی اصلاح وفلاح، اخروی نجات کی فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آجائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاجی کی ضرورت ہے۔ جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں انہیں مہارت وحذاقت میسر ہو، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھتے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاوئی ہیں۔ اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناں گوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی اور دوسری طرف ماہرین عصریات جبکہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انہی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی بہر دوصورت تشکیل جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور فکر اور باہمی بحث وتمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب وسنت اور اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگی۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا' نیز ایک طبقہ ہدف طعن و ملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سدراہ نہ ہوگا۔

تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کے لئے ایک امر لازم...... البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق وحرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاء خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس

لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلہ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہیں ''مَاحَالَ فَقَدْ زَالَ'' کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگیا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات کے مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے میں منہاج نبوت نے اصولاً یا جزءً وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر، مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے۔ نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی ضرورت واہمیت...... فی زمانہ اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں۔ آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتی کہ عقائد بھی بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی، چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہر گئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریہ پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس لئے آج ایک سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد وافکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند مفکر گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ قدیم زمانہ کے ''ملل ونحل'' اس دور کے پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیش نظر مرتب ہوئے تھے۔ جب کہ دلوں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے نہیں تھے اب عصر حاضر کے سیاسی عقائد وافکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل وشواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکر اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ اٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ سیمینار کے ثمرے کے طور پر اس سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی ''ملل ونحل'' کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے۔ حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جو نوعیں ابواب وفصول کے ساتھ جن جن عنوانوں سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیتہً حاوی ہیں اور ان میں فقہاء

امت کے دل و دماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر عملی اور فکری سعی کا محور بنایا لیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آ جائیں گے اور دوسرے مہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی ''ملل ونحل'' تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری، اسٹاک ایکسچینج وسودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جب فکر اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جا رہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آ جانے پر یہ شبہ بھی حل ہو جائے کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے، جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ اسے توڑنے والا خود اسلام ہے، جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے۔ اسلام نے اپنے اصول فطرت میں ماننے والوں کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں۔ لیکن اصول فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاجِ نبوّت کے اساسی اصول...... منفی پہلو

1 ...... لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ. ''اسلام بغیر جماعت نہیں' یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسندانہ ہے' انفرادیت پسندانہ نہیں''۔

2 ...... لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ. ''یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی ہے۔ نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے''

3 ......﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر واکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی ومحبت کے ساتھ حجت وبرہان سے حق واضح کر دینے کا ہے۔ ماننا نہ ماننا کلیتہً مخاطب کا اختیاری فعل ہے''۔

4 ...... لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ. ② ''یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے''۔

5 ...... لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ فِي الْاِسْلَامِ. ③ ''یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لینا اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے کہ امور واقعیہ ہی

---

① پارہ: ۳، البقرۃ: ۲۵۶.

② السنن للامام الدارقطني، باب في المرأة تقتل اذا ارتدت، ج: ۴ ص: ۲۲۷ رقم: ۸۳.

③ الصحيح لمسلم، كتاب السلام، باب لاعدوى ولاطيرة، ج: ۴ ص: ۱۷۴۳ رقم: ۲۲۲۰.

اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پذیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہمانی خطرات و وساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث کا ان سے تعلق ہو''۔

6 ...... انالا نولی هذا من سأله ولا من حرص علیه. ① ''یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے۔ گویا عامۂ عہدوں کی طلب خود غرضی کی دلیل ہوتی ہے اور خود غرض انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادۃً قاصر رہتا ہے''۔

7 ...... ﴿لا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّاوُسْعَهَا﴾ ② ''یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بوجھ رکھنا اس کے نزدیک ظلم ہے''۔

8 ...... لَیْسَ مِنَّامَنْ غَشَّنَا ③ ''یعنی اسلام کا مزاج گندم نمائی جو فروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر دغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے''۔

9 ......﴿وَمَآ اَنَامِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ﴾ ④ ''یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمائش پسندی کا نہیں، بلکہ سادگی سچائی اور ظاہر و باطن کی یکسانی کا ہے''۔

10 ......﴿ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِه﴾ ⑤ ''یعنی اسلام کا مزاج شخصیات مقدسہ کے نام پر تعصب، تنگی، حد بندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے''۔

11 ......﴿لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ ⑥ ''یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوت یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہمت مردانہ دکھلانے کا ہے''۔

12 ......﴿لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ ⑦ ''یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آ جائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید بھروسہ اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات و استقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے مایوسی اس کے نزدیک

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب مایکره من الحرص علی الامارة ج:٢٢ ص:٦٠ رقم:٦٦١٦.

② پارہ:٣ سورة البقرة، الآیة: ٢٨٦.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غشنا ...... ج: ١ ص: ٩٩ رقم: ١٠١.

④ پارہ: ٢٣، سورة ص، الآیة: ٨٦.

⑤ پارہ: ٣، سورة البقرة، الآیة: ٢٨٥.

⑥ پارہ: ٤، سورة آل عمران، الآیة: ١٣٩.

⑦ پارہ: ١٣، سورة یوسف، الآیة: ٨٧.

کفر کا شعبہ ہے''۔

13 ......﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے''۔

14 ......لَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ ② ''یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو، مبالغہ اور تحمل بیجا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹا دے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے۔ توسط واقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے''۔

15 ......﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ③ ''یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلاف عدل اور خلاف تقویٰ ہے''۔

16 ......﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ ④ ''یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اسی کی سعی کام دے گی، دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تاکہ آدمی دوسروں پر تکیہ کر کے معطل نہ ہو بیٹھے ہمت سے خود آگے بڑھے''۔

مثبت پہلو...... یہی صورت اسلام کے اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے، جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے مثلاً

1 ......﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾ ⑤ ''یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی، حجت طلبی اور تحقیق حال کا ہے جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں''

2 ......﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَّاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ ⑥ ''یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے۔ لڑائی جھگڑا شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جود وکرم کا ہے۔ بخل، تنگی اور جز رسی کا نہیں''۔

3 ......﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ⑦ ''یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندانہ نہیں بلکہ کریمانہ اور مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا ہے۔ اس کو اس نے اولوالعزمی کہا ہے''۔

4 ......﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ⑧ ''یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور ملنساری کا ہے اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں''۔

5 ......''اِنَّ النَّاسَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ۔'' ''یعنی اسلام کا مزاج عام بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۸.
② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر ج: ۱ ص: ۲۹ رقم: ۳۸.
③ پارہ: ۶، سورۃ المآئدۃ، الآیۃ: ۸.
④ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹.
⑤ پارہ: ۹ سورۃ الانفال، الآیۃ: ۴۲.
⑥ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۸.
⑦ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷.
⑧ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۰.

طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو۔ غلام سازی یا استحصال عوام یا گروہ سازیوں کے ذریعے بھائی کو بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں ہے"۔

6 ...... ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ ① "یعنی اسلام کا مزاج پورے عالم انسانیت کے احترام و تحفظ کا ہے انسانیت کی تحقیر و تذلیل اور لاپرواہی سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں"۔

7 ...... ﴿وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ، وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ ② "یعنی اسلام کا مزاج خلط والتباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضا جوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بین بین راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے"۔

8 ...... ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ③ "یعنی اسلام کا مزاج دائرہ حق (اسلام) میں پورے داخل کرانے یک رخی کے ساتھ دلوں کو سکون واطمینان بخشنے کا ہے۔ ناتمام اور ادھ کچرے کام سے دلوں کو ڈانواں ڈول کر دینے کا نہیں"۔

9 ...... ﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ④ "یعنی اسلام کا مزاج امانت داری اور امانت سپاری کا ہے بد دیانتی خیانت پسندی یا غل فصل کا نہیں"۔

10 ...... ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ⑤ "یعنی اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیام امارت پر امیر کے حق میں سمع و طاعت کا ہے اگر چہ ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے لامرکزیت یا فوضویت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں یہ انتشار پسندی ہے"۔

11 ...... ﴿كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ ⑥ "یعنی اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر ابھارتا ہے تاکہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے"۔

12 ...... ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ ⑦ "یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا"۔

13 ...... ثَلٰثَةٌ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (وَمِنْهُمْ) مُتَّبِعٌ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً جَاهِلِيَّةً. ⑧ "یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٣٢.
② پارہ: ٦، سورۃ النساء، الآیۃ: ١٥٠.
③ پارہ: ٢، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٢٠٨.
④ پارہ: ٥، سورۃ النساء، الآیۃ: ٥٨.
⑤ پارہ: ٣، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٢٨٦.
⑥ پارہ: ٢٧، سورۃ الطور، الآیۃ: ٢١.
⑦ پارہ: ٣، سورۃ النساء، الآیۃ: ١٢٣.
⑧ کنز العمال، ج: ١٦ ص: ٥٨.

جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹا دیا ہے ان کا اعادہ یا نئی پگڈنڈیاں نکالنا اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے''۔

14 ......﴿مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے۔ قانونِ حق میں ایجاد اختراع کرانا نہیں''۔

15 ......''اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ② اور ''اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ.'' ③ ''یعنی اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ عبادۃ ہو خواہ عادۃ، اخروی بنانا ہے، دنیا پر ختم کر دینا نہیں ہے نہ دنیاوی مفادات کو اصل رکھنا ہے، مگر دنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کر کے اس میں سے آخرت نکلوانا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کو کھیتی کہا ہے، پس اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی کرنا بھی ضروری ہے ورنہ پھل نہیں مل سکتا، پس اسلام کے مزاج میں ترکِ دنیا نہیں بلکہ ترکِ محبتِ دنیا ہے اس لئے یہ ساری دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جا سکتی اور انسان آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جا سکتا''۔

خلاصۂ اصول...... بہرحال کتاب و سنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی مرکزیت، امارت، سمع و طاعت، تفویض، عہدہ جات کی نوعیت، عوام کا طرزِ تربیت، اخلاقی بلندی، عملی جوش، معاشرت کا ڈھنگ، دین کی وسعت، خلط و التباس سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات و محدثات سے گریز، اتباعِ رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل و انصاف، خدمتِ خلق، دنیا کا آخرت سے ربط اور آخرت کی مقصودیت وہ امور ہیں جن سے منہاجِ نبوت کا ذوق اور اسلام کا مزاج کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آئیں ورنہ کتاب و سنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تشکیلِ نو میں ان سب کو بہرحال سامنے رکھنا ہے۔

تشکیلِ جدید میں سب سے زیادہ اہم قدم رجالِ کار کا انتخاب...... لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم قدم یا چوتھا قدم رجالِ کار کا انتخاب ہے جو دین کے مبصر اور فقیہانہ شان رکھتے ہوں۔ بحیثیت مجموعی دین کے اصول و فروع ان کے سامنے ہوں۔ اسلام کی حقیقی روح ان کی روحوں میں پیوست ہو اور اسلام کی وہ حکمتِ عملی اگر رجالِ کار ناواقف یا غیر فقیہ۔ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمتِ عملی سے نابلد، روحِ اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکرِ اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہو گی۔ اس لئے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کا ہے، حق تعالیٰ نے جب اس نامکمل دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم و تفکیر کیلئے نہیں بلکہ تربیت کے لئے آتا ہے اور تربیت محض تعلیم یا کتاب کے

---

① پارہ: ۲۸ سورۃ الحشر، الآیۃ: ۷. ② علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیها مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمر مرفوعاً: الدنیا قنطرۃ الآخرۃ فاعبروها ولا تعمروها. دیکھئے: المقاصد الحسنۃ ج: ۱ ص: ۱۱۸.

③ شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس. ج: ۷ ص: ۳۶۰.

نوشتوں سے نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں کرنے والی سامنے نہ ہوں۔ اس لئے دنیا کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ امتوں کی صلاح وفلاح کے لئے محض قانون اتارا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو، کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اس حکمت عملی سے پیش کرسکتی ہے، جو شارع حقیقی حق تعالیٰ شانہ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ اس لئے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لئے منتخب کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر دور میں اس رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اس نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا۔ جو نوعیت اس دور کے ذہن ومزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہوچکی ہے تو انبیاء کا کام اس امت کے مجددوں اور مفکر علماء عرفاء کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کرکے دلوں میں جمائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرینؒ نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں ان لفظوں میں ادا فرمایا کہ: ''اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ.''① ''یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں یہ فکر) ہی تمہارا دین ہے تو دیکھ لو کہ کس شخصیت سے تم دین (یا فکر) اخذ کر رہے ہو''۔

جس سے دین اور دین کے فکر کی بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو تب قلوب کی صحیح رہنمائی کرسکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کی فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب میں کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب وسنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لاکر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن ہی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں اس حال میں کہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق وثواب پر ہوسکتا ہے۔ سب کے سب اس تضاد فکری کے ساتھ محق نہیں کہلائے جاسکتے۔ ظاہر ہے کہ کتاب وسنت کے سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ مبطل ہوسکتا ہے تو یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیح اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے مبطل ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب وسنت اور دینی لٹریچر نہیں۔ بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوق سلف پر تربیت یافتہ شخصیت نہیں، بلکہ کوئی مبطل اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے پس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی سامنے لے آئے گی اور اگر وہی فاسد الفکر ہو تو قرآن وحدیث سے بھی وہ باطل ہی نمایاں کرکے قلوب کو فاسد کردے گی۔ ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی مبطل فرقہ مبطل نہ ہوتا۔ اس لئے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح

① الصحیح لمسلم، المقدمة، باب بیان ان الاسناد من الدین...... ج: ۱ ص: ۱۴ .

الفکر شخصیات ہی کا انتخاب ہے جس سے منہاج نبوت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آجائے اور اس سیدھے سے منہاج پر ہماری فکر استقامت کے ساتھ رواں دواں ہو۔

حرف آخر...... بہر حال فکر اسلامی کی تشکیل تو قابل تبریک ہے جس کا سہرا جامعہ اسلامیہ کے سر ہوگا لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشان فکر متعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوت ہے۔ دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے لئے اس کے اصول وقواعد درکار ہوں گے۔ جس میں قواعد کلیہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں۔ تیسرا قدم اس مزاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملت اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آرہی ہے۔ چوتھا رجال فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور، صاحب فکر ہی سے ہوسکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلت وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی صرف اجمالی فہرست ہی پیش کرسکا تھا۔ جو یقیناً تشنہ تفصیل تھی اور اب مقالہ کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کررہا ہوں تو قلت فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیلی اور مرتب شدہ نہیں ہیں۔ بلکہ کثرت مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آرہی ہیں۔ انہی کو عجلت کے ساتھ جمع کردیا گیا۔ جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہوسکی ہے۔ نہ نظام کلام کی۔ اس لئے اسے ''جُهْدُ الْعَقْلِ دُمُوْعُهٗ'' کے مصداق سمجھنا چاہئے، جو ادائے فرض تو ہے۔ مگر لوازم فرض سے آراستہ نہیں ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام حسن تک پہنچائے اور ملت کے لئے ایک نافع قدم ثابت فرمائے۔ (آمین)

ماخوذ از ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بھارت شمارہ جنوری' فروری' مارچ ۱۹۷۹ء

اسلامی تمدن

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!①

اسلام کے پیش کردہ دوراستے...... بزرگان محترم! اسلام نے دنیا کے سامنے دوراستے پیش کئے ہیں۔ گویا اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک اقترابات، دوسرے ارتفاقات۔

اقترابات کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے جن سے آدمی اللہ کا قرب اورنزدیکی پیدا کرسکے اس کی نزدیکی کی یہ صورت نہیں ہے کہ جیسے ہم آپ کے نزدیک ہوجائیں کہ گز بھر کی بجائے آدھ گز یا آدھ گز کی بجائے بالشت بھر کا فاصلہ رہ جائے۔ اسے نزدیک کہیں گے مگر یہ نزدیک ہونا جسمانی ہے اور اللہ جسم نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہونے کا یہ مطلب ہو کہ ہم دوچار گز سرک جائیں یا دس پانچ میل آگے پہنچ جائیں۔ اس کی نزدیکی کا مطلب یہ ہے ہم اس سے مناسبت اور مضبوط تعلق پیدا کریں۔ اس کے اخلاق سے متخلق ہوں۔ اس کے کمالات سے باکمال بنیں۔ خدائی اوصاف ہمارے اندر نفوذ کریں تاکہ ہمیں خلافت اور نیابت خداوندی کا مقام حاصل ہو۔ اس چیز کا نام اسلام میں اقترابات یعنی قرب خداوندی پیدا کرنے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے عبادات نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ رکھی گئی ہیں۔

دوسری چیز ارتفاقات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی میل جول، لطف و مدارات، تمدن وتعاون اور مدنیت و شہریت کے اصول وطریقے ہمارے سامنے ہوں کہ کس طرح سے ہم دنیا میں زندگی گزاریں۔ دنیا میں جیسے مساجد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، گھر بنانے کی بھی ضرورت ہے، بازار بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سلسلہ ارتفاقات کے شعبے ہیں کہ آپس کا میل جول اور باہمی تمدن وتعاون، یہ ہم کس طرح سے انجام دیں۔ اس کے لئے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیلات اسلام نے پیش کی ہیں۔ بہرحال یہ دوسلسلے ہیں، ایک اقترابات اور ایک ارتفاقات:

اس لئے کہ ایمان کے دوشعبے ہیں۔ ایک اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ اور ایک اَلشَّفْقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ اللہ کے

① ۱۴ جولائی، ۱۹۶۳ء افریقہ۔

اوامر اور بھیجے ہوئے قانون کی عظمت اور اس کی مخلوق پر شفقت و مدارات اور رحم وکرم کرنا یہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ اس لئے علم کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔

علم کی دو قسمیں...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ." علم دو ہیں۔ ایک بدنی زندگی کا علم اور ایک روحانی زندگی کا علم۔ بدنی زندگی کے نیچے یہ تمام شعبے آتے ہیں۔ کھانا، پینا، گھر بنانا، بازار وغیرہ یہ تمام ضروریات۔

اور روحانی زندگی کے نیچے یہ شعبے آتے ہیں کہ کس طرح سے سجدہ کیا جائے، کس طرح اللہ کے سامنے جھکا جائے، کس طرح اس سے مناسبت پیدا کی جائے، تو جس طرح سے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا دین و دیانت درست کریں، اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنی معاشرت و تمدن اور مدنیت کو بھی درست کریں۔

ہر ملت کا ایک مزاج ہے...... لیکن ہر قانون اور ہر ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہودیت ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ نصرانیت ایک ملت ہے، اس کا خاص مذاج ہے۔ اسلام ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ اسلام میں بھی پھر ایک فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے، جس کو حق کہا گیا ہے۔ جتنے فرقے الگ الگ ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مزاج ہے۔ اہل تشیع کا ایک مزاج، سنیوں کا ایک مزاج۔ غرض جس طرح سے ہر ہر طبقے کا مزاج الگ الگ ہے۔ پوری ملت کا مزاج بھی الگ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے مزاج کو باقی رکھ کر ہی اپنے اصولوں پر چل سکتے ہیں، اپنی بنیادیں قائم کر کے ہی اپنی تعمیر اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے دوسروں کی بنیادوں پر تعمیر کھڑی کی، تو دوسرے کو حق ہے کہ وہ کل کو کہہ دے کہ میاں! زمین اور بنیاد میری ہے۔ تم اپنا ملبہ اٹھاؤ اور اپنی تعمیر ختم کرو۔ آپ بے بس ہوں گے، اپنا لگا لگایا سرمایہ آپ کو ختم کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر ذاتی بنیاد پر تعمیر اٹھائی ہے تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ تم ملبہ لے جاؤ، بنیادی میری ہے۔ آپ کہیں گے کہ بنیاد، زمین اور تعمیر بھی ہماری ہے۔ بہرحال ہر ملت کا ایک الگ مزاج ہے جو اس کی تعمیر کی بنیاد ہے۔

دورِ جاہلیت کے تمدن کی بنیاد نفس پرستی پر اور اسلامی تمدن کی بنیاد حق پرستی پر ہے...... آج اس چیز کی ضرورت ہے، جس کے لئے مسلمان دنیا میں آیا کہ اس تمدن کو یہ غالب کرے جس کو اسلام لے کر آیا ہے۔ اس واسطے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے تو دنیا میں دو بڑے بڑے تمدن قائم تھے۔ ایک طرف فارسیوں کا تمدن تھا، جس پر کسریٰ کی حکومت تھی۔ ایک طرف رومیوں کا تمدن تھا، جس پر قیصر کی سلطنت تھی۔ روم میں عیسائیوں کا اقتدار تھا اور فارس میں فارسیوں کا اقتدار تھا۔ ان دونوں ملکوں اور حکومتوں نے تمدن کو انتہاء تک پہنچا دیا تھا۔ تاریخوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم اور آپ اس تمدن کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچے، جتنا ان کا تمدن اونچا ہو چکا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ کوئی امیر اور رئیس اس وقت تک امیر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کم سے کم ایک ایک لاکھ

روپے کا لباس اور زیور اس کے بدن پر نہ ہو۔ پٹکا ہو تو کم سے کم دس ہزار روپے کا۔ اسی طرح دیگر لباس بہرحال مجموعی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک پہنچتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، ہمارا بڑے سے بڑا رئیس اس مقام پر نہیں پہنچ سکا کہ صرف اس کے بدن پر ایک لاکھ روپے کا لباس ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی ساری جائیداد کار کوٹھی لگا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہو۔ مگر یہ کہ بدن پر ایک لاکھ روپیہ لگا ہوا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ اور وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ امیر زادے کے بدن پر ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا ہوتا، تب وہ امیر سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جگہ پانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ یہی حال رومیوں کا تھا اور یہی فارسیوں کا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اگر خالص تمدن مقصود ہوتا تو اس سے بڑا تمدن آج تک نہیں پیدا ہو سکا' جتنا ہو چکا تھا۔ آج کی خصوصیات اپنی جگہ ہیں کہ مشینی تمدن ہے۔ یہ بے شک انہیں میسر نہیں تھا۔ لیکن مشینی حالات کو چھوڑ کر جہاں تک عمارات، غنا اور امیری کا تعلق ہے تو وہ بہت اونچے پہنچے ہوئے تھے۔ یہی چیز مقصود ہوتی تو اسلام اسی کی تائید کر دیتا کہ فارسیوں کا اور رومیوں کا بھی تمدن حق ہے اور مقصود حاصل ہو جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ضرورت نہ پیش آتی کہ جنگیں لڑ لڑ کر اس تمدن کو ختم کر کے اسلامی تمدن کو جگہ دیں۔

اس کی بناء یہ تھی کہ ان تمدنوں کی بنیاد محض نفس کی آرائش پر تھی۔ اسلامی تمدن کی بناء رضاء خدا اور حق پرستی پر ہے، اس لئے دونوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ اسے دنیا میں رائج کیا اور اس کے لئے بڑی بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ اعلیٰ طریق تو یہ ہے کہ تمام مسلمان مل کر زمانے کی ضروریات سامنے رکھ کر، زمانے کے تقاضوں کو قطع نظر کر کے نہیں، بلکہ سامنے رکھ کر دینی طور پر اس تمدن کی بنیاد ڈالیں اور اسے غالب کریں تاکہ دنیا کی قومیں ہمارے سامنے آئیں، جھکیں اور اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

دور حاضر کا تمدن جہاں اسلامی تمدن سے ٹکرائے تو اسلامی تمدن کو ترجیح دینی چاہئے...... رہا یہ کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ تو خوب کہا ہے لسان العصر اکبر الہ آبادی نے، وہ کہتا ہے کہ ؎

کیا ہوا آج جو بدلا ہے زمانے نے تجھے   مرد وہ ہے جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

مردانگی کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ہم جھک کر اپنے عجز کا اعلان کریں بلکہ ہم اپنا کردار اور کیریکٹر پیش کر کے دنیا کے سامنے اس کی خوبی اور برکت پیش کریں تاکہ دنیا ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو اور اس مشن کو لے کر آگے بڑھیں، جس مشن کو آگے بھیجنے اور پہنچانے کا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ سے وعدہ کیا ہے۔

لیکن موجودہ حالات میں یہ ہمارے لئے دشوار ہے۔ ہم خواہ اپنی بدعملی سے یا تکوینی طور پر اس مقام پر آگئے ہیں کہ دنیا کی قوموں کو جھکا نہیں سکتے۔ مگر کم سے کم یہ جذبہ تو سرد نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے تمدن ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی اچھی چیزیں لینے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا میں جب کوئی نیا تمدن آتا ہے، اس کی ایک ہوا ہوتی ہے اور ہوا جب چلتی ہے تو تنہائیوں میں بھی گھستی ہے۔ اس سے آدمی کو مفر نہیں ہو سکتا، اس سے آدمی الگ نہیں رہ سکتا۔

اس سے متاثر ہونا ضروری ہے مگر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کم سے کم ان مواقع کو دیکھیں جہاں اس تمدن کا اسلامی تمدن سے تصادم ہوتا ہے۔ اس میں ہم اپنے کردار اور اپنے مقاصد کو ترجیح دیں۔

دور جدید کے حوادث و واقعات سے اسلام صرف نظر نہیں کرتا...... جیسے مثلاً فرض کیجئے آپ تجارت کر رہے ہیں اور تجارت کے سلسلے میں مالی تمدنی مشکلات بھی پیش آ رہی ہیں۔ ان مشکلات کو آپ زیادہ سمجھتے ہیں۔ کچھ سنی سنائی ہمارے بھی سامنے ہیں۔ یقیناً مشکلات کا وقت ہے۔ لیکن جہاں ایسی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جو مشکلات کا باعث ہیں۔ انہی مشکلات میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جو ان کا بدل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان چیزوں کو اختیار کر کے آپ کو غور کرنا ہوگا کہ کس حد تک یہ چیزیں اسلام سے موافقت کرتی ہیں اور کتنی مخالفت کرتی ہیں۔ پھر مخالف چیزوں میں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ کس حد تک اسلام گنجائش دیتا ہے اور کس حد تک نہیں دیتا۔ میرا یقین ہے کہ کیسا ہی تمدن اور کیسا ہی زمانہ آ جائے، جو حوادث و واقعات پیش آتے ہیں، اسلام نے نہ پہلے کبھی ان سے قطع نظر کیا، نہ آج کرتا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ ان کی رعایت کی جاتی ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر اسلام ایسی گنجائشیں دیتا ہے کہ قوم کا مفاد ختم نہ ہو۔ کچھ تھوڑا تغیر کر دیا۔ کچھ تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ بعض چیزوں کو بعینہٖ قبول کر لیا۔ کچھ تغیر کچھ ترمیم کچھ خلاف کچھ قبولیت یہ مل کر کام چل سکتا ہے۔ ہمیں دنیا سے بہر حال الگ ہونا نہیں ہے۔

بعض چیزوں میں تھوڑا سا فرق پڑتا ہے ذرا سا طریقہ بدل دیں، فائدہ وہی کا وہی رہے گا۔ چیز بھی ضائع نہیں جائے گی اور حد جواز میں آ جائے گی ایسی صورتوں میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ ایک ممنوع اور گناہ میں مبتلا ہو کر رہیں۔ جب کہ ایسا طریقہ بھی ممکن تھا کہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ جاتا اور ہم کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں بھی مبتلا نہ ہوں۔

ہمارے ہاں میرٹھ میں حاجی عبدالغنی صاحب ایک تاجر تھے بڑے صالح اور نیک آدمی تھے۔ ان کے ہاں ٹوپیوں کی تجارت ہوتی تھی۔ ان سے دارالعلوم کے ایک فاضل نے فرمائش کی کہ مجھے دو ٹوپیاں بنا دی جائیں جو خالص زری کی ہوں اور کام اتنا گھٹا ہوا ہو کہ کپڑا نظر نہ پڑے۔ بس چاندی چاندی کا کام نظر پڑے کپڑا بالکل چھپ جائے۔

یہ اگلے دن پہنچے، انہوں نے کہا کہ ٹوپیوں کی تیس روپے قیمت ہے۔ پندرہ روپے کی ایک ٹوپی ہے۔ انہوں نے دیکھا تو ٹوپیاں بہت اعلیٰ اور ان کی مرضی کے مطابق بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا دام کل کو بھجوا دوں گا۔ حاجی صاحب نے کہا کہ: بے اعتمادی کی بات نہیں ہے۔ چاہے ایک مہینے کے بعد بھجوا دیں مگر آپ کے لئے یہ جائز بھی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس میں ناجائز ہونے کی کیا بات ہے؟ کیا ادھار نہیں لیا جا سکتا؟

انہوں نے کہا کہ اس ٹوپی میں کپڑا بالکل نظر نہیں آتا۔ اسے مورق کہتے ہیں اور مورق کام کپڑے پر ہو تو وہ چاندی کے حکم میں بن جاتا ہے اور چاندی کی بیع و شرا میں ادھار جائز نہیں ہے۔

اب یہ بے چارے چپکے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں فاضل دیوبند ہو کر بھی نہیں جانتا اور تم دوکان پر بیٹھ کر بھی

اتنے باریک مسائل جانتے ہو۔مگر بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی تو کہا کہ اچھا یہ معاملہ ختم میں پرسوں دام لے کر آؤں گا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ: میں ایسی ترکیب نہ بتلاؤں کہ ادھار بھی ہو جائے، جائز بھی ہو جائے۔انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ تیس روپے میرے سے قرض لے لو اور یہ ٹوپیاں نقد خرید لو۔ بعد میں قرض ادا کر دینا۔ اب یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ خیر ان کو بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے بہت بہت ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں اس بات کو نہیں سمجھا تھا۔

بات وہی ہوئی کہ خریداری بھی ہوئی، ادھار بھی ہو گیا، مگر ذرا سے رد و بدل سے بات حد جواز میں آ گئی۔ غرض بہت سے مسائل خواہ بینکنگ یا لاٹری سسٹم ہو یا انشورنس کا ہو۔ جہاں ان میں کچھ ناجائز چیزیں نکلیں گی، ایسی گنجائشیں بھی پیدا ہوں گی کہ اگر ذرا سا رد و بدل کر لیا جائے تو فائدہ تو ہاتھ سے نہ جائے اور چیز حد جواز میں آ جائے اور ممنوع نہ رہے کہ جس سے آدمی گنہگار کہلائے اور کسی برائی کا مرتکب نہ ٹھہرے۔

دور حاضر کے پیش آمدہ واقعات میں مفتی اور صاحب واقعہ مل کر اعتدال کی راہ نکال سکتے ہیں

......مگر اس کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام آدمی کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے اور جو فتویٰ دینے والا مفتی ہے اس کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے کوئی سرسری چیز نہیں ہے اگر آپ کوئی چیز اجمالاً پوچھیں گے تو فتویٰ اور ہوگا، تفصیل سے واقعات سامنے رکھ کر پوچھیں گے تو حکم اور ہوگا۔اگر آپ مجھ سے یوں پوچھیں کہ ہم تجارت کر رہے ہیں۔ اس میں سودی کاروبار ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہوں گا حرام اور ناجائز ہے۔ سود کو اسلام نے حرام کیا ہے۔قرآن میں صاف آیت موجود ہے۔اجمالاً پوچھنے کا تو یہ جواب ہے۔

اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ بینکنگ کا سسٹم جاری ہے۔ بین الاقوامی تجارت ہے' اس لئے سود میں پڑنا ناگزیر ہے۔تجارت کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔تو یا تو یہ فتویٰ دو کہ ہم سب چھوڑ چھاڑ کے جنگل میں جا کر بیٹھ جائیں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں گزر بسر کر لیں۔ دنیا کی قومیں بڑھیں گی ہم ان سے قطع نظر کر لیں گے کہ بھئی! بڑھتی ہیں تو بڑھ جائیں اور کل وہ ہمارے اوپر زیادتی کریں، تو ہم صبر کریں گے، مار کھائیں گے۔

اگر آپ یہ فتویٰ دیں تو ہم تیار ہیں۔اور اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ تمہیں دنیا کی قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے۔عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنا ہے بقدر ضرورت دولت بھی کمانا ہے۔تو پھر اس مصیبت کا کیا علاج ہے؟ کہ اس سسٹم میں بعض چیزیں ناجائز بھی ہیں۔ آپ غور کریں تو مجموعی حالت پر، جب آپ تفصیلی حالات سامنے رکھیں گے اور مفتی ان پر غور کرے گا، پھر حکم دوسرا ہوگا، پھر اس میں کچھ نہ کچھ گنجائشیں نکلیں گی۔ البتہ کچھ ایسی چیزیں بھی نکلیں گی جس میں آپ کو کچھ تغیر کرنا پڑے گا۔ آخر شریعت یا دین کا قانون پبلک کے تابع تو نہیں ہو سکتا کہ جو آپ چاہیں، قانون ادھر ہی کو جھک جائے۔ وہ قانون کیا ہوا، وہ تو موم کی ناک ہو گئی۔ جدھر کو چاہو اسے پھیر دو۔ لوگوں کو ہی قانون کے تابع بننا پڑتا ہے۔

اسلام ابدی بین الاقوامی قانون ہے وہ بین الاقوامی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا......لیکن جب کوئی قانون بین الاقوامی ہوگا، سامنے آئے گا، وہ یہ بھی کہے گا میں ہر زمانے اور ہر ملت کے لئے یکساں قانون ہوں، میرا پیغام دنیا کی ہر قوم کے لئے ہے۔ تو اس قانون کو یہ رعایت بھی کرنی پڑے گی کہ کس قوم کی کیا ذہنیت ہے؟ اس کی کیا نفسیات ہیں؟ اس کا اصول کیا ہے؟ اس کا لین دین اور معاشرت کا کیا اصول ہے؟ اس کی رعایت کرنی پڑے گی۔

اسلام جب ایک جامع اور بین الاقوامی مذہب ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر رعایتیں نہ ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ بین الاقوامی تجارت کی بنیاد ہی اسلام نے ڈالی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کو بین الاقوامی تجارت کی خبر نہیں تھی۔ تجارتیں بے شک بڑی بڑی تھیں۔ لیکن ایک ملک اور ایک شہر میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک ملک سے دوسرے ملک کو اور دوسرے سے تیسرے پھر پوری دنیا کو مال سپلائی۔ اور پوری دنیا سے رقم اور روپیہ آئے اور جائے۔ یہ صورت نہیں تھی نہ ہی اس کے وسائل تھے۔ لیکن اسلام نے بنیاد ڈالی۔

قرآن کریم نے ایک دو نہیں بلکہ چھ سات قسم کے سفر بتلائے۔ تعلیمی سفر، تبلیغی سفر، اخلاقی سفر، تجارتی سفر اور سیاسی سفر وغیرہ۔ ان سفروں کی فضیلتیں بیان کیں اور ان سفروں کی نوعیتیں بیان کیں۔ تو بین الاقوامی مذہب نے بین الاقوامی راستے ڈالے اور چونکہ بین الاقوامی مذہب کو دنیا میں آنا تھا اور بھیجنے والا اللہ، جس کو ماضی اور مستقبل کی بھی اطلاع ہے۔ وہی جانتا تھا کہ بین الاقوامی مذہب اسی دور میں آنا چاہئے، جس میں بین الاقوامی وسائل بھی سامنے ہوں نقل و حرکت کے بین الاقوامی وسائل ہوں، ایک ملک سے دوسرے ملک جانا آسان ہو۔ ایک ملک کی خبر دوسرے ملک میں پہنچانا آسان ہو۔ تو یہ ترتیب تھی کہ چونکہ تمدن بین الاقوامی ہونے والا ہے۔ تو دین بھی بین الاقوامی ہوتا کہ دین بھی دنیا کے سامنے آسکے۔ ایسا بین الاقوامی دین دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کو قطع نظر نہیں کر سکتا۔ ان کی نفسیات کی رعایت کرے گا۔ جب کہ اسلام کے خود اندرونی دائروں کے اندر بھی یہ چیز ہے۔ ہر قرن میں ہر موقع پر مختلف ذہنیتیں پیدا ہوئیں۔ بلکہ ہر سو برس کے بعد قوم کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ جب ایک نسل ختم ہوتی ہے۔ دوسری نسل آتی ہے۔ تو دنیا میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نظریات بدلتے ہیں، جب ایک جنگ ہو کر صلح کا وقت آتا ہے تو بھی نظریات تبدیل ہوتے ہیں، تمدن بدلتا ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی یہ خبر دی کہ ہر سو برس کے بعد ہم مجدد بھیجیں گے جو دین کو نکھاریں گے اور اس کی تجدید کریں گے۔ چونکہ سو ہی برس کے لئے ان ضرورتوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لئے بعد میں آنے والوں کے لئے کل دین کی ان کے، مناسب حال، انہی کے رنگ میں، ان کی زبان میں تشریح کی جائے گی تاکہ وہ دین کو سمجھ سکیں۔

اگر قوم میں تصوف کا غلبہ ہوا تو اسلام نے اپنے کو صوفیانہ رنگ میں سامنے کیا تاکہ صوفی مشن لوگ سمجھ سکیں۔ صوفیانہ انداز میں تفسیریں لکھی گئیں۔ جیسے محی الدین ابن عربیؒ اور امام غزالیؒ ان لوگوں نے تفسیریں لکھیں۔ ایک زمانہ عقل پرستی کا آیا کہ لوگ بغیر عقل کی مدد کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایسے مجدد پیدا ہوئے جنہوں نے

قرآن وحدیث کو عقلی رنگ میں پیش کیا۔امام رازی،شاہ ولی اللہ،امام غزالی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہ کام کیا کہ عقلی اصول پر تفسیریں لکھیں۔قرآنی مسائل کو خالص عقل کے جامے میں سمجھایا۔ایک زمانہ آیا،اس میں طبعیات کا غلبہ تھا۔تو طبعی رنگ میں قرآن وحدیث کو پیش کیا گیا۔قرآن کی یہ جامعیت ہے کہ وہ ایسا حسین چہرہ ہے کہ جیسا لباس پہنادو۔اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے۔جس رنگ کی کوئی قوم یا طبقہ سامنے آتا ہے۔وہ اسی رنگ میں اپنے کو سامنے کرتا ہے۔جیسے اسلام میں یہ جامعیت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کے طبقات اور دنیا کی قوموں کی ذہنیت الگ الگ ہو۔وہ سب کے لئے پیغام بنے اور سب کی نفسیات کی رعایت نہ کرے۔اس میں ایسے جامع اصول موجود ہیں،وہ ضرور رعایت کرے گا۔

ایسی اشیاء جو اپنی ذات سے ممنوع ہیں خاص اوقات میں مشروع ہو جاتی ہیں.....مگر ضرورت اس کی ہے کہ سوال کرنے والے اجمالی سوال نہ کریں۔جن جن معاملات میں وہ مبتلا ہوں ان معاملات کو تفصیل سے واقعاتی رنگ میں پیش کریں۔یوں نہ پوچھیں کہ فلاں چیز جائز ہے یا نہیں۔بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟انشورنش جائز ہے یا نہیں؟اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ناجائز ہے۔اسلام کے اصول کے خلاف ہے۔سود بھی ناجائز انشورنش بھی ناجائز اور بیمہ کرانا بھی ناجائز۔فلاں اور فلاں چیز بھی حرام۔

لیکن جب ان واقعات کی تفصیل پیش کریں گے اور مجموعی پہلو جب سامنے آئیں گے،تو حکم میں گنجائش نکلے گی۔بلاشبہ اسلام میں شراب ناجائز ہے۔خاص حالات میں اسلام کی تفصیلات پیدا ہوتی ہیں۔لیکن یہ حکم تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔چنانچہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا مریض ہو کہ ڈاکٹر کہہ دے کہ یہ اس وقت تک زندہ نہیں بچ سکتا جب تک شراب نہ پئے۔اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ شراب پئے،وہ اپنی جان بچائے۔اسی طرح خنزیر ہے،اسلام میں بالکل نجس العین ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے گوشت پوست ہی نہیں بلکہ اس کا جوہر بھی ناپاک ہے۔یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔لیکن اگر کوئی مر رہا ہو،فاقے کی حالت میں ہو اور کوئی غذا نہ ملتی ہو،تو اسلام اجازت دے گا کہ اسے خنزیر کھلا دو،اسے مردار کا گوشت بھی کھلا دیں گے۔کفر کا کلمہ کہنا اسلام کو ختم کر دیتا ہے۔اسی طرح کوئی شرک کا کلمہ کہے۔لیکن اگر ایک شخص تلوار لے کر مسلم کی گردن پر کھڑا ہو کہ یا کفر کا کلمہ کہہ،ورنہ ابھی تیری گردن قلم کر دوں گا۔اسلام اجازت دیتا ہے کہ دل سے ایمان پر مطمئن رہو،زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دو۔اب کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ صاحب!کفر کا کلمہ جائز ہے یا ناجائز؟ہم کہیں گے بالکل حرام ہے۔آدمی کافر ہو جائے گا۔لیکن اگر یوں کہے میں اصول نہیں پوچھتا،میں تو یہ واقعہ پوچھتا ہوں کہ میرے اوپر ایک شخص تلوار لے کر آیا ہوا ہے،کہ کہہ کفر کا کلمہ ورنہ گردن قلم کر دی جائے گی۔اب یہ حکم ہوگا کہ تیرے لئے جائز ہے،کفر کا کلمہ کہہ دے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ایک شئے اپنی ذات سے بالکل ممنوع ہوتی ہے،لیکن حالات کے سامنے آنے سے اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔یہ صورت خواہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔اسلام میں گنجائشیں نکلتی ہیں۔اسلامی قانون

میں لچک ہے۔ یہ اعتدال کا مذہب ہے۔ افراط وتفریط کا مذہب نہیں ہے۔ ایک درمیانی نکتہ پر ہے جس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت نکلتی ہے۔

اس بناء پر میں عرض کر رہا ہوں کہ مسئلے دو ہی ہیں۔ ایک دیانات کا ہے جس میں عبادات آتی ہیں۔ ایک معاشرت کا ہے جس میں تجارت، معاملات، بیع وشرا، نکاح وطلاق، زمین کی خریداری، ٹھیکہ، کرایہ داری اور محکمہ قضا ومقدمات، فوجداری اور دیوانی عدالت، یہ اس کے نیچے آجاتی ہیں۔ ان سب کے اصول بتلائے گئے ہیں جو معتدل ہیں اور جامع بھی ہیں۔ ہر قوم کے جذبات کو اپیل کر سکتے ہیں، لیکن جب قوم اس کی طرف توجہ کرے یا خود سمجھے اور سیکھے یا پھر سیکھے ہوئے سے پوچھ کر اس پر عمل کرے، مگر شرط یہ ہے کہ تفصیل سے پوچھو۔ تو جس طرح سے استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں صرف اجمالی ذکر نہ کریں تفصیل کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم اپنے مفاد سے بھی محروم نہیں ہوگی اور ناجائز وحرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

مفتی کے سامنے تفصیلی واقعات لانے سے ہی جدید مسائل میں گنجائشیں نکل سکتی ہیں...... اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سوالات کو آپ ہی مرتب کریں اور جوابات کے لئے ہم علماء کی کمیٹی بٹھا دیں گے کہ ان واقعات پر غور کر کے آپ فتویٰ دیں کہ کیا حکم ہے؟ یا تو یہ کہیں کہ قوم تجارت کو چھوڑ دے اور بالکل بین الاقوامی دنیا سے نکل کر جنگلوں میں جا کے بسر کرے۔ لیکن اگر اس کو ایک سچا شہری بننا ہے تو پھر جب اس کی شہریت بدل گئی ہے، اس کے مناسب آپ بھی گنجائشیں نکال کر فتویٰ دیں۔ جتنی اسلام نے گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

زیادہ سے زیادہ مفتی یہ کہے گا کہ: تم مجرم ہو۔ تم ناجائز چیزوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں مجرم کے لئے بھی گنجائشیں دی جاتی ہیں۔ شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جاتا ہے۔

اگر شبہ نکل آئے تو مجرم کی سزا اٹھالی جاتی ہے۔ تو ہم مجرم سہی، مگر ساتھ ہی کچھ شبہات بھی ہیں۔ ان شبہات کا فائدہ بھی ہمیں پہنچے گا۔ گنجائش ہمیں ملے گی۔ مگر واقعات کو پیش کرنے والے کو چاہئے کہ وہ تفصیلی واقعات ذکر کرے۔ اس زمانے میں اجمال اور سرسری بات سے کام نہیں چلتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل نابلد ہیں۔ ہم ان واقعات میں پڑے ہوئے نہیں۔ اب ہمیں کیا خبر کہ انشورنش میں کیا ہوتا ہے اور بیمے کس طرح سے کرائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ نہ تجارت کر رہے ہیں نہ انشورنش آپ حضرات مطلع ہیں، آپ تفصیل سے بتائیں۔

حکم بتلانا ہمارا کام ہے، واقعات بتلانا آپ کا کام ہوگا۔ اگر آپ نے واقعات میں اجمال برتا۔ تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ہم تو یوں کہہ دیں گے کہ تم جو کر رہے ہو وہ حرام ہے۔ لیکن اگر واقعات اچھی طرح سے سامنے آئیں تو پھر جامع فتویٰ آئے گا۔

اس واسطے اس مختصر مجلس میں میں اتنا عرض کرسکتا ہوں۔ حضرات محترم مقررین نے جو کچھ کہا، وہ بیشک ہم تفصیل سے نہیں سمجھے۔ لیکن بالا جمال ایک اندازہ ہوا کہ دین و دنیا ان دونوں کے اندر ہمیں بڑھنا ہے۔ دین کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ اپنی تعلیم اور مدارس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تجارت کو بھی حفاظت کرنی ہے۔ تجارتی لوگ نہ ہوں تو نہ مدارس چلیں، نہ علماء کی کتابیں چھپیں نہ کام ہو۔ تو دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ بہرحال واقعات کو شریعت کے سامنے پیش کر کے حل کیا جائے، اور فتویٰ حاصل کیا جائے۔ تاکہ لوگ بھی مطمئن رہیں کہ ہم کسی ناجائز پر نہیں چل رہے ہیں اور دنیا بھی ہماری چل رہی ہے۔ اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ہم علماء کی ایک جماعت بٹھا دیں گے، جو غور فکر کر کے اس کے بارے میں احکام دے آپ کا کام ہوگا کہ تفصیل سے واقعات ہمارے سامنے رکھیں تاکہ ان پر حکم دیا جاسکے۔

اظہار تشکر...... یہ چند باتیں مجھے گزارش کرنی تھیں اور اخیر میں اپنے بزرگوں اور بھائیوں کا اور مخلصین افریقہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک ناچیز بھائی کی پذیرائی فرمائی۔ اتنی عزت افزائی فرمائی' جس کا میں واقعی مستحق نہیں تھا۔ یہ محض آپ لوگوں کا کرم ہے۔ ہم اس کے شکر گزار بھی ہیں اور دل میں اس کا ایک نقش لے کر جائیں گے۔ یہ زبانی شکریہ نہیں، بلکہ دل معترف ہے اور جہاں جائیں گے دل میں اس کی قدر رہے گی اور اقرار رہے گا۔ اور سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس ماحول میں رہ کر ان حالات کے اندر بھی آپ لوگوں میں دینی جذبہ موجود ہے۔ گویا آپ چاہتے ہیں کہ ہماری نسلوں کے اندر دین و ایمان باقی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر قوم کا کیریکٹر الگ ہوتا ہے۔ ہم اپنے قومی کیریکٹر کی خصوصیات چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ جذبات موجود ہیں تو کام بالکل آسان ہوجائے گا۔ واقعات پیش کریں۔ فتویٰ ان کے اوپر ہوگا اور انشاء اللہ پھر زیادہ دشواری نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑی بہت اس میں آپ کو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ بعض چیزوں میں ہم اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں لوٹا کے پیچھے لانا پڑے گا۔ اسلام نے اتنا زیادہ آگے بڑھنا نہیں بتلایا ہے۔ جیسے رجعت نہیں بتلائی کہ رجعت پسند بن کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ بھی نہیں بتلایا کہ بالکل آگے بڑھ جاؤ۔ اعتدال کے نقطے پر قائم رہو۔

بہرحال یہ چیز قابل قدر ہے اور ہم دعاء کرتے ہیں اور آئندہ بھی دعاء کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی مشکلات کو آسان فرمائے اور سیدھا اور آسان روشن راستہ کھول دے اور آپ کی تجارتوں اور دین میں برکت عطاء فرمائے۔ اس وقت نماز کا بھی وقت ہے۔ یہی چند ضروری کلمات عرض کرنے تھے اور میں شکریہ پر ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

درسِ ختم بخاری

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

ثمراتِ ختمِ بخاری...... بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز طلباء! جہاں تک ختم بخاری کا تعلق تھا، وہ ہو گیا اور اس کا حق بھی ادا ہو گیا آخری حدیث پڑھی گئی اور دعا بھی ہوگئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے اپنی (جامع) بخاری کی نسبت فرمایا: "جَعَلْتُهٗ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً" " میں نے اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے"۔ اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ختم بخاری کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں تو تجربہ بھی شاہد ہے، امت کا عمل بھی ہے کہ وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں، اس لئے عام علماء میں یہ دستور رہا ہے کہ جب بخاری ختم کرنی ہوتی ہے تو مجمع ہو جاتا ہے، اجتماعاً دعاء کر کے ختم کرتے ہیں۔ اب یہ سسٹم اور بڑھ گیا ہے کہ باہر سے بھی لوگ بلائے جانے لگے ہیں، لیکن ہم لوگ طالب علمی کے زمانے میں دیکھتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت اقدس مولانا انور شاہ صاحبؒ جب بخاری ختم کراتے تھے تو باہر سے کسی کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن دار العلوم کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین سب جمع ہو کر ختم بخاری میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے تو دار العلوم کے لوگ اور شہر کے لوگ بھی اطلاع پانے پر آ جاتے ہیں۔ اور دعا میں شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال ختم بخاری پر دعا کا معمول رہا ہے۔ ایک تو درساً درساً ختم ہوا اس وقت تو ختم بخاری ہوتی ہی ہے۔ دعا بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی مہم پیش آ جاتی ہے۔ خدانخواستہ مسلمانوں کو کوئی آفت پیش آ ئی یا کوئی مقصد کسی نے لکھ کر بھیجا اور چند مقاصد جمع ہو گئے، تو اس کے لئے بخاری کا ختم کرائے جانے کا مدارس میں اور دار العلوم میں بھی معمول ہے۔ متعدد مقاصد و درخواستیں جمع ہو جائیں تو ایک دن اساتذہ اور طلباء جمع ہو کر ختم کرتے ہیں اور دعاء مانگتے ہیں اور اس کے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں کہ حق تعالیٰ (دعا) قبول فرماتے ہیں۔

تقدیسِ بخاری...... امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مقدس کو اپنے اور اللہ کے درمیان میں حجت ٹھہرایا،

اور حجت ہونی بھی چاہئے۔ اس لئے کہ جس اعتناء اور جس تقدس کے ساتھ امام بخاریؒ نے اس کتاب کو مدون کیا اس کی نظیر بھی دوسرے محدثین میں نہیں، حرم محترم میں جا کے اس کتاب کی کتابت اور تکمیل کی۔

اور فرماتے ہیں کہ ہر حدیث جب میں لکھتا تھا تو لکھنے سے پہلے غسل کرتا تھا، دو رکعت نفل پڑھتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا کہ: اے اللہ! مجھ میں انشراح پیدا فرما۔ جب شرحِ صدر ہو جاتا تھا۔ تب ایک حدیث میں لکھتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں تقریباً سات ہزار یا کم و بیش حدیثیں ہیں۔ تو چودہ ہزار نفل پڑھ کر امام بخاریؒ نے قلم بند کیا ہے ہر حدیث پر رجوع الی اللہ کیا ہے۔

تو اول تو حدیث خود کلام مقدس، کلام نبوی ہے، پھر مدون کرنے والے امام بخاریؒ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور اس کی تدوین میں حرم محترم میں ہر حدیث پر دو دو رکعت نفل پڑھنا۔ تقدس ہی تقدس جمع ہو گیا پھر بھی اگر حجت نہ بنتی تو اور کیا ہوتا؟ تو وہ حجت بنی اور امت میں یہ تعامل جاری ہے کہ ختم بخاری کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ ختم بخاری کا حق تو ادا ہو گیا۔ حدیث بھی پڑھی گئی۔ دعاء بھی مانگ لی گئی۔ اب آگے زوائد کی بات ہے۔

جہاں تک حدیث کی شرح کا تعلق ہے وہ اساتذہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کیا عرض کروں؟۔ میں تو ان سے بہت زیادہ کم علم ہوں تو وہ بھی حق ادا ہو گیا یا ہو جائے گا کہ جو استاذ بخاری پڑھانے کے متعلق ہیں۔ وہ حدیث کی شرح کر دیں گے اور اگر کسی درجہ میں کوئی شرح کر سکتا تھا۔ تو تین سال ہوئے یہاں آ کے شرح بھی کر دی تھی۔ جب ختم بخاری ہوئی تھی، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ تو حدیث پر تقریر ہو گئی تھی وہ آئندہ کے لئے بھی کافی ہے۔ اس وقت اس مقدس جلسے میں تو صرف اظہار مسرت و مبارک باد مقصود ہے۔

شرفِ اولیت...... کیونکہ جہاں تک انسانوں کا تعامل ہے۔ دو چیزیں خوشی کی اور مبارک باد کے قابل سمجھی گئی ہیں۔ ایک کسی شئے کا آغاز اور ایک اختتام۔ آغاز پر بھی لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور اختتام پر بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں' مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج اس کی انسانیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابتداء ہو رہی ہے۔ اس واسطے خوشی کرتے ہیں۔ کوئی شخص باغ لگاتا ہے تو پہلا درخت نصب کر کے احباب کو بلاتا ہے مٹھائی تقسیم کرتا ہے' اس لئے کہ باغ کا آغاز ہو گیا۔

کوئی شخص دکان کھولتا ہے تو اکثر اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے کہ صاحب! آپ ہی افتتاح کر دیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بہر حال آدمی کا آغاز ہو یا اس کے افعال کا آغاز ایک خوشی کی چیز ہے اور اسی لئے کسی چیز کی اولیت کو شرف سمجھا گیا اور اس کو فضیلت مانا گیا ہے۔ جو شخص بھی کسی کام کی ابتداء کرے وہ ایک تاریخی چیز بن جاتی ہے کہ فلاں کام کا یا فلاں بات کا فلاں نے آغاز کیا ہے تو اولیت ایک شرف ہے۔

نورِ علم...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں اولیات کو ایک خاص

مقام حاصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ.'' ① ''سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا''۔

ظاہر بات ہے کہ نور سے مراد حسی نور نہیں ہے جیسے سورج یا چاند کا نور رہتا ہے یہ نور اس کے سامنے معمولی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہے، وہ نور حقیقت محمدیہ کا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اللہ نے حقیقت محمدیہ پیدا کی اور وہ ہے نور یعنی میرا نور بنایا۔ حسی نور نہیں معنوی نور اور معنوی نوروں میں سب سے زیادہ علم کا نور اکمل ہے، جس طرح سے حسی نور کے چاندنے میں آپ راستہ پالیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یا بری ہے۔ ادھر چلنا چاہئے ادھر نہیں۔ نور آفتاب میں راہ طے کرتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر نور علم ہے جس میں کسی شی کی خوبی اور خرابی کو پہچانا جاتا ہے۔ علم کی روشنی میں جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ چیز مرضی خداوندی اور یہ نامرضی خداوندی ہے۔ یہ اللہ کی پسند اور یہ ناپسند ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کی تمیز سورج کے نور سے نہیں ہوسکتی۔ سورج کا نور شکلیں دکھلادے گا اور علم کا نور حقیقتیں دکھلاتا ہے حقائق کے اندر امتیاز پیدا ہوگا۔ صورت دکھلا دینا یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس لئے آفتاب کا نور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لالٹین، انڈے اور بجلی کا نور ہے۔ اس میں شکلیں، صورتیں، رنگ اور الوان پہچانے جاتے ہیں لیکن علم کا نور وہ ہے جس میں حقائق پہچانے جاتے ہیں: جس کے اندر شریعتیں پہچانی جاتی ہیں۔ شریعتوں کے احکام کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ احکام کی علتیں پہچانی جاتی ہیں۔ علتوں سے احکام نکالے جاتے ہیں اسرار و معارف اور حقائق پہچانے جاتے ہیں تو علم کا نور بہ نسبت آفتاب کے نور کے عظیم نور ہے۔

حقیقت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم)...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور علم ہے یعنی آپ کی حقیقت میں علم گوندھ دیا گیا ہے اس لئے آپ نے فرمایا: ''اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ.'' '' اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کردیئے گئے''۔ تو آپ اعلم البشر ہیں۔ کائنات میں وہ علم نہ ملائکہ کو دیا گیا نہ انسانوں کو جو علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ تو آپ ساری خلائق میں سب سے زیادہ علم والے اور اعلم الخلائق ہیں۔ وہ کیوں ہیں؟

اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ہی علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے۔ اس لئے آپ کی شریعت علم سے لبریز ہے کوئی حکم نہیں جس کے نتیجے میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں جس کے اندر عقل چھپی ہوئی نہ ہو۔ کوئی صورت حکم نہیں جس کے اندر حقائق کی تہ پرتہ جمی ہوئی نہ ہو۔

حرف حرفش راست اندر معنی   معنی در معنی در معنی

ایک ایک حرف کے اندر حقائق کے دریا چھپے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم آپ پر معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ علمی معجزہ

① قال العلامة الكهنوی: وقد اشتهر بين القصاص حديث "اول ما خلق الله نوری" وهو حديث لم يثبت بهذا المعنى وان ورد غيره موافق له فی المعنى.

ہے۔ تو قرآن کریم کی حقیقت علم سے لبریز ہے۔ تو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خود علم سے گوندھی ہوئی ذات ہوئی۔ شریعت وہ دی گئی جو علم سے لبریز ہے۔ شریعت کا کوئی حکم نہیں جس کی حقیقت ولمیّت موجود نہ ہو۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی ارشاد فرمایا: ﴿اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ① ''میں اور میرے ماننے والے دین کے بارے میں بصیرت پر ہیں''۔ یعنی اسلام چند بندھی رسوم کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ حقائق سے لبریز دین ہے جو اس دین کی واقفیت حاصل کرے گا علوم وکمالات سے بھر جائے گا۔ دنیا اور آخرت کے سارے راز اس پر کھلیں گے۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جامع العلوم ہیں۔

کمالات نبوّت کے منتہیٰ...... اور اس لئے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا۔ ختم نبوّت کے معنی قطع نبوّت کے نہیں کہ نبوّت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ ختم نبوّت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ نبوت کے جتنے مراتب اور کمالات ہیں وہ آپ کی ذات پر لا کر جمع کر دیئے گئے۔ اب نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ بعد میں کسی کو نبی بنا کر لایا جائے اور اس کو ظاہر کیا جائے۔ سارے کمالات نبوت علمی ہوں، اخلاقی ہوں عملی ہوں وہ سب آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ ان کی انتہا ہوگئی۔ تو آپ سارے کمالات نبوّت کے منتہی ہیں۔ اخلاق کو دیکھو تو آپ صابر ہی نہیں بلکہ سید الصابرین ہیں، آپ شاکر ہی نہیں۔ بلکہ سید الشاکرین ہیں آپ فقط حیاء والے ہی نہیں بلکہ حیاء والوں کے سردار ہیں اور حیاء کے سارے مراتب آپ میں جمع ہیں۔ غیرت وحمیت اور شجاعت وسخاوت اور جتنے بھی اعلیٰ ترین اخلاق ہیں آپ ان سب کا منتہی ہیں کہ تمام اخلاقی درجات آپ پر لا کر ختم کر دیئے گئے۔ اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ② ''آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں''۔

مراتب اخلاق...... اس لئے کہ اخلاق میں اگر غور کیا جائے تو تین مرتبے نکلتے ہیں۔ ایک خلق حسن، ایک خلق کریم اور ایک خلق عظیم۔ خلق حسن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر کیا گیا، حق تعالیٰ نے فرمایا: ''خَلِيْلِيْ حَسِّنْ خُلُقَكَ وَلَوْمَعَ الْكُفَّارِ.'' ③ ''اے میرے خلیل! حسن اخلاق سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے کیوں نہ ہوں؟''

دوسرا درجہ خلق کریم کا ہے۔ آدمی کا کریم الاخلاق ہونا یہ دوسرا مقام ہے اور تیسرا مقام خلق عظیم کا ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ.'' ④ ''میں مبعوث کیا گیا

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم من اسمہ: محمد ج: ۱۴ ص: ۲۷۲۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ مؤمل بن عبدالرحمٰن الثقفی وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۲۰۔

④ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا۔ ج: ۱۰ ص: ۱۹۲۔

ہوں اس لئے کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں''۔

تعریف اخلاق......تو آپ پر کریمانہ اخلاق، اخلاق حسنہ اور اخلاق عظیم بھی مکمل ہو گئے۔ ان تینوں اخلاق میں کیا فرق ہے؟ خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ جو ادھر سے ہو اس کے برابر ادھر سے ہو۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ایک پیسے کا سلوک کرے تو آپ کا فرض ہے کہ ایک پیسے کے برابر آپ بھی سلوک کریں کہا جائے گا کہ انہوں نے خلق حسن برتا۔ اخلاق حسنہ کا آدمی ہے کہ بدلہ برابر کر دیا۔

اس کے برخلاف اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مار دیا تو آپ کو حق ہے کہ آپ بھی تھپڑ ماریں۔ اگر تھپڑ سے زیادہ مکہ ماریں گے تو کہیں گے بدخلق آدمی ہے۔ اسے برابری کا حق تھا کہ دوسرے نے اس کو تھپڑ مارا، اسے بھی تھپڑ مارنے کا حق تھا۔ تھپڑ کی بجائے مکہ مار دینا بداخلاقی وزیادتی شمار ہوگی۔ اس نے اتنی زیادتی نہیں کی تھی کی جتنی آپ نے کی تو آپ مستحق سزا ہوں گے تو خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ نیکی اور برائی کے اندر برابر آپ بدلہ لیں یہ خلق حسن ہے۔

خلق کریم اس سے اگلا مرتبہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے ساتھ اگر کوئی برائی سے پیش آئے تو آپ بدلہ نہ لیں، بلکہ معاف کر دیں، درگزر کریں یہ خلق کریم ہے۔ اگر بدلہ لے لیا تو خلق حسن ہے بشرطیکہ برابر سرابر بدلہ ہوا اور اگر برائی کو معاف کر دیا یا ایک روپے کے بدلہ میں دو روپے دے دیئے ورنہ ایک روپیہ کا بدلہ ایک روپے سے دے سکتا تھا۔ تو کہیں گے خلق کریم کا برتاؤ کیا۔ یہ آدمی کریم النفس ہے بہر حال مساوات سے آگے بڑھ کر کچھ کام کرے وہ خلق کریم کہلائے گا۔

اور تیسرا درجہ خلق عظیم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ برائی کی تو نہ صرف یہ کہ آپ نے بدلہ نہ لیا نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ اوپر سے برائی کرنیوالے کے ساتھ احسان بھی کیا۔ یہ خلق عظیم ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم......جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی۔ فرمایا گیا ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِينَ﴾ ① اس سے زیادہ فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ② وہ جو اللہ نے آپ میں کوٹ کوٹ کر رحمت بھر دی ہے۔ اس کی وجہ سے آپ رقیق القلب ہیں، قلب مبارک نہایت نرم ہے۔ ذرا سی مصیبت کسی کی دیکھی اور پگھل جاتا ہے۔ قلب رحمت سے بھرا ہوا ہے۔ ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ③ اگر آپ سخت دل ہوتے، یہ جو آپ کے اردگرد پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں۔ یہ اٹھ اٹھ کر بھاگ جاتے۔ سب آپ کے اخلاق نے انہیں جذب کر رکھا ہے۔ آپؐ کے اخلاق کیا ہیں؟

پہلا درجہ فرمایا گیا ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ④ یہ نہیں کہا گیا کہ برابر سرابر بدلہ لے لیں۔ اگر کوئی برائی کرے تو

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔
③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔ ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

معافی اور ایثار سے کام لیں۔ آپ معاف کر دیں، بدلہ لینے کا تصور نہ کریں۔ بدلہ لینے سے آپ کی ذات بہت بالاتر ہے۔ اگر چہ برابر کا بدلہ لینا وہ بھی خلقِ حسن ہے مگر آپ کے اخلاق اس سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ کا ابتدائی خلق یہ ہے کہ جب کوئی برائی کرے تو آپ تو معاف کر دیں۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ① اس برائی کرنیوالے کے لئے دعاء مغفرت بھی کریں یہ ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ دوسرا گالیاں دے رہا ہے اور آپ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ② آپ ان سے مشورہ لیں یہ اس سے بھی اونچا مقام ہے۔ اس مجموعہ کا نام خلق عظیم ہے۔ تو خلق عظیم میں خلق حسن اور خلق کریم بھی درج ہے۔

درجاتِ تربیت...... انبیاء علیہم السلام جامع الاخلاق ہوتے ہیں لیکن تربیت کرنے میں انبیاء علیہم السلام کے درجات ہیں ان درجات میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاں خلق حسن کا درجہ ہے۔ جس پر انہوں نے اپنی امت کو تربیت دی کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے، تمہارا فرض ہے کہ تم برائی کا بدلہ لو۔ موسوی شریعت کے اندر معاف کرنا جائز نہیں تھا۔

فرمایا گیا ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ......﴾ ③ ہم نے اہل تورات پر لازم کر دیا تھا کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو معاف کرنا جائز نہیں۔ بدلہ لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی دانت توڑے، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دانت توڑ دو۔ کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑ دو۔ کوئی تھپڑ مارے، تم بھی تھپڑ مارو۔ بدلہ لینا واجب ہے عفو کرنا جائز نہیں۔ یہ موسوی شریعت ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو خلق حسن پر تربیت دی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، انہوں نے خلق کریم پر تربیت دی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی برائی کرے تو بدلہ لینا جائز نہیں۔ معاف کرنا واجب ہے۔ تو وہاں تشدد غالب ہے۔ یہاں تساہل غالب ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ اگر کوئی تمہارے بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھائی ایک اور مارتا جا خدا بھلا کرے۔

یہ نہیں کہ بدلہ لو۔ بدلہ لینا جائز نہیں، معاف کرنا واجب ہے جھک کر تواضع سے رہنا ضروری ہے۔ اسی میں تمہارے نفس کے لئے انکسار ہے۔ اسی میں اولیت واولویت ہے تو یہاں خلق کریم پر تربیت دی گئی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خلق عظیم پر تربیت دی ہے کہ کوئی برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلا کرو۔ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ ④ "دوسروں کی برائی کا بدلہ اپنی بھلائی سے دو۔ وہ گالیاں دے تم دعائیں دو"۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ جہاز میں سوار تھے اور حج کے لئے جا رہے تھے۔ لوگوں نے انکے مقام کو نہ پہچانا کسی نے برا کہا، کسی نے گالی دی، کسی نے کچھ اور کہا وہ گالیاں دے رہے ہیں اور جنیدؒ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ان کو ہدایت دے اور انہیں وہی مقام دے جو تو نے مجھے دیا ہے تو وہ برائی کے درپے ہیں یہ ان کی بھلائی

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔
③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۵۔ ④ پارہ: ۲۴، سورۃ الفصلت، الآیۃ: ۳۴۔

کے درپے ہیں۔اس شان سے امت محمدیہ کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ ان کے اندر خُلقِ عظیم آئے۔

شرفِ خاتمیت ...... عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ: اخلاق کے تین مراتب ہیں۔اعلیٰ ترین مرتبہ خُلقِ عظیم ہے۔ اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں۔وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تو آپ جامع الاخلاق اور جامع الکمالات ہیں۔علم بھی آپ کو اگلوں اور پچھلوں کا دیا گیا۔تو آپ جامع العلوم بھی ہیں۔احوال سابقہ سارے آپ کے اوپر طاری ہوئے تو آپؐ جامع الاحوال بھی ہوئے۔اس لئے آپ کو خاتم بنایا گیا کہ آپ کمالاتِ علم، کمالاتِ عمل اور کمالاتِ اخلاق کے منتہی ہیں۔گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کمالات سے بھرپور ہے۔اس کو آپ نے فرمایا: ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ.'' سب سے پہلے میری حقیقت پیدا کی گئی۔وہ حقیقت علم اور کمالات سے گوندھی ہوئی ہے۔مگر عرض یہ کرنا تھا کہ مناقب میں اولیت کا ذکر کیا گیا۔اگر یہی چیزیں بعد میں پیدا کر دیتے کسی اور کو پہلے لا کر تو کمالات کے جامع جب بھی آپ ہی ہوتے مگر وہ جو اول ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ نہ ملتا۔تو اولیت بھی عطاء کی گئی۔تو ایک طرف تو خاتمیت عطاء کی گئی کہ آپؐ سب سے اخیر میں ہیں اور ایک طرف اولیت عطاء کی گئی۔

تو آپؐ ان کمالات میں جو اللہ نے عطاء کئے ہیں اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔رجوع آپ ہی کی طرف ہوگا۔ تو اولیت ایک عظیم فضیلت ہے۔یا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ مِنْهُ الْقَبْرُ.'' ① ''سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اور بعد میں سب کو اٹھاؤں گا''۔ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اٹھائیں گے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو جنت البقیع میں مدفون ہیں انہیں اٹھاؤں گا۔اس کے بعد مکہ کی طرف جنت المعلیٰ ہے۔وہاں کے قبرستان سے لوگ اٹھیں گے اور سب میرے ساتھ ہوں گے تو قبر سے اٹھنے میں آپ کی اولیت ثابت ہے۔

''اَنَا اَوَّلُ مَنْ يُّفْتَحُ بَابَ الْجَنَّةِ'' ② ''سب سے پہلے میں ہوں گا جو جنت کا دروازہ کھولوں گا''۔اس واسطے وہاں بھی آپ ہی کو اولیت حاصل ہے۔''وَاَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا'' ③ ''قیامت کے دن سب سے پہلے میں قائد ہوں گا''۔میری قیادت میں دنیا کی امتیں چلیں گی، میں ہی شفاعت کبریٰ کروں گا، سب امتیں میرے جھنڈے کے نیچے آئیں گی۔تو دنیا و آخرت کی جتنی بھی اولیتیں ہیں، وہ سب آپؐ کے لئے ثابت ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اولیت ایک عظیم شرف ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر چیز کی اولیت پر اور ابتداء و آغاز پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔

تکمیل پر مسرت ...... اسی طرح سے دوسرا مقام اختتام کا ہے کہ اس پر خوشی منائی جاتی ہے۔جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو خوشی مناتے ہیں کہ آج پوری ہوگئی۔بچہ اگر تعلیم سے فارغ ہو کر سند حاصل کرے، آپ دعوت کرتے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الخصومات، باب مایذکر فی الاشخاص...... ج:۲ ص:۸۵۰ رقم:۲۲۸۱.

② مسند ابی یعلی الموصلی، شھر بن حوشب عن ابی ھریرۃؓ ج:۱۳ ص:۳۹۶.

③ السنن للامام الدارمی، باب مااعطی النبی ﷺ من الفضل، ج:۱ ص:۴۰.

ہیں کہ بچہ فارغ ہوگیا۔ یعنی اس کا علم حد انتہام کو پہنچ گیا۔ جو تدریس کا سلسلہ تھا، اس میں آخری مرتبے پر آ گیا۔ تو انتہاء کی بھی خوشی کرتے ہیں۔

آپ کہیں گے، بچے کی پیدائش پر خوشی کرنا صحیح ہے لیکن اس کا تقاضا یہ ہے جس دن اس کا انتقال ہو، اس دن بھی خوشیاں منائی جاتیں حالانکہ اس دن روتے ہیں خوشیاں کوئی بھی نہیں مناتا۔ اس قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ جب ابتداء میں خوشی کی گئی تو انتہاء میں بھی خوشی کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ: انتہاء میں بھی آپ خوشی کرتے ہیں۔ موت پر بھی کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اچھی موت ہو بعض اوقات کہا کرتے ہیں کہ: بھئی بڑا اچھا آدمی تھا، خدا ایسی موت ہر ایک کو نصیب کرے۔ مرنا تو تھا ہی، مگر ایسی موت نصیب ہوئی، بڑی خوشی کی بات ہے، بڑی فرحت کی بات ہے۔ کوئی جام شہادت پی لے تو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! موت تو اپنے وقت پر آتی ہے لیکن شہید ہو کر مرا ہے۔ کتنی خوشی کا مقام ہے۔

موت کی خوشی ...... اور ویسے بھی مرنے کے معنی اللہ سے مل جانے کے ہیں۔ تو کیا اللہ سے مل جانا کوئی غم کی چیز ہے کہ اس میں آدمی رنج کرے کہ ہائے فلاں آدمی خدا سے کیوں مل گیا؟ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ.'' ① ''یا اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے، جو میرے رسول ہونے کا قائل ہے''

کیوں محبت ڈال دے؟ کیوں موت محبوب بنائی گئی؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ: ''اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ.'' ② ''موت ایک پل ہے جس سے آدمی گزر کر محبوب حقیقی سے جاملتا ہے۔ اپنے پروردگار سے جاملتا ہے''۔ تو موت درحقیقت بندے کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ یہ نہیں کہ بندہ تو خدا سے مل رہا ہے اور آپ بیٹھ کر رنج کریں؟ اور آہ و فغاں کریں؟ بلکہ حقیقت میں موت بھی خوشی کی چیز ہے پھر بھی جو غم کرتے ہیں۔ وہ غم موت کا نہیں، جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں عزیز جدا ہوگیا۔ اس پر غم نہیں کہ مر کیوں گیا؟ اللہ سے کیوں مل گیا؟ بلکہ ایک نعمت ہم سے چھنی اصل میں اس کا غم ہوتا ہے۔ یہ غم اس کی موت پر نہیں ہوتا۔ یہ غم فراق کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں آدمی چھن گیا۔

تو غم حقیقت میں جدائی کا کرتے ہیں۔ موت کا غم نہیں ہوتا، نہ اس کا غم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے کیوں مل گیا؟۔ لہٰذا موت بھی ایک خوشی کی چیز ہے۔ اور اہل اللہ کے ہاں تو اس سے زیادہ فرحت کی چیز ہی کوئی نہیں۔

ابن الفارض کہتے ہیں ؎

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج:٣ ص:٢١٨. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الطبراني وفيه محمد بن اسماعيل بن عياش وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:١٠ ص:٣٠٩.

② یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے دیکھئے: فيض القدير، ج:٣ ص:٢٣٣.

خرم آن روز کزیں منزل ویراں برویم　　　　تا در میکدہ شاداں و غزل خواں برویم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے دیار کو چھوڑیں گے۔ اور اپنے محبوب حقیقی سے جا کے ملیں گے۔

شوق ملاقات محبوب...... حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جب وفات کا وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے اور چہرے پر ایسی خوشی کہ عمر بھر اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ لوگوں نے عرض کیا: ''موت کی تو تکلیف گزر رہی ہے اور چہرہ آپ کا دمک رہا ہے۔ خوشی سے نورانیت برس رہی ہے'' فرمایا: ''غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ.'' بس ''اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی''۔ اس لگن میں مطمئن ہوں۔ تو موت کی خوشی کوئی ان اہل حقیقت سے پوچھے کہ اس گندے عالم کو چھوڑ کر پاکیزہ عالم میں جا رہے ہیں یہاں کے دوستوں کو چھوڑ کر جن کی دوستی مشکوک ہے، ان دوستوں میں جا رہے ہیں جن کی دوستی میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

منصورؒ اکثر قبرستان میں رہتے۔ لوگ کہتے کہ شہروں کو چھوڑ کر قبرستانوں میں کیوں جاتے ہو؟ تو کہتے کہ میں اس قوم کے پاس رہتا ہوں جو نہ غیبت کرتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے نہ چغلی کھاتی ہے نہ بدخواہی کرتی ہے۔ مرنے کے بعد آدمی کی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اس کی جتنی نیکیاں ہیں وہ ابھر جاتی ہیں۔ اس لئے آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے ملے تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا مقام ہے؟ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت بھی خوشی کی چیز ہے اور آپ بھی درحقیقت خوش ہی ہوتے ہیں مگر اس کے اوپر جدائی کا غم چونکہ غالب ہو جاتا ہے تو وہ خوشی دب جاتی ہے۔ اگر جدائی کی غمی نہ ہوا کرتی تو شاید لوگ میت پر شادیانے بجایا کرتے کہ بڑا اچھا ہوا اللہ سے جا ملا۔ مگر اس خوشی کے اوپر جدائی کا غم غالب آ جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ خوشی کی دو چیزیں ہیں۔ ایک آغاز اور ایک اختتام۔

اصل خوشی...... آغاز میں توقع پر خوشی ہوتی ہے۔ ابتداء آدمی توقع باندھتا ہے کہ آج میں نے بچے کو پڑھنے کے لئے بٹھایا ہے۔ امید ہے کہ آٹھ برس میں عالم بن جائے گا۔ اس توقع پر خوشی مناتے ہیں یہ نہیں کہ آج کوئی خوشی میسر آ رہی ہے۔ اگر باغ لگاتے ہیں اس کی ابتداء میں خوشی کریں تو توقع کی خوشی ہوتی ہے کہ اب چند دن کے بعد پھل دے گا اور ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ غرض ابتداء کی خوشی محض توقع پر مبنی ہوتی ہے واقع پر مبنی نہیں ہوتی۔ لیکن انتہاء کی خوشی واقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ شی تکمیل کو پہنچ گئی۔ ختم ہونے کا یہاں یہ مطلب ہے کہ دلوں کے اندر مکمل ہو گئی۔ ساری احادیث کو عبور کر کے آج اس درجے پر آ گئے کہ ہم سات ہزار احادیث کے عالم بن گئے۔ بقدر استعداد ہم نے علم حاصل کر لیا۔ وہ ہمارے اندر مجتمع ہے۔ تو اختتام کے وقت جو خوشی ہوتی ہے۔ وہ تکمیل شے پر اور ابتداء میں محض توقعات پر خوشی ہوتی ہے۔ کسی شے کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے اصل خوشی اختتام کی ہے۔ تو آج خوشی کا دن ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔

قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ..... غور یہ کرنا ہے کہ آخر ختم پر ہم نے کیوں خوشی منائی؟ آپ کو بخاری

پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ ایک متن حدیث اور اس کی مرادات جو آپ کے اساتذہ نے آپ کو سمجھائیں۔ کتاب الایمان اور اس کی احادیث کے یہ مطالب و مرادات ہیں۔ کتاب العلم اور اس کی احادیث کے یہ مطالب ہیں۔ یہ مفہوم شرعی ہے۔ کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الحج اور پھر آگے معاملات اور کتاب الاجتہاد اور غزوات، ان تمام چیزوں میں دو ہی باتیں ہیں۔ ایک متن حدیث وہ آپ تک پہنچا اور آپ نے اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھ لیا اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔

آپ نے کہا مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی۔ اسے اس کے استاد سے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا۔ گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہوگیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آگئے۔ تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہوگئی اور آپ مستند عالم ہوگئے۔

ضرورت سند...... اور محض عالم ہونا کافی نہیں، مستند عالم ہونا ضروری ہے۔ جس عالم کا بلا انقطاع سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو جائے، وہی عالم ہے۔ اگر آپ دیکھیں اس سے سلسلہ ہی قطع ہوگیا۔ نہ اس نے کسی استاد سے تعلیم پائی نہ سند حاصل کی، نہ تربیت حاصل کی اور پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے تو وہ قوت مطالعہ سے کہہ رہا ہے۔ اپنے نفس کو امام بنا کے کہہ رہا ہے کہ جو میرے نفس نے سمجھ لیا وہ میں کہہ رہا ہوں۔ ظاہر بات ہے وہ مراد ربانی نہیں ہو سکتی مراد نبوی نہیں ہو سکتی۔ اس کے نفس کی مراد ہو سکتی ہے۔

اس لئے کہ لفظ اللہ و رسول کے لئے، اور معانی اپنے ڈال دیئے لفظ منقول لئے اور معنی غیر منقول لئے وہ معانی ہمیں مطلوب نہیں جو سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو کر ہم تک نہ پہنچیں۔

مسلسلات...... محدثین نے تو سند کا یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف لفظ اور معانی ہی کو نقل کیا بلکہ ان ہیئتوں کو بھی نقل کیا ہے جو حدیث کے پڑھنے اور سننے میں ان کے سامنے آئیں، استاذ کی حالت و کیفیت کو بھی سند کے ساتھ نقل کیا۔ چنانچہ مسلسلات کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے ''الدر الثمین'' مستقل رسالہ لکھا اس میں فقط الفاظ و معانی کی ہی نقل و روایت نہیں بلکہ ہیئتوں کی بھی ہے۔ ان افعال کی بھی سند جو افعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلائے جیسے کہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ كَفَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ① ''میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مصافحہ کیا اور اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی''۔ اور کہتے ہیں ''فَمَا مَسَسْتُ خَزًّا وَّلَا حَرِيْرًا أَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.'' ''میں نے جب اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی تو میں نے کوئی ریشم اور ملائم سے ملائم کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی

① الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب مايذكر من صوم النبي صلى الله عليه وسلم وافطاره ج:٧ ص:٨٣۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک نرم تھی، تو میں نے اس کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا"۔

تابعی کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھوں تاکہ اس سلسلہ سے بالواسطہ میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی جائے، ان تابعی سے تبع تابعی بھی کہتے کہ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں آپ سے مصافحہ کروں تاکہ دو واسطوں سے میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک پر رکھی جائے، اسطرح یہ حدیث چلی۔

عالی سند...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ کو فرمایا کہ: اس وقت میری سند اپنی جماعت میں سب سے عالی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مجھ میں کم واسطے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی سند دوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سہارن پور آ کر حدیث کی اجازت لو۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی بھول بھال گئے۔ ایک برس گزر گیا۔ اتفاق سے میں ایک سفر میں ساتھ ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تو آیا نہیں؟ میں تجھے حدیث کی اجازت دیتا۔ میں نادم ہوا۔ میں نے کہا حضرت! اب حاضر ہوں گا۔ پھر ایک برس گزر گیا۔ وہ بھی لڑکپن کی بات تھی گزر گئی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب فکر ہوئی کہ پھر یہ دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تو میں نے سہارن پور کا سفر کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے کہا: حضرت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ بہت خوش ہوئے مولانا زکریا صاحب سے فرمایا: مظاہر العلوم کے کتب خانہ میں جتنی حدیث کی متداول کتابیں ہیں سب لے آؤ۔ تو وہ معاجم مسانید اور صحاح ستہ لے آئے۔ ساری کتابیں جمع ہو گئیں۔ ہر ہر کتاب کا اول پڑھ کر حضرت نے مجھے حدیث کی اجازت دی۔ کچھ مجھ سے پڑھوایا، بعض کتابوں کی نقل کرنے کی اجازت دی۔

اس کے بعد فرمایا بھائی! مسلسلات کی اجازت بھی دے دوں گا۔ تو یہ جو مسلسل بالمصافحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کی اجازت مصافحہ کر کے اور میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ کر دی۔ مصافحہ کیا اور حدیث نقل کی کہ یہ مصافحہ بھی مسلسل سند کے ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ ان واسطوں سے گویا تیری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسری حدیث "حدیث مسلسل بالماء والتمر" کی بھی عملاً اجازت دی۔ یہ حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کھجور کی ضیافت کی اور اس کے بعد آپ نے کھجور کھائی اور کھا کر الش حضرت علیؓ کو کھلایا اور پانی پیا اور پانی حضرت علیؓ کو پلایا۔ گویا کھجور اور پانی کی دعوت کی اور دعوت کر کے پھر وہ حدیث سنائی کہ کھجور اور پانی کی دعوت کرنے میں کیا فضیلت ہے۔

حضرت علی نے اسی طرح اپنے شاگرد کو اجازت دی کہ خود کھجور کھائی۔ الش اسے کھلایا۔ پانی پیا اور بچا ہوا پانی

پلایا اور حدیث پڑھی ۔ یہ مسلسل عمل چلا آ رہا ہے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھجور منگوائی اور پانی بھی منگوایا (زمزم کا پانی) کھجور کھا کر الش مجھے کھلایا اور پانی مجھے پلایا اور حدیث نقل فرمائی ۔ اور اس کی اجازت دی ۔ تو عملاً حدیث مسلسل بالماء والتمر اور مسلسل بالمصافحہ کی اجازت دی اور پھر روایۃً ساری مسلسل کی اجازت دی کہ میں حدیث کی اجازت دیتا ہوں تو ان کی روایت کر سکتا ہے ۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محدثین نے فقط قول نبی نقل نہیں کیا معانی بھی نقل کئے اور معانی ہی نہیں بلکہ وہ افعال اور ہیئتیں بھی سند کے ساتھ ہم تک پہنچائے جو افعال پہنچتے آئے ہیں ۔

محدثین کی احتیاط..... معمولی سی بات ہے کہ میں نے مشکوٰۃ اپنے والد ماجد سے پڑھی تھی ۔ تو نوحہ کی حدیث آئی ۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا ۔ تو وہ وصیت کر کے جاتا تھا کہ چھ مہینے تک یا سال یا دو برس تک مجھے رویا جائے اب ظاہر بات ہے کہ اتنے دنوں تک آنکھوں میں کوئی آنسو لے کر بیٹھ جائے تو یہ ہو نہیں سکتا اور نہ روئے تو لوگ کہیں گے بھئی! کوئی بڑا آدمی نہیں تھا ۔ معمولی تھا ۔ مر گیا لہٰذا چھ مہینے روؤ تا کہ معلوم ہو کہ کوئی بڑا آدمی گزرا ہے ۔ مگر اب چھ مہینے تک روئے کون؟ تو رونے والیاں کرائے پر رکھی جاتی تھیں کہ وہ چھ مہینے تک بیٹھ کر روئیں اور وہ عورتیں ہی رکھی جاتی تھیں ۔ اس لئے کہ آنسو بہانا انھیں آسانی سے آتا ہے بس ارادہ کیا اور ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے ۔ تو رونے اور رلانے کے لئے عورتوں سے بہتر دوسرا کرایہ دار نہیں مل سکتا تھا ۔ اس لئے عورتوں کو کرایہ پر رکھتے تھے ۔ اجرت بھی دی جاتی اور کھانا کپڑا بھی اور ان کا طریقہ کیا تھا؟ گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں کھا پی رہی ہیں ۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، بس وہ فوراً گھیرا بنا کر بیٹھ گئیں اور انہوں نے ''راں راں'' کر کے رونا شروع کیا ۔ ''وَاکَذَاہ! وَاجَبَلَاہ! وَاشَمْسَاہ!'' تو تو پہاڑ تھا، تو تو آفتاب تھا، چاند تھا، وغیرہ ۔ اور پوری لَے کے ساتھ اور کچھ ''راں راں'' کر کے دکھلایا کہ یوں روتی تھیں ۔

ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ پھر خود ہی فرمایا کہ تمہارے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا ہوگا کہ میں نے ''راں راں'' کر کے کیوں دکھلایا؟

فرمایا اس لئے کہ جب مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے حدیث پڑھی، تو انہوں نے یوں ہی ''راں راں'' کر کے دکھلایا تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو اس حدیث پر انہوں نے بھی یوں ہی ''راں راں'' کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے یہی کر کے دکھلایا اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث

پڑھی۔ انہوں نے یونہی کر کے شاہ ولی اللہ کو دکھلایا اور اس ''راں راں'' کی صحابی تک سند پہنچا دی۔

تو محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ نقل کئے بلکہ ہیئتیں بھی نقل کیں۔ بلکہ وہ عوارض اور احوال بھی سند کے ساتھ پہنچائے تا کہ معلوم ہو کہ پورے وثوق کے ساتھ انہیں حدیث آئی اور حدیث سنی ہے۔

غیر مستند عالم...... اب جس شخص کے پاس سند نہ ہو، محض ترجمے دیکھ کر وہ حدیث بیان کرے۔ وہ قابل اعتبار نہیں وہ مستند عالم نہیں ہے۔ اسے عالم نہیں کہیں گے زیادہ سے زیادہ ناقل کہیں گے۔ اگر نقل صحیح کر دی، کہیں گے نقل صحیح کی۔ غلط کی کہیں گے غلط کی، لیکن عالم کہہ دیں؟ یہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عالم کے لئے استناد لازمی ہے بغیر استناد کے علم، علم نہیں ہوتا۔

عقلی علوم میں استناد ضروری نہیں ہے کہ آپ فلسفہ میں صدرا پڑھ کر یوں کہیں کہ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَرَسْطُوْ وَاَفْلَاطُوْنَ'' وہاں ضرورت نہیں۔ اس واسطے کہ عقلی چیزیں ہیں۔ ہمیں بھی عقل ہے۔ انہیں بھی عقل تھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عقلی باتوں میں غلطی کر گئے ہوں۔ ہم کہیں گے غلط کام ہوا۔ ہماری عقل میں یہ چیز آتی ہے۔ تو ہر شخص کو عقل دی گئی ہے، دوسرے کی عقل اس کے لئے حجت نہیں وہ تخطیہ کر سکتا ہے۔

لیکن نقل و روایت کی چیز میں پابند ہونا پڑے گا استاذ کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم نقل کر کے کہے گا میرے استاذ نے یہ نقل کیا پھر وہ کہے گا میرے استاذ نے یہاں تک کہ صاحب شریعت تک سند پہنچ جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں، وہ وحی سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھ سے یوں فرمایا۔ تو ہماری سند حق تعالیٰ تک متصل ہو جائے گی۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی ختم ہوگئی علم مستند باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں، نہ اسے عالم مستند کہیں گے۔

مثال غیر مستند عالم...... اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مادی وراثت میں جب تک باپ سے نسب ثابت نہ ہو آپ وارث کیسے بنیں گے؟ پہلے آپ یہ ثابت کریں گے۔ یہ فلاں کا بیٹا ہے تو اس کا جو ترکہ ہوگا وہ اس کو ملے گا اور اگر آپ یہ ثابت نہ کر سکے اور لوگوں نے کہا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اس کے بیٹے نہیں۔ معلوم نہیں اس کا باپ کون ہے۔ یہ فرضی طور پر کھڑے ہو گئے۔ وراثت نہیں مل سکتی۔ تو وارثت کے لئے نسب کا ہونا ضروری ہے باپ سے سلسلہ نسب ہو تو کہا جائے گا کہ وارث ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کی وارثت علم ہے۔ اس کا وارث بھی وہ بنے گا جس کا سلسلۂ نسب روحانی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہوا ہو۔ وہاں مادی نسب ضروری ہے، یہاں روحانی نسب ضروری ہے۔ وہاں بغیر مادی نسب کے وراثت نہیں مل سکتی، یہاں بغیر روحانی نسب کے علمی وراثت نہیں ملے گی۔

تو ہم اس علم کو علم کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے پہنچا ہو، جس علم کا ہماری عقل نے

اختراع کیا ہو، سنی سنائی باتیں کہہ رہے ہوں یا کسی ترجمہ میں دیکھ کر کہہ دیں۔ وہ مستند نہیں سمجھی جائیں گی۔ ایسے آدمی کو عالم نہیں کہا جائے گا۔ عالم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مستند ہو۔ کن اساتذہ سے اس نے علم حاصل کیا ہے؟ اس کا سلسلۂ نسب علم میں کہاں پہنچتا ہے؟ اگر نہیں پہنچتا ہم کہیں گے بھئی! تو بے باپ کا بیٹا ہے۔ اور جو بے باپ کا بیٹا ہے وہ وراثت کا مستحق نہیں ہوتا۔ بہر حال سب سے بڑی چیز سند اور استناد ہے۔

سببِ تبریک...... اسی واسطے محدثینؒ کہتے ہیں "لَوْلَا الْاِسْنَادُ لَبَطَلَ الدِّیْنُ." اگر دین میں اسناد نہ ہو تو دین ہی باطل ہو جائے۔ "لَقَالَ مَنْ شَآءَ مَاشَآءَ." ① "جس کا جو جی چاہے گا کہہ مارے گا"۔

اور کہے گا یہ دین کی بات ہے۔ ہر ایک کو حق ہو گا لیکن جب ہم پوچھیں گے سند کیا ہے؟ کس کے شاگرد ہو؟ وہ کس کے شاگرد ہیں؟ آگے وہ کس کے؟ جب تک اسناد پیش نہ کرے گا اس کے علم کو ہم علم نہیں کہیں گے۔ غرض علم میں سب سے بڑی چیز سند ہے۔

تو آپ کے لئے سب سے بڑی قابلِ مبارکباد چیز یہ ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔ یعنی آپ کو سند حاصل ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک روحانی نسب نامہ مل گیا۔ آپ وہی کہہ رہے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا اور وہی باتیں سمجھا رہے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھائی تھیں اور صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو۔ تو ایک متن حاصل ہوا جس سے علم کا دروازہ کھلا۔ ایک سند حاصل ہوئی جس سے آپ کا علم مستند اور دوسروں کے لئے حجت بنا بغیر سند کے وہ حجت نہ ہوتا۔ اس لئے محدثین نے سند ضروری قرار دی۔

وقعتِ روایت...... اور اس میں بھی ایک درجہ رکھا ہے کہ اس شخص اور اس راوی کی روایت زیادہ وقیع ہے جو اپنے شیخ سے کثیر الصحبت ہو۔ ایک راوی تو وہ ہے کہ اس نے استاذ کی زیارت کی، ملاقات ہوئی۔ ایک حدیث نقل کی اور ایک وہ ہے کہ برس دو برس شیخ کی خدمت میں رہ کر اس نے فن حاصل کیا۔ ظاہر بات ہے جو برس دو برس اپنے شیخ کی خدمت میں رہے گا، اسے قول اور فعل ہی حاصل نہیں ہو گا، بلکہ اس کے قلب کو وہ رنگ بھی ملے گا جو استاد کے قلب کا رنگ ہے اس تک وہ کیفیات بھی منتقل ہوں گی جو استاد کے قلب میں اوپر سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں۔ اس لئے جو راوی کثیر الصحبت ہے اس کی روایت کا جو وقار ہو گا وہ اس راوی کی روایت کا نہیں ہو گا۔ جس کی چند گھنٹے ملاقات ہوئی۔ حدیث سن کر چلا آیا سند ٹھیک ہے۔ مگر سند کے ساتھ وہ کیفیات منتقل نہیں ہوں گی۔ جو استاذ کے قلب میں تھیں اور وہ اصل چیز ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ ② "اللہ کا رنگ سب رنگوں پر غالب ہے"۔ اللہ نے وہ رنگ اپنے نبیؐ کے قلب میں ڈالا۔ نبیؐ نے اپنے فیضِ صحبت سے وہ رنگ صحابہؓ کے قلوب میں ڈالا۔ صحابہؓ نے اپنے

---

① الصحیح لمسلم، المقدمة، ج: ۱ ص: ۳۸. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۸.

فیضِ صحبت سے وہ رنگ تابعین کے قلوب میں ڈالا۔ انہوں نے تبع تابعین کے، وہ کیفیات، قلب کی صفائی اور ذوق و وجدان کا رنگ بھی درحقیقت منقول ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہم اسی کو صحیح مانیں گے جو اوپر سے منقول ہو۔ یعنی اپنے ذوق کا علاج بھی اپنے استاد سے کرائیں گے تاکہ ہمارا ذوق صحیح ہو جائے۔ اپنے وجدان کو استاذ کے آگے پیش کریں گے کہ ہمارا وجدان صحیح ہے یا غلط؟ تو ذوق بھی وہی ہونا چاہئے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ وجدان کا رنگ بھی وہی ہونا چاہئے۔ جو اللہ کے رسول کا ہے۔

ذوقِ صحیح...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چار فرائض قرآن حکیم میں ذکر کئے گئے ہیں ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① پہلا کام یہ ہے کہ آپ آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ الفاظ خداوندی پوری امانت کے ساتھ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہے ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم معانی کا سمجھانا اور مرادات ربانی کا ذکر کرنا ہے۔ اسکے بعد فرمایا:

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ حکمت بھی سکھلاتے ہیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور حکمت عملی۔ حکمت نظری تعلیم کے اندر آ گئی۔ باقی حکمت عملی رہ جاتی ہے تو بلاغت کے قاعدے سے اگر ایک لفظ کے دو معنی ہیں اور ایک پہلے لفظ میں آ جائیں۔ تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے دوسرے معنی ہیں۔ تو حکمت نظری تعلیم میں آ گئی۔ اس لئے الحکمۃ میں حکمت عملی مراد ہوگی۔ حکمت عملی سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بھی دکھلاتے ہیں کہ یہ عمل اس طرح کرو۔ تو لفظوں میں تعبیرات پہنچائیں۔ معنی میں مرادات سمجھائیں حکمت میں عمل کر کے دکھلایا کہ اس نمونہ کا عمل پیش کرو اور چوتھا فریضہ ذکر کیا:

﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ④ آپ دلوں کو مانجھتے بھی ہیں۔ یہ وہی ذوق اور وجدان کا صحیح کرنا ہے کہ قلوب میں سے زیغ نکل جائے۔ ٹیڑھ نکل جائے۔ کجی نکل جائے، استقامت پیدا ہو اور فہم میں اتنی سلامتی آ جائے کہ جو چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی جائے وہ قطعاً دل کے اندر اترتی ہوئی چلی جائے۔ ٹیڑھ باقی نہ رہے۔ غرض سلامتی قلب، ذوق صحیح اور وجدان صحیح یہ تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔ تو صحابہؓ کے ساتھ آپ ﷺ نے محنت کی، تاکہ ان کا ذوق درست کریں، کجی باقی نہ رہے۔

اس لئے کہ اگر دل میں کجی رہ جاتی تو دل کی کجی کے ہوتے ہوئے جو آیت بھی سامنے آئے گی، دل اس کے وہی معنی سمجھے گا جو الٹے معنی ہوں گے۔ اگر معاذ اللہ کسی کے دل میں نصرانیت کا جذبہ گھسا ہوا ہو اور وہ نصرانیت کا ذوق لے کر قرآن پڑھے تو اسے ہر آیت سے نصرانیت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانیت کا ذوق لے کر آئے تو پورے قرآن سے قادیانیت ٹپکتی ہوئی نظر آئے گی۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

③ پارہ: ۲۸ سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

اس واسطے کہ قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں۔کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ یہ استاذ اور مربی سمجھائے گا کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد نہیں۔ اگر تربیت نہ ہو تو کئی معنوں میں سے آدمی اپنے نفس کے مطابق جو معنی سمجھے گا وہ اختیار کرے گا۔ وہ مرادِ نبوی نہیں ہوگی۔ اس کے نفس کی مراد ہوگی۔ اس لئے ذوق کا درست کرنا ضروری ہے۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف قرآن پیش کیا، ایک طرف دلوں کو مانجھ کر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح کی۔ تو علماً وعملاً وذوقاً صحابہؓ وہی سمجھ گئے جو آپ کو سمجھانا تھا۔ اگر ذوق صحیح نہ ہو، عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو تو مراداتِ ربانی سمجھنے کی کوئی صورت نہیں۔

مرادِ قرآن اور سنت...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو جب خوارج سے مناظرہ کرنے بھیجا تو ایک وصیت کی، فرمایا: دیکھو! خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ ابن عباسؓ نے عرض کیا، حضرت! قرآن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی ہے "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" ① "اے اللہ! ابن عباس کو قرآن کا علم وحکمت نصیب فرما"۔ اور اللہ نے مجھے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے اور قرآن ہی میرا موضوع ہے۔ اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کروں۔ سنت سے پیش کروں اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم آیت پڑھ کر ایک معنی سے استدلال کرو گے، مخالف اسی آیت کو دوسرے معنی میں ڈھال کر اپنی دلیل پیش کرے گا، عوام کہیں گے یہ بھی تو قرآن پڑھ رہا ہے۔ حق واضح نہیں ہوگا۔ لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پیش کر دیا۔ اس میں دو معنی نہیں ہو سکتے۔ اس سے مراد متعین ہو جائے گی۔ اس واسطے ضرورت ہے کہ سنت سے استدلال ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن سے من مانی مرادیں نکالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ بلا کہاں سے نازل ہوگئی۔ اس سے تو ہم وہی معنی لینے پر مجبور ہو گئے۔ جو اللہ کی طرف سے منقول ہوتے آرہے ہیں اور ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ وہ انکار کر کے حدیث کو بیچ سے ہٹاتے ہیں تاکہ آزادی حاصل کریں اور جو ان کے نفس وعقل میں اختراعی چیزیں آئیں۔ انہیں قرآن کی طرف ٹھونک دیں ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کی مراد نہیں ہوگی۔ ان کے نفس کی مراد ہوگی۔

کلام میں لب ولہجہ کا دخل...... اس واسطے کہ قرآن کی مراد سمجھانے میں لب ولہجہ کا بھی دخل ہے، کلام کی خصوصیات کا بھی دخل ہے، ماحول کا بھی دخل ہے جب ساری چیزیں قطع ہو جائیں تو مراد کیسے متعین ہوگی؟ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو کا ایک جملہ ہے" کیا بات ہے، اسکے کئی معانی آتے ہیں اور لب لہجہ سے معنی بدل

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللهم علمه الکتاب...... ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۵.

جاتے ہیں اگر میں یوں کہوں کیا بات ہے؟ آپ سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں کہ بھئی! کیا معاملہ ہوا ہے؟ کیا واقعہ پیش آیا؟ اور اگر میں لہجہ بدل کر یوں کہوں کیا بات ہے۔اب کیا سمجھے؟ قطعاً سوال نہیں سمجھے، بلکہ آپ سمجھے کہ میں کسی شئے کی بڑائی بیان کر رہا ہوں کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے۔ وہ تو بہت ہی بڑی ہے۔اور اگر میں لب ولہجہ بدل دوں اور کہوں کیا بات ہے۔اب آپ کیا سمجھے؟ اب نہ بڑائی سمجھے نہ سوال بلکہ تحقیر سمجھے کہ میں نے کسی شی کی حقارت بیان کی اور اگر پھر لب ولہجہ بدل کر اسی جملہ کو یوں ادا کروں کیا بات ہے۔اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔نہ بڑائی بیان کی نہ تحقیر نہ استفہام وسوال۔تو ایک ہی جملہ ہے''کیا بات ہے'' اور اس کے چند معنی ہیں اور سب معانی لب ولہجہ سے متعین ہوتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ اگر یہ جملہ خط میں لکھ کر بھیج دیں تو لب ولہجہ تو خط میں نہیں آئے گا۔تو وہ اس جملہ سے وہی معنی سمجھے گا جو خیال اس کے نفس پر غالب ہوگا۔ لیکن اگر آپ بالمشافہ سامنے بٹھلا کر لب ولہجہ سے (یا کلام دے کر کسی شخصیت و پیامبر کے ذریعہ) سمجھائیں گے تو مخاطب وہی معنی سمجھے گا جو آپ کی مراد ہے۔لیکن اگر خط میں لکھ کر بھیجیں گے تو وہ وہی معنی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی۔گویا وہ اس جملے کے جو معنی سمجھے گا وہ (لفظ آپ کے ہوں گے) مراد اس کی اپنی ہوگی لکھنے والے کی مراد نہیں ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم اور حدیث نبوی کو سمجھ لیں بہت سے معنی ہوتے ہیں جو لب ولہجہ اور ماحول سے متعین ہوتے ہیں اور بہت سے معنی ہیں جو اسباب نزول سے متعین ہوتے ہیں۔اگر ان سب امور کو قطع کر کے محض الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو ہر شخص اس سے وہی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی اور ایسا کرنے سے بہت سے نقصانات وجود میں آئیں گے۔بہت سے بدبخت ایسے بھی ہیں جو تلبیس کر کے دنیا کو دھوکہ دیں گے کہ یہ اللہ اور رسول کی مراد ہے۔حالانکہ اللہ اور رسول کی مراد نہیں،اس کی اپنی مراد ہے۔لفظ اللہ کے لئے اور معنی اپنے بھر دیئے۔

لیکن اگر سند آ گئی، بیان رسول آ گیا، وراثتی معنی آ گئے جو صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور مع کیفیات کے بیان کئے تو شی متعین ہو جائے گی اور ایسی صورت میں میں کسی کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوگی۔ غرض جو بھی چاہے گا کہ میں قرآن میں من مانی مرادات کو داخل کروں وہ حدیث اور کلام سلف سے انکار کرے گا۔ وہ ان کے مفہوم کی حجیت کا انکار کرے گا تا کہ دنیا کے اندر اس کی حجیت قائم ہو۔ہم کہتے ہیں دین وہ ہے جو سلسلے وار مرتب ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مسلسل مل جائے۔لفظ معنی اور کیفیت وحال بھی اور عوارض و واقعات اور احوال کے لحاظ سے بھی۔

ضرورت نبوّت...... آج وہ طلباء جنہوں نے بخاری شریف ختم کی ہے قابل مبارکباد ہیں۔پہلی بات قابل مبارکباد یہ ہے کہ سات ہزار احادیث کے قریب متون ان کو حاصل ہوئے۔جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہیں اور کلام رسول کی عظمت وہی ہے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جیسے اللہ

تک بندہ نہیں پہنچ سکتا جب تک بیچ میں رسول کا واسطہ نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ نور مطلق ہیں اور بندہ ظلمت محض ہے۔ نور، ظلمت کے ساتھ نہیں جمع ہوسکتا۔ تو اللہ نے ایک برزخی مخلوق پیدا فرمائی کہ وہ بشر بھی ہیں۔ مگر اتنے کامل بشر کہ لطافتوں میں اللہ سے واصل ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ تو بندوں کے خدا تک پہنچنے کے لئے نبی واسطہ ہیں۔ نبی نہ ہو تو بندہ کا پہنچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کا کلام اتنی عظمت وجلالت میں ہے کہ بندہ کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو کلام رسول بیچ میں برزخ ہے کہ اس واسطے سے ہم کلام خداوندی تک پہنچیں گے۔

اگر کوئی کلام رسول کا واسطہ بیچ میں سے نکال دے اور چاہے کہ چھلانگ مار کر اللہ کے کلام تک پہنچ جائے تو وہ نیچے آپڑے گا اور وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے کہ وہ کلام بہت اونچائی پر ہے، جیسے ذات خداوندی تک پہنچنا بغیر ذوات رسل کے ممکن نہیں ایسے ہی کلام ربانی کے حقائق تک پہنچنا ممکن نہیں ورنہ پھر نبی کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟۔ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن شریف لکھ کر بیت اللہ شریف کی چھت پر رکھ دیتے اور ایک آواز لگا دیتے۔ اے لوگو! تم سب مریضان نفوس ہو اور یہ نسخہ شفا ہے اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج کرلیا کرو، پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ تھی مگر پیغمبر بھیجا گیا۔ جیسے محض طب کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہ اپنا علاج کرسکتا ہے نہ غیر کا۔ کیونکہ کتاب میں اصول بیان ہوں گے۔ لیکن نبض پہچان کر کہ فلاں کو کیا روگ ہے؟ فلاں کا مزاج کیسا ہے؟ اس کے لئے تجربہ وتربیت کی ضرورت ہے اور کتاب کے اوراق تربیت کرتے نہیں۔ تربیت کرنے والی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ اگر شخصیتوں سے قطع نظر کرلیا جائے اور محض کتاب کے اوراق رہ جائیں تو کالے کالے نقوش تو سامنے آئیں گے۔ تربیت اور کیفیات سامنے نہ آئیں گی۔ اسی لئے اللہ کے کلام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کلام رسول کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم نہیں پہنچ سکتے۔ جو آج خوشی کا مقام ہے کہ کلام رسول آپ تک پہنچا، اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا، محض قوت مطالعہ یا کتب بینی سے یا اختراع نفس سے نہیں پہنچا کہ اس میں نفس کا بھی دخل ہوتا ہے، شیطان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلہ جڑ گیا۔ تو وہ طلبہ خوش نصیب ہیں جنہیں آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہوگئی اور ان کا قلب گویا قلب نبوت سے بواسطہ کلام نبوت واصل ہوگیا۔

امت محمدیہ کی سب سے بڑی عظمت...... اس امت کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس امت میں اللہ کا کلام مستند طریق پر موجود ہے۔ آج قرآن کے بارے میں اگر کوئی دعوی کرے کہ اس کی سند کیا ہے تو امت کے علماء اپنی جگہ۔ ہیں میں یہ کہوں گا کہ میری سند حق تعالیٰ سے متصل ہے۔ مجھے یہ قرآن میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا، ان کو قاری عبدالرحمن نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی، انہیں قاری عبداللہ صاحب مکی نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی اور انہیں ابراہیم نے سکھلائی اور سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریل علیہ السلام نے پڑھا

اور جبریلؑ کے سامنے حق تعالیٰ شانہٗ نے تکلم فرمایا، تو حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہٗ تک پہنچ جاتی ہے۔

دنیا میں آج کون سی کتاب ہے جو سند متصل کے ساتھ اللہ تک پہنچے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جارہا ہو کہ یہ الہامی کتاب ہے تورات، انجیل یا زبور ہے کسی کی سند نہیں ہے۔ بس ایک ہی سند ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ ① "باپ دادا کو یوں ہی کہتے سنتے چلے آتے ہیں"۔ ممکن ہے باپ دادا نے غلطی کی ہو۔ جب تک سند سامنے نہ ہو غلطی کا امکان ہے لیکن اگر سند سامنے ہے تو غلطی کا امکان نہیں ہے۔

فنِ اسماء الرجال...... اور مسلمانوں نے یہی نہیں کیا کہ سند لے لی۔ نہیں، بلکہ روایانِ حدیث کے لئے ایک مستقل فن ایجاد کیا۔ اور پچاس ہزار ایسے آدمیوں کی سوانح عمریاں مرتب کیں جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں۔ ان کے نسب نامے کیا تھے؟ ان کا کیریکٹر کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟ ان کا حافظہ کیسا تھا؟ ان کا عدل وانصاف کیسا تھا؟ انکے قلب کے اخلاق کیسے تھے؟ پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمریاں (فنِ اسماء الرجال) مرتب کر دیں۔ تو وہ کسوٹی ہے کہ دیکھ کر معلوم کرلیں کہ یہ راوی ہیں جن کے واسطے سے کتابِ مبین ہم تک پہنچی ہے۔

غرض مسلمان اگر اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا کلام لئے بیٹھے ہیں تو اس بھروسے پر نہیں کہ باپ دادا سے یوں ہی سنتے چلے آرہے ہیں۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ ② چاہے باپ دادا نے غلطی کی ہو، چاہے عقل نہ لڑائی ہو، پھر بھی تم یہی کہو گے کہ باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی سند کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو افواہ ہے۔ افواہاً کوئی چیز معتبر نہیں ہوسکتی۔ سند یہ ہے کہ میں نے فلاں سے پڑھا اور اس نے فلاں سے پڑھا اور اسی طور پر اس کی اللہ کے رسول تک انتہاء ہوجائے۔

دین کے ہر ہر جز کی سند...... تو مسلمانوں کے پاس ایک ایک حدیث کی سند موجود ہے۔ اگر چھوٹا جملہ بھی پڑھیں گے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچائیں گے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں استناد کی عادت پڑگئی، وہ محض قرآن وحدیث نقل نہیں کرتے، بلکہ کوئی دینی فن نہیں کہ جس کی سند نہ ہو۔ آپ ہدایہ پڑھائیں گے، اس کی سند موجود ہے کہ صاحب ہدایہ سے ہمارے استاذوں نے اس اس طرح حاصل کیا۔ حتی کہ تصوف کے اندر عرفاء حقیقت اور حضرات صوفیہ نے بھی سند کیساتھ۔

شیخ ابواسحاق کا رسالہ قشیریہ ہے۔ اس میں حضرت جنید اور حضرت شبلی کے واقعات بھی نقل کئے ہیں اور سندیں بھی نقل کی ہیں تصوف کے اصول نقل کئے ہیں تو سندیں نقل کی ہیں۔ تصوف کا یہ واقعہ جنید یا شبلی سے یا سید الطائفہ سے فلاں سند کے ساتھ ہمیں پہنچا ہے۔

اور اس میں پھر آگے قرآن وحدیث سے ماخذ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اخذ کیا ہے۔ تو تصوف کی سندیں الگ موجود ہیں، فقہ کی الگ، حدیث کی الگ۔ اور قرآن کی سند تو تواتر طبقات

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰۔

کے ساتھ ہے تو کوئی دینی فن یا دینی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان یہ کہہ کے نقل کریں کہ ہم باپ دادا سے یونہی سنتے چلے آ رہے ہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ میں نے فلاں استاذ سے پڑھا وہ اپنے استاذ کا حوالہ دے گا، وہ اپنے استاذ کا تو یہ کسوٹی ہے جس کے ہاتھ میں سند نہ ہو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم مستند نہیں، ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی بات مانی جائے گی جو سند متصل سے بات کرے۔

تو آج ان طلباء کے لئے مبارکباد دینے کا وقت ہے جنہیں متن حدیث حاصل ہوا اور سند متصل کے ساتھ ہوا اس واسطے میں ان طلبہ کو بھی مبارکباد دیتا ہے۔ اور ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں مدرسہ کے معاونین اور منتظمین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے سامنے آ گیا اور سند کے ساتھ چند علماء تیار ہو گئے۔

مراتب علماء...... یہ ظاہر ہے کہ علماء سب ایک درجہ کے نہیں ہوتے کوئی اعلیٰ فہم رکھتا ہے کوئی متوسط درجے کا۔ ﴿فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾. تو ایک درجے کے سارے نہیں ہوتے۔ بعض دقیق الفہم ہوتے ہیں۔ بعض بلید الفہم ہوتے ہیں، بعض غبی بھی ہوتے ہیں مگر خیر دیندار تو بن جاتے ہیں۔ ان کی عبادت اگر علم تک نہ پہنچا سکے تو کم سے کم ان کا عمل صحیح ہی قائم ہو جاتا ہے۔ بہر حال علماء ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ مگر سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے جب کہ وہ سند کے ساتھ روایت کریں اور انہیں سند کے ساتھ علم حاصل ہوا ہو تو ہم سب کا فرض ہے کہ انکے ساتھ حسن ظن رکھیں۔ ان کی عظمت کریں۔ وہ عظمت ان کی ذات کی نہیں ہوتی۔ ذات تو گوشت پوست سے بنی ہوئی ہے وہ ہمارے اندر بھی موجود ہے، اس کی کیا عظمت ہے؟

وہ عظمت علم کی ہوتی ہے اور ان کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے پاس سے علم آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس واسطے علم کی اور اس نسبت اور سند کی تعظیم کی جاتی ہے۔ جو انہیں حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ تو یہ سب طلباء اور علماء جو تیار ہوئے ہیں، ہم سب کے لئے مستحق اور مستوجب تعظیم و عظمت اور وقار کے ہیں۔ "لِوَجْهِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" اور "لِوَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى" کہ انہیں حق تعالیٰ سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہوگئی ہے اس لئے ہم انکی عظمت کریں گے، کسی عالم کی تحقیر کسی طرح بھی جائز نہیں اس کی تحقیر سے علم کی تحقیر ہوتی ہے اور علم اللہ اور اللہ کے رسول کا ہے اس کی تحقیر ہمارے لئے کب جائز ہے؟ تو مستند عالم واجب التعظیم اور واجب التکریم ہے۔ اس واسطے ان دونوں کو عظمت دی جائے گی اور ان کو مبارکباد دی جائے گی۔ تو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اجازت حدیث...... اور چونکہ ختم کے لئے اپنی عنایت اور مہربانی سے انہوں نے مجھے بلایا اور اس سعادت میں شریک کیا کہ میں ختم کراؤں۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ میں اپنی سند پیش کر کے اس سند کی اجازت انہیں دوں جن طلبہ نے میرے سامنے حدیث پڑھی۔

میرا سلسلہ ایک یہ ہے حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اور وہ شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں (اس سے آگے سلسلہ سند ترمذی شریف میں مرقوم ہے) اور دوسرا سلسلہ سند یہ ہے کہ بندہ کو مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارن پوری نے اور ان کو مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ان کو شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ الی آخر سند نے اجازت فرمائی۔ ہر دو سلسلہ سند سے میں ان طلباء کرام کو اجازت حدیث دیتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَاتَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دورۂ افریقہ سے واپسی پرالوداعی خطاب

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَـنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

محبت وشکر گذاری کو الفاظ میں ادانہیں کیا جاسکتا...... بزرگان محترم،صاحب حق صدر باوقار، اراکین جمعیت علماء، اور ذمہ داران قوم! اس پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں متعدد جلسے، مجلسیں ہوتی رہیں اور میں ان میں حاضر رہا۔ آج بھی ایک بڑا اجتماع سامنے ہے۔ لیکن اور جلسوں کی نسبتاً اس جلسے کی نوعیت کچھ جداگانہ ہے۔

اس سے پہلے جو جلسے ہوتے تھے وہ درحقیقت سننے کیلئے تھے اور آج کا جلسہ کچھ کہنے کیلئے منعقد کیا گیا ہے اس سے پہلے آپ حضرات سنتے تھے اور بولنے والا ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن آج میں سننے والا ہوں۔

سب حضرات بولنے والے ہیں۔ جس کی ترجمانی وہ حضرات فرمارہے تھے، جنہوں نے ابھی کلام کیا۔ ہمارے مولانا عمردین صاحب، ہمارے محترم احمداللہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب یہ حضرات کچھ کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا اور اس کو یوں کہنا چاہئے کہ اس ناچیز خادم کے پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں جو کچھ آپ کا تاثر ہوا، اسے قدر دانی کے ساتھ اور شکریہ کے الفاظ کے ساتھ آپ نے ظاہر فرمایا۔

ان الفاظ سے اور پچیس روزہ محبت کے طرزِ عمل سے، خود میرے اندر بھی محبت وشکر گذاری کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں انہیں الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ وہ قلب کی کیفیات ہیں اور کیفیات الفاظ میں نہیں آسکتیں، کتنے بھی بڑے سے بڑے الفاظ میں کیفیات کی تصور پر کھینچی جائے، محبت کو ظاہر کیا جائے لیکن وہ ظاہر ہو ہی نہیں سکتی۔ الفاظ کا دامن تنگ ہے اور جذبات محبت کا میدان بے حد وسیع ہے۔ تو الفاظ کی قبا کا لباس ان پر چست ہو ہی نہیں سکتا۔ کتنا ہی آدمی کھل کر بیان کرے۔ حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پر سید یکے کہ عاشقی چیست؟

کسی عاشق سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی عاشقی اور محبت کیا چیز ہے، اسے کچھ الفاظ میں بیان کرو ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

گفتم کہ تو چو ماشوی بدانی

یعنی میں محبت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ قلبی کیفیات اتنی لطیف اور باریک ہوتی ہیں کہ الفاظ میں نہ سما سکتی ہیں نہ الفاظ ان کو ادا کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ نفسانی کیفیات ہوں یا روحانی، الفاظ سے بالاتر ہیں۔

اگر کوئی بچہ آپ سے سوال کرے کہ جوانی کی کیفیات کیا ہیں؟ ذرا مجھے بتلا دیجئے۔ آپ کیا بتلائیں گے یوں کہیں گے کہ بیٹا! ایک دس برس کا انتظار کرو۔ جوان ہو جاؤ گے۔ خود بخود پتہ چل جائیگا کہ جوانی کیا چیز ہے۔ اس کی کی کیفیات ہیں۔ ایک نوجوان آدمی بوڑھے سے سوال کرے کہ بڑے میاں! مجھے بڑھاپے کی کیفیات بتلا دو؟ بوڑھا یہی کہے گا کہ: خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ بڑھاپے تک پہنچ جاؤ۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ بڑھاپا کیا ہے۔ میں لفظوں میں کیسے ادا کروں؟

اسی طرح جب ایک بوڑھا آدمی اس کیفیت کو جو کسی محتضر کی جان پر گزر رہی ہو کسی پر نزع کی کیفیت ہو جان کنی ہو۔ اس کو شریعت اسلام میں محتضر کہتے ہیں کہ موت اس کے پاس آ گئی ہو۔ اب ایک بوڑھا اس محتضر سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ الفاظ میں مجھے بتلا دو۔ وہ کہے گا کہ اس کیفیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چند دنوں میں تمہارے اوپر بھی آنے والی ہے۔ اس وقت سمجھ میں آ جائے گی۔ یا ایک محتضر کسی میت سے پوچھے کہ: قبر میں تم پر کیا کیفیات گزریں۔ وہ بھی کہے گا بھئی! قبر میں آ جانا۔ آنا تو ہے ہی۔ وہاں سمجھ میں آ جائے گی۔ میں کیا بیان کروں؟ تو کیفیات کو نہ الفاظ ادا کر سکتے ہیں نہ وہ الفاظ میں سما سکتی ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے لگے کہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ میں کیا بیان کروں؟ کتنا ہی بیان کروں، حق ادا نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے یہ کہوں کہ چار پیسے خرچ کرو، سیب خریدو، کاٹ کے کھاؤ، پتہ چل جائے گا کہ سیب کی کیا کیفیات ہیں؟ مزے کو الفاظ میں میں کیسے ادا کروں؟ تو سیب کا مزہ ایک حسی مادی چیز ہے، وہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، عاشق اور محبت الفاظ میں کسے سما سکتی ہے؟ کیسے ترجمانی ہو سکتی ہے؟ آپ حضرات کے محبت کے عمل سے جو شکر گزاری اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ الفاظ نہیں ہیں کہ انہیں ادا کیا جائے۔

آپ کی محبت کے جذبات دل کا جوہر بن گئے ہیں جو آخرت تک ساتھ جائیں گے...... پھر ایک طرف تو پچیس دن کا عمل ہے اور ایک طرف قول ہی قول ہے۔ کوئی عمل مجھ سے بن ہی نہیں پڑا۔ آپ حضرات کی طرف سے عمل کا ظہور ہوا۔ محبت کا عمل، مدارات کا عمل، اکرام ضیف کا عمل، آپ نے یہ عمل کر کے دکھلایا۔ ایک دن کی مہمانی ہو، دو دن کی ہو؟ یہ پچیس دن کی مہمانی؟ شرعی طور پر آدمی تین دن مہمان ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر مستحب ہے۔ گو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تین دن کی مہمانی واجب تھی۔ اور حدیث میں فرمایا گیا۔ اس زمانے کے لوگوں کو خطاب تھا کہ اگر کوئی تین دن مہمانی نہ کرے، ایک ہی دن میں جواب دے دے، تو مہمان کو حق ہوتا تھا کہ میزبان کے گھر سے اتنی قیمت کی روٹیاں اٹھا کے لے جائے جس میں تین دن کی مہمانی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ابتدائی حکم منسوخ کر

دیا گیا۔ ایک وقتی طور پر یہ حکم تھا، کیونکہ غربت کا دور تھا۔ اسلام لانے کے لئے لوگ آتے تھے، ان کی مدارات اور مہمانی نہ کی جاتی، وہ دین کی دولت سے محروم ہوجاتے۔ اس لئے تین دن کی مہمانی واجب قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ یہ مستحب اور اعلیٰ واولیٰ کا درجہ ہوگیا۔ البتہ اس سے کم جتنے دن یا جتنی دیر ٹھہرے، اس کا اکرام واجب قرار دیا گیا، بلکہ اس کو ایمان کا جز بتلایا گیا اور فرمایا گیا: ''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ.'' ① ''جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مہمان کی مدارات کرے''۔

مہمان کی مدارات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے روزانہ مرغ ہی کھلایا جائے یا بریانی کھلائی جائے، یہ معنی نہیں۔ بلکہ یہ کہ جو کچھ بھی کھلایا جائے، محبت سے کھلایا جائے، چاہے چٹنی روٹی ہو اور اگر گوشت بریانی ہو اور ساتھ محبت و مدارات بھی ہو تو یہ نور علی نور رہے۔ غرض پچیس دن تک اسی طرح کی مہمانی کیا جانا، یہ مستحب ہونے کے درجات سے بالاتر ہے۔ واجبات میں نہیں تھی۔ محض محبت اور مخلصانہ جذبات تھے۔ تو پچیس دن کے عمل سے جو جذبات و تاثرات محبت اور شکر گزاری کے پیدا ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں الفاظ میں کیسے ادا ہوسکتے ہیں۔ وہ جذبات تو ساتھ جائیں گے، وہ دل کا جوہر بن گئے۔

اور یہ محبت کے جذبات انشاء اللہ آخرت تک بھی جائیں گے، دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آپ حضرات نے جو مدارات و محبت فرمائی، وہ دنیا کی خاطر نہیں فرمائی، وہ آخرت کی خاطر فرمائی۔ کسی دنیوی رشتے سے نہیں کی کہ میرے سے آپ کی کوئی غرض متعلق تھی یا کوئی دنیا کا مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ محض اپنے دین کی محبت میں اس شبہ کی بناء پر کہ یہ شخص ہمیں کچھ نیک ہدایت کرے گا۔ تو یہ آخرت کے جذبات تھے۔ اس لئے اس کے تاثرات بھی یہیں تک نہیں ہیں، آخرت تک جائیں گے۔ جو چیز دنیا سے آخرت تک جانے والی ہو، اس کو الفاظ میں کس طرح سمایا جاسکے اور کون سا ایسا لفظ ہے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں سمٹ کر آجائیں۔ اس لئے یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان جذبات تشکر کو یا اپنے ان تاثرات کو جو آپ حضرات کی محبت سے پیدا ہوئے۔ الفاظ میں ادا کرسکوں۔ بجز اس کے کہ دعا کی ہے اور یہ وعدہ ہے کہ آئندہ بھی دعا کروں گا۔ نیز دعا کے سوا اور کسی چیز کی ہم میں استطاعت بھی نہیں ہے۔

اور یہ اس لئے بھی کہ دعاء کے لئے اہلیت شرط نہیں ہے۔ نااہل بھی دعاء مانگتا ہے، اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ گنہگار بھی دعاء مانگتا ہے۔ اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ اس لئے دعاء مانگنے کے لئے اہل ہونا ضروری نہیں۔ اسی دعاء کی آپ سے بھی استدعا ہے۔ بجز دعا کے میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں پیش کرسکوں۔

مولانا عمر دین صاحب نے یہ فرمایا کہ: وہ خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات سے تقریر کررہے ہیں۔ خوشی اس کی ظاہر ہے کہ ان کے خیال کے مطابق پچیس روزہ قیام میں کچھ کام بنا رنج اس کا ظاہر کررہے ہیں کہ آج

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الحث على اكرام الجار والضيف، ج: ١ ص: ٦٨ رقم: ٤٧.

جدائی کا دن ہے لیکن میرے اندر اس وقت سوائے رنج کے کوئی خوشی کا نشان نہیں ہے۔

اس لئے جدائی کا غم الگ ہے اور کام نہ بننے کا غم الگ ہے اس لئے کہ کوئی خدمت نہیں بن پڑی۔ یہ تو آپ کی قدردانی اور محبت کی بات ہے۔ جو کہ آپ نے فرمایا کہ اپنا سب وقت لگا دیا۔ کچھ بھی وقت نہیں لگایا۔ محض چند ساعتیں ایسی گزری ہیں جس میں کچھ عرض کر سکا۔ جو مجھے کرنا چاہئے تھا' نہیں کر سکا۔ اس لئے میرے واسطے تو غم ہی غم کا موقع ہے۔ جدائی کا غم بھی ہے اور کچھ نہ کر سکنے کا غم بھی ہے۔ اب سوائے اس کے میں شکریہ کی بجائے آپ حضرات سے معافی چاہوں اور کیا کر سکتا ہوں جو تقصیرات ہوئی ہیں، ان سے آپ درگزر فرمائیں اور جو خدمت میں قصور ہوا ہے، اس کو نظر انداز فرمائیں۔ کریموں کی کریم النفسی یہی ہوتی ہے کہ قصور و تقصیر پر درگزر اور معافی کا برتاؤ کیا جائے۔

اصل شکریہ عملی زندگی میں انقلاب ہے...... بہر حال ان دنوں میں جو بھی آپ نے خلوص اور محبت کا برتاؤ فرمایا، اس کے اثرات دل کے اندر موجود ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ان کا حقیقی شکریہ یہ ہے کہ جو گذارشات پیش کی گئی ہیں، ان پر عملی زندگی میں کوئی چیز سامنے آئے۔ عمل میں انقلاب پیدا ہو۔ یہ اصل شکر۔ یہ ہے شرعاً بھی شکریہ اسی کو کہتے ہیں کہ اگر قول کی بات بتائی گئی ہو، تو وہ قول کیا جائے، یہ شکریہ ہے اور اگر عمل کی بات بتائی گئی ہو، عمل کیا جائے، یہ شکریہ ہے اس لئے میں تو آپ کے شکریہ کا متمنی ہوں۔

یہ بھی ایک بے جا جرات اور جسارت ہے کہ میں آپ سے یوں کہوں کہ میرا شکریہ ادا کیجئے۔ مگر ہاں میں یہ جرات کرتا ہوں۔ آپ شکریہ ادا کریں۔ مگر عملی شکریہ ادا کریں۔ اگر ان پچیس دنوں میں کوئی کام کی بات آپ کے کانوں میں پڑ گئی ہے۔ تو اس پر عمل کر کے دکھلائیں۔

اور حقیقت میں یہ میرا شکریہ نہیں ہوگا۔ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اور دین اسلام کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکر گزاری ہوگی کہ جن کی جوتیوں کے صدقے میں ہم کچھ کہہ سکے اور آپ کچھ سن سکے۔ تو اصل شکریہ جس کی مجھے خود طلب اور تمنا ہے وہ یہ ہے کہ عملی طور پر ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ آپ حضرات تقریباً سو یا اسی سال سے یہاں ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد یہاں آئے، تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی آپ کو آج دولت یا عیش میسر ہے، یہ ان آباء و اجداد کا طفیل ہے۔ یہ ان کی دعاؤں کی اور خلوص کی برکت ہے۔ وہ آئے اور اپنا دین ساتھ لے کر آئے، دنیا بھی کمائی اور انہوں نے دین بھی کمایا اور دین کو مضبوطی سے پکڑا۔ ان کے دین کے آثار موجود ہیں۔ یہ جو آج اس ماحول میں آپ کے اندر دینی جذبات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کا طفیل ہے۔ یہ ان کے اثرات ہیں جو آبائی طور پر آپ کے اندر منتقل ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ کر لیں کہ اگر آپ ان تاثرات کو باقی رکھیں گے۔ آپ کی اولاد میں بھی وہ اثرات منتقل ہوں گے، جیسے ان آباء و اجداد سے آپ نے کچھ پایا، آپ کی اولاد بھی کچھ پائے گی اور اگر خدانخواستہ آپ نے ان اثرات کو چھوڑ دیا تو اولاد سے بھی کوئی توقع نہ رکھی جائے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے والے اپنے دین میں بھی مضبوط تھے' دنیا میں بھی ان کے معاملات میں

کھرا پن اور خالص دینی رنگ تھا اور ڈھیلا پن نہیں تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا ہے کہ: جب کوئی قوم میری اطاعت کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اس پر رحمت کرتا ہوں اور رحمت کا اثر اس کی سات پشت تک جاتا ہے اور جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے۔ میں بھی اس پر لعنت کرتا ہوں اور میری لعنت کا اثر بھی سات پشت تک جاتا ہے۔ یہ جو آپ کی پشتوں میں دین اور جذبات دین کا اثر ہے۔ یہ ان بزرگوں کے اثرات ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کا طفیل ہے، جنہوں نے اپنے قلوب کو دین سے بھر رکھا تھا۔ یہی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بھی اگر اسی طرح سے ان کے دین کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ اس دین کا اثر ہماری اولادوں میں بھی قائم رہے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی شکریہ یہ ہے کہ دین کی باتوں کو عملی طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کیا جائے۔

اسلام درحقیقت نام ہی عمل کا ہے۔ اسلام قول یا خیال کا نام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے "اَلْاِ یْـمَـانُ سِرٌّ وَّالْاِسْلَامُ عَلَانِیَۃٌ" ① ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جو قلب میں رہتی ہے، وہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ اسلام کھلی ہوئی چیز ہے جو عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ تو نماز، روزہ، حج زکوٰۃ سچ بولنا اور حسن معاشرۃ وغیرہ یہ اسلام ہے اور اللہ کو ایک جاننا، رسول کو برحق ماننا، قیامت کو برحق ماننا، یہ ایمان ہے۔ ایمان مثل جڑ کے ہے جو دلوں میں مخفی رہتا ہے اور اسلام مثل شاخوں اور پھل پھول کے ہے جو اوپر نظر آتا ہے۔ اس لئے اسلام عمل ہی کو کہتے ہیں، کسی تخیل کا نام اسلام نہیں ہے، اس لئے اسلامی چیز عمل سے ظاہر ہوگی، قول سے نہیں ہوگی اور جو چیزیں پیش کی گئی ہیں، وہ اسلام کی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

اس لئے کہ ایمان تو بحمد اللہ ہر ایک دل میں موجود ہے۔ ہم جتنے بھی ہیں، آخرت کے، اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت کے بھی قائل ہیں اور سب چیزوں کو حق مانتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو موجود ہی ہے۔ کسر اور کوتاہی جو ہم میں ہے وہ عمل میں ہے عقائد میں نہیں ہے۔ اس واسطے عمل ہی کی چیزیں زیادہ بیان کی گئیں۔ اس لئے اس چیز کی تمنا اور توقع بھی ہے کہ وہی چیزیں آگے ظاہر بھی ہوں۔ تو اصل شکریہ وہی ہوگا۔ اس لئے قول کا شکریہ بلاشبہ ایک قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے شکریہ جس طرح زبان اور قلب پر آتا ہے، اسی طرح عمل پر بھی آتا ہے۔ قلب کے شکر کے معنی اعتراف کے ہیں۔ زبانی شکر کے معنی بولنے کے ہیں۔ عملی شکر کے معنی عمل کرنے کے ہیں۔ تو قلب میں اور زبان پر بھی بحمد اللہ شکر گزاری کے جذبات اور اقوال موجود ہیں۔ اب آگے انتظار ہے تو عملی زندگی کا ہے۔ عملی چیزیں سامنے آئیں، جن کے اوپر چلا جائے۔ پھر شکریے کی تکمیل ہو جائے گی۔

دنیوی مشکلات کے حل کے لئے دینی وروحانی تدبیر...... جو حالات آج کل پوری دنیا میں اور یہاں

① المسند للامام احمد، مسند انس بن مالکؓ، ج:۳ ص:۱۳۴ رقم:۱۲۴۰۴۔

(افریقہ) بھی پیش آ رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر دین ہی کے اعتبار سے فی الحقیقت پریشان کن ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مشکلات ہیں مگر دنیا کی مشکلات زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتیں کیونکہ عارضی ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ اگر دینی تکلیف پیش آئے، وہ زیادہ سوہانِ روح ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے مصیبت کا تذکرہ کیا۔ تو کیسا اچھا حل دل کو ہلکا کرنے کے لئے بتلایا۔

فرمایا جب کوئی مصیبت آئے پہلے یہ سوچ کہ وہ تمہارے دین پر آئی ہے یا دنیا پر آئی ہے۔ اگر دنیا پر آئی ہے تو وہ شکر گزاری کا موقع ہے۔ کہ الحمد اللہ دین محفوظ ہے، جو کچھ گزر رہی ہے دنیا پر گزر رہی ہے اور دنیا کی مصیبت چند دن کی ہوتی ہے۔ مگر دین کی مصیبت پائیدار ہوتی ہے، وہ لمبی چلتی ہے، اس کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس واسطے اگر دین آفتوں سے محفوظ ہے، تو ہمارے لئے شکر کا موقع ہے۔

دنیا کی آفات بلاشبہ تکلیف دہ ہیں۔ لیکن ان کے حل بھی ہیں دنیوی اعتبار سے بھی، شرعی اعتبار سے بھی، وہ مصیبتیں ختم بھی ہو سکتی ہیں۔ خود دنیا ہی ختم ہونے والی ہے۔ تو اس کی مصیبتیں بھی عارضی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر لے کر آتی ہے۔ اس میں اجمالی درجہ میں اس کا کچھ دفعیہ اور تدبیر کرو۔ مگر زیادہ اللہ کو سونپ دو۔ جب اس کی عمر پوری ہوگی، وہ اپنے وقت پر خود ختم ہو جائے گی اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارے تو بعض دفعہ الٹ پڑ جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بیمار ہو تو، ڈاکٹر یا طبیب کو بلائے اور اپنا معمولی علاج شروع کر دے، بیماری اپنے وقت پر گزر جائے گی لیکن اگر اتنا اہتمام کیا کہ ایک ڈاکٹر صبح کو اور ایک شام کو اور ایک دوپہر کو علاج کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ وہ علاج معالجہ ہی خود مرض بن جاتا ہے۔ مرض کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

اگر کوئی چڑیا کسی جال میں پھنس جائے، تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ آہستہ بیٹھی غور کرتی رہے کہ کونسا سوراخ ہے جس سے میں جال سے نکل کر بچوں اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تو جال اتنا پھنس جائے گا کہ پھر نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ تو مصیبت جب آتی ہے تو زیادہ ہاتھ پیر مارنے سے آتی ہے۔ صبر وتحمل اور تدبیر کہ کس راستے سے نکلیں، اس کی تدبیر، کیا ہو سکتی ہے۔ سکون وصبر کے ساتھ وہ کی جائے۔ کچھ مصیبت کو گوارا کر لیا جائے۔ کچھ تدبیر کی جائے اگر آدمی یوں چاہے کہ مصیبت آنے نہ پائے اور بالکل ختم ہو جائے۔ یہ ناممکن ہوا کرتا ہے یہ دنیا کی فطرت کے خلاف ہے۔ تو کچھ تھوڑی سی وہ گوارہ کی جائے تھوڑی سی تدبیر کی جائے۔ بیچ کا راستہ نکل آتا ہے۔ مصیبت کو ہاتھ پیر مار کر بالکل دفع کرے تو آدمی پھنس جائے گا اور بالکل چپ بیٹھا رہے تب بھی دوامی طور پر پھنسا رہے گا۔ بیچ ہی کی چال کارآمد ہوتی ہے۔ بہر حال دنیوی مصائب آتے بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔ زیادہ خیال کرنے کی چیز یہ ہے کہ دینی مشکل نہ ہو جو ہمارے دین پر کچھ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے جتنا بھی عرض کیا وہ دینی امور کے بارے میں عرض کیا، دنیوی، سیاسی یا انتظامی

معاملات ظاہر ہے کہ میں ایک غیر ملکی آدمی کہہ ہی کیا سکتا ہوں اور کہنے کی ضرورت جب ہو، جب ملک کے اندر با فکر اور باتدبیر لوگ موجود نہ ہوں وہ خود ہی متفکر ہیں اور تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنا کام تو یہ ہے کہ دعا کی جائے۔ ہم دعا کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہر مشکل سے آپ حضرات کو بچائے اور امید ہے کہ مشکلات دفع ہوں گی۔ حسن نیت اور تدبر کے ساتھ چلا جائے اور اللہ سے معاملہ صحیح کر لیا جائے' مشکلات رفع ہو جائیں گی اور مشکلات تو انسان پر آتی ہیں۔ اس لئے کہ دنیا نام ہی مشکلات کا ہے۔ اگر مشکلات نہ ہوں پھر اس کو جنت کیوں نہ کہا جائے؟ اور جنت کی پھر طلب کیوں ہو؟ یہ سب اس لئے ہے کہ دنیا مشکلات کا نام ہے۔

بہر حال اس کی دعاء ہے اور انشاء اللہ رہے گی کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کی ہر قسم کی دینی اور دنیوی مشکلات حل فرماوے۔ (آمین)

مصائب سے بری و بالا کردے اور طمانیت وسکون کی زندگی دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے نصیب فرماوے۔ (آمین)

اس لئے میں جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں، وہ درحقیقت اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار ہے کہ خود میں کتنا متاثر ہوا۔ آپ تو اپنے دینی جذبات کی وجہ سے کچھ کلام سن کے متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن میں عمل کو دیکھ کے متاثر ہوں کہ پچیس دن میں ہر قسم کی محبت ومدارات اور قدر دانی سامنے آئی۔ ابتداء میں آتے ہوئے مجھے تشویش تھی کہ معلوم نہیں کیسا ماحول ہوگا۔ لوگ کچھ بات بھی سن سکیں گے یا نہیں؟ کس قسم کے جذبات ہوں گے۔ جب دور بیٹھے ہوئے اجنبیت ہوتی ہے، تو آدمی کو تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ میرے عزیز نے بیان کیا۔ آنے کے بعد پہلے ہی دن معلوم ہوا کہ اپنے عزیزوں میں آ گئے۔ کوئی اجنبیت اور بعد محسوس نہیں ہوا۔ بالکل جیسے ہم گھر والے ہوتے ہیں اور پچیس دن کے بعد تو آدمی ویسے ہی گھر والا ہو جاتا ہے۔ مگر ہم تو پہلے ہی دن گھر والے ہو گئے۔

اس پر میں جتنا بھی شکر گزار اور اپنے جذبات اور قلب کے تاثرات کو ظاہر کروں، وہ کم ہی کم ہوں گے، سوائے اس کے کہ میں دعا کروں اور دعا کا وعدہ کروں اور آپ حضرات کے سامنے پیش کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ اتنی بات آپ حضرات سے عرض کرنی ہے کہ یہ مشکلات کا زمانہ ہے۔ جس طرح اور تدابیر کی جاتی ہیں اور اہل الرائے جو تدابیر بتلاتے ہیں۔ اس پر چلا جائے۔ وہ تدبیریں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن روحانی طور پر بعض ادعیہ اور چیزیں ایسی ہیں، وہ بھی مشکلات کے حل کے اندر معین ہیں اور ایک مسلم کیلئے ان سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر آدمی چل پڑے اور اس سے قطع نظر کرے کہ کیا ہوگا؟ بس وہ حل ہو جائے گی۔ مگر ہم ایسے ماحول میں ہیں۔ اس درجے کا تو ہمارا ایمان نہیں ہے کہ بالکل ہر چیز سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو روحانی سلسلے میں ڈال دیں لیکن میں کہتا ہوں کہ دنیوی ومعاشرتی تدابیر ضرور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ دینی تدابیر سے بھی غافل نہ رہا جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض غزوات اور جنگوں میں جب غیر مسلموں سے مقابلہ پڑا

ہے تو حق تعالیٰ نے اس وقت آیت اتاری۔ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ① اور اس کا ثمرہ بھی بتلایا کہ ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ ② اور جوں ہی صحابہؓ نے اس کا ورد شروع کیا تو اللہ کی خبر ہے کہ انقلاب پیدا ہو گیا اور مصیبت سے نعمت آ گئی۔ اور اللہ کے فضل سے برائیاں دور ہو گئیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص کم سے کم روزانہ صبح کی نماز کے وقت سو مرتبہ ورد کر لیا کرے اور یہ نیت کر لیا کرے کہ میری بھی مشکل حل ہو اور میرے بھائیوں کی بھی۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے۔ ہر ایک وعدہ ٹل سکتا ہے اللہ کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ یہ تو لکھی پڑھی بات ہے۔ اس سے مشکلات حل ہوں گی۔ اس لئے ایک تو یہ اور ایک یہ آیت کریمہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ③ یہ حضرت یونس علیہ السلام کو تدبیر بتلائی گئی تھی جب کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے، اور مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو یہ دعاء تلقین فرمائی۔

اس کا اثر یہ نکلا کہ مصیبت ختم ہوئی اور ایسی بہترین فضا سامنے آئی کہ یونس علیہ السلام کے سامنے کامیابیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ کوئی ناکامی باقی نہیں رہی۔ یہ ہمارے اعتقادات میں کچھ ضعف اور سستی ہے، جس کی وجہ سے ہم پورا دھیان نہ دے سکے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تجربہ تو کر کے دیکھئے، انشاء اللہ حالات بدلیں گے، یہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے۔ کسی اور کا بتلایا ہوا نسخہ نہیں ہے، جس کے علم میں کوئی کوتاہی ہو تو ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ④ صبح کو سو مرتبہ ورد کر لیا جائے اور ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ⑤ سوتے وقت اس کا ورد کر لیا۔ تو صبح کی دعا تو مصیبت سے نعمت کا انقلاب پیدا کرے گی اور شام کی یہ دعا غم سے مسرت اور ناکامی سے کامیابی کا انقلاب پیدا کرے گی۔ انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے کہ زندگی کامیاب ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تدبیر بھی کرو۔ مگر ظاہر بات ہے کہ محض تدبیر تو کارگر نہیں ہوتی اور اس پر اثرات پیدا کرنے والے تو اللہ ہی ہیں، اس لئے تدبیر تو بندے کا فعل ہے، لیکن بندہ فاعل تو نہیں ہے، فاعل مختار تو اللہ ہے، اس میں اثر ڈالنے والا تو وہ ہے۔ چھری کے اندر کاٹنے کا اثر ہے۔ لیکن اگر اللہ اثر چھین لے تو چھری کام نہیں کر سکتی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھی گئی تھی، چھری کی دھار بھی تھی، گلہ بھی نازک تھا۔ چاہئے تھا کہ کاٹتی اور اپنا اثر دکھاتی۔ مگر تاثیر نکال دی گئی تھی۔ کوئی اثر نہ دکھا سکی۔ گویا چھری میں اثر دینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ کی قدرت اور مشیت جلاتی ہے۔ آگ نہیں جلاتی۔ اس میں سے جلانے کی تاثیر نکال لی گئی۔ وہی آگ باغ و بہار بن گئی۔ اللہ رب العزت جو فاعل حقیقی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۴۔ ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷۔ ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳۔ ⑤ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷۔

ہیں۔ ان سے معاملہ صحیح ہونا چاہئے۔ آگ کو پانی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہے، مشیت ٹھنڈا کرتی ہے۔ اگر پانی کو آگ بنادیں تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اسی طرح چھری نہیں کاٹتی مشیت حق کاٹتی ہے۔

اس واسطے مشکلات کے رفع کرنیکی جہاں اور تدابیر کی جائیں وہاں بڑی تدبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے نسخوں کو استعمال کیا جائے اور اس کا ورد کیا جائے۔ امید ہے کہ چند دن کے بعد ہر شخص محسوس کرے گا کہ کچھ انقلاب ہوا ہے۔ کچھ خیر کی طرف بات آرہی ہے۔ اس واسطے ادھر توجہ فرمائی جائے۔

شریعت کا ہر حکم دینی و دنیوی فوائد پر مشتمل ہے...... اس کے علاوہ جو جو چیزیں وقتاً فوقتاً عرض کی گئیں۔ وہ حقیقت میں دینی اعتبار سے بھی نافع تھیں، دنیوی اعتبار سے بھی۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں آخرت کے ساتھ دنیا کا مفاد شامل نہ ہو۔ گو میں نے اس کی پوری تشریح نہیں کہ کہ دنیوی فوائد کیا کیا ہیں۔ زیادہ دینی فوائد بتلائے گئے ہیں۔ لیکن جب آپ کریں گے، دنیوی فائدہ بھی آخرت کے ساتھ اس پر مرتب ہوگا۔

مسواک کے بارے میں علماء لکھتے ہیں اور احادیث میں ہے کہ مادی فائدہ تو یہ ہے کہ منہ میں خوشبو پیدا ہوجاتی ہے۔ بہت سے امراض رفع ہوجاتے ہیں۔ آخرت کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو مرتے وقت کلمہ نصیب ہوتا ہے یہ گویا مسواک کی تاثیر بتلائی گئی۔ یہ اثر کیوں ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ اس کی تشریح اس وقت مقصود نہیں ہے کہ مسواک کرنے سے مرتے وقت کلمہ کس طرح منہ سے نکلے گا؟ یہ لمبا مضمون ہے۔ مگر بتلانا یہ ہے کہ اس میں دونوں فائدے ہیں۔ منہ کی خوشبو، یہ مادی فائدہ اور کلمہ نصیب ہوجانا یہ روحانی فائدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہادت کی حالت میں تھے، تو آپ مرض میں مبتلا تھے، زخم گہرا تھا، وفات قریب تھی۔ ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ جب وہ واپس چلا گیا۔ فرمایا اس نوجوان کو بلاؤ۔ اس کی لنگی پیروں سے اتنی نیچے پڑے ہوئی تھی کہ زمین کے اوپر گھسٹتی ہوئی آرہی ہے۔ فرمایا "یَا فَتٰی! اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ" ① "اے عزیز! اس لنگی کو زمین پر گھسیٹنے کی بجائے اوپر ٹخنوں تک اٹھا۔ یہ کپڑے کے لئے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور تیرے لئے پروردگار کی رضامندی کا ذریعہ بنے گا۔ مادی فائدہ بھی بتلایا، آخرت کا فائدہ بھی بتلایا"۔

اسی طرح حدیث میں ہے "صُوْمُوْا تَصِحُّوْا" ② "روزہ رکھو، صحت حاصل کرو"۔ تو روزہ کا دنیوی فائدہ صحت ہے اور آخروی فائدہ رضاء خداوندی ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا جہاں مادی تدابیر اختیار کی جائیں۔ وہاں روحانی تدابیر سے غفلت نہ کی جائے۔ اس پر انشاء اللہ دنیوی فوائد بھی مرتب ہوں گے۔

نیز دنیوی اور دینی تدبیر میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح ہے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ صبح کے وقت بیٹھ کر دس پندرہ منٹ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ③ کا ورد کرلے اور رات

① مصنف ابن ابی شیبة، ج: ٦ ص: ٢٧. ② حدیث موضوع ہے دیکھئے تذکرة الموضوعات ج: ١ ص: ٧٠.
③ پارہ: ٤، سورة آل عمران، الآیة: ١٧٣.

کو سوتے وقت پانچ منٹ صرف کر کے آیت کریمہ کا ورد کر لے۔ پھر انشاء اللہ اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔

میں نے ان چند کلمات سے اس وقت اپنے جذبات تشکر کا بھی اظہار کرنا ہے، اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے اور دعا کے لئے دعویٰ تو نہیں کرتا۔ مگر بہر حال یہ ظاہر کرنا ہے کہ دعاء کے سوا اور کسی کا ہوں بھی نہیں۔ اس سے انشاء اللہ غفلت نہیں ہوگی۔ دعائیں برابر کرتا رہا ہوں برابر کرتا رہوں گا اور وہاں کے بزرگوں کو بھی توجہ دلاؤں گا کہ وہ بھی آپ سب حضرات کے لئے دعائیں کریں؟ ادھر دعاء ہو، ادھر مادی تدبیر اور روحانی تدبیر ہو۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشکلات کا حل نہ نکلے۔ دنیوی و دینی دونوں مشکلات انشاء اللہ ختم ہوں گی۔

بار دگر شکریہ...... ان چند الفاظ کے ساتھ میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے بھی دعاؤں کا خواہشمند ہوں۔ آپ دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ مادی چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ لیکن دعاء منقطع نہیں ہوتی۔ اگر انسان آخرت میں بھی چلا جائے، جب بھی دعاء وہاں پہنچتی ہے۔ اس لئے اس سے آپ بھی فراموش نہ فرماویں۔

رہا یہ کہ یہاں دوبارہ آنا۔ تو میں کہتا ہوں کہ مولانا عمر دین صاحب کم ہمتی کیوں فرماویں کہ میں جوہانسبرگ سے یہاں آؤں۔ یہ ہمت فرمائیں کہ میں ہندوستان سے لوٹ کر پھر یہاں آ جاؤں۔ اس چیز کی کیا ضرورت ہے کہ میں تھوڑی دور جا کے پھر واپس آؤں۔

آپ کی محبت کی تو بے شک یہی بات ہے کہ تھوڑی دور سے واپس آؤں۔ مگر اصول یہ ہے کہ ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ بھوک چھوڑ کے کھانا چاہئے۔ زیادہ پیٹ بھر کے آدمی کھالے گا تو کھانے کی طرف توجہ باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کچھ بھوک چھوڑی رکھنی چاہئے تا کہ بھوک باقی رہے اور دوبارہ خواہش ہو کہ پھر کھانا آئے اور جلدی جلدی کھانے میں معدہ خراب ہوتا ہے۔ بیچ میں کچھ فاصلہ ہونا چاہئے۔ اس واسطے آپ ہمت سے یوں کہیں کہ ہم وہاں سے بلوائیں گے۔ جوہانسبرگ سے بلوانا کوئی زیادہ ہمت کی بات نہیں ہے اور میں انشاء اللہ حاضری کے لئے تیار رہوں گا۔ نکما تو ہوں گا جیسے اب نکما ہوں، پھر رہوں گا۔ مگر آنے کے لئے بہر حال تیار رہوں گا۔ حق تعالیٰ حاضری بھی نافع فرمادے اور جو کچھ آپ حضرات کے لئے کہا جائے وہ بھی۔

ان چند جملوں کے ساتھ میں اپنے بھائیوں کا بہنوں کا اور اس ملک کے تمام مسلم باشندوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اپنی محبت اور مدارات سے ہمارے قلوب کو موہ لیا ہے اور اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ حق تعالیٰ اس محبت کو باقی رکھے اور اس کو دارین میں ثمرات صالحہ کا ذریعہ بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ